قال امام الصوفیہ جنید رحمۃ اللہ علیہ

(عند ذکر الصالحین تتنزل الرحمۃ)

سرخیل جماعت صوفیہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

(صالحین کے حالات کے بیان کے وقت رحمت الٰہی نازل ہوتی ہے)

(بناءً علیہ)

حالاتِ مصلح الامۃ

حصہ (یعنی) دوم

مصلح الامۃ عارف باللہ حضرت مرشدنا مقتدانا مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری (اعظمی) حنفی چشتی صابری اشرفی نور اللہ مرقدہٗ کے حالات زندگی

(بحکم)

مخدوم و محترم جناب مولانا حافظ قاری محمد مبین صاحب مدظلہ العالی خلیفہ و جانشین حضرت مصلح الامۃ قدس اللہ سرہٗ العزیز

(بقلم)

عاجز و ہیچمدان عبد الرحمن جامی عفی عنہ

مقیم خانقاہ و یکے از خدام حضرت والا رح
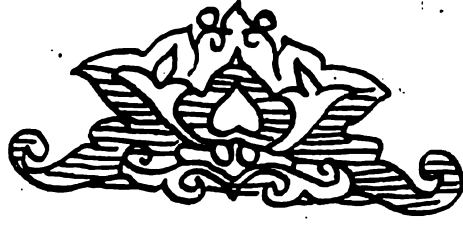
نام کتاب .... حالات مصلح الامتؒ دوم

مرتب .... حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب جامی علیہ الرحمۃ

ناشر .... دائرۃ الاشاعت خانقاہ مصلح الامتؒ ۲۵/۲۳ بخشی بازار الہ آباد۔

صفحات ۴۰۴

سن طباعت ۱۹۹۵ء

زیر نگرانی .... سعادت علی (گورینی)

قیمت حصہ اوّل .... ۱۵۰ روپئے

قیمت حصہ دوم .... ۱۵۰ روپئے

فہرست مضامین حالاتِ مصلح الامتؒ (حصۂ دوم)

حضرت مصلح الامتہؒ کے حالات کے سلسلہ میں حضرت کے طریق کار پر سطور گذشتہ میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے ناظرین کو حضرت کے مشاغل دینیہ اور مزاج والا کا فی الجملہ اندازہ ہو گیا ہو گا اب اسکے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسند ارشاد پر فائز ہو کر حضرت نے اصلاح امت کے سلسلہ میں جو کام کیا اور اس کے لئے جیسا کچھ تعب برداشت کیا اسکا بھی کچھ خاکہ پیش نظر کر دیا جائے تاکہ ناظرین کے سامنے سلف صالحین کے کارناموں اور اشاعت دین کے باب میں انکی محنتوں کا کچھ نقشہ اور اسکا کچھ نمونہ بھی آ جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کو جب کسی بندہ سے کام لینا مقصود ہوتا ہے تو وہ اپنے ایک ایک بندے سے ایسا ایسا بڑا کام لے لیتے ہیں۔ چنانچہ اسلاف کا طریقہ بھی یہی رہا ہے کہ وہ کام کرنے کے لئے پہلے جماعت اور کمیٹی وغیرہ نہیں بناتے تھے بلکہ خود کام کرنا شروع کر دیتے تھے اپنی ذات کو اخلاص کے ساتھ دین کی خدمت کیلئے وقف کر دیتے تھے اور پھر انکے اسی اخلاص کی برکت سے اللہ تعالیٰ انسانوں کی ایک بڑی تعداد کی اصلاح فرما دیتا تھا ایک مجمع کثیر کو ان حضرات کے گرد جمع فرما دیتا تھا

حضرت اقدس مصلح الامتہؒ نے سب سے اہم اور اقدم جن امور کو سالک کے لئے ضروری گردانا ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ صحیح دین پر لگنے کے لئے اور اصلاح نفس کیلئے ضروری ہے کہ انسان کسی کو اپنا مصلح، رہبر اور شیخ تجویز کرے، اور شیخ تو بس ایک ہی ہونا چاہیئے چنانچہ اسکی تفصیل ایک طالب کے مکتوب ذیل میں ملاحظہ فرمائیے انھوں نے حضرت اقدسؒ کو لکھا کہ :۔

حال: حضرت والا اپنی کمی کا احساس تو ہو جاتا ہے لیکن احساس کے موافق عمل میں دوام مشکل ہو جاتا ہے۔

تحقیق: عمل تو مشکل ہے ہی مگر طالب کیلئے نہیں طلب پیدا کرنا چاہیئے۔

حال: حالانکہ اسی کی بڑی ضرورت اور یہی بہت بڑی کمی ہے۔

تحقیق: ہاں کمی ہے اسکی وجہ میں نے لکھ دی (یعنی طلب کا نہ ہونا)

حال: حضرت والا صحیح یہ ہے کہ شخصیت پرستی کو (غالباً شہرت عامہ کی بنا پر ان

مولوی صاحب نے یہاں پرستی کا لفظ استعمال کیا ورنہ مراد انکی اس سے یہاں تقلید شخصی ہوگی اور تقلید اور چیز ہے (اور پرستی کا اور مفہوم ہوتا ہے ایک لازم اور ضروری ہے اور دوسری حرام ہے) پہلے میں زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا (بس) یہ ضرور سمجھتا تھا کہ بڑوں کے یہاں جانے سے کچھ اصلاح ضرور ہوجاتی ہے لیکن یہ کہ اصلاح انھیں (حضرات کے پاس جانے) میں منحصر ہے اسکے قطعی خلاف تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اللہ اور اسکے رسول کی کتاب میں سارے اعمال موجود ہیں اور بزرگان دین بھی اسی (کتاب وسنت) پر چلکر خدا کے برگزیدہ بندے ہوئے ہیں لہذا اگر ہم بھی صحیح معنوں میں ان اعمال کی اتباع کریں تو ہم بھی اس درجہ کو پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن اب میں نے کچھ تھوڑا سا حضرت کی کتاب وصیۃ الاخلاص کا مطالعہ کیا تو معلوم یہ ہوا کہ صحیح معنوں میں اتباع ہی تو مشکل ہوتا ہے اور واقعی یہ کتاب ایک عالم کے لئے ایک بار نہیں ستر بار مطالعہ کرنے کی ہے اور اس پر عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہے (یعنی اسکے مطابق عمل کرنے کی)۔

(تحقیق) بیشک صحیح لکھتے ہو۔

(راقم عرض کرتا ہے کہ مولوی صاحب نے آجکل کے نئے فارغین اور جدید اہل علم حضرات کے خیال کی خوب ترجمانی فرمائی اس مغالطہ میں آج ایک دنیا مبتلا ہے اور مبتلا کیا ہے انکو مبتلا کیا گیا ہے اور یہیں سے دین کی شاہراہ سے انھیں گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ ہدایت و ضلالت خدا کے قبضہ میں ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے صالحین ومخلصین کو ضائع نہیں فرماتے)

حال: ہم نے الفاظ بخاری تو ضرور ختم کرلیا ہے لیکن امام بخاریؒ نے کتاب کس مقصد کے لئے لکھی اس مقصد کیطرف نظر نہیں گئی۔ حضرت اس للّٰہیت کیطرف متوجہ کرانے کی دو شخصوں کو ضرورت ہے اول اول تو استاد ہی کا حق ہے کہ الفاظ کے ساتھ ساتھ معانی کی طرف بھی توجہ دلائیں اسلئے کہ طالب بحیثیت طالب ہونے کے ذہن اسکا خالی ہوتا ہے اسلئے اگر یہ لوگ اسوقت تنبیہ کرتے جائیں تو زیادہ اثر پڑے چنانچہ پہلے کے اساتذہ ایسے ہی ہوا کرتے تھے اسی لئے طالب علم جب نکلتا تھا تو

بیک وقت وہ بیہقی وقت اور غزالیٔ وقت ہوا کرتا تھا۔

تحقیق: بیشک ٹھیک لکھ رہے ہو، ٹھیک کہتے ہو (مگر اساتذہ ایسا کریں تب نا انکو تو خود اپنی اصلاح کی ضرورت ہے)

حال: لیکن حضرت آجکل ایسے اساتذہ کمیاب ہیں بلکہ آجکل اساتذہ نے اسکو دو جگہ منقسم کردیا ہے یعنی اپنے ذمہ الفاظ کرکے معانی کو بزرگوں کے حوالہ کردیا ہے جو بڑی غلطی ہے۔ تحقیق: صحیح ہے۔

حال: لہٰذا (آج اب) منحصر ہوگیا کہ للّٰہیت پیدا کرنے کے لئے کسی خدارسیدہ کا دامن ہاتھ میں مضبوط پکڑا جائے جو اعمال میں للّٰہیت پیدا کردے اور خدا کی صحیح معرفت کا پتہ دے۔ تحقیق: بیشک بیشک

حال: رہا یہ سوال کہ اس میں کسی ایک شخص کی شخصیت پرستی (یعنی تقلید شخصی) کی کیا ضرورت ہے، بیک وقت کئی ایک بزرگ سے اصلاح ہوسکتی ہے (اور دین کی اچھی بات جہاں سے بھی ملجائے لے لینے میں کیا حرج ہے) یہ سوال میرے ذہن میں بہت دنوں سے کھٹکتا رہا جو بحمداللہ حضرت کی دعاؤں کی برکت سے اسطرح حل ہوا کہ چونکہ ہر ایک بزرگ کے طریقۂ اصلاح میں فرق ہوتا ہے لہٰذا مرید (طالب دین) کے ذہن میں کبھی یکسوئی پیدا نہیں ہوسکتی۔ حالانکہ اس طریق میں یہی اصل اصول ہے

تحقیق: الحمدللہ خوب حل ہوا اور فرق بھی خوب سمجھ میں آیا۔ صحیح سمجھتے ہو۔

(راقم عرض کرتا ہے کہ اسی مسئلہ کے متعلق حضرت حکیم الامۃ کیا فرماتے ہیں ملاحظہ فرمائیے:-)

فرمایا کہ "پہلے تو میری عادت یہ تھی کہ جہاں جاتا تھا وہاں کے علما و مشائخ سے ملتا تھا چاہے کسی مشرب کا ہو اور اب تجربہ کے بعد یہ عادت نہیں رہی۔ اور اب تو میں خود اپنے دوستوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ یہ طرز خطرناک ہے۔ پہلے لوگوں کے طبائع میں سلامتی تھی اور اب شرارت ہے آجکل بجائے کسی نفع کے مضرت کا اندیشہ ہے اور جو ایسا کرتے

ہیں انکو اکثر الجھن ہی میں دیکھتا ہوں بکثرت اس قسم کے خطوط آتے ہیں جسمیں یہ لکھا ہوتا ہے کہ فلاں سے ملا فلاں سے ملا اوراب فسادِ قلب کی یہ کیفیت ہے۔ بتدی کو مختلف لوگوں سے ملنا نہیں چاہیئے اسلئے کہ انتشار ہوتا ہے، طبیعت میں یکسوئی نہیں رہتی اور اس طریق میں ضرورت ہے یکسوئی اور جمعیت قلب کی اور جب وہی اس صورت میں نہیں رہتی تو پھر نفع کہاں؟ انتہٰی

(ملفوظات حصہ پنجم ص ۱۲۱)

ملاحظہ فرمایا آپ نے حضرت تھانویؒ جو اپنے زمانہ میں طریق کے مسلمہ امام گذرے ہیں اپنے عمل اور تجربہ سے اسکو مضر فرما رہے ہیں۔ اور ہمارے حضرت نوراللہ مرقدہ تو فرمایا کرتے تھے کہ بھائی اس طریق کی نزاکت اور آداب کا تو کچھ ایسا معاملہ ہے کہ پیر تو بس ایک ہی ہونا چاہیئے۔ اور یہ فرماتے تھے کہ جس طرح سے خدا ایک خدا کا رسول ایک، باپ ایک، عورت کا خاوند ایک، پیر بھی بس ایک ہی ہونا چاہیئے

معلوم ہوا کہ طریق میں سلوک و تسلیک کے لئے کسی ایک ہی کو انتخاب کرنا ہوگا اور قلب کو تشتت سے بچانے کے لئے اور اسکی یکسوئی اور جمعیت کو باقی رکھنے کے لئے کسی ایک ہی شیخ اور ایک ہی مشرب کو اختیار کرنا ہوگا۔ شاید بزرگوں کے اس ارشاد کا کہ — یک در گیر و محکم گیر — یہی محل ہو۔ اس کا صحیح نام "تقلید شخصی" تو ہو سکتا ہے "شخصیت پرستی" نہیں معلوم ہوتا ہے کہ غلط العوام یا غلط العام کی راہ سے آج یہ زبان زد خاص بھی ہو گیا ہے)

حال: گو ہر بزرگ کا مرجع ایک ہی ذات (ذاتِ حق) ہے لیکن وہاں تک پہنچانے کے لئے چونکہ سب کے طریقے مختلف ہیں لہٰذا مرید کو سب کے طرق پر چلنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جائیگا ٹھیک اسی طرح سے جیسے کہ ائمہ اربعہ کہ سب حق پر ہیں اور سب کا مرجع بھی ایک ہی ہے لیکن ہر ایک کے طریقہ میں بون بعید کا فرق ہے سو اگر کوئی چاہے کہ بیک وقت وہ حنفی بھی ہو اور شافعی بھی ہو تو یہ ناممکن ہے بلکہ ایسا شخص اہل سنت والجماعۃ

کے طریقہ سے خارج ہے لہٰذا ضروری ہوا کہ کسی ایک امام کی اتباع کرے اور اسی
کے بتائے ہوئے مسائل پر عمل کرے اور جس طرح سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت
میں کوئی دوسرا شریک نہیں رسول کی رسالت میں شرکت نہیں مسلک حنفیت اور شافعیت
میں شرکت نہیں اسی طرح ایک شیخ کی مشیخت میں بھی کوئی دوسرا ہرگز ہرگز شریک نہیں
ہو سکتا۔ پس ایک مرید کے لئے ضروری ہوگیا کہ اپنا شیخ واحد تسلیم کرے اور اسکے ہر ایک
ارشاد کو اپنے لئے فلاح دارین کا سبب جانے اور اسکے کردار و گفتار کو سمجھنے کے لئے
ضرورت ہے اس بات کی کہ شیخ کی صحبت او معیت اختیار کرے۔

تحقیق : بیشک، بیشک۔

حال : حضرت یہ نعمت غیر مترقبہ (یعنی آپ کی صحبت کا حصول) جب اپنے پاس
تھی تو کچھ قدر نہ تھی اور اب جبکہ دور ہوگئی (یعنی آپ وطن سے چلے گئے) تو
کچھ سمجھ میں آیا لیکن صحبت دور ہو چکی تھی)۔

تحقیق : غنیمت ہے کہ آیا (قدر نعمت بعد زوال تو مشہور مقولہ ہی ہے)۔

حال : لیکن حضرت بڑی چیز عظمت (و محبت شیخ) ہے اگر یہ دل میں ہے تو حضرت
بھی دل سے قریب ہیں ورنہ جسد کے اعتبار سے قرب کوئی قرب نہیں ہے،
حضرت کے عتاب سے کچھ سمجھ میں آیا۔ **تحقیق** : بیشک

ملاحظہ فرمایا آپ نے طریق میں یکسوئی کی ضرورت آج ہمارے درمیان
سے یہی رخصت ہو چکی ہے اسی لئے فیض بھی ناپید ہوگیا ہے۔ چنانچہ جس طالب میں اسکا
اہتمام دیکھتے تھے اس سے حضرت مصلح الامۃؒ اپنی بڑی خوشی کا اظہار فرماتے اور یہ
سمجھتے تھے کہ یہ راستہ پر لگا ہوا ہے۔ ایک طالب مخلص کا عریضہ ملاحظہ فرمایئے:۔

حال : حضرت گذشتہ دو ہفتوں میں ہمارے شہر میں دو بزرگ یکے بعد دیگرے
تشریف لائے تھے۔۔۔۔ ان میں سے ایک صاحب کی مجلس بھی بھائی صاحب
کی کوشش سے مدرسہ میں ہوئی اور دونوں حضرات کے وعظ بھی ہوئے جن میں ناکارہ
بھی شریک رہا لیکن حضرت کیا بتاؤں کہ دل دوسری ہی طرف لگا ہوا تھا۔ قلب میں

برابر یہ بات موجزن رہتی تھی کہ ہمارے حضرت کی مجلس کے سامنے یہ مجلس کچھ بھی نہیں حضرت! یہ کچھ بُرا تو نہیں؟ حالانکہ اب تک یہ ناکارہ (حضرت والا کی مجلس میں) شرکت کے شرف سے محروم ہے، تاہم تصور میں ایک نقشہ ذہن میں بنا رہا تھا حالت یہ تھی ع
"ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیال ماہے" حضرت! اب حاضری کا اشتیاق بہت ہی زیادہ ہوگیا ہے کسی لمحہ چین نہیں ہے۔ حضرت والا کی یاد بہت ستا رہی ہے دعا فرماویں کہ اللہ تعالیٰ جلد از جلد خدمت میں پہنچا دیں۔

تحقیق: سلامٌ علیکم چوں در خاطری گر از چشم دوری بدل حاضری

آپ نے دو بزرگوں کا ذکر کرکے اپنا حال تحریر فرمایا اور یہ استفسار فرمایا کہ یہ برا تو نہیں؟ سبحان اللہ برا کیسے ہو سکتا ہے آپ نے تو اخیر میں اسکا عشقی جواب بھی عنایت فرمایا ہے میں اسی کی قدرے تفصیل لکھتا ہوں ؎

گفت معشوقے بعاشق اے فتیٰ تو بغربت دیدۂ بس شہرہا

(ایک معشوق نے عاشق سے پوچھا کہ ارے میاں تم نے تو مسافرت میں بہت سے شہروں کی سیر کی ہے)

پس کدامی شہر از آں خوشتر است گفت آں شہرے کہ در وے دلبر است

(یہ تو بتاؤ کہ انمیں سب سے بہتر کون سا شہر تمھیں معلوم ہوا اس نے کہا مجھے تو وہی شہر سب سے عمدہ نظر آیا جس میں میرا محبوب تھا)

اور سنیئے:-

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیال ماہے چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بکس نگاہے

(گو تمام شہر حسینوں سے پر ہے لیکن میں ہوں اور اپنے ماہرو کا خیال ہے کیا کروں میری بدخو آنکھ کسی دوسرے کو نظر اٹھا کر دیکھنے کیلئے تیار ہی نہیں ہوتی)

یہ کیفیت مسمّی بعشق ہے اسی کے کمال کو فنا کہا جاتا ہے۔ آخرِ خط میں آپ نے اسکے اثرات کا ذکر فرمایا ہے۔ مبارک ہو عاشق کو اسکا عشق۔ ملاقات کی بے چینی بھی اسی عشق سے مسبب ہے اسکے لئے بھی دعا کرتا ہوں۔

اسی سلسلہ کا ایک اور عریضہ ملاحظہ فرمایئے:-

حال: حضرت والا! یہاں مدرسہ کے مولوی صاحبان جب حضرت والا کی خدمت میں خط لکھتے ہیں تو اول مجھے دکھاتے ہیں کچھ اس میں ترمیم کرنا ہوتا ہے تو کر دیتا ہوں

کوئی غیر ضروری بات ہوتی ہے تو اسکو کاٹ دیتا ہوں یہ مناسب ہے یا نہیں
تحقیق : خوب مناسب ہے ۔ لکھنے کا ڈھنگ (اور طریقہ) سکھاتے ہیں (اس سے بڑھکر کیا بات ہے) ۔

حال : یہاں حضرت مولانا ... صاحب تشریف لائے تھے اسکے دو ہفتہ قبل حضرت مہتمم صاحب (دیوبند) بھی تشریف لائے تھے ۔ حضرت مہتمم صاحب سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت حکیم الامۃؒ کے خلفاء میں سے کون بزرگ حضرت اقدسؒ کے طریقہ پر زیادہ ہیں تو فرمایا کہ پاکستان میں حضرت مولانا محمد حسن صاحب (امرتسریؒ) حضرات اقدسؒ کے طرز پر کام کر رہے ہیں لیکن ہو بہو تمام باتوں میں حضرت اقدسؒ ہی کے طرز پر بس ایک مولانا وصی اللہ صاحب ہی ہیں ۔
تحقیق : میرے لئے اس سے بڑھکر کیا ہو سکتا ہے مگر کہاں میں اس قابل ہوں ۔ آپ دعاء کیجئے ۔

حال : حضرت مہتمم صاحب کا یہ قول ایسے ہی ضمناً میں نے عرض کر دیا کیونکہ میرے لئے اس میں راحت کا سامان تھا ۔ تحقیق : بیشک

حال : میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کل ایک مولوی صاحب نے حضرت کے نام خط لکھکر مجھے دکھایا تھا اس میں بعض حضرات (علماء) کی یہاں تشریف آوری وغیرہ کا ذکر تھا تو میں نے ان سے کہا کہ ویسے تو یہاں اکثر علماء آتے ہی رہتے ہیں تم کس کس کا ذکر کرتے رہوگے اسکی کیا ضرورت ہے ۔ میری حالت یہ ہے کہ چونکہ یہاں بعض حضرات نے سلوک میں گڈ مڈ پیدا کر دیا ہے ، طریق سے بیگانگی ہو گئی ہے جنکی وجہ سے اہل اللہ سے لوگوں کو بدظنی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے لہٰذا اگر ہمارے میں سے کوئی ایسا آجاتا ہے جن سے غلط فہمی کے ازالہ کی توقع ہوتی ہے تو میں محض اس نیت سے ان کے وعظوں میں شرکت کر لیتا ہوں کہ میری کنارہ کشی کا اثر عام لوگوں پر پڑتا ہے
تحقیق : بڑی مصلحت ہے ۔

حال : ورنہ میرا دل تو بجز حضرت والا کے کسی اور کی طرف آنکھ نہیں اٹھاتا ۔

تحقیق: مبارک ہو

حال: دلآرامے کہ داری دل دروبند — دگر چشم از ہمہ عالم فروبند

(جو ذات کہ قلب کو راحت پہنچانے والی ہے اس محبوب کے ساتھ دل کو لگاؤ اور دوسری سب چیزوں سے آنکھ بند کرلو)

تجھ میں وہ کون سی ادا — اے مرے باخدا نہیں

(اور میں نے ان سے کہا کہ) یاد رکھو کہ جسکو اپنے شیخ سے مخلصانہ اور قوی نسبت حاصل ہوجائے اس نے بڑی نعمت حاصل کرلی اسی کا نام وحدت مطلب ہے اور پیرومرشد سے صحیح استفادہ کے لئے یہ شرط ہے۔ تحقیق: بیشک بیشک۔

حال: یہ نہو تو بس اسکا حال یہی ہوجاتا ہے ع نہ خداہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے پس کوئی عالم آجائے تو وقتی طور پر مصالح کے پیش نظر انکے وعظ و مجلس میں شرکت کرلیجائے باقی حال یہ ہے کہ ؎

جس نے بچشم نکتہ بیں دیکھ لیا وہ مہ جبیں — اسکی نظر میں پھر کہیں کوئی حسیں جچا نہیں

حضرت والا! اس میں دوسرے بزرگوں کی نعوذ باللہ توہین (اہانت) تو نہیں۔ واللہ مقصود اسکا بالکل نہیں ہوتا۔

تحقیق: نہیں ہرگز نہیں۔ یہ غیرت ہے جو لوازم عشق سے ہے (یعنی طریق میں ایک ضروری شے ہے)

ملاحظہ فرمایا آپ نے سالک کیلئے اپنی تسلیک کے سلسلہ میں جو شے سب سے ضروری تھی یعنی ایک شیخ سے مخلصانہ تعلق جس کا دوسرا نام وحدتِ مطلب ہے اسکی اہمیت مذکورہ بالا مکاتبت میں کس قدر نمایاں ہے۔

اسی طرح سے سالک کیلئے ایک اور چیز کی بھی حاجت ہے اسکا نام طلب ہے۔ اس کا بھی مطالبہ کتنی شدت سے فرمایا گیا ہے اور طلب کسے کہتے ہیں اسکو خود حضرت مصلح الامۃؒ نے بارہا حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ کے کلام سے نکال نکالکر سنایا ہے۔

شیخ فرماتے ہیں کہ :۔

طلب بر جان طالب چناں غالب آید و استیلا یابد کہ ہیچ مقصودے و ہیچ آرزوئے ازاں مانع نہ آید و غلبہ شوق و تعطش بآں سرحد رسد کہ اگر عقلاء عالم حکم کنند کہ وصول بدیں مطلوب محال است و حصول ایں متعذر ایں سخن در گوش اصلا راہ نیابد۔

(کتاب المکاتیب ص ۴۲)

طلب کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ طالب کی جان پر اسطرح سے غالب آجاتی ہے اور اسقدر اسپر اسکا استیلا ہو جاتا ہے کہ مطلوب کے حصول میں کوئی اور شی یا کوئی اور آرزو یا خیال رکاوٹ نہیں ڈال سکتا اور شوق کا غلبہ اور حصول مطلوب کی پیاس اسقدر بڑھ جاتی ہے کہ اگر تمام دنیا کے عقلاء ملکر یہ حکم کریں کہ اے میاں تمہارا یہ مطلوب حاصل ہونا محال ہے اور بالکل متعذر ہے تو انکی بات کی طرف یہ طالب کان کبھی نہ لگائے (اور اپنی دھن میں لگا رہے اسکا نام ہے طلب صادق)۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک طالب مخلص کا اپنا حال جو انھوں نے حضرت مصلح الامۃ کے پاس لکھا پیش کر دوں اس سے اندازہ ہو جائیگا کہ اللہ کے دین کے طالب کس طرح سے خود کو شیخ کے حوالہ کیا کرتے ہیں۔

حال : " بندہ مدرسہ عالیہ دیوبند سے ۴۱ء میں حضرت مرشدی و مولائی سید حسین احمد صاحب مدنی سے سند فراغت حاصل کر چکا ہے اور آنحضرت سے رسمی طور پر بیعت بھی کی تھی لیکن فیض صحبت سے محروم رہا اب بوساطت جناب مولانا ۔ ۔ ۔ ۔ کے آپ کے حضور کا تعارف نصیب ہوا۔ حضرت والا کی تصنیفات کا بھی مطالعہ کر چکا ہوں بعدہٗ خود بھی منگوالی ہیں بعد مطالعہ حضور والا شان سے حد درجہ عقیدت بندھ گئی ہے اور محبت بھرے جذبات سے بذریعۂ عریضۂ ہٰذا حاضر خدمت ہو کر معروض ہوں کہ اگر کرم نوازی فرمائی جائے تو بندہ کو اصلاح حال میں رہنمائی فرمائی جائے۔

بندۂ پُر تقصیر اپنے عیوب کو کسی طرح بھی شمار نہیں کر سکتا لیکن خاص خاص عیوب پیش خدمت کرتا ہے۔ اول یہ کہ بندہ میں انانیت حد درجہ پائی جاتی ہے، میں اپنے آپکو بہت بڑا عالم سمجھتا ہوں حضرت مدنیؒ کی شاگردی کیوجہ سے دل میں بڑا فخر رہتا ہے۔ دوسرے لوگوں کو خواہ وہ عالم ہی کیوں نہ ہوں جاہل تصور کرتا ہوں، بعض علمی مقابلوں میں کامیابی کیوجہ سے یہ چیز پیدا ہوگئی ہے دل چاہتا ہے کہ کسی اللہ کے مقرب بندے سے ملاقات ہو تو

ان عیوب کو پیش کر کے اصلاح کراؤں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہوا تو آپکی طرف رہنمائی فرمائی گئی۔

صرف علمی ہی معاملہ میں نہیں بلکہ ہر معاملہ میں مجھ میں انانیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً جوان ہونے میں اور دیگر دنیوی امور میں اپنے آپ کو صائب الرائے تصور کرتا ہوں۔

دوم بدمعاملگی (یعنی دین کی بے اعتدالی) چنانچہ بعض دوستوں سے قرض لیکر واپس ادا نہیں کیا۔ کچھ تو اپنی بعض کمزوریوں کیوجہ سے آتنی رقوم مہیا نہ ہوسکیں اور کچھ مہیا بھی اگر ہوئیں تو کوئی خاص پروا نہ کی۔

سوم بندہ کی دو بیویاں با اولادہیں جنمیں اکثر تنازع رہتا ہے رفع تنازع میں مجھ سے اکثر زیادتی ہی ہوتی رہی۔

چہارم بداخلاقی (یعنی) عملی نفاق کا درجہ بھی کم نہیں۔ نیز بعد فراغت قرآن مجید بھی حفظ کیا لیکن وہ ضبط نہ رہ سکا اپنی سستی اور کمزوری سے اسکو بھلا دیا وغیرہ وغیرہ (اسکے علاوہ بھی اور اتنے عیوب سے پُر ہوں کہ قلم میں لکھنے کی تاب نہیں۔ رب قدوس کے فرشتے ہی اسکو شمار کر سکتے ہیں۔ یہاں صاحب فضیلت جناب مولانا ۔۔۔۔ صاحب موصوف ہیں ماشاء اللہ انکے فیض صحبت سے کافی فائدہ ہوا لیکن آنکی صحت کی خرابی سخت مانع رہی۔ نیز وہ بھی فرماتے تھے کہ میں مجاز نہیں ہوں (یعنی آپ سے مجاز بیعت نہیں ہوں) اسلئے بندہ (جناب ہی سے) بیعت کی بھی درخواست پیش کرتا ہے باقاعدہ سلوک سکھایا جائے اور ابتدائی تعلیمات تحریر فرمائی جائیں خط و کتابت کیلئے مولانا جامی صاحب کی معرفت ایک روپیہ ارسال خدمت کر دیا گیا ہے۔ اگر حضور مولانا ۔۔۔۔ کے حق میں دعائے صحت فرما دیں تو بڑے کام کی چیز ہو۔ بصورت صحت امید کیجا سکتی ہے کہ ان سے مخلوق فائدہ حاصل کر سکے۔ بعض دوستوں کی یہ بھی رائے ہے کہ انھیں حضرت والا کی خدمت میں پہنچانے کی کوئی سبیل بنائی جائے تاکہ وہ فیض صحبت سے بہرہ ور ہو کر ہم تشنگان کے لئے مشعل راہ بن سکیں وما توفیقی الا باللہ۔

(حضرت مصلح الامۃ رح کا جواب)

آپ کا محبت نامہ ملا۔ آپکی خوش فہمی اور حسن عقیدت سے جی بہت خوش ہوا
اللہ تعالیٰ اس میں یوماً فیوماً ترقی عطا فرمائے۔ میں کیا اور میری تالیفات کیا۔ آپ ماشاءاللہ
خود بھی عالم ہیں اور پھر بڑی درسگاہ سے آپ کا تعلق، بایں ہمہ آپکی نظروں میں اسکی تحسین
میری ہمت افزائی کا سبب بنی، اللہ تعالیٰ انکو نافع خلائق بنائے اور مجھے زیادہ کام کرنے
کی توفیق عطا فرمائے۔ مولانا ۔۔۔ صاحب سے آپکا تعلق معلوم کرکے خود کو بھی آپ
سے ایک خاص تعلق ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اسکو جانبین کے لئے مفید اور کارآمد بنائے اور
دارین میں اسکے ثمرات سے سب کو بہرور فرمائے۔ آمین۔

اصلاحی تعلق کا خیال ظاہر فرمایا گیا ہے۔ توکلاً علی اللہ بخوشی منظور ہے
اللہ تعالیٰ اسکو جانبین کے لئے مثمر بنائیں۔ آپ نے اپنے حالات بھی کچھ تحریر فرمائے ہیں
اس سے اسکا اندازہ تو ہو ہی گیا کہ الحمدللہ آپکو فکر ہو چکی ہے اور احساس پیدا ہو گیا ہے
اسی کو طلب کہتے ہیں)

مولانا! طریق میں اصل یہی ہے کہ فکر و احساس پیدا ہو جائے۔ اگر صحیح معنوں میں
یہی چیز انسان میں پیدا ہو جائے تو پھر مجال نہیں کہ انسان رذائل سے متصف باقی رہ سکے
اپنے امراض قلب کے ازالہ کی فکر اور اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق پیدا ہونے کا غم جو کہ صورۃً
دو ہے مگر حقیقۃً ایک ہی چیز ہے یہی چیز جب آدمی میں پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ کامیاب ہی
ہو جاتا ہے۔ طریق میں یہ غم محمود بلکہ مطلوب ہے ؎

غم، چہ ایستادۂ تو بر در ما؟ اندر آ یار ما برادر ما!

باقی یہ ہو سکتا ہے کہ اسکو پیدا ہوتے ہوتے کچھ عرصہ لگ جائے اور آپ نے جس مرض
کے متعلق پہلے لکھا ہے مشائخ اسکے متعلق فرماتے ہیں کہ علماء کا مخصوص مرض یہی ہے
اور یہ سب سے آخری چیز ہے جو کہ صدیقین کے قلب سے نکلتی ہے۔ سنئے ابن ماجہ شریف
کی ایک حدیث ہے۔

عن جابر بن عبد اللہ ان حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لاتعلموا العلم لتباھوا بہ العلماء ولا لتماروا بہ السفھاء ولا تحیزوا المجالس فمن فعل ذلک فالنار النار

علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم کو اسلئے مت سیکھو کہ اسکے ذریعہ علماء پر مفاخرت کرو اور نہ اسلئے کہ جہلاء پر رعب جماؤ اور محافل و مجالس میں صدر نشینی نہ تلاش کرو، جس نے یہ سب کیا تو جہنم سے ڈرے۔

"لا تحیزوا" کے تحت حاشیہ میں مولانا شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں :-

التحیز التمکن والتقرر المراد منہ لاتمکنوا فی قلوب الناس لتکونوا صدرًا للمجالس فانہ من اشد اغراض الدنیا لان آخر ما یخرج من قلوب الصدیقین حب الجاہ وھذہ عقبۃ کئودۃ للعلماء لاینجو منہ الا المخلصون

تحیز کے معنی ہیں تمکن اور تقرر کے مراد یہ کہ لوگوں کے قلوب میں ایسے نہ بنو کہ وہ تمکو مجالس کا صدر بنا دیں کیونکہ یہ اغراض دنیویہ میں بدترین شے ہے کیونکہ صدیقین کے قلوب میں سب سے جو رذیلہ کہ سب سے آخر میں نکلتا ہے وہ یہی حب جاہ ہے اور ایک دشوار گزار گھاٹی ہے علماء کے لئے، جس سے کہ مخلصین ہی نجات پا سکتے ہیں۔

دیکھئے ابن ماجہ کی یہ حدیث اور اسکی جو شرح محشی نے نقل فرمائی ہے کسقدر موثر ترہیب ہے علماء کے لئے۔ اگر آج اس قسم کی احادیث ہمارے پیش نظر ہو جائیں تو اخلاص پیدا کرنے کے لئے یہی کافی ہے۔ چنانچہ اہل علم کے مجمع میں یہ گفتگو ہوئی کہ علماء میں آج جو یہ غفلت ہے اسکا سبب کیا ہے؟ کسی نے کہا کہ تعلیم و تعلم کا شغل ہی ان کو ادہر (یعنی اپنے قلب کی اصلاح کیجانب) متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ اس پر کسی دوسرے نے کہا کہ بھائی (تعلیم و تعلم کے سلسلہ میں) احادیث میں آخر کتاب الرقاق اور کتاب الزہد بھی تو ہے جن میں ایسی ایسی روایات بھی ہیں جو ابھی بیان ہوئی۔ پس غفلت کا سبب درس و تدریس نہیں ہے بلکہ ان ابواب کا پیش نظر نہ ہونا ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ آج علماء ان ابواب کو بالخصوص اس قسم کی روایات کو برابر پیش نظر رکھیں، اسی سے یہ غفلت زائل ہوگی۔ میرا خیال بھی یہی ہے کہ یہ صحیح علاج ہے۔

تصوف کوئی بدعت تو ہے نہیں مشائخ محققین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حقیقی

تصوف وہی ہے جو قرآن و حدیث سے ماخوذ ہو۔ میں بھی احباب کو بالخصوص اہل علم کو اس جانب متوجہ کرتا رہتا ہوں کہ آپ کے پاس قرآن کا علم موجود احادیث موجود پھر انکے بعد آخر کس چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دل سے انکی تصدیق کیجئے، انکو پڑھئے اور ان پر عمل کیجئے پھر دیکھئے کہ قلب ٹھیک ہو جاتا ہے یا نہیں۔ یہاں ہندوستان کے ایک مشہور عالم نے مجھ سے کچھ دریافت کیا تھا میں نے انکو مفصل خط کچھ اسی قسم کے مضمون پر مشتمل لکھا۔ غالباً وہ "الفرقان" میں اس ماہ شایع بھی ہو گا مل جائے تو دیکھئے گا۔

(راقم عرض کرتا ہے کہ مراد اس خط سے شاید مولانا مناظر احسن گیلانی کا خط ہو جو ابتدار حالات میں مکاتیب ثلاثہ کے نام سے شایع ہو چکا ہے یا حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کا خط ہو جس کے جواب میں حضرت والا نے رسالہ التذکیر بالقرآن تصنیف فرمایا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔)

نیز آپ نے مکتوب بالا میں ملاحظہ فرمایا کہ حضرت مصلح امتؒ نے عوام ہی کا نہیں بلکہ علماء تک کا مرض اس زمانہ میں غفلت تجویز فرمایا اور پھر اسکے ازالہ کی تدبیر بھی بتلائی اس سے معلوم ہوا کہ بطور قدر مشترک کے آج سب ہی لوگ کیا عوام اور کیا خواص غفلت کا شکار ہیں جسکی اصلاح بچپنے میں اگر والدین نہیں کر سکے تھے تو کم از کم مدارس میں اساتذہ ہی کر دیا کرتے لیکن افسوس کہ آج اس کام کو بھی خانقاہوں میں حضرات مشائخ اور مصلحین امت کو انجام دینا پڑتا ہے۔ چنانچہ طالبین سے زیادہ غافلین سے ان حضرات کو سابقہ پڑتا ہے۔ ہمارے حضرت مصلح الامۃؒ کا زمانہ جس نے پایا ہے اور حضرتؒ کے کام کو جس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کم از کم وہ تو اسکی تصدیق ہی کرے گا کہ حضرتؒ کے یہاں مسلسل، آنے جانے والوں کی نکال بیٹھال جاری رہتی تھی۔ کبھی یہ سوال ہوتا کہ آپ لوگ یہاں کیوں تشریف لاتے ہیں؟ کبھی دریافت کیا جاتا میرا آپ کے یہاں اتنے عرصہ سے قیام ہے آپ حضرات نے اپنی عملی حالت میں کیا تبدیلی فرمائی؟ کبھی پوچھتے کہ میں نے آج مجلس میں کیا مضمون بیان کیا اور اس سے آپ نے کیا اثر لیا؟ لکھکر

فرداً فرداً ہر مولوی صاحب پیش کریں۔ کبھی کسی کو تنبیہ فرماتے کہ تم میں طلب نہیں ہے یا اعتقاد نہیں یا شیخ کی عظمت نہیں یا انکار موجود ہے یا طریق سے عقیدت نہیں ہے یا دین کا صحیح علم نہیں ہے یا اخلاص نہیں ہے اسکی جگہ نفاق۔ پالیسی۔ چالبازی۔ سخن سازی ریاکاری، دنیاداری وغیرہ موجود ہے۔ لہٰذا تمھاری اصلاح مشکل ہے تم کہیں اور چلے جاؤ ہماری جگہ کو کیوں فاسد کرتے ہو، یا تم میں محبت کی کمی ہے یا اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں ہے یا شریعت کی قدر و منزلت سے دل خالی ہے یا تمھارے اندر معمولات کا اہتمام نہیں ہے۔ طبیعت بیفکر واقع ہوئی ہے۔ لاپروائی مزاج میں ہے۔ غفلت ہے۔ لہٰذا تم اپنے گھر ہی رہو اور اپنی ان تمام چیزوں کا فیض اور انکا نور وہیں برساؤ یہاں کیوں ہو وغیرہ وغیرہ غرض یہ تمام باتیں دلیل تھیں اسکی کہ حضرتؒ کا سابقہ مخلصین سے زیادہ غیر مخلصین سے اور طالبین سے زیادہ غافلین سے پڑا کرتا تھا۔ چنانچہ طالبین کے لئے تو شاہراہ کھلی ہی رہتی تھی اور غافلین یعنی غیر طالبین کو اول طالب بنانے کی سعی کیجاتی تھی۔ یہ ایک ایسا کھلا ہوا معمول تھا کہ اسمیں دو رائے نہیں تھی۔ لیکن ایک متعلق خانقاہ کے متعلق یہ بات سنکر میری تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ انھوں نے "خانقاہ کے کام" اور "دیگر دینی کوششوں" کا فرق ظاہر کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہم لوگ بھی جو کام کر رہے ہیں وہ بھی دینی کام ہے فرق صرف دونوں میں یہ ہے کہ وہاں یعنی خانقاہ میں طالبین کی اصلاح کیجاتی ہے اور ہم لوگوں کا کام جو ہے وہ غافلین کو دین پر لگانا ہوتا ہے۔ شاید ان صاحب کے پیش نظر یہ رہا ہوگا کہ خانقاہ والوں کا معاملہ ایسے لوگوں سے متعلق ہوتا ہے جو وہاں خود جاتے ہیں، بس اسی کا نام انھوں نے طلب رکھدیا تھا اور ہم دوسرے لوگوں کے پاس گھر گھر پہونچکر انکو دین کیطرف بلاتے ہیں اس لئے یہ انکے نزدیک غفلت کا مصداق بنا۔ حالانکہ گذشتہ سطور کے مطالعہ سے بات خوب واضح ہوگئی ہوگی کہ صرف اپنے قدموں سے خانقاہ تک آجانے ہی کا نام طلب نہیں ہے۔ طلب کا مفہوم ہی کچھ اور ہے اور اگر اسی کا نام طلب ہے تو اس معنی کر یہ غفلت کے ساتھ بھی جمع ہو سکتی ہے اسکے بالمقابل کوئی شئے نہیں ہے اور ایسا شخص طالب غافل

کہلائے گا۔ جس طرح سے کہ حضرت مولانا حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ کا مقولہ نقل فرماتے تھے کہ وہ بعض اہل علم کو بھی عالم جاہل کے عنوان سے یاد فرماتے تھے انکی کسی صریح اور فاش غلطی کے پیش نظر فرماتے تھے کہ یہ صاحب عالم جاہل ہیں اس پر طلبہ ہنس دیتے کہ حضرت علم وجہل میں تو منافات ہے پھر یہ دونوں کا اجتماع کیسا؟

بہرحال حاصل مدعا یہ ہے کہ کسی خانقاہ میں آمدورفت رکھنے والے بھی سب کے سب مخلص اور طالب صادق نہیں ہوا کرتے بلکہ وہاں بھی ایک سے ایک بڑھکر منافق، غیر مخلص، دنیا دار، خود غرض، منکر آجاتے ہیں جنکو سمجھکر شیخ انکے ساتھ معاملہ کیا کرتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ایسا بھی ہوتا ہے اور بہت ہوتا ہے کہ ایک انسان ابتداء میں غیر طالب اور غیر مخلص ہوتا ہے لیکن خدا کے فضل شیخ کی توجہ اور صالحین کی صحبت کی برکت سے آگے چلکر وہ بدل بھی جاتا ہے اور اسکے اندر طلب اور اخلاص آجاتا ہے۔ بس یہ تو ایسا شفا خانہ ہے کہ یہاں ہر قسم کے مریض کا علاج ہوتا ہے غیر طالب کو طلب کا سبق دیا جاتا ہے اور طالب مخلص کو آگے بڑھایا جاتا ہے تا آنکہ حق تعالیٰ کی محبت اسکے قلب میں راسخ ہوکر اسکو صاحب نسبت بنا دے اور یہی صحیح نسبت والا ہو جانا اس مکتب عشق کی آخری ڈگری ہے۔

آج جو لوگوں کو خوانق پر اعتراض ہے اور مشائخ اور بزرگوں بلکہ طریق ہی کا انکار ہے تو اسکی وجہ انکو علم صحیح نہونے کے علاوہ رسمی خوانق کی بدعملی بھی ہے۔ حضرت والا کے یہاں الحمدللہ رسومات پر سخت نکیر تھی اور خانقاہ کا موضوع کتاب وسنت کی روشنی میں اپنے ظاہر و باطن کی اصلاح اور اتباع سنت وشریعت کا رسوخ پیدا کرنا تھا۔ اسی لئے فرمایا کرتے تھے کہ میری یہ مجالس کوئی مجالس وعظ نہیں یا تقریر کا جلسہ نہیں ہے کہ ہم بیان کریں اور آپ سنیں یا سوئیں اس سے کوئی سروکار نہ ہو ایسا نہیں ہے بلکہ ہمارے اس اجتماع کی مثال مدارس کے درس کی سی کہی جا سکتی ہے لہٰذا جو بیان ہوگا آپکو اسے صرف سمجھنا ہی نہیں بلکہ مجھ سے بیان کرنا ہوگا کہ آپ کیا سمجھے اور اس سے اپنے لئے کیا سبق حاصل کیا، اسی لئے کہتا ہوں کہ جو لوگ اسکے لئے خود کو تیار پاتے ہوں

وہی تو ہماری مجلس میں شریک ہوں اور جو لوگ ابھی اپنے اندر اسکی ہمت نہ پاتے ہوں (یعنی دوسرے لفظوں میں اسکو یوں کہہ لیجئے کہ طلب طریق پورے طور پر موجود نہ ہو) تو وہ اس میں شریک ہو کر دوسروں کی راہ نہ ماریں، دوسرے اوقات میں مجھ سے ملیں میں انکو وقت بھی دونگا، ملوں گا بھی اور ان سے بات بھی کرونگا۔ پھر جب آتے جاتے طلب پیدا ہو جائے تو پہلی مجلس میں بھی شریک ہو سکتے ہیں۔

حضرت اقدسؒ نے اس چھانٹ اور پھانٹ کی بہتیری کوشش فرمائی لیکن خود فرماتے تھے کہ میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا یعنی اپنی مجلس کو غیر طالبین سے پاک نہ کر سکا یہ لوگ اسی میں گھستے تھے سمجھتے تھے کہ مجلس خاص میں کچھ خاص چیز بٹتی ہو گی اس سے ہم محروم کیوں رہیں، اور اس خاص چیز کے حاصل کرنے کا جو ظرف تھا یعنی اخلاص و طلب اسکے حاصل کرنے کی اصلا فکر نہ ہوتی تھی جسکا نتیجہ یہ ہوتا کہ انکو تو کچھ نفع نہ ہوتا ہاں دوسروں کا نقصان البتہ ہو جاتا تھا۔

اس موقع پر اکثر یہ فرماتے تھے کہ ایک چھوٹا سا کام (یعنی چھوٹے پیمانہ پر کام) کر رہا ہوں اور تھوڑے سے لوگ میرے اردگرد جمع ہیں لیکن اپنے کو اور اپنے کام کو منافقین کی آمیزش سے بچانے پر قادر نہ ہو سکا، خدا معلوم بڑے پیمانہ پر یہ قومی کام کرنیوالے کیسے کام کر لیتے ہیں اور کام کیا کرتے ہیں یہی سنتا ہوں کہ بعض نادانوں کی بدفہمی کے سبب کام کرنے والوں کا بھی ناطقہ بند ہی ہے اور عام لوگوں کا تو کہنا کیا، اسی جماعت نے آج حکومتوں تک کو فیل کر رکھا ہے اور اہل سلطنت بھی ان سے پریشان ہیں۔

بہرحال فرماتے تھے کہ جس طرح سے مدارس میں اوقات تعلیم کے وقت (خواہ وہ عربی مدارس ہوں یا انگریزی کالج اور یونیورسٹیاں ہوں) کوئی غیر شخص درس میں شریک نہیں ہو سکتا یہی حال ہماری مجالس کا سمجھو کہ جو اس میں داخلہ کرالے وہی شریک ہو ہر کس و ناکس کیوں اس میں آکر بیٹھ جائے۔ ملاقات سے منع نہیں کرتا لوگوں کو آنے سے نہیں روکتا لیکن اپنی مجالس کی عظمت کو بھی ختم نہیں کرنا چاہتا۔ یہ کیا کہ تمام چیزوں سے سستا بس دین اور طریق کو سمجھ لیا جائے گویا ع یہ وہ جامہ ہے کہ جسکا نہیں الٹا سیدھا

اسکول و کالج میں اصول و شرائط ہوں۔ کچہری اور دفاتر میں قواعد و نظم موجود ہوں اور ہماری ان جگہوں کو بے اصولی اور بے نظمی سمجھا جائے یہ آخر کیوں؟

انھیں مذکورہ بالا اصول کو اکثر و بیشتر بیان فرماتے اور لوگوں کو ان پر لگاتے ہوئے حضرت مصلح الامۃ نے شاندار مجالس فرمائیں چنانچہ چند ہی مجالس میں شرکت فرما کر جناب نجم احسن صاحب وکیلؒ نے (جو کہ حضرت حکیم الامۃؒ کے مجاز بھی تھے) اپنا یہ تاثر ظاہر فرمایا کہ ؎

دیکھ دیوانے دیکھ اے احسنؔ　　　یہ بھی گلشن ہے اشرفی گلشن

مجلس حضرت وصی اللہ　　　ہے نمود بہار تھانہ بھون

غرض مصلح الامۃؒ نے اپنے یہاں تعلیم و تربیت کا انداز بھی مدارس ہی کے طور پر رکھا کہ کبھی کبھی فرماتے ہوئے درس کا طالبین و سالکین سے امتحان بھی لیا کرتے اسکا کچھ نمونہ پیش خدمت ہے۔

حضرت مصلح الامۃؒ کے یہاں سالکین کا امتحان بھی ہوتا تھا

فرمایا کہ جس طرح سے مدارس میں امتحانات ہوتے ہیں اسی طرح سے اہل اللہ (مشائخ) بھی مریدین کا امتحان لیتے ہیں اور انکا امتحان طالب کی لغزش پر مواخذہ کرنا اور اس سے سوالات کی صورت میں ہوا کرتا ہے۔ بعض مرتبہ وہ شخص بالکل بے قصور ہوتا ہے مگر اہل طریق اسکا امتحان لیتے ہیں اب اگر اسکا نفس مر چکا ہوتا ہے تو ان سوالات پر غایت انقیاد کا ثبوت دیتا ہے اور اپنے کو خطا وار سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ مجھ میں نمعلوم کتنے عیوب موجود ہیں اور اگر اسکا نفس مرا نہیں ہوتا تو وہ وساوس وغیرہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ان حضرات کے مواخذہ پر چیں بجبیں ہوتا ہے اس سے یہ حضرات سمجھ لیتے ہیں کہ یہ کامل ہو گیا ہے یا نہیں۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے کہ الٓمّٓ ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (کیا لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ یونہی چھوڑ رکھے جائیں گے اور انکی آزمائش نہ ہوگی)۔

ایک بزرگ نے ایک شخص کو ڈانٹا اور اپنے پاس سے ہٹا دیا اور جب وہ جانے لگا تو پھر بلا لیا اور پھر اسکو اپنے خواص میں سے بنا لیا یہ ہے بزرگوں کا امتحان کہ ایک منٹ میں امتحان بھی لے لیا اور نتیجہ بھی سنا دیا۔ جو بزرگ بدون امتحان لئے مریدین کا اعتبار کر لیتے ہیں یہ کچھ نہیں ہے۔ حضرت

مولانا تھانوی کے یہاں دیکھا کہ جس کا امتحان ہوا وہی تو کچھ ہوگیا اور جس کی تعظیم و تکریم کی گئی وہ آخر میں کچھ نہیں نکلا۔ میں اپنے یہاں لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ جس کو خوب آزماتا ہوں وہ تو خلوص کی راہ اختیار کر لیتا ہے کسی ایک کو بھی نہیں دیکھا کہ امتحان لینے کی وجہ سے بھاگ گیا ہو۔ اور جس کسی کے ساتھ اخلاق برتا وہ ہمارا معتقد ہی نہیں ہوا۔ ہم لوگ حضرت مولاناؒ کے یہاں ڈرتے ہی رہتے تھے کہ کب ہمارے نفس کی کوئی چوری پکڑ لی جائے اور جب حضرتؒ کسی کو طلب فرماتے تھے تو وہ بس اسکا مصداق ہوتا تھا کہ ؎

داغ جاتے تو ہیں مقتل میں پہ اول سب سے　　دیکھئے وار کرے وہ ستم آرا کس پر

مگر ہم لوگ سمجھتے تھے کہ یہ جگہ ہی اصلاح کی ہے اور یہ ان بڑے میاں کی مہربانی اور انکا کرم ہے کہ ہماری اصلاح میں اس طرح سے سرگرم ہیں۔

راقم عرض کرتا ہے کہ جب حضرت مصلح الامتؒ کا اپنا زمانہ آیا تو حضرت نے بھی یہی طریقہ باقی رکھا اور سالکین سے برابر دارو گیر جاری رہتی کبھی زبانی بالواسطہ یا بلا واسطہ سوال و جواب ہوتا اور کبھی بذریعہ تحریر امور دریافت فرمائے جاتے۔ چنانچہ خود فرماتے تھے کہ :-

"یہ جو میں اپنے پاس آنے جانے والوں یا یہاں رہنے والوں سے کبھی کبھی کچھ دریافت کرتا رہتا ہوں یا کچھ کہلاتا رہتا ہوں تو اسکا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ میں کچھ انکو تنگ کرنا چاہتا ہوں، یا میں یہ نہیں سمجھتا کہ یہ لوگ کسی برائی وغیرہ میں نہیں رہتے اور نماز، روزہ، تعلیم و تعلم بھی نہیں کر رہے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کیا میں اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ آپ لوگ بظاہر کسی برائی میں نہیں ہیں اور نماز روزہ کرنا اور علم دین پڑھنا پڑھانا اتنا تو کر ہی رہے ہیں، باوجود اسکے جو میں کہتا رہتا ہوں تو آپ لوگوں کو بھی اسکی وجہ سمجھنا چاہئے اور دل سے اس پر غور کرنا چاہئے ورنہ میں تو کہتا رہونگا اور آپ پر اسکا کچھ ثمرہ بھی مرتب نہ ہوگا۔

گفتہ گفتہ من شدم بسیار گو　　وز شما یک تن نشد اسرار جو

یعنی میں کہتے کہتے (بغرض نصیحت) بسیار گو ہوگیا ہوں لیکن آپ لوگوں میں سے ایک بھی اصلاح پذیر نہ ہوا اسکی وجہ میں خود ہی بیان کرتا ہوں، سنیئے!

اتنا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اصلاح کیلئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک

تعلیم دوسری تربیت تعلیم تو یہی ہے جو آپ لوگ مجھ سے کتابیں پڑھتے ہیں لیکن صرف تعلیم کتاب تو کافی نہیں ہے اسکے ساتھ تزکیہ اور تربیت بھی تو ہونا ضروری ہے۔ پس میں جو آپ حضرات کو کبھی کبھی تکلیف دیتا ہوں اور سوالات کرتا ہوں، کچھ کہتا ہوں، کچھ پوچھتا ہوں یہی تزکیہ اور تربیت ہے۔

گو اس باب میں اصل تو یہی ہے کہ قلب کو ذاکر بنایا جائے اور اس میں شک نہیں کہ اسکے لئے علم دین کافی وافی ہے بالخصوص کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم کہ وہ تو اسی لئے ہے ہی لیکن بات یہ ہے کہ یہ زمانہ زمانۂ غفلت ہے اور لوگوں کے قلوب خراب ہو گئے ہیں اسطرح سے کہ اسباب ذکر بھی اس میں تذکر پیدا نہیں کرتے اور نہ غفلت ہی کو دور کرتے ہیں۔

پس تجربہ سے معلوم ہوا کہ ایسے طرق جن سے قلب کو کچھ ٹھیس لگے اور جو بمنزلہ دوائے تلخ کے ہوں وہی انسان کو بیدار کر سکتے ہیں اور پھر جب قلب سے غفلت دور ہو جائے تب کتاب وسنت کا علم بھی اس پر کامل جلا کر سکتا ہے۔

لہٰذا قلب پر اسی قلعی کے عمدہ آنے کے لئے شیخ کامل بذریعہ تربیت وتزکیہ پہلے قلب سالک کو مصفیٰ اور اس سے میل کچیل صاف کرتا ہے بس بالکل یہی حیثیت ہے میرے اس طرز عمل کی جس کی حقیقت میں اسوقت بیان کرنا چاہتا ہوں۔

اب غور فرمائیے گا تو ایک نئی بات کا علم ہونے کی وجہ سے قلب میں مسرت پائیے گا اور اس امر کے استحضار کے بعد مخلص اور طالب کیلئے میری اس پوچھ گچھ کی تلخی مبدل بہ لذت ہو جائیگی اور تحصیل علم کے ساتھ ساتھ اس مرتبہ کے مل جانے سے اسکی ترقی کا راستہ صاف اور سہل ہو جائیگا

ناقل عرض کرتا ہے کہ بلاشبہ ہم لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور اسباب غفلت اختیار کئے ہوئے ہیں، بلکہ اپنی باطنی خرابی سے اسباب ذکر کو بھی ہم نے اسباب غفلت بنا رکھا ہے علم سے مستفید ہونے کیلئے ہم خود اپنے کو درست اور صالح نہیں بنا پا رہے ہیں تو شیخ کامل نے اپنے ذوق واجتہاد سے ہماری اس خامی کو دور کرنے کے لئے ایک اقرب طریق تجویز فرمایا ایسا کہ ہمکو پتہ بھی نہ چلے اور ہمارا کام بنتا چلا جائے۔ فجزاہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

حضرت والا کبھی کبھی آنے والوں سے یہ دریافت فرماتے تھے کہ آج میں نے مجلس میں کیا بیان کیا ہے۔ چنانچہ اسی نوع کے ایک سوال پر ایک سالک نے یہ لکھکر پیش کیا:۔

" آج حضرت والا نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اسکا حاصل یہ سمجھا ہوں کہ رسم اور ظاہر داری کا اس قدر غلبہ ہو گیا ہے کہ لوگ بات کو سنتے اور زبان سے کہتے بھی ہیں لیکن اسکا مطلب نہیں سمجھتے مثلاً کسی کا یہ شعر مشہور ہے اور زبان زد خاص و عام ہے کہ ؎

پے نبرد ہیچکس در منزل حق الیقیں　　　　تا نبود ذات پاکش اندریں رہ مقتدا

(حق الیقین کی منزل تک پہونچنے میں کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکا ہے جبتک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسکے لئے اس راہ کے مقتدا نہیں ہو گئے ہیں)

اس شعر کو خوب لطف لے لے کر پڑھا جاتا ہے اور اسکا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ منزل حق الیقین تک پہنچنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ضروری ہے لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ پیروی کن امور میں کیجائے اور ان میں سب سے اہم کیا چیز ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ ہی کی زبان مبارک پر یہ اعلان فرمایا وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (جس شخص نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو خواہشات سے روکا تو جنت اسکا ٹھکانا ہوگا) چنانچہ سب سے زیادہ ترغیب وتحریض کتاب وسنت میں نفس ہی کے متعلق آئی ہے اور اسی طرح نصوص کی اتباع میں بزرگان دین نے اصلاح نفس کو اپنا موضوع بحث اور فنائے تام کو منتہائے مقصود قرار دیا ہے اور لوگوں کو یہ سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ کا سب سے بڑا مانع اور روڑا انسان کا نفس ہی ہے اور شرارت، دنارت، خست اور نقص اسکی ذاتی اوصاف ہیں لیکن وہ انھیں بالکل بھولا ہوا ہے اور ان سے آنکھ بند کر کے عارضی کمالات کی بنا پر خود کو مبدأ خیرات سمجھے ہوئے ہے۔ چنانچہ مشائخ اسی امر کی سعی فرماتے ہیں کہ سالک اپنے عدمیت ذاتیہ پر مطلع ہو جائے اور اپنے صفات کو پرتو اور ظل سمجھے۔ اسی طرح سے یہ حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ انسان پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرے دوسروں کی فکر میں نہ پڑے

ابدأ بنفسك فانهها عن غيها　　　　فاذا انتهت عنه فانت حكيم

(اپنی ذات سے تبلیغ شروع کرو یعنی اسکو برائیوں سے روکو اور جب وہ رک جائے گی تو اسوقت تم حکیم سمجھے جاؤ گے)

پس ایک سالک کیلئے ابتداء کار بھی اسکا نفس ہے یعنی یہ کہ اسکو رذائل سے نکالے اور انتہائے کار بھی اسکا نفس ہے کہ اس میں جو محاسن بظاہر پیدا ہو گئے ہیں ان کو حق تعالیٰ کی چیز سمجھکر انکی نسبت الخفیں کی طرف کرے اور خود کو ان سے عاری جانے یہی اسکا کمال ہے ۔ باقی یہ چیزیں ایسی ہیں اور لوگوں کی مناسبتیں ایسی کمزور ہو گئی ہیں کہ انکا سمجھنا اور سمجھانا اس زمانہ میں آسان نہیں ہے ۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا کی برکت سے نفس کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اسکے رذائل سے قلب کو پاک و صاف فرمائے ۔ انتہی ۔

اس تحریر کو ملاحظہ فرماکر حضرت والا نے فرمایا کہ ٹھیک ہے اسکو نقل کرا دو ۔

ایک اور مولوی صاحب نے لکھا کہ :۔

حال : معروض خدمت اینکہ بندہ بدفہم حضرت والا کی اصلاح کی حقیقت کو بھلا کیا سمجھ سکتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے لکھتا ہوں اللہ کرے حضرت والا کے منشار کے مطابق ہو جائے ۔

تحقیق :۔ موافق ہوا فالحمد للہ علیٰ ذلک

حال :۔ الحمد للہ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کما حقہ حضرت والا کی ذات مبارک سے ہو رہی ہے اور یہاں کا طرز بالکل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہے حضرت جس نہج پر اصلاح فرما رہے ہیں واقعی بالکل وہی درست اور نافع ہے ۔ حضرت نے اصلاح کا مدار نفاق کو رکھا ہے اور بالکل صحیح ہے کہ عوام کیا خواص تک کے قلوب اس مرض نفاق کا شکار اور اس سے ملوث ہیں اور اسکی اصلاح ضروری ہے اسلئے کہ اسکی وجہ سے نہ دنیا میں فلاح ہو سکتی ہے نہ آخرت میں چین نصیب ہو سکتا ہے اسلئے کہ روزانہ دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے لوگ صوم و صلوٰۃ کے عادی ہیں مگر نفاق کی وجہ سے بالکل ترقی نہیں کرتے سالہا سال تک اسی گمراہی میں رہ جاتے ہیں چنانچہ حضرت سے سنا ہے کہ ایک دل ایسا بھی ہے جس میں نفاق بھی ہے اور ایمان بھی ہے ۔ ایمان کی وجہ سے تو مسلمانوں جیسے اعمال ظاہر ہوتے ہیں نفاق میں رہنے کی وجہ سے منافقوں جیسے اقوال و افعال سرزد ہوتے ہیں اسلئے ہو سکتا ہے کہ نماز روزہ بھی کوئی شخص کرتا ہو اور نفاق بھی اسکے دل میں موجود ہو جو کہ اسکی ترقی کرنے سے

مانع ہو۔ الحمدللہ حضرت اس کے متعلق بے انتہا باتیں بتاتے ہیں۔ حضرت سے ایک مرتبہ سنا کہ کوئی شخص نفاق چھوڑ کر دیکھ لے کہ دل میں کس قدر نور ہوجاتا ہے اگرچہ زیادہ وظائف وغیرہ کا پابند نہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفاق کسقدر بری اور مہلک چیز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے متعلق بڑے شدومد سے دور تک بیان فرمایا ہے۔ بہرحال حضرت نے اسکو اختیار فرمایا ہے کہ آجکل مصلحین کو ضروری ہے کہ منافقین کی بری طرح گت بنادیں اور انکو ذلیل کریں اور برائی اسکی ذہن نشین کریں۔ بغیر حضرت والا کا طرز اختیار کئے ہوئے نفاق کا سمجھانا اور اصلاح کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اور جب تک نفاق رہے گا اسوقت تک آدمی ترقی نہیں کرسکتا اور جہنم کا ایندھن ہوجائے گا۔ حضرت دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نفاق سے بچائیں اور اخلاص پیدا کردیں۔ فقط"۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے ان مولوی صاحب کو حضرت اقدس کی تعلیمات میں سے نفاق کی بحث کتنی اہم نظر آئی کہ شروع سے آخر تک اسی کا ذکر کیا اور یہ حقیقت بھی ہے کہ حضرت والا نے اسکا بیان ہی اس شدومد سے فرمایا تھا کہ لوگ لرز اٹھے تھے اور طالبین کو اصلاح کی فکر پڑگئی تھی، لیکن یہ حضرت اقدس ہی کا منصب تھا جو اس پر اتنا بول گئے۔ ہر شخص کے لئے منافقین کی گت بنانا، اسکو ذلیل کرنا اور اس سے یہ کہنا کہ تم نفاق ترک نہ کروگے تو تم کو جہنم کا ایندھن بننا ہوگا آج آسان نہیں ہے۔ کوئی شخص بغرض اصلاح آج کسی کیلئے لفظ نفاق بول دے تو عجب نہیں کہ اسکے خلاف احتجاج شروع ہوجائے۔

امتحان تحریری کے سلسلہ میں چند سالکین کے جوابات نقل کئے جاتے ہیں جو حضرت والا کے طرز امتحان کے سمجھنے میں بھی معین ہوگا اور انشاء اللہ تعالیٰ معلومات کا ذریعہ ہوکر ناظرین کیلئے موجب بصیرت بھی ہوگا۔ وھو ہذا۔

عرض ہے کہ حضرت والا دامت برکاتہم کے ارشادات سے جو کہ . . . . . صاحب

حال: کے ذریعہ سے معلوم ہوئے یہ سمجھ میں آیا کہ اس زمانہ میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ علوم دینیہ میں انہماک اور کثرتِ اشغال کی بنا پر باطنی چیزوں سے غفلت ہوجاتی ہے اور یہی علوم

حجاب اکبر بن جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے سے ۔ حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے تو چونکہ ہم لوگ بھی زیادہ تر پڑھنے لکھنے ہی میں رہتے ہیں اسلئے ہوسکتا ہے کہ باوجود یہاں رہنے کے اپنی اصلاح اخلاق و نفس سے غافل ہو کر علوم رسمی میں پھنسے رہجائیں اور قلبی دولت سے کورے رہ جائیں ۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ حضرت مولانا دامت برکاتہم جیسا مرشد نصیب فرمایا ہے کہ باوجود ان مشغولیتوں کے ایسے طریقہ سے اصلاح و تربیت فرماتے ہیں کہ الگ سے وقت بھی نہیں دینا ہوتا اور اصلاح بھی مسترشدین کی اکمل طریقہ پر ہوجاتی ہے

مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جتنی توجہ اپنے اخلاق اور قلب کی طرف اثنائے ذکر میں ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ حضرت والا کے استفسار سے ہوتی ہے ۔ اور ایک آدمی ایک سوال سے کہاں سے کہاں تک پہونچ جاتا ہے اور کامل توجہ اپنی اصلاح کی طرف ہوجاتی ہے ۔ بیشک حضرت والا کا جو منصب ہے یعنی تزکیہ و تربیت کا اس کا حق بدرجۂ اکمل ادا فرماتے ہیں ۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم جیسے لوگوں کی اصلاح و تربیت کے لئے یہی طریقہ عقلاً و نقلاً متعین ہے اور اسی کا نام تزکیہ ہے بغیر اسکے تعلیم محض کافی نہیں ہے ۔

اور حضرت والا دامت برکاتہم جو بار بار استفسار فرماتے ہیں اسکی یہ بھی وجہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص کسی کامل کے پاس رہے اور بظاہر تعلق رکھے مگر باطناً موافق نہو اسکے قلب میں نفرت و کراہت اور بدعقیدگی ہو اور باطناً طریق اور اہل طریق کا مخالف ہو حضرت کو چونکہ تجربات و مشاہدات ہیں اسلئے ایسے لوگوں سے چوکنے رہتے ہیں کہ کوئی ایسا تو اس حلقہ میں داخل نہیں ہے جو کہ ظاہراً موافق ہو اور باطناً مخالف ہو اسلئے کہ اگر ایک بھی ایسا آدمی کہیں رہے گا تو خود تو خود دوسروں کو بھی بگاڑ دیگا اور خود چونکہ اپنے نفاق اور ظاہرداری کی بناء پر فیض و برکت سے محروم رہتا ہے اس لئے دوسروں کو بہکانا ایسے لوگوں کا شیوہ ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے کام آگے بڑھنا کیا وہ جگہ ہی فاسد ہوجاتی ہے ایسے لوگوں کو پہچاننا اور تمیز ضروری ہے کہ یہ دل سے موافق ہے یا بدعقیدہ ہے یا خالی الذہن ہے ۔

تو حضرت ایسے سوالات سے یہ بتلانا چاہتے ہیں اور یہ منشا ہوتا ہے کہ تم جب میرے پاس رہ ہی رہے ہو تو دل سے رہو اگر باطنی فیض نہیں لے رہے ہو تو کم از کم نفرت اور بدعقیدگی تو نہ رکھو، اور جب کوئی ان سب چیزوں سے خالی ہوکر رہے گا تو انشاءاللہ کبھی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔

الحمدللہ کہ حضرت والا تعلیم کے ساتھ ساتھ تزکیہ و تربیت بھی فرمارہے ہیں حضرت والا دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ تزکیہ فرمادیں اور نفس کو پاک و صاف فرمادیں اور اللہ تعالیٰ سے صحیح نسبت اور تعلق پیدا ہوجائے۔

(۲)

حال: حضرت والا کے طرز تعلیمات اور طرز اصلاح کا حسن اور اسکا جمال و کمال کیا عرض کیا جائے جو بات بھی ہوتی ہے عجیب ہوتی ہے

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

حضرت کا طرز برابر یہی رہا ہے کہ کلام بمقتضائے حال فرماتے ہیں جس چیز کو جس وقت مناسب خیال فرماتے ہیں بہتر طریقہ سے تعلیم فرماتے ہیں اور چونکہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل اور حضورؐ کی خاص تائید حضرت والا کے ساتھ ہے اور وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ حضرت ہر حال میں کتاب و سنت کو سامنے رکھکر کام کرتے ہیں لہٰذا نافع ہوتا ہے۔ کتاب و سنت سے اخذ کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے۔ ع: ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن۔

آج مسلمان جس دور سے گذر رہے ہیں انکو جن جن مصائب و آلام کا سامنا ہے انکا سمجھنا اور پھر انکی اصلاح یہ صرف حضرت ہی کا وصف امتیازی ہے کوئی دوسرا اسمیں شریک نہیں۔ دوسرا یہ بھی صحیح طور پر نہیں سمجھتا کہ یہ بلائیں اور یہ خرابیاں آخر کیوں ہیں؟ وہ تو اسکا واحد سبب غیر کو بتلاتے ہیں اور خود کو بے قصور قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ بگاڑ اور خرابی خود انھیں کے ہاتھوں بلکہ ان کے خواص کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ ان کے یہاں تعلیمی اور اصلاحی ادارے بھی چل رہے ہیں لیکن پھر بھی خرابی جوں کی توں۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے یہاں سے اہل وناہل ضروری وغیر ضروری مناسب ونامناسب کا فرق ہی ختم کردیا ہے۔ بلکہ حضرت کے ارشاد کے مطابق یہ تو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اس وقت توسب لوگ صالح ہی ہیں اور صلاح وکمال کے اس درجہ پر پہونچے ہوئے ہیں جس پر پہلے لوگ تھے حالانکہ بعض ان میں ایسے تھے کہ اگر وہ ادنیٰ فکر وتدبیر سے کام لیتے تو شاید ان سے کچھ کام ہو جاتا، لیکن چونکہ نبض شناسی ہر شخص کا کام نہیں اسلئے انھوں نے کبھی اس جانب توجہ بھی نہیں کی بلکہ اپنی ساری قوت علمیہ اور بیانیہ دقیق وغامض علوم اور اختلافی امور کی نذر کردی جسکا اثر یہ پڑا کہ وہ عوام کو شریعت کی طرف تو کیا لاتے بلکہ اس سے کچھ نفرت ہی دلادی اور اس شعر کا مصداق ہوگئے ؎

تو برائے وصل کردن آمدی — نے برائے فصل کردن آمدی

حالانکہ ان کے ذمہ تھا کہ وہ شریعت کے حسن وخوبی کو بیان کرکے لوگوں کی نظروں میں اسکو محبوب بناکر خود خدا ورسول کی نظروں میں سرخروئی حاصل کرتے، مگر چونکہ یہ چیز حضرت ہی کے حصہ میں لکھی ہوئی تھی اسلئے کوئی دوسرا وہاں تک پہونچ نہ سکا۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ (یہ حق تعالیٰ کا فضل اور انکا انعام ہے جسے چاہتے ہیں مرحمت فرماتے ہیں)

(۳)

گذارش خدمت اقدس میں یہ ہے کہ حضرت والا کی خصوصیات وکمالات کا بیان کرنا اور تحریر میں لانا احقر بدفہم کے بس سے باہر ہے مگر محض بطور تعمیل حکم کے چند باتیں عرض کرنے کی ہمت کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے خزانۂ غیب سے علم عطا فرمایا تھا اسی طرح اپنے خزانۂ حکمت سے مردم شناسی وموقع شناسی کا ملکہ بھی عطا فرمایا تھا، نیز معاش ومعاد کی فہم بھی عطا فرمائی تھی، اب ان کے ورثا رعلماء ہیں العلماء ورثۃ الانبیاء مگر علم کے ساتھ ساتھ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ذی علم کو تعلیم وتربیت کا ملکہ اور معاش ومعاد دونوں کو درست کرنے کا ملکہ حاصل ہو یہ نہیں ہوتا ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند — نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

یہ ضروری نہیں کہ جو چہرہ کہ حسین ہو وہ انداز دلبری بھی رکھتا ہو جس طرح سے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو شخص بھی آئینہ رکھتا ہو وہ سکندری بھی رکھتا ہو

نہ ہر کہ طرف کلہ کج نہاد و تند نشست　　　کلاہ داری و آئین سروری داند

(چنانچہ یہ بھی ضروری نہیں کہ جو شخص بھی اپنی ٹوپی ٹیڑھی کرلے یا اکڑ کر بیٹھ جائے وہ واقعی کلاہ محبوبی ہی کا اہل ہو یا وہ صاحب سلطنت ہی بن گیا ہو)

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست　　　نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

(ہزار نکتے بال سے بھی زیادہ باریک یہاں یعنی شان محبوبیت والے کیلئے ہوا کرتے ہیں یہ نہیں کہ بس سر گھٹا لے اور قلندر کہلانے لگ جائے)

بلکہ جنکو اللہ تعالیٰ صحیح معنوں میں وارث بناتے ہیں اور نائب رسول بناتے ہیں اور جس کو اپنے دین متین کی خدمت کے لئے مامور فرماتے ہیں اسی کو یہ ملکہ عطا فرما کر نوازتے ہیں وَ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ تو سب سے مابہ الامتیاز یہاں اخلاقی تعلیم ہے اور کل دین محمدی کی بنا راخلاق پر ہے، اس لئے ایسا شخص قوم کے حالات کو نظر غائر سے دیکھتا ہے اور حالات کے رخ کو پہچانتا ہے اور اسی کے مطابق کلام کرتا ہے اور وہ قوم میں روح پھونک دیتا ہے اور زندگی آجاتی ہے۔ ع۔ عیسیٰ وقت است کہ دم می زند۔

دوسری بات یہ ہے کہ قوم کے بگاڑ کے ہزاروں اسباب ہوتے ہیں جنکے متعین کرنے کیلئے لوگ حیران و پریشان رہتے ہیں مگر وہ مرد کامل بگاڑ و فساد کی اصلی شہ رگ پر انگلی رکھدیتا ہے۔ الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کو یہ ملکہ مردم شناسی کا اور موقع شناسی کا عطا فرمایا ہے بات گو کتنی ہی عمدہ ہو مگر ہر موقع و ہر محل میں کارگر نہیں ہوتی اور ہر شخص اسکا اہل نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنا ایک موقع اور محل رکھتی ہے۔ خمیرۂ گاؤزباں کسی مریض کو دیا جاتا ہے اور کسی کو نہایت مضر بتایا جاتا ہے۔ گیہوں اور جگہ بویا جاتا ہے اور دھان کی کاشت کی زمین اور ہوتی ہے۔ حضرت والا کی خصوصیات سے ہے کہ کلام کو بے محل اور بے موقع ضائع نہیں فرماتے بلکہ اسکو اسکے موقع و محل میں پہونچا دیتے ہیں۔

نیز حضرت والا کو حق تعالیٰ نے قوم کی نبض شناسی کا ملکہ عطا فرمایا ہے۔ یہ خاص چیز ہے کہ جو ذرایع کہ اہل دنیا کے حالات معلوم کرنے کے لئے ہیں ان سے غایت درجہ نفرت ہے مثلاً اخبار بینی یا ادھر ادھر آنا جانا وغیرہ وغیرہ ان سب چیزوں سے طبعی تنفر ہے اور عام حالات سے پوری طرح واقفیت ہے اور اس پر مفصل کلام فرماتے رہتے ہیں کہ عام طور پر خانہ جنگی کیونکر ہے اور اسکے اسباب کیا ہیں؟ اسی طرح سے حضرت والا اپنے ملکہ حالات شناسی و فراست سے

اس پر بہت دنوں سے زور دیتے ہیں کہ قوم میں جو عام تعطل اور غفلت طاری ہے اور دین فروشی وگمراہی و بددینی میں مبتلا ہوتی جارہی ہے اور طرح طرح کے فسادات انہیں رونما ہورہے ہیں اسکا اصلی سبب کسی دوسری قوم کا مسلط ہونا نہیں ہے بلکہ قوم کے بناؤ و بگاڑ کی ذمہ دار خود یہی قوم بلکہ ان کے خواص ہیں۔ خواص کے فساد سے عوام کا فساد ہے ساری قوم کی ذمہ داری انھیں پر ہے۔ جب انھیں میں صحیح دین و ایمان کی بہار آتی ہے تو قوم میں بھی بہار اور ایمانی زندگی اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔ اور جب انکا احساس زندہ رہتا ہے تو قوم کا احساس بھی زندہ رہتا ہے اور جب ان میں غفلت اور تعطل طاری ہو جاتا ہے تو قوم بھی سو جاتی ہے بلکہ مردہ ہو جاتی ہے۔ اصل میں انہی میں بگاڑ و فساد پیدا ہو گیا ہے یہ جڑ ہیں جڑ ہی میں گھن لگ گیا ہے جب تک یہ درست نہ ہوں گے اور صحیح راستہ نہ پکڑیں گے تو قوم بھی صحیح راستہ نہ پاسکے گی۔

اسکے علاوہ حضرت والا کی یہ بھی تشخیص ہے کہ جب کسی قوم میں پستی آنے پر ہوتی ہے اور جن پر عتاب نازل ہونا ہوتا ہے تو سب سے پہلے جو چیز اس سے لے لیجاتی ہے وہ فہم لے لیجاتی ہے، چنانچہ ہم سے فہم لے لی گئی، اب فہم مفقود و عنقا ہے۔ ہر خاص و عام کو اس پر متوجہ فرماتے ہیں اور متنبہ فرماتے ہیں کہ فہم پیدا کرو ہم سے فہم ہی رخصت ہوگئی ہے۔ دین و دنیا کی بڑی بڑی باتیں کیا سمجھیں گے جبکہ معمولی معمولی باتیں بھی نہیں سمجھتے۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جو طبقہ کہ دیندار ہے، ذی علم ہے، بلکہ مشائخ بھی، دوسروں کو تبلیغ کرنے میں اور انکو دین پہونچانے میں بڑی جد و جہد کرتے ہیں، دوسروں کے لئے دینداری پسند کرتے ہیں مگر اہل وعیال اور خاندان والوں کو بالکل بے مہار چھوڑے رہتے ہیں جدھر چاہیں جائیں جس میں چاہیں منہ ڈالیں ان سے بالکل بے توجہی برتتے ہیں۔

مگر حضرت والا کی یہ خاص بات ہے جیسے اخلاق نبوی سے اور سب حصے ملے ہیں اور انکے فیض سے فیض یاب ہیں ویسے ہی اس اخلاق سے بھی متخلق ہیں کہ جو باتیں دینی کہنی ہوتی ہیں پہلے اپنے اہل وعیال پھر اپنے مقربین سے فرماتے ہیں۔ درجہ بدرجہ تبلیغ کی یہی سنت اور عمل بالقرآن یہی ہے۔

اسی طرح حضرت والا اس پر بھی توجہ دلاتے رہتے ہیں کہ دنیا سے جتنے بڑے بڑے لوگ جاتے ہیں اپنی جگہ کسی کو نہیں چھوڑ کر جاتے کہ وہ ان کے فضل وکمال کا حامل ہو اور انکے علوم کو لوگوں سے بیان کرسکے اور اس چشمۂ فیض کو جاری رکھے بلکہ کسی کا جہاں سایہ اٹھتا نہیں کہ وہ چشمۂ فیض بند ہوجاتا ہے اور وہ جگہیں صرف تبرک اور قصہ وکہانی بن کر رہ جاتی ہیں۔ اسکا حضرت والا کو بے حد رنج وغم رہتا ہے اسلئے اکثر وبیشتر پاس رہنے والوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ان کے جمود وغفلت کو دور کرنے کی کوشش فرماتے رہتے ہیں

حضرت والا کی بہت سی خصوصیات ظاہری وباطنی ہیں مگر جو خصوصیات کہ ظاہر و عام فہم ہیں جنکو مجھ جیسا بدفہم بھی سمجھ سکتا ہے اس بدفہم نے عرض کردیں۔ اللہ تعالیٰ سے یہی دعا ہے اور حضرت والا سے بھی دعا کی التجا ہے کہ حضرت والا دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو اس چشمۂ فیض سے پوری طرح فیض یاب فرمائے اور ہم لوگوں کو اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ اور کَانَ سَعْیُھُمْ مشکورًا کا مصداق ونمونہ بنادیں جو کہ حضرت والا کی فرحت ومسرت کا سبب بنے۔ والسلام۔

(۴)

سیدی وسندی حضرت والا دامت برکاتہم وفیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ ——— اپنی کم فہمی کے سبب سے کل حضرت والا کے سوال کا منشاء میں ہی نہ سمجھ سکا اور ایک عام سوال کو خاص کرکے لقد تحجرت واسعًا کا مصداق بن گیا پھر بناء الفاسد علی الفاسد کے طور پر میری وجہ سے احباب کو بھی غلط فہمی ہوگئی جس کی میں نے معافی مانگ لی ہے لیکن رات کو جناب . . . . صاحب کے بیان فرمانے سے اور اسوقت مولوی . . . . . صاحب کے خط سنانے سے حضرت کا منشاء پوری طرح الحمدللہ سمجھ میں آگیا۔ چنانچہ حضرت کی تعلیم وتربیت کی خصوصیات میں چند باتیں جو سمجھ میں آتی ہیں عرض کرتا ہوں۔ خدا کرے صحیح سمجھا ہوں اور صحیح ادا کرسکا ہوں:۔

۱۔ حضرت والا اپنی تعلیمات میں صرف کتاب وسنت اور پھر سیرت مشائخ کا بیان فرماتے ہیں اور ان میں بھی ترتیب پیش نظر رہتی ہے کہ پہلے کتاب وسنت اور نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور پھر اسکی تائید میں سیرت اکابر پیش فرماتے ہیں

۲ - تربیت میں حضرات انبیاء علیہم السلام کے طریقے کا خاص اہتمام ہے کہ جس چیز کا دوسروں سے مطالبہ کیا جائے اپنے گھرانے کے لوگوں میں اسکا اجراء پہلے کیا جائے یہی وجہ ہے کہ سالکین سے اگر اعتقاد، اتباع، انقیاد اور اخلاص کا مطالبہ فرماتے ہیں تو اپنے لوگوں سے اس سے زیادہ شدومد کے ساتھ مطالبہ ہوتا ہے

۳ - نیز تربیت کے باب میں قرآن حکیم کے پراز حکمت وشفقت طرز پر حضرت والا کا عمل ہے کہ اعمال میں ترتیب کا لحاظ فرماتے ہیں اور جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے محض شفقۃً علی الناس وتسہیلاً لہم پہلے مفصلات[ع۵] نازل فرمائیں تاکہ قلوب جنت و دوزخ کے خوف وشوق سے لبریز ہو جائیں جنکی وجہ سے اعمال کی مشقت ان پر آسان ہو جائے۔ اسی طرح سے حضرت والا پہلے سے بھی مگر اب تو زیادہ اسکا اہتمام فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو کام کام کی اور آسان آسان چیزیں پہلے بتائی جائیں چنانچہ بہت زیادہ ذکر وشغل اور مراقبہ وغیرہ تو حضرت کے یہاں کبھی بھی نہیں رہا اور ابتو اس پر آگئے ہیں کہ مسلمانوں کو وضوء، طہارت تلاوت پہلے درست کرنا چاہیئے اور اسکو ایسا مدلل بیان فرمایا ہے کہ عوام الناس کی سمجھ میں بھی آگیا کہ یہ دین ہے اور یہ اس کا راستہ ہے ورنہ تو قوم کی نظروں میں نماز و روزہ کی عظمت ختم ہو رہی تھی تا بہ طہارت و وضو چہ رسد؟ اور اس میں شک نہیں کہ یہ ایک مرتبہ عظیم ہے جس سے حق تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو نوازتے ہیں اور وہ دین کو غیر دین سے ممتاز کر دیتا ہے۔

۴۔ اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی یہ بھی ہے کہ عمل سے بھی پہلے حضرت والا اس کی سعی فرماتے ہیں کہ لوگوں کی فہم درست ہو اسلئے کہ فہم درست ہوگی تو بہت کچھ دین کا کام کرے گا اور جو کچھ کرے گا وہ صحیح کرے گا ورنہ بدفہم آدمی تو عمل کا ڈھیر بھی لگالے لیکن اسکی بدفہمی نہ معلوم کس راہ سے اسمیں گھن کا کام کر جائے

ایک خصوصیت حضرت والا کی یہ نظر آرہی ہے جو پہلے سے ہے لیکن اب زیادہ معلوم ہوتی ہے کہ آنے جانے والوں اور خاص کر پاس رہنے والوں سے جس طرح ایک جانب اخلاص کا مطالبہ شدید ہوتا جارہا ہے اسی طرح دوسری جانب شفقت و رافت و رحمت بھی فراواں

ع۵ - یعنی آخر قرآن کی سورتیں جن میں جنت و دوزخ کا بیان ہے ۱۲

ہوتی جارہی ہے یعنی قلب کی نہیں اور دل کی لگن حضرت والا کے عمل میں برائی العین مشاہدہ ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمکو ہمارے نفس سے نکالکر اپنی بندگی میں لگائے اور حضرت والا کے منشا رکو ہمارے ہی ذریعہ پورا فرمائے کہ یہ اُسکا محض فضل و احسان ہوگا۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی   منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

(احسان مت رکھو کہ تم سلطان کا کام کر رہے ہو بلکہ اسی کے احسان مند ہو کہ اس نے تمکو اپنی خدمت میں رکھ لیا)

اور اس طرح سے اپنے کام پر لگا دے کہ حضرت والا کے لئے ہم سب لوگ قرۃ اعین ثابت ہو سکیں۔

آنکھ کی ٹھنڈک ۱۲

حضرت والا کی توجہ کی برکت سے کچھ آنکھ کھل رہی ہے اور قلب میں بھی کچھ حرکت پیدا ہو رہی ہے۔ دعا رکا ہر آن محتاج ہوں کیونکہ اپنا حال جانتا ہوں، حضرت ہی کی توجہ سے کشود کار ہو رہا ہے اور اسی سے ترقی ہوگی۔ اس وقت یہی باتیں سمجھ میں آئیں جو عرض کیں حضرت والا اصلاح فرمائیں۔ والسلام

(۵)

حضرت والا کو اللہ تعالیٰ نے جو خاص منصب ارشاد اور نور بصیرت عطا فرمایا ہے اس سے امت کی گمراہی اور اور اسکے اسباب وعلل کو بنظر غائر اچھی طرح دیکھ لیا ہے اسی لئے امت کی اصلاح کے لئے ہمہ وقت بے انتہا سعی فرماتے رہتے ہیں اور گمراہی کے اسباب کے ازالہ کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ حضرت والا دیکھ رہے ہیں کہ عوام کا بگاڑ خواص کی وجہ سے ہوا ہے، مدارس اور خانقاہیں قائم ہیں، مسلمانوں کے ہزار ہا ہزار روپئے ان پر خرچ ہو رہے ہیں مگر ایک آدمی بھی ان میں ایسا نہیں نکلتا جس کو صحیح معنوں میں کہا جاسکے کہ یہ اپنے بڑوں کا سچا جانشین ہے اسی لئے حضرت اپنے خواص اور پاس رہنے والوں کی اصلاح پر بڑی خصوصی نگاہ رکھتے ہیں کیونکہ عوام کی اصلاح خواص ہی کی اصلاح پر موقوف ہے۔

اسی طرح حضرت والا اپنی اولاد اور خدام کی اصلاح پر برابر زور دیتے رہتے ہیں کیونکہ اصلاح باطن کی نعمت ہے اگر یہی لوگ محروم رہ گئے تو بڑے افسوس کی بات ہے تاکہ

بعض لوگوں کا مقولہ کہ تین شخصوں کو نفع نہیں ہوتا کم از کم یہاں تو نہ صادق آوے۔

حضرت والا صحابہ کرام اور اکابر امت کے حالات کو اس طور پر بیان کرنا پسند نہیں فرماتے کہ زمانۂ حال کے لوگ سمجھنے لگیں کہ ہمارا حال بھی وہی ہے اور ہم بھی اللہ تعالیٰ کے انھیں انعامات کے مستحق ہیں جس کے وہ لوگ تھے۔ بلکہ اس زمانہ کے لوگوں کے ایک ایک مرض کو بیان فرماکر اسکی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ جس طرح دور اول میں اخلاص اور مخلصین کی کثرت تھی اسی طرح اس زمانہ میں نفاق اور منافقین کی گرم بازاری ہے اسی لئے حضرت والا نے بڑے شد و مد کے ساتھ اس مرض کے متعلق تحریر و تقریر رسائل کے ذریعہ کلام فرمایا ہے جو بلا شبہ حضرت والا کا تجدیدی کارنامہ ہے۔

عام طور پر اس زمانہ میں فہم کی کمی کی وجہ سے مسلمانوں کو معاش و معاد دونوں مقصدوں میں ناکامی ہوتی ہے اسی لئے حضرت والا فہم و عقل پر برابر زور دیتے رہتے ہیں اور فرماتے رہتے ہیں کہ مسلمانوں میں نہ عقل معاش باقی ہے نہ عقل معاد بعضے لوگ نیک ہوتے ہیں مگر عقل کی کمی اور بدفہمی کی وجہ سے ناکام رہتے ہیں۔

اصلاح کے سلسلہ میں حضرت والا مخاطب کے فہم و استعداد کے لحاظ سے اسکی تربیت و اصلاح فرماتے ہیں ان دنوں خصوصیت کے ساتھ بسط سے اسپر کلام فرماتے ہیں اور تائید میں حضرت عائشہؓ کا اثر اور دیگر نصوص پیش فرماتے ہیں۔

امت کی گمراہی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جو لوگ اصلاحی کام کرنا چاہتے ہیں بے طریقہ اور بے قاعدہ کام کرتے ہیں جو بات نہ کہنے کی ہوتی ہے وہ کہہ جاتے ہیں یا بے محل اور بے موقع کلام کر جاتے ہیں جس سے بجائے اصلاح کے افساد اور بجائے کام بننے کے بگڑ جاتا ہے اسی لئے حضرت والا کام کرنے کا طریقہ اور اسکے آداب بتاتے ہیں۔

حضرت والا کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ اصلاح پورے طور پر فرماتے ہیں اس معاملہ میں ذرا بھی تسامح نہیں فرماتے مگر رفق ولین سے کام لیتے ہیں اور اس طرح فرماتے ہیں کہ مخاطب کو بجائے توحش کے اسکی گردن ندامت سے جھک جائے اور اپنی کوتاہی کو برای العین مشاہدہ کر لے۔

حضرت والا کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بڑے بڑے امراض جنکے لئے بزرگوں کے یہاں بڑے بڑے مجاہدے کرائے جاتے ہیں حضرت والا انکو ایک ایک جملہ سے زائل فرما دیتے ہیں۔ سالہا سال کے مجاہدے کی جگہ حضرت والا کا مختصر سا سوال اور گاہ گاہ کسی کے واسطے سے یا بلاواسطہ کچھ فرما دینا ہوتا ہے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار حضرت والا نے ایک مولوی صاحب سے کچھ مواخذہ فرمایا جس کو انھوں نے اپنی ناسمجھی سے حضرت والا کی ناراضگی پر محمول کر کے ایک صاحب سے سفارش کرائی ، حضرت والا نے اس سیہ کار سے فرمایا کہ دیکھو لوگ سمجھتے نہیں جو کام اگلے لوگ سالہا سال کے مجاہدے سے نکالتے تھے میں باتوں باتوں میں اسکی اصلاح کر لیتا ہوں ۔

سیدی ! حضرت کو معلوم ہی ہے کہ یہ سیہ کار ہر طرح نابلد اور بد استعداد ہے اسلئے عجلت میں جو کچھ ذہن میں آیا عرض کر دیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت والا کی خصوصیات سمجھنے کیلئے بڑی بصیرت اور ذہانت کی ضرورت ہے بڑی ہی لجاحت سے درخواست کر رہا ہوں کہ دعا فرمائیں کہ یہ سیہ کار بھی اس در سے محروم نہ رہے کم از کم سگ اصحاب کہف کیطرح نجات کا راستہ ملجائے اللہ تعالیٰ حضرت والا کے سایۂ عاطفت کو تا ابد ہمارے سروں پر قائم رکھیں ۔ والسلام

(۶)

معروض خدمت اقدس اینکہ یہ ناکارہ بدفہم حضرت والا دامت برکاتہم کی تعلیمات کو بیان ہی کیا کر سکتا ہے تعمیل حکم کیلئے چند باتیں عرض کرتا ہوں ، وہ یہ کہ اجمالی اور کلی طور پر یہ تو سب پر واضح ہے کہ حضرت والا کی تعلیمات سراسر تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور طریق کار طریق سنت ہے اور احقر یہ سمجھتا ہے کہ کسی مرشد و مصلح کے شرف و فضل اور اسکے طریقۂ اصلاح کے خیر و خوبی کیلئے اس سے بڑھکر کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت والا اپنی خداداد بصیرت و فراست سے امت کے خواص اور عوام کے احوال کا بنظر غائر مطالعہ فرما کر کتاب و سنت سے اس کے احکام بیان فرماتے رہتے ہیں جو احوال و امراض کے مطابق ہوتے ہیں ۔

یہ نہیں کہ ہیں تو لوگ مبتلائے نفاق و فسق و فجور ہیں اور بیان کیا جائے حضرات صحابہ کے واقعات اور ان کے فضائل اور یہ باور کرانے کی کوشش کیجائے کہ تم بھی انھیں جیسے ہو اور ان کے شرف و فضل میں برابر کے شریک ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے انکا حال مشتبہ ہو جائے گا اور باوجود ہلاکت کے اپنی ہلاکت کا تصور بھی نہ کریں گے اسلئے برابر حضرت والا آیات منافقین اور ان کے واقعات بیان فرماتے ہیں اور زمانہ حال کے حالات سے مطابق فرماتے ہیں تاکہ اپنے مرض کا صحیح علم ہو جائے اسکے بعد ہی شفا کی امید ہوسکتی ہے اور اصلاح کی توقع کیجاسکتی ہے ــــــــ دوسری بات یہ کہ حضرت مولانا مدظلہم کی یہ نہایت دیانت اور للہیت ہے کہ اپنے پاس والوں کو دین و تقویٰ اختیار کرنے کی ترغیب دیا کرتے ہیں اور برابر متنبہ فرماتے ہیں کہ ہمارا جسمانی قرب کافی نہیں ہے تم کو کچھ حاصل ہو سکتا ہے تو تم کو بھی وہی کرنا ہوگا جو اغیار کو کرنا ہوتا ہے یعنی عقیدت و صدق و خلوص اختیار کرنا ہوگا جبھی کچھ فیض حاصل ہو سکتا ہے ــــــــ اور حضرت کیا خوب بیان فرماتے ہیں کہ تین صنف کو جو اہل اللہ سے فائدہ نہیں ہوتا تو اسکی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ فیض کے حصول کیلئے جو شرط اول ہے یعنی عقیدت وہی مفقود ہے اسلئے محروم رہتے ہیں ان کے پاس والوں کی ایسی مت ماری جاتی ہے کہ ظالم سرے سے عقیدت ہی کھو بیٹھتے ہیں عمل میں کوتاہی ہو تو دور بھی ہو جائے مگر عقیدت کی تلافی کس طرح ہوسکتی ہے اسلئے باوجود ہر اعتبار سے قرب کے باطناً کوسوں دور رہتے ہیں۔ اعاذنا اللہ منہا۔

حضرت والا کا یہ بھی خاص ارشاد ہے کہ بھائی جب ہم پاس والوں اور قلیل مقدار کی اصلاح نہیں کر سکتے تو باہر جاکر دوسروں دوسروں کی اصلاح پر کیسے قادر ہوسکتے ہیں اسلئے الاقرب فالاقرب اور اقل فالاکثر کا بہت لحاظ فرماتے ہیں جو نص کے بالکل موافق ہے وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۔ نیز اسکا اہتمام بھی فرماتے ہیں کہ تعلیمات کے پیش کرنے میں رفق و سہولت کا لحاظ ہو تاکہ مخاطبین بخوشی قبول کریں ورنہ تو بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ فی نفسہ ایک شی محمود ہوتی ہے مگر بے موقع یا بدعنوانی اور بے ڈھنگے طریقہ پر پیش کرنے سے بھونڈی اور بدنما ہو جاتی ہے جس سے مخاطب پر اچھا اثر نہیں پڑتا

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر احکام نازل فرمانے میں انکی طبیعت کا لحاظ فرماتے ہوئے ترتیب کا لحاظ فرمایا ہے، اور ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہوتی ہے ورنہ یکایک احکام شاقہ کے نزول سے انکار پیدا ہو جانے کا احتمال تھا جیساکہ حضرت عائشہؓ کا اثر موجود ہے۔

نیز حضرت والا فہم کے پیدا کرنے اور بات کے سمجھنے کی طرف بہت زور دیتے ہیں اور دین و دنیا کی باتوں کو کھول کھول کر بیان فرماتے ہیں اور یہ اکثر فرماتے ہیں کہ نیک تو ہیں مگر فہم نہیں ہے اگر ذرا سی فہم ہو جائے تو کہاں سے کہاں پہونچ جائیں۔ دنیاوی فہم میں بھی نقص کی برابر شکایت فرماتے ہیں کہ تم سے دین کیا سپڑے گا اور اسکو کیا سمجھوگے ہم لوگ سمجھ لیں تو بہت ہے تم دنیا ہی قاعدہ سے کرلو تو بہت بڑی بات ہے۔ اس طرح الحمدللہ کام کرنے سے نفع محسوس کیا جارہا ہے، خواص و عوام سبھی متاثر ہیں۔ آج اسطرح کام کرنے والے جو سمجھ و عقل رکھتے ہوں کام کریں تو اب بھی فائدہ ہو مگر اس طرح کام کرنے والے معدوم ہی سے ہوگئے ہیں۔ اسلئے کام نہیں ہورہا ہے حضرت والا یہ مختصر سا خاکہ پیش خدمت ہے حتی الوسع اختصار کیا ہے تاہم طویل ہوگیا ہے معاف فرمائیں اور دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو سمجھ عطا فرمائے۔ والسلام

(۷)

عرض خدمت اقدس میں یہ ہے کہ حضرت والا دامت برکاتہم نے اپنی خداداد بصیرت و فراست سے جو طرز تربیت اور طور اصلاح اختیار فرمایا ہے وہ کتاب و سنت سے ماخوذ اور طریقۂ نبویہ کے عین مطابق ہے حضرت والا نے خواص و عوام کے حالات کا بنظر غائر مطالعہ فرمایا ہے اور پھر ان کے مناسب حال کتاب و سنت کی روشنی میں کلام فرمانا شروع کیا جس کا نفع ہر طبقہ میں ظاہر و عیاں ہورہا ہے۔ یہ نہیں کہ ضرورت تو لوگوں کو مبادی امور کی تعلیم کی ہے اور ان کے سامنے حضرات صحابہؓ کے فضائل و مناقب بیان کیے جائیں اور جن امراض میں لوگ مبتلا ہیں ان سے تعرض ہی

نہ کیا جائے جسکی وجہ سے خود ان پر اپنا حال مشتبہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ پھر اصلاح کی کیا صورت ہو سکتی ہے اسلئے حضرت والا نے مرض نفاق میں عام ابتلا دیکھکر نفاق و اخلاص کی بحث چھیڑی اور قرآن و حدیث و اکابر کی تصریحات سے اس پر مفصل و مدلل کلام فرمایا گویا اس مسئلہ میں بھی علم کا ایک باب مفتوح فرمادیا اور پھر تعلیم و تربیت میں بھی یہ ترتیب قائم فرمائی کہ سب سے پہلے اپنے گھر کے افراد پھر قریب کے خدام پھر عوام کو خطاب فرماتے ہیں اور موافق نص وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ کے پہلے اپنوں سے تب دوسروں سے کچھ فرماتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اولاد و خدام کے حق میں یہ بھی کمال رافت و شفقت ہے کہ یہی لوگ کیوں فیوض و برکات سے محروم رہ جائیں مگر اس کے باوجود جو لوگ انمیں سے محروم رہ جاتے ہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ حصول فیض کے لئے شرط اول اعتقاد و اخلاص ہے اور یہ اپنوں اور غیروں سب ہی کے لئے ہے۔ پس جنکو فہم، عقیدت و خلوص ہوتا ہے انکو فیوض سے حصہ مل جاتا ہے اور جنکی مت ہی ماری جاتی ہے انکی فہم تک درست نہیں ہوتی اسلئے وہ محروم رہ جاتے ہیں اور یہ وجہ بھی ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بھی آجاتی ہے کہ جیسے ہم لوگ ان بزرگ کے مال و جائداد میں شریک ہیں اور ان کے بعد وارث ہوں گے اسی طرح انکی بزرگی اور ولایت میں بھی اپنا استحقاق سمجھتے ہیں حالانکہ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ ان بزرگ کو تو بہت ریاضت و مجاہدہ کے بعد یہ دولت حاصل ہوئی اور اس منصب سے مشرف ہوئے اور یہ لوگ بغیر کچھ کئے دھرے ہی اپنے کو اس منصب کا مستحق سمجھنے لگتے ہیں اور چونکہ ان بزرگ کے مریدین ان لوگوں کو اچھی نظروں سے دیکھتے ہیں اور تعظیم و تکریم کا معاملہ کرتے ہیں اسلئے غرور اور دھوکہ میں پڑ جاتے ہیں اور اس طرح کمال کی تحصیل کیطرف توجہ اور التفات نہیں کرتے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی حکیم و ڈاکٹر ہے تو کیا اسکی بیوی، بچے اور اقربا و احباب سب ڈاکٹر ہو جاتے ہیں؟ ایسا تو نہیں ہوتا۔ اور نہ محض مال میں وارث ہونے کی وجہ سے کوئی اس فن میں وارث ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، تو اسی چیز میں کیوں ایسا ہوگا؟ اب بجز اسکے اور کیا کہا جائے کہ یہ بھی شیطان کا کید اور زبردست اغوا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عوام الناس تو آج بھی دین کے لئے تیار ہیں مگر ان میں جو تعطل ہے اسکی سب سے بڑی وجہ خواص ہی ہیں کہ نہ تو انکو دین کی فہم ہے اور نہ دنیا ہی کی عقل ہے مدرسہ میں پہنچے تو وہاں کچھ نہیں سیکھتے اور مشائخ کی خدمت میں آئے تو وہاں بھی کچھ حاصل نہیں کرتے، البتہ کسی بزرگ کی خدمت میں پہنچ جانے کیوجہ سے ہر ہر فرد اپنے متعلق کمال کا مدعی ہوجاتا ہے اور اپنے کو واجب التکریم و تعظیم سمجھنے لگتا ہے۔ حضرت والا اس پر بھی بار بار متنبہ فرماتے رہتے ہیں کہ یہاں قرب جسمانی کا اعتبار نہیں ہے بلکہ قرب روحانی معتبر ہے ہوسکتا ہے کہ قرب جسمانی کے باوجود قرب روحانی نہ حاصل ہو ــــــ اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا کہ ہماری جماعت سے باوجود حق پر ہونے کے جو کام نہیں ہو رہا ہے تو اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ کام کرنے چلے انھوں نے اپنی لاعلمی اور بے بصیرتی اور قلتِ عقل و فہم کی وجہ سے غلط طرز اختیار کیا اسوجہ سے کام نہیں ہوا ورنہ اگر اب بھی صحیح طریق کار اور مناسب طرز اختیار کیا جائے تو کام ضرور ہوگا اور لوگ ضرور دین اختیار کریں گے اور بہت کچھ سیکھ لیں گے۔

حضرت والا! جو کچھ ہوسکا مختصر عرض کردیا۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ فہم سلیم اور تفقہ فی الدین عطا فرمائے۔ آمین۔

(۸)

حضرت والا دامت برکاتہم نے اپنے تعلیم و تربیت کی خصوصیات دریافت فرمائی ہیں یہ بدفہم، بداستعداد ایسی ذات کے جمال و کمال اور تعلیم و تربیت کو کیا سمجھ سکتا ہے جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے دین متین کی خدمت و اشاعت اور مردہ دلوں میں ایمان و یقین کی روح پھونکنے کے لئے پیدا فرمایا ہو اور اس دور فاسد و جہل و جہالت میں قرآن و سنت کی ترویج اور اخلاق نبوی و شریعت مطہرہ کی تعلیمات سے دل و دماغ کو روشن کرنے کے لئے منتخب فرمایا ہو، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کی ذات کو اس دور فتن میں مسلمانوں کے لئے پشت پناہ اور مامن بنایا ہے۔ حضرت تو بسیط ارض پر

حجۃ اللہ فی الارض ہیں ع۔ کہیں نہ دیکھا کہیں نہ پایا جمال ایسا کمال ایسا۔

یہ بلید اور بدفہم حضرت والا کی توجہ اور برکت سے عرض کرنے کی جرأت کرتا ہے ورنہ "کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل" ۔ حضرت والا ہمیشہ ہی عوام وخواص کے سب حالات اور تمام خرابیوں کی اصلاح قولاً وفعلاً فرماتے رہتے ہیں، شب و روز ہر آن امت کی اصلاح کی فکر رہتی ہے اور کتاب وسنت وسلف صالحین کی ترجمانی اور تعلیمات نبویہ کو دلنشین عنوان سے پیش فرماتے رہتے ہیں۔ سب سے زیادہ توجہ وزور حضرت والا کا فہم کے لئے ہوتا ہے۔ آنے جانے والوں کو عموماً اور پاس رہنے والوں کو خصوصاً دیکھتے رہتے ہیں کہ ان میں فہم کتنی پیدا ہوئی کیونکہ حضرت والا مسلمانوں کی عام بدحالی کو اسی بدفہمی کا نتیجہ سمجھتے ہیں کہ دین و دنیا کا کام اسی فہم کی خرابی کی وجہ سے خراب ہے اگر آدمی میں فہم و عقل نہو تو دین کا کام تو کیا کریں گے دنیا کا بھی کام نہیں کر سکتے چنانچہ ہمارے معاد ومعاش میں برابر کتاب وسنت سے رہنمائی فرماتے رہتے ہیں اور اسکی کوشش بلیغ فرماتے ہیں کہ بات سمجھ میں آجائے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا نائب اور وارث اور نسبت محمدیہ کا حامل بنایا ہے اس لئے ہر ہر قدم پر سنت نبوی کی اتباع فرماتے ہیں۔ پہلے اور سب سے زیادہ اپنے قریب والوں کو دین و دیانت اور اخلاق کی درستی کیطرف متوجہ فرماتے ہیں اور یہ جو مقولہ مشہور ہے کہ کسی شیخ سے ان کے اولاد وخادم اور گھر والوں کو نفع نہیں ہوتا تو اسکی وجہ حضرت والا یہ فرماتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ مدارِ نفع عقیدت پر ہے ان لوگوں کو چونکہ دوسرے قسم کا بھی تعلق ہوتا ہے اسلئے ان لوگوں کو اعتقاد مشکل ہی سے ہوتا ہے جو مدارِ نفع ہے عملی کوتاہی کی مکافات ہوسکتی ہے مگر اعتقاد کی کمی کی مکافات نہیں ہوسکتی۔ دوسرے لوگ جو عقیدت سے آتے ہیں نفع اٹھاتے ہیں اور یہ پاس والے محروم رہتے ہیں۔

حضرت والا کو یہ کسی طرح گوارا نہیں کہ دوسرے تو نفع اٹھائیں اور پاس والے محروم رہیں چنانچہ وانذر عشیرتک الاقربین اور قم فانذر اور سنت نبوی پر عمل فرماتے ہیں۔

(مرید صادق کی ایک صفت)

آپ نے حضرت مصلح الامۃؒ کے امتحانات ملاحظہ فرمائے۔ مجال نہیں تھی کہ کوئی طالب اصلاحی تعلق حضرت اقدسؒ سے رکھے اور غافل رہ سکے ہر وقت خود بھی اسکی اصلاح کی تدبیر سوچنے میں غرق رہتے تھے اور اسکو بھی فکر مند بنائے رکھتے تھے ع چنانچہ اندریں رہ می تراش و می خراش کا صحیح نقشہ یہیں دیکھنے میں آتا تھا۔ کوشش اس امر کی ہوتی تھی کہ طالب کے اندر خود اسدرجہ فہم پیدا ہو جائے کہ طریق کے خلاف امور کے ارتکاب سے اسکو بطور خود کھٹک پیدا ہونے لگے چنانچہ لوگوں کا یہی حال ہو جاتا تھا۔ ایک سالک کا خط ملاحظہ ہو، حضرتؒ کو لکھا کہ:۔

"حضور والا کی خدمت میں حاضری کے وقت میں نے عہد کیا تھا کہ جو کام کرونگا وہ حضرت والا کے حکم کے مطابق کرونگا وطن پہنچکر اس عہد میں اور پختگی ہو گئی اسلئے یہاں پر ایک اجلاس کے سلسلہ میں حضور والا سے استصواب رائے کرنے کیلئے عریضہ ارسال خدمت کیا جس کا جواب تو باعث سرفرازی ہوا مگر مجھے پورے طور پر تشفی نہیں ہوئی کیونکہ اس میں حضور والا نے اپنی سرپرستی سے نہیں نوازا جس سے معلوم ہوا کہ حضرت اس قسم کی چیزوں کو پوری خوشدلی سے پسند نہیں فرماتے میں چونکہ عہد کر چکا ہوں کہ یہاں پر کوئی کام اب بدون حضرت کی پسندیدگی کے نہیں کرونگا کیونکہ میرا پختہ یقین ہے کہ مجھے جو کچھ ملا ہے اور آئندہ ملیگا اپنے بزرگوں کی اطاعت شعاری ہی سے ملیگا جذبۂ اطاعت شعاری کے بغیر بزرگوں کی دعاؤں و توجہات سے محرومی ہوگی جسکو میں کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا، چنانچہ رفقائے کار سے بھی یہی کہدیا ہے کہ جبتک حضرت کی خوشدلی کے ساتھ پسندیدگی معلوم کرلونگا اسوقت تک میں سکوت کرونگا اسلئے آئندہ کا دارومدار حضرت کی پسندیدگی واستحسان کی اطلاع یابی پر ہوگا"

حضرت اقدسؒ نے جواب مرحمت فرمایا:۔ "عہد پر پختگی مبارک ہو، آپ کی عقیدت ومحبت سے خوشی ہوئی ایک مرید صادق کو ایسا ہی ہونا چاہیئے باقی ان جلسوں کو زیادہ مفید مسلمانوں کے لئے نہیں سمجھتا ہوں مگر منع بھی نہیں کرتا یہ مقامی حضرات کی رائے پر ہے وہاں کے حالات سے وہ واقف ہوتے ہیں خود کریں یا دوسروں کو بلائیں میں جب خود کہیں نہیں جاتا تو دوسروں کو کیوں منع کروں۔

(حضرت والا احسن اعتقاد اور معرفت کی باتوں سے خوش ہوتے تھے)

ایک مسترشد نے لکھا کہ :- "بندہ کو حضرت والا سے قلبی محبت پیدا ہو چکی ہے صرف حضور والا کے اخلاق حسنہ کو سنکر نیز اصلاح نفس کے متعلق حضرت کی بے لوث خدمت معلوم کر کے کہ درحقیقت یہی شان ہمارے سلف صالحین کی تھی جسے آج ہم لوگوں نے کھو دیا ہے جسکی وجہ سے آج ہمارا یہ حال ہے۔ حضور والا آج دنیا میں صحیح مصلحین کی بڑی کمی ہے، جہاں کہیں موجود بھی ہیں تو ہمکو ان کی مخالفت میں مزہ آتا ہے اور دن رات کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ انکی جڑ کاٹ دیں۔ حضور والا میری اصلاح فرمائیں اور اپنی غلامی میں داخل فرمالیں

حضرت مصلح الامۃ کا جواب :- "آپ کی محبت کا ممنون ہوں یہ اللہ تعالیٰ کا محض فضل ہے کہ اپنے نیک بندوں کو متوجہ فرما دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس محبت اور تعلق کے ثمرات سے طرفین کو دارین میں بہرہ ور فرمائے آپنے میرے متعلق جن جذبات اور خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ آپ کا حسن ظن اور آپکی محبت ہے اللہ تعالیٰ مجھے اسکے مطابق فرما دے اور سلف صالحین (کے زمرہ) میں ہمارا بھی شمار فرما دے کہ

احب الصالحین ولست منهم لعل اللہ یرزقنی صلاحًا

(میں صالحین سے محبت کرتا ہوں گو انمیں سے ہوں نہیں عجب کیا کہ اللہ تعالیٰ کچھ حصہ صلاح میرے لئے بھی مقدر فرما دے)

آپکی یہ بات بہت پسند آئی کہ آج صحیح مصلحین کی دنیا میں بڑی کمی ہے الخ" بالکل صحیح ہے اور واقعہ کے عین مطابق ہے اور ابتلائے زمانہ کی صحیح ترجمانی ہے آپکا اصلاحی تعلق دل سے منظور ہے تشریف لانے کی اجازت ہے

("تا دمِ آخر دمے فارغ مباش" اچھا حال ہے)

ایک طالب نے اپنا حال لکھا کہ :- مولائی! اپنے امکان بھر سعی کئے جا رہا ہوں اور قوی امید ہے کہ مولا تعالیٰ بھی اپنی بیحد عنایتوں سے سرفراز فرمائیں گے، پھر بھی بیحد تردد اور فکر ہے کہ معلوم نہیں میری کیا حالت ہے قرب مولا عطا ہو رہا ہے یا نہیں ایک ایک دن جیسا گذرتا ہے اپنی نا اہلی اور کورے پن کا زیادہ سے زیادہ احساس ہوتا جا رہا ہے عجیب حیرت میں ہوں جہاں بیحد یقین حاصل ہے وہیں گاہے گاہے نا امیدی (اور یاس) کی ایک موہوم سی لہر بھی دل پر چھا جاتی ہے جو کبھی ایک آن میں یا ذراسی دیر کے بعد پھر مولا تعالیٰ کے فضل سے دور ہو جاتی ہے۔ مولائی ادبًا مستدعی ہوں کہ میرے لئے ایک دستور العمل مقرر فرما دیجئے میں دن بھر اپنے کو وقف کرنا چاہتا ہوں۔

(اسکا جواب حضرت کے یہاں سے یہ گیا)

مجھے تو آپ کے حالات معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی ہے آس کے ساتھ جس یاس سے آپ پریشان ہوتے ہیں وہ عین ایمان کی علامت ہے کالایمان بین الخوف والرجا رہے اگر اتنی پریشانی اور خوف نہو تو ناقصین عجب میں مبتلا ہو کر اپنا ناس ہی کریں۔ آپ نے دستور کی فرمائش کی ہے تو مومن کا دستور العمل تو قرآن و شریعت ہے اللہ و رسول ہی نے اسکو بنا یا ہے۔ پانچ نماز فرض فرما دی ہے۔ تلاوت و ذکر و تسبیح بھی آپ کر ہی رہے ہیں اب کیا چاہتے ہیں کہ بالکل مجموعۃ الوظائف ہی ہو کر رہجائیں حضرت (تھانوی) کے مواعظ اور تفسیر بیان القرآن۔ بہشتی زیور وغیرہ کا مطالعہ بھی آپ فرما رہے ہیں۔ اسلئے میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ اب صرف آپ قلب کی نگرانی فرمائیں یعنی یہ دیکھیں کہ یہ نماز و روزہ ذکر و فکر تلاوت و تسبیح اور مطالعۂ کتب جو کچھ ہو رہا ہے ان میں کس درجہ اخلاص ہے اور وہ برابر بڑھ رہا ہے یا نہیں۔

اسکے علاوہ اور معاملات میں بھی اسکی حفاظت فرمائیں کہ نفاق سے اپنے اقوال و اعمال و احوال کو بچائے جائیں، بس تو پھر انشاءاللہ اتنے کو اخلاص کے ساتھ کرنے اور نفاق سے دور رہنے اور بچنے کے بعد اب اور کسی چیز کی مزید ضرورت نہیں ہے البتہ نفاق اور اخلاص کی تفصیل معلوم کرنے کیلئے وصیۃ الاحسان۔ تحذیر العلماء۔ عاقبۃ الانکار وصیۃ الاخلاق اور مضمون ذکر جو میرے رسائل ہیں انکا مطالعہ بار بار کیجئے اور رسالہ اخوت نیز التذکیر بالقرآن جو کہ رسالہ الفرقان میں شائع ہوا ہے ان سب کا مطالعہ فرمائیے اور پھر اپنے تاثرات سے مجھے بھی مطلع فرمائیے

آپ کے کل خط کا یہی جواب ہے، باقی اللہ تعالیٰ کا معاملہ اللہ تعالیٰ جانیں۔ ع۔ رموز مصلحت خویش خسرواں دانند۔ نسبت کے الوان مختلف ہوتے ہیں جسکے مناسب جو لون ہوتا ہے اس سے اسکو نوازتے ہیں اور جب مصلحت ہوتی ہے تب ہی عطا فرماتے ہیں، ہمارا کام بس درخواست کرنا ہے تقاضا نہیں ہے ؎

کھولیں وہ یا نہ کھولیں در اس پر ہو کیوں تری نظر
تو تو بس اپنا کام کر یعنی صدا لگائے جا

حضرت مصلح الامۃ کے مکتب اصلاح کے یہ وہ نمونے تھے جو عام سالکین کی اصلاح کے سلسلے میں حضرت کے یہاں دیکھے جاتے تھے۔ اب بعض وہ نمونے بھی ملاحظہ فرماتے چلئے جو خواص اور اخص الخواص، منظورِ نظر طالبین کی اصلاح کے سلسلے میں معرضِ وجود آتے رہے، اسمیں شک نہیں کہ ان چند ہی مکاتیب کے مطالعہ سے حضرت اقدس کی شان شفقۃ علی الامۃ اور ایک طالب خدا کے ساتھ حضرت کی قلبی محبت کا پورا پورا اندازہ ہوجاتا ہے۔ افسوس اب کہاں یہ شفقت بھری اصلاح دیکھنے میں آئیگی اور کہاں ایسا ساقی نظر آئیگا، بس ابتو یہ حال ہو رہا ہے ؎

یہ حالت ہوگئی ہے ایک ساقی کے نہونے سے
کہ خم کے خم بھرے رکھے ہیں اور میخانہ خالی ہے

اب وہ خطوط ملاحظہ فرمائیے :-

بعض خواص کے مخصوص خطوط

حال : حضرت والا کے سمجھانے سے یہ بات دل میں جگہ پکڑتی جارہی ہے۔
تحقیق : نہایت مبارک ہے (یہ حال) یہی انتفاع بالعلم ہے اسکے بعد عمل ہے۔
حال : کہ اللہ و رسول کے دربار کے محبین جو نیابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح معنوں میں حق ادا کر رہے ہیں ان حضرات کی جیسی کچھ کہ شان و عظمت ہے اس اعتبار سے ان سے تعلق و محبت کا دعوی کرنا جھوٹ ہی ہے۔ تحقیق : اور کیا۔
حال : اور جسقدر بھی تعلق حاصل کیا جائے کم ہے۔ تحقیق : بیشک
حال : اس راہ میں اصل چیز شیخ سے قلبی محبت و انس اور تعلق ہے۔ تحقیق : بیشک
حال : دل میں اکثر یہ خیال آیا جایا کرتا ہے کہ یہ قرب جو (حضرت والا سے) حاصل ہے یہ بھی بہت بڑا فضل ایزدی ہے۔ تحقیق : الحمدللہ، بیشک۔
حال : ظاہر دولت اس سے جتنی بھی حاصل ہوجائے ہوجائے مگر باطنی دولت جو کہ اللہ و رسول کی سچی محبت و معرفت ہے وہ تو حضرت والا کی جوتیوں کے صدقہ

ہی میں حاصل ہوسکتی ہے (یعنی محض قرب بدنی اس کے لئے کافی نہیں)

تحقیق، بالکل صحیح ہے۔

حال، حضرت والا دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ فہم ظاہری اور فہم باطنی سے نوازیں

تحقیق: دل سے دعا کرتا ہوں آمین

حال، اور حضرت والا کی سچی معرفت اور قلبی انس و تعلق سے نوازیں تحقیق: آمین ثم آمین ثم آمین

حال، تاکہ اپنی بگڑی بن جائے۔ تحقیق، آمین ثم آمین ثم آمین۔

(راقم عرض کرتا ہے کہ حضرت اقدسؒ کا معمول عام طور سے تو یہ تھا کہ کسی طالب دعا کے جواب میں ایک مرتبہ آمین تحریر فرمایا کرتے تھے یہاں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ دو دفعہ تین تین بار آمین تحریر فرمایا (یعنی یہ کہ آمین، ثم آمین، ثم آمین تحریر فرمایا) اس سے حضرت والا کے طالب موصوف کے حال کیجانب اعتنا کا اندازہ ہوتا ہے کہ جس رفتار پر انکا چلنا دیکھنا چاہتے تھے دیکھا اور جس حال کی توقع فرمائے ہوئے تھے اللہ تعالیٰ سے اصرار والحاح کے ساتھ اسکی دعا فرمائی، واللہ تعالیٰ اعلم)

(انہیں سالک کا دوسرا خط ملاحظہ فرمائیے)

(حضرت مرشدی نوراللہ مرقدہٗ نے اپنے یہاں درس و تدریس کا بھی سلسلہ قائم فرما رکھا تھا اپنے چاروں خویشوں کو خود ہی پڑھایا کرتے تھے اس درس میں خانقاہ میں مستقل قیام کرنے والے بعض حضرات بھی شریک رہتے تھے، چنانچہ ان طلبا سے بھی خانقاہ کے طرز کا امتحان ہوتا تھا مثلاً یہی کہ کبھی کبھی یہ سوال ہوتا تھا کہ میں جو آپ لوگوں کو پڑھا رہا ہوں اور اسکے لئے وقت دے رہا ہوں اسکا کیا ثمرہ مرتب ہو رہا ہے اسکو بیان کیجئے ورنہ یہ سمجھ لیجئے کہ میرا ضمیر اس پر راضی نہیں ہے کہ میں بلا کسی نتیجہ کے اپنا وقت ضائع کروں۔ ایک مرتبہ اسی نوع کا کچھ سوال ہوا اس پر ایک صاحب نے یہ جواب پیش فرمایا) :-

حال: حضرت والا نے فرمایا کہ سبق اسلئے ہوتا ہے کہ علم سے مناسبت پیدا ہو، عقل صحیح اور فہم سلیم اور تجربہ کی زیادتی ہو (اور دیکھتا ہوں کہ) یہ نہیں ہو رہا ہے اسلئے میرا ضمیر

اسکے لئے راضی نہیں کہ میں اپنا وقت ضائع کروں، تو حضرت والا کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے بیشک حضرت والا جتنی کاوش اور تکلیفیں برداشت کرکے اور اپنا خون پسینہ ایک کرکے پوری توجہ اور رغبت سے پڑھاتے ہیں اس اعتبار سے تو حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ بالکل ہی خالی خولی ہیں اور حضرت والا کی سعی گرانمایہ کی قدر کچھ تو عام قویٰ کی کمزوری اور کچھ بیفکری اور ناعاقبت اندیشی اور خلوص کی کمی کی وجہ سے نہیں ہورہی ہے اور یہ چیز ہمارے لئے افسوس صد افسوس خون رونے کی چیز ہے، اور حضرت والا کے لئے بھی بہت گھٹن اور روحی کوفت کا باعث ہے۔

حضرت والا اس سلسلہ میں میں تو اپنے آپ کو (بالکل ہی) طفیلی سمجھتا ہوں کہ کوزۂ مصری کے ساتھ ساتھ ایک حقیر دھاگے کا بھی گذر ہوجاتا ہے بلکہ اسی قیمت کو فروخت ہوجاتا ہے اسلئے میری زبان یہاں نہیں کھلتی کہ میں علم سے مناسبت اور استعداد کے متعلق حضرت سے عرض کروں۔ ہاں البتہ یہاں دو چار اشخاص ایسے ہیں کہ حضرت والا کی سعی (انشاء اللہ تعالیٰ) رایگاں نہیں جائیگی۔

یوں تو حضرت والا کے اعلیٰ معیار اور کسوٹی کے سامنے (سب ہی لوگ) نکمے ہی ثابت ہوں گے مگر عام حالات کے اعتبار سے جیسا کہ (عام طور سے) مدرسہ اور اہل مدرسہ کے حالات دیکھے جارہے ہیں کہ مدارس زیادہ ہوتے جارہے ہیں اور علم نایاب اور پڑھنے پڑھانے والے کمیاب ہورہے ہیں، اس دنیا میں ان میں حضرت والا کے فیوض وبرکات کے طفیل میں امید ہے کہ چند لوگ کام کے ثابت ہوں گے اور حضرت والا کی سعی وصول ہوجائیگی اور ان ہی حضرات کے طفیل میں ہم جیسے بد استعداد اور بدفہم کے کانوں میں بھی قرآن وحدیث کے صحیح معنی ومطلب حضرت والا کی زبان مبارک سے سنکر پڑجاوے گا اور ایسے ہی سنتے سناتے بہت کچھ پلے پڑجانے کی امید ہے کہ ؎

مستی کے کیلئے بوئے مئے تند ہے کافی　　میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

حضرت والا دعا فرمادیں اور اللہ تعالیٰ اس حقیر خادم پر اپنا فضل فرمادیں اور حضرت والا کے فیض سے نوازیں۔

الحمدللہ حضرت والا کی توجہ سے پہلے کے اعتبار سے بد استعدادی اور بدفہمی میں فرق پاتا ہوں (یعنی استعداد و فہم بہ نسبت پہلے کے بہت کچھ بڑھی ہے)، اور کوشش کرونگا کہ اور بڑھے۔

(حضرت مصلح الامۃ کا انتہائی شفقت آمیز جواب)

آپ نے سب صحیح تحریر فرمایا ہے، اب میری (داستان) سنو اور غور سے سنو! شاید دیوبندیوں میں (یعنی مدرسہ دیوبند میں) اور اہل تھانہ بھون میں مجھ سے بد استعداد کوئی نہ تھا مگر اب دیکھ رہا ہوں کہ جائے استاد خالی است بجز اس خاکسار کے کوئی کام کرنیوالا نہیں، یہ اسوقت کی بات ہے جو مشاہدہ کر رہے ہو پہلے کی سنو! ہمارے سر گروہ سید احمد صاحب بریلویؒ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے یہاں پڑھنے گئے، کافیہ پڑھتے تھے ایک دفعہ مولانا کے پاس رونے لگے کہ مجھکو تو کافیہ کے حروف ہی نظر نہیں آتے مجھکو علم کیا آویگا۔ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ) نے فرمایا کہ پڑھنا چھوڑ دو تم کو کتاب سے علم نہ آویگا علم لدنی ملیگا، چنانچہ اس دور کے علماء فحول انکے شاگرد ہوئے۔ مولانا مملوک علی صاحب جب دہلی پڑھنے گئے تو دو تین دن پڑھانے کے بعد ہر استاد انکار کر دیتا تھا کہ تم غبی ہو یہ مولانا عبدالعزیز صاحبؒ کے پاس گئے کہا کہ ہمکو پڑھنے کا شوق ہے کوئی پڑھاتا نہیں مولانا صاحبؒ نے فرمایا کہ (تمکو) ہم پڑھائیں گے (صرف) تین دن پڑھایا اور فرمایا کہ جاؤ اب جس استاد سے پڑھوگے پڑھائیگا، چنانچہ استاذ العلماء ہوئے، مولانا گنگوہی، مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے استاد تھے۔ خوب سمجھ لو۔

(ملاحظہ فرمائیے کہ حضرت والا کی یہ باز پرس اور بظاہر عتاب کسقدر سخت ہے کہ ارشاد ہو رہا ہے کہ تعلیم دین اور درس و تدریس سے جو میرا مقصد تھا آپ لوگوں میں اسکا حصول نہیں دیکھ رہا ہوں اسلئے میرا ضمیر اسکے لئے راضی نہیں ہے کہ (خوامخواہ آپ لوگوں کو وقت دیکر اپنا وقت ضائع کروں ——— لیکن طالبعلم موصوف نے بھی جو کہ سالک بھی تھا اسکا کیسا جواب لکھا اور کس درجہ پستی اور تواضع، انقیاد اور کسر نفسی اختیار فرمائی کہ جس نے

اسس عتاب والا کو ترحم اور شفقت کا جامہ پہنا دیا اور پھر اسکے بعد حضرت اقدس رح نے طالب مذکور کی کیسی کچھ دلداری فرمائی ہے کہ سبحان اللہ۔ اسکی یاس کو آس سے بدلنے کے لئے اسپنے نیز بزرگوں کے واقعات بیان فرماکر کسقدر تسلی فرمادی گویا زخم پر مرہم رکھدیا اور امید لگا دی کہ علم اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ اور منجملہ موھبت الٰہیہ کے ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اپنی جانب سے بخشدیتے ہیں، ذہن اور کوشش پر اسکا مدار نہیں ہے پھر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ صرف یہ سنانا ہی مقصود تھا یا اس کے ضمن میں اشارہ بھی ہوسکتا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ تمکو بھی اسی راہ سے جو ملنا ہوگا ملیگا اور پھر خود حضرت والا رح نے ان محترم کیلئے اللہ تعالیٰ سے کیسی کچھ دعا نہ فرمائی ہوگی۔ وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء)

(سالک موصوف کا تیسرا خط)

جسکی صورت یہ ہوئی کہ ایک دن خود حضرت اقدس رح نے بذریعہ تحریر انکو مخاطب کرکے تحریر فرمایا کہ

"میں آپ سے ایک بات دریافت کرتا ہوں، وہ یہ کہ آپ کو مجھ سے کامل اعتقاد ہوگیا یا کچھ کسر باقی ہے؟ دوسرے یہ کہ طریق سے مناسبت کسقدر ہوئی؟ —— یہ میں کسی وجہ سے لکھ رہا ہوں آپکو تہمت کیوجہ سے نہیں لکھ رہا ہوں۔ والسلام۔ وصی اللہ عفی عنہ"

(اس سوال کا جواب اور اسپر حضرت والا کا ارشاد)

حال: گذارش خدمت اقدس میں یہ ہے کہ حضرت اقدس نے عقیدت کا ملہ و طریق سے مناسبت کے متعلق دریافت فرمایا ہے جو کہ اس راہ کی بہت ہی اہم اور بنیادی چیز ہے۔ (عرض ہے کہ) عقیدت کے متعلق جرأت کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ (الحمدللہ) حضرت والا سے عقیدت ہے، اگر حضرت والا سے عقیدت نہ ہوگی تو کس سے ہوگی؟ اگرچہ اپنے اندر اتنی قوت فکریہ وعلمیہ نہیں ہے کہ حضرت والا کے درجات عالیہ کو سمجھ سکوں، مگر ذی استعداد اور ذی رائے لوگوں کے (یعنی علماء و فضلاء کے) رجوعات سمجھنے کیلئے کافی ہیں۔

(جسکو) بدفہم انسان بھی سمجھ سکتا ہے اور عقیدت مند ہو سکتا ہے۔
تحقیق: یہ بہت سمجھ کی بات لکھی یہی بہت بڑی دلیل ہے ایسے شخص کے حق پر ہونیکی
اللہ تعالیٰ تمھیں فہم کامل عطا فرماوے۔ آمین۔
حال: اب رہی طریق سے مناسبت (تو عرض ہے کہ نہ تو میری ماں ہی عالمہ تھیں اور
نہ میرے باپ دادا عالم و فاضل تھے، ایک کسان جاہل گھر کا رہنے والا، ان ہی
لوگوں کی بود و باش گھٹی کی طرح سرایت کئے ہوئے ہے اور ذہن و دماغ میں بھی
ان ہی لوگوں کی ہمت و حوصلہ موجود ہے۔
تحقیق: یہ حقیقت ہے ہر آدمی ابتدا میں ایسا ہی پیدا ہوا ہے، اسکا یہ تواضع ہی ہے
کہ اپنی حقیقت پیش نظر رہے۔ میں بھی تو پہلے ایسا ہی تھا کسی کی برکت پہونچی ہے
حال: یہ تو صرف حضرت کے طفیل اور حضرت والا کی توجہ خاص کی بدولت الف، بائ
پہچاننے لگا اور اب کچھ انسانی زندگی بسر کرنے کا خاکہ ذہن میں آگیا ہے
تحقیق: الحمد للہ یہی دریافت کرنا چاہتا تھا، الحمد للہ کہ زندگی بسر کرنے کا خاکہ ذہن میں
آگیا ہے، ذہن خالی نہیں ہے جس نے اتنا دیا ہے اور دے سکتا ہے۔
حال: کہ اس طرح انسان کو ایک انسان کے ساتھ باہم رہنا سہنا چاہیئے۔
تحقیق: اخلاق کا اعلیٰ درجہ یہی ہے، یعنی انسانیت۔
حال: اور پنجوقتہ نماز کی ادائیگی کا خیال کہ وقت مقرر پر اور اچھی طرح ادا کرنا چاہیئے۔
تحقیق: اس سے زیادہ (یعنی بڑھکر) دین میں کوئی چیز نہیں (کہ کوئی شخص نماز وقت پر پڑھے اور اچھی طرح پڑھے)
حال: ہم جیسے جاہل اور نااہل کے لئے حضرت والا کی توجہ کی برکت سے اسی پر
زندگی گذر جائے۔ کافی ہے اور بہت بڑی کامیابی ہے۔
تحقیق: بیشک کافی ہے۔ بیشک کامیابی ہے۔
حال: حضرت والا دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نیک عمل کی توفیق عطا فرمادیں۔ والسلام
تحقیق: دل سے مزید توفیق کی دعا کرتا ہوں۔ آمین۔

دیکھا آپ نے مصلح الامۃ کے یہاں کا معاملہ؛ طالبین کی کس کس طرح تربیت اور نگہداشت فرمائی جاتی تھی اور عقیدت و مناسبت جو کہ طریق کی رُوح اور طریقت کا جوہر ہیں انکا کیسا جائزہ لیا جاتا تھا اور اپنی خداداد بصیرت سے طالب کی گفتگو اور اسکے عرض و معروض سے ہی اسکا حال معلوم فرما لیتے تھے۔ فرماتے تھے کہ جسطرح سے کہ لوگ ہانڈی کا سالم ہونا یا اسکا ٹوٹا ہوا ہونا اسکی آواز سے معلوم کر لیتے ہیں اسی طرح سے ہم لوگ بھی سالک کی گفتگو اور اسکی تحریر سے اسکے قلبی احوال کا کچھ اندازہ کر لیتے ہیں، شاید اسی مضمون کو عارف سعدیؒ نے اس شعر میں بیان فرمایا تھا کہ ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد   عیب و ہنرش نہفتہ باشد

انسان جب تک زبان نہیں کھولتا اسکے عیب و ہنر مخفی رہتے ہیں بولنے سے اس کا اندازہ لگ جاتا ہے یہ الگ بات ہے کہ ہوتا ہے یہ حکم ظنی ہی اور شیخ سے اس باب میں خطا بھی ہو سکتی ہے لیکن غیب کا علم چونکہ انسان کو ہوتا نہیں اسلئے انسان بس ظن غالب ہی کا مکلف ہے، یوں چونکہ ایک شیخ کامل کا تمام تر معاملہ للہ فی اللہ ہوتا ہے اور وہ کسی بات کا حکم لگانے سے پہلے باطنی طور پر حق تعالیٰ کی طرف رجوع بھی کر لیتا ہے اس لئے عموم احوال میں اللہ تعالیٰ اسکو لغزش سے بچا ہی لیتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

یہاں بھی سالک موصوف سے یہی سوال ہوا مگر چونکہ مکتب وصی اللّٰہی کے تربیت یافتہ تھے کیا عمدہ تواضع میں ڈوبا ہوا جواب دیا اور یہ قاعدہ ہی ہے کہ من تواضع للہ رفعہ اللہ یعنی جو تواضع اور پستی اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسکو بلند فرماتے ہیں حضرت والا کے قلب پر اسکا اثر ہوا اور حضرت کو انکی بے مائیگی اور بے چارگی پر رحم آگیا فوراً تسلی فرمائی کہ یہ خلو سب ہی کو پیش آتا ہے میں بھی پہلے ایسا ہی تھا پھر کسی کی برکت پہونچی اسی طرح سے تم بھی خاطر جمع رکھو تم نے جو یہ تواضع اختیار کی ہے تو یہ بھی انشاء اللہ ایک دن اپنا رنگ لائیگی اور تم پر بھی کسی کی نظر فیض اثر ہو جائے گی اور انشاء اللہ تم بھی کامیاب ہوگے سبحان اللہ کس قدر ڈھارس اور بشارت کے کلمات ارشاد فرمائے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے یعنی شیخ کا انداز تربیت ملاحظہ ہو کہ ابتداء میں سوال تو ایسا سخت کیا کہ طالب دہل ہی جائے

اور گھبرا ہی جائے لیکن آخر کلام میں کیسا تلطف اور کیسی شفقت بھر دی کہ ایک محب ذبح ہی ہو جائے ۔ اسی بات کو حضرت خواجہ صاحبؒ نے اپنے شیخ حضرت حکیم الامۃؒ کے متعلق یوں فرمایا تھا کہ ؎

مزا آتا ہے انکو چھیڑنے میں اپنے عاشق کے ۔ کبھی مغموم کرتے ہیں کبھی مسرور کرتے ہیں

اسی کو احقر نے عرض کیا تھا کہ "اندریں رہ می تراش و می خراش" کا منظر یا حضرت حکیم الامۃؒ کے یہاں دیکھنے میں آتا تھا یا پھر حضرت مصلح الامۃ نور اللہ مرقدہ کے یہاں دیکھا جاتا تھا خود فرماتے تھے کہ مشائخ طریق نے لکھا ہو کہ جس مرید کا حال اچھا دیکھئے اور اپنے کام میں جسکو چاق و چوبند پائیے تو اسپر مزید مشقت لازم کر دیتے تا کہ وہ یکسو ہو کر راہ مولی اور طلب مطلوب میں لگے کیونکہ یہ طریق ہی تنگی اور عزیمت و مشقت کا ہی اگر سالک نے رخصت کا راستہ اختیار کیا تو ہو سکتا ہو کہ حصول مطلب سے رہ جائے چنانچہ ہمارے حضرتؒ کا بھی اسی پر عمل تھا مرید کی سستی اور بے عملی جو اسکی جانب سے اپنے گھر یا وطن میں وجود میں آتی رہی ہو (جسکا ذکر اس نے کبھی اپنی مکاتبت میں کر دیا ہو) تو ملاقات ہوتے ہی سب سے پہلے اسی پر اس سے جواب طلب ہو جاتا تھا کہ جب کچھ کام نہیں کرنا ہے تو کیا دوڑ دوڑ کر میرے پاس آتے ہو ۔ چنانچہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا طالب کو اپنی یہ بد حالی یاد بھی نہ رہ جاتی اور وہ شش و پنج میں پڑ جاتا کہ مجھ سے کونسی ایسی غلطی ہو گئی جسپر یہ جواب طلب کیا گیا ہے ، غرض یہ تو بازپرس کا اول مقام ہوتا ، پھر اثنائے قیام میں کبھی کبھی اسی نوع کے امتحانات ہوتے کہ میں نے آج مجلس میں کیا بیان کیا ہے لکھکر لائیے یہ دوسرا مقام ہوتا تھا اور تیسرا اور آخری مقام وہ ہوتا جب وہ ایکدن قبل واپسی کی اجازت اور مکان جانے کا خیال ظاہر کرتا اسوقت بھی اسکے مناسب حال جو امور ہوتے دریافت فرماتے تب چھٹی ملتی تھی اور اجازت ہوتی تھی ۔ اسی لئے (چونکہ ایک مرید پر اتنی اور ایسی محنت صرف فرماتے تھے) کبھی کبھی ہم لوگوں کو کام پر لگانے کیلئے فرمایا کرتے تھے کہ اب زمانہ میں دھرے ہیں مشائخ ؟ کسکو ایسی غرض دل سوزی اور دماغ سوزی کی پڑی ہے کہ وہ ایک ایک مرید پر اتنا وقت صرف کرے ، اور آہ یہ بھی فرماتے تھے کہ تم لوگ میری ان تنبیہات کا بُرا مانتے ہو قدر نہیں کرتے افسوس مجھے کوئی اسطرح سے کہنے والا نہیں ملا تھا نہیں تو ہم کچھ ٹھیک ہی ہو جاتے اور تم لوگوں سے آج اسطرح حجامت نہ بنواتے ۔ حضرتؒ کی قلبی شفقت طالب سے دلی لگاؤ اور ہم جیسے نالائقوں پر غم کھانا ان الفاظ میں نمایاں ہے ۔ اللہ تعالیٰ حضرت اقدس کو انکی ان محنتوں پر اجر عظیم عطا فرماوے ۔ آمین

حضرت اقدس کے خصوصی معاملات بھی اپنے مسترشدین کے ساتھ آپ نے ملاحظہ فرمائے نیز طالبین کے امتحانات بھی دیکھے اور مخصوصین محبین کے ساتھ عنایات بھی دیکھیں اب اس موقع پر جی چاہتا ہے کہ حضرت والا کا ایک ہدایت نامہ جو اصلاح عامہ سے متعلق تھا اسکو بھی پیش نظر کردوں، ہے تو وہ حضرت والا کے زمانۂ قیام بمبئی کے آخر آخر کا تاہم کہیں پر کچھ دینی کام کر لینے کے بعد حضرت والا لوگوں کی جو جانچ فرماتے رہتے تھے اسکا کچھ خاکہ و نقشہ اسکی وجہ سے ضرور ناظرین کی آنکھوں میں پھر جائے گا۔ اور عالم تصور میں بہت سے محبین کی نظروں میں حضرت والا کا سراپا سامنے ہوگا۔

صورت حال یہ ہوئی تھی کہ شہر بمبئی چونکہ بڑا شہر ہے اور حضرت کا قیام کرلا میں تھا یہاں سے اصل بمبئی کا تقریباً دس میل کا فاصلہ تھا آنے والے لوگ بیان کرتے تھے کہ کبھی کبھی تو شرکت مجلس والا کے لئے چار چار گھنٹے نکالنے پڑتے ہیں اسطرح پر کہ گھنٹہ گھنٹہ بھر بس کے انتظار میں کھڑا رہنا پڑتا ہے پھر پینتیس چالیس منٹ کا راستہ اور پھر اسی طرح سے واپسی کا حال، اسلئے لوگوں نے اپنی سہولت کے لئے یہ خواہش ظاہر کی ہفتہ بھر میں دو دن خاص بمبئی میں کسی جگہ مجلس ہوجایا کرے تو ان لوگوں کو آسانی ہو، حضرت والا نے اسکو منظور فرمالیا اور تین چار ہفتے گئے اسکے بعد ایک مرتبہ راقم کے ذریعہ ایک پیغام کہلا بھیجا اور خود تشریف نہیں لے گئے اس پیغام کا خلاصہ یہ تھا کہ فرمایا کہ — میں بہت دنوں سے آپ کے شہر میں ہوں اور یہاں بھی کئی بار آچکا ہوں اسلئے آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ ہر ہفتہ آنا جانا کچھ سودمند بھی ہو رہا ہے یا صرف آنا ہی جانا ہو کر ختم ہوجاتا ہے لہٰذا معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو مجھ سے کیا نفع ہوا اگر اب تک بلا فائدہ ہی یہ آنا جانا رہا تو اب سے یہ زائد کام نہیں کرنا چاہتا، اسکے بارے میں آپ کے خیالات معلوم کرنا چاہتا ہوں — اسکے جواب میں لوگوں نے اطمینان دلایا اور نفع کا اظہار کیا اور اپنے اپنے تاثرات لکھے جسکی مفصل کیفیت تو "قیام بمبئی" کے عنوان میں انشاء اللہ تعالیٰ آئیگی اسوقت اسی معاملہ کا ایک حصہ پیش کرنا چاہتا ہوں، ربط کے لئے اتنی تمہید عرض کردی اب حضرت والا کا ارشاد ملاحظہ ہو:-

(عمومی ہدایت برائے اہل ممبئی)

فرمایا کہ میں نے گذشتہ ہفتہ جو پیغام بھیجا تھا اس سلسلہ میں وہاں لوگوں نے یہ بھی کہا تھا کہ فلاں فلاں (چند معزز حضرات کا نام لیا کہ یہ) لوگ میرے پاس آکر (پیغام کے جواب کے سلسلے میں) زبانی بھی کچھ فرمائیں اسکے متعلق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسکی کیا ضرورت تھی؟ حضرت مولانا جب کسی سے خفا ہوتے اور وہ خوشامد کرتا تو فرماتے تھے کہ کیا میں خوشامد کا منتظر تھا؟ اسکو بہت ناپسند فرماتے تھے۔ بزرگوں کے یہاں اور اصلاح کے معاملہ میں خوشامد کیسی؟ اور اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ خوشامد سے ان حضرات کو راضی کرلیگا تو یہ ان سے پوری بداعتقادی ہے کہ اپنے شیخ کو خوشامدی سمجھتا ہے اسلئے آپ سے کہتا ہوں کہ اسکی کیا ضرورت ہے اور دین کے معاملہ میں یہ سب کیا ہے میرا مقصد تو اس پیغام اور سوال سے یہ تھا کہ آپ سب لوگوں کو عمل کی ترغیب دوں اور کام کرنے پر آمادہ کروں اسلئے کہ عمل کا وجود تو عمل کرنے ہی سے ہوگا اور یہ ہر ہر شخص کا ذاتی فعل ہے۔ اسکے لئے قولی نمائندگی کافی نہیں ہے یعنی بالفرض اگر شہر کے چند معزز حضرات نے مجھ سے آکر کچھ کہہ بھی دیا تو اس سے کیا ہوا؟ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوگا کہ ان حضرات کو بے اعتنائی نہیں ہے بلکہ میری جانب اور میرے کام کی جانب اعتناء ہے، لیکن اور دوسرے لوگ بھی عمل پر لگ گئے ہیں یا لگنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو محض ان حضرات کا تشریف لانا اس کا تو ضامن نہیں ہوسکتا۔ اور میرا مقصد اس پیغام سے یہی تھا کہ عام لوگوں کے خیالات اور رجحانات کا اندازہ لگاؤں۔

باقی یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ بہت سے لوگوں نے میری باتوں کا اثر لیا ہے اور وہ لوگ میرے کام کی قدر کرتے ہیں، مجھ سے کچھ سیکھنا اور حاصل کرنا چاہتے ہیں انکی طلب کا اندازہ ان کے طرز عمل سے ہو رہا ہے اور ایسے لوگوں کو میں خوب جانتا ہوں۔ اور یہ سب اسلئے کرتا ہوں کہ جانتا ہوں کہ احکام شرعیہ پر لوگوں کو لگانا اور مسلمانوں کو دین پہونچانا اس زمانہ میں آسان نہیں ہے اس لئے پہلے ان میں طلب اور دین کا شوق پیدا کرنا ہوتا ہے، اور

یہ مشکل چیز ہے آپ کو کیا معلوم بزرگوں کو اس معاملہ میں کتنی مشقتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں اور کسقدر یہ حضرات فکرمند رہتے ہیں۔

ایک بزرگ نے آخر وقت میں کہا کہ اب اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا وقت ہے اب امت محمدیہ علی صاحبہا السلام والتحیۃ کی باگ ہم فلاں کے ہاتھ میں نہیں دیں گے تو دیکھئے کہ جو امانت انکو بزرگوں سے ملی تھی اسکی فکر تھی کہ نااہل کو کیسے حوالہ کردیں خدا تعالیٰ سوال فرمائیں گے تو کیا جواب دیں گے اور اہل کوئی نظر آتا نہیں پس کس طرح اس دین کی گاڑی کو آگے بڑھایا جائے۔ اب کام کے لوگوں کا پیدا کرنا کتنی مشکل چیز ہے؟ وعظ کہدینا آسان ہے، اور کسی کو پاکر اسکے بدن پر گرنا (یعنی کسی سے صرف بدنی اور ظاہری قرب حاصل کرنا) یہ بھی بہت زیادہ آسان ہے اس میں لگتا ہی کیا ہے ابھی چلو دکھلادیں کہ مصافحہ کے لئے کتنے لوگ گرے پڑتے ہیں اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مجھ کو بہت ہی مانتے ہیں لیکن اگر کوئی عملی اور کام کی بات کہدوں تو سب بھاگ نکلیں گے الا ماشاء اللہ میں کہتا ہوں کہ یہ کیا؟ ایک جانب تو اتنا اعتقاد اور ایک طرف ایسی بدعقیدگی! یہی آج زمانہ کا حال ہے۔

تو لوگوں کا یہ حال چونکہ جانتا ہوں اس لئے پوچھ لیا تھا کہ آپ لوگوں کا بھی یہ آنا جانا آخر کس مد میں ہے؟ اس میں علماء اور امراء ہی سے خطاب نہیں تھا بلکہ سب لوگ اسکے مخاطب تھے اہل اللہ ظاہر سے راضی نہیں ہوں گے ان کے یہاں خلوص، صدق اور طلب ان امور کو پیش کرو۔

اور کام کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آؤ۔ اپنے گھر میں دین پھیلاؤ۔ اپنے بچوں کو دین سکھلاؤ اس طرح سے کہ انکا نشو ونما دینی ماحول میں ہو، وہ لوگ اپنے کو مسلمان بنائیں اسی پر زندہ رہیں اور اسی پر مریں۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح امتی بنیں۔ یہ سب کام کرنے کے ہیں۔

اسی کو کہنا چاہتا تھا کہ دین کے جاننے کی ضرورت ہے۔ حلال وحرام کے جاننے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں جو پیشی ہونے والی ہے اسکے جاننے اور پیش نظر

رکھنے کی ضرورت ہے۔ جب دنیا میں پیدا ہو گئے ہو تو اب تو حسن عمل کا مطالبہ ہو گا ہی
اور برے اعمال پر مواخذہ بھی ہو گا۔

مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ لوگوں میں سے سب سے اچھا کون ہے؟ آپ نے
فرمایا کہ جسکی عمر زیادہ ہو اور عمل اچھے ہوں۔ پھر انھوں نے دریافت کیا کہ سب سے برا
کون شخص ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ جس کی عمر زیادہ ہو اور عمل برے ہوں۔

پہلے زمانہ میں جوان لوگ بوڑھوں کا بہت زیادہ ادب اور احترام کرتے تھے
اور ان کے ساتھ تواضع سے پیش آتے تھے اس خیال سے کہ انکی عمر زیادہ ہے تو عمل صالح
بھی ان کے زیادہ ہونگے۔ اسی طرح سے بوڑھے بھی جوانوں کے ساتھ تواضع کے ساتھ
پیش آتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ تم لوگ ہم سے اچھے ہو اسلئے کہ تمھاری عمر کم ہے تمھارے
گناہ بھی ہم سے کم ہیں۔

سبحان اللہ! عمل صالح پر ابھارنے والا اس سے بڑھکر اور کون سا مضمون ہو سکتا
ہے یہی سب باتیں آپ کو سنانا چاہتا ہوں اور سمجھانا چاہتا ہوں۔ اور میں کیا سمجھا سکتا ہوں
قلب میں کسی بات کو اتارنا یہ اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے ایک مولانا صاحب جو کہ اچھے آدمی
تھے صاحب دل بھی تھے ایک جگہ گئے مسجد کو دیکھا کہ بالکل ویران ہے لوگوں نے کہا کہ حضرت
یہاں فلاں شخص با اثر آدمی ہے اگر یہ نماز پڑھنے لگے تو سب لوگ پڑھنے لگیں گے۔
مولوی صاحب نے اس سے کہا اس نے جواب دیا کہ نماز تو پڑھ سکتا ہوں لیکن
وضو کرنا میرے لئے ایک مشکل امر ہے۔ مولانا نے فرمایا اچھی بات ہے آپ بلا وضو ہی
کے نماز پڑھ لیا کیجئے۔ چنانچہ مسجد گئے اور نماز کے لئے کھڑے ہوئے مولانا نے
اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ آپ کے دربار میں میں نے اس کو لا کھڑا کر دیا ہے
بس اتنا ہی میرے بس میں تھا اب اسکے قلب کو دین کی طرف پھیرنا یہ آپ کے اختیار
میں ہے آپ اسکے قلب کو پھیر دیجئے چنانچہ اسکے بعد سے وہ باوضو نماز پڑھنے لگا۔
بہرحال دین حق پہونچانے والے اللہ کے کچھ بندے ہر زمانہ میں رہیں گے۔

تھوڑے ہوں گے لوگوں میں اجنبی اور غیر معروف ہوں گے مگر ہوں گے ضرور اور ایسے لوگوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشخبری دی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا ہے کہ بدئ الاسلام غریبًا وسیعود غریبًا کما بدئ فطوبیٰ للغرباء من امتی قیل یارسول اللہ ومن الغرباء من امتك قال الذین یصلحون ما افسد الناس من بعدی من سنتی۔ یعنی اسلام کی ابتداء غربت میں ہوئی ہے یعنی وہ لوگوں کے نزدیک اجنبی اور غیر مانوس تھا پھر ابتداء ہی کی مانند آخر میں بھی غریب ہو جائے گا پس امت کے جو غرباء ہیں ان کے لئے خوشخبری ہے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ آپ کی امت کے غریب لوگ کون ہیں؟ فرمایا کہ وہ لوگ غریب ہیں جو میری ان سنتوں (طریقوں) کی اصلاح کردیں جنھیں لوگوں نے میرے بعد فاسد کر دیا ہے۔

یہ کہہ رہا ہوں کہ آئیے کچھ کام کیا جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان بشارات سے کچھ حصہ حاصل کیا جائے۔ مومن جتنی بھی ترقی کرتا ہے وہ اپنے عمل صالحہ کی بناء پر کرتا ہے، اصل چیز ایمان ہے پھر عمل صالح سے اس میں اور ترقی ہوتی رہتی ہے عملوا الصلحت کی ترقی کو آپ سمجھ بھی نہیں سکتے۔ ایک صاحب نے کل ہی کہا کہ کعبہ کے پاس بیٹھا رو رہا تھا کہ بس ایسا معلوم ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ جاؤ معاف کر دیا جو ترقی عمل کے ذریعہ ہوتی ہے وہ عمل ختم ہونے کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور ایمان کے ذریعہ سے جو ترقی ہوتی ہے تو مرنے کے بعد بھی چونکہ ایمان باقی رہتا ہے اسلئے وہ بھی باقی رہتی ہے۔

اسی بات کو سمجھانا چاہتا تھا، جو کچھ پیغام کہلا بھیجا تھا۔ آپ لوگوں نے سمجھا کہ ہم خوشامد چاہتے ہیں۔ خوشامد تو ہم آپ کی کرلیں، یہ سب کیا آئیے مل جل کر کچھ کام کیا جائے۔ دین کے کام کے لئے دنیا مانع تھوڑا ہی ہے اسکو معین بنانا چاہیئے۔ ابھی میں نے پہلے آپکو حدیث سنائی تھی کہ لا بأس بالغنیٰ لمن اتقی اللہ عزوجل والصحة لمن اتقی خیر من الغنی وطیب النفس من النعیم اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزوں کا ذکر فرمایا ہے ایک تو غنیٰ کا دوسرے صحۃ کا تیسرے طیب نفس کا

یعنی یہ فرمایا کہ متقی شخص کے لئے غنیٰ اور مالداری میں کچھ مضائقہ نہیں ہے اور متقی آدمی کو اگر صحت کی دولت مل جائے تو یہ اس سے بھی بڑھکر اور طیب نفس یعنی طبیعت کا خوش رہنا یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے اور حضرت سفیان ثوریؒ کا قول بھی سنایا تھا کہ مال کا ہونا پہلے زمانہ میں مکروہ سمجھا جاتا تھا بہر حال اس زمانہ میں تو وہ مومن کی ڈھال ہے۔ اور یہ فرمایا کہ اگر ہمارے پاس یہ دنانیر نہوتے تو امراء اور سلاطین توہمکو صافی بنا لیتے۔ اور یہ فرمایا کہ جس کے پاس کچھ مال ہو وہ اسکو تجارت وغیرہ کرکے بڑھائے اسلئے کہ ایسا زمانہ ہے کہ اگر آدمی حاجت مند ہوا تو سب سے پہلے اپنے دین ہی پر ہاتھ صاف کرے گا۔ اور یہ فرمایا کہ حلال آمدنی اسراف کی متحمل نہیں ہوا کرتی۔

آج دنیا جو ہمارے پاس نہیں ہے تو اسلئے کہ اخلاق ہمارے پاس نہیں ہے جب اخلاق آدمی میں ہوتا ہے تو دنیا بھی آتی ہے۔ اور دین ہو یا دنیا ان دونوں کی درستگی عقل پر موقوف ہے جسقدر عقل زیادہ ہوگی اسی قدر آدمی دین کو بھی سمجھے گا اور دنیا کو بھی سمجھے گا۔ دنیا کو بھی پہچانے گا اور آخرت کو بھی پہچانے گا، خدا کو بھی پہچانیگا رسول کو بھی پہچانے گا۔ اور دنیا کے زہر کو جو چیز مارنے والی ہے وہ فکر آخرت ہی ہے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ فکر الآخرۃ اذا استولی علی قلب المومن لا یترک شیئاً من الدنیا۔ یعنی فکر آخرت جب قلب مومن پر مسلط ہو جاتی ہے تو پھر دنیا کے لئے کوئی جگہ نہیں چھوڑتی۔

غرض یہی ایمان، عمل صالح اور فکر آخرت کو قلب میں پیدا کرنے کے لئے کچھ کہتا سنتا رہتا ہوں اور اسی کا جائزہ لیتا رہتا ہوں کہ کچھ فکر پیدا ہوئی یا نہیں؟ اور اس میں شک نہیں کہ یہ چیزیں ملتی ہیں اہل اللہ ہی سے، جب تک کسی اہل اللہ کو نہیں پاؤگے ایمان نہیں پاؤگے۔ اور اہل اللہ کا پانا بھی مشکل ہی سے ہوتا ہے۔

ایک دفعہ حضرتؒ بیٹھے ہوئے تھے ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ہملوگ اللہ تعالیٰ کو تو کیا پہچان سکتے ہیں آپ کا بھی پہچاننا آسان نہیں ہے حضرت ان کے اس کہنے سے بہت خوش ہوئے اور ہم لوگ بھی ان کے بہت ممنون

ہوئے کہ ایسی بات کہدی کہ حضرت کو خوش کر دیا۔ سبحان اللہ!

بس یہی کہنا ہے کہ ایمان درست کرو اور اس کے لئے کسی مومن کو تلاش کرو بدون مومن کامل کی صحبت کے ایمان کامل کبھی نہیں پاؤ گے۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے ان جواہر پاروں کو مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اگر صدق دل کے ساتھ اس مضمون کا بار بار مطالعہ کرے تو انشاء اللہ تعالیٰ، اللہ تعالیٰ سے اسکو تعلق ضرور پیدا ہو جائیگا۔ ابتداءً بظاہر تو عتاب نامہ تھا مگر انتہا کس قدر شفقت و محبت اور قلبی درد کا مظہر ثابت ہوا اہل بمبئی تو سمجھے کہ حضرت والا ان سے ناراض ہو گئے ہیں لگے خوشامد کرنے اور وہاں حالات کا جائزہ مقصود تھا اور اصل کا رپر لگانا منظور تھا۔ اور نہ صرف اپنے سے بلکہ دین سے، دیانت سے، رسولؐ سے اور خدا تعالیٰ سے قریب کرنا چاہتے تھے۔ حضرت خواجہ صاحبؒ کا کہا ہوا شعر یہاں پر بھی کسقدر چسپاں ہے فرماتے ہیں کہ ؎

عجب سرکار ہے ان کی ستم ہی میں کرم دیکھا
وہی مقبول ہوتا ہے جسے وہ دور کرتے ہیں

گذشتہ صفحات میں حضرت والاؒ کا طریقۂ اصلاح و تربیت اور نگرانی و امتحان مسترشدین وغیرہ سے متعلق گفتگو کیجا رہی تھی آخر میں بمبئی میں فرمائی ہوئی ایک ہدایت کا بھی ذکر آگیا حالانکہ زمانہ کے لحاظ سے وہ بالکل آخر آخر کی بات تھی اور ہم زماناً ابھی فتحپور ہی کے حالات بیان کر رہے تھے۔ بہر حال ناظرین نے ان مجموعی حالات سے حضرت کی تعلیم و تربیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور لگا لیا ہوگا۔ راقم کا مقصد بھی اس سیرت نگاری سے یہی ہے کہ حضرت مرشدی مصلح الامۃؒ کا سراپا حضرت کو نہ دیکھنے والوں کی نظروں میں پھر جائے پھر جنکی نظر میں اللہ تعالیٰ کی طلب کا یہ راستہ اور اسکا سلوک مستحسن معلوم ہو وہ اس سے مستفید ہو سکے۔ اور اپنے خیال سے بھی نیز حضرت کی تصویب و تائید کی رو سے بھی بات یہی سمجھ میں آتی ہے کہ مرید رشید کا حق ہے کہ اس نے جس شیریں گھاٹ سے سیرابی حاصل کی ہے اسکا پتہ دوسروں کو بھی بتا دے جنکی شکل یہی ہے کہ اپنے کردار و گفتار میں شیخ کا نمونہ بنے اور اپنی مجالس و محافل میں محاسن و فضائل شیخ کے ساتھ ساتھ افادات و تعلیمات مرشد کا بھی ذکر ضرور کیا کرے کہ اب شیخ کے بعد فیض شیخ کے باقی رکھنے کا یہی طریقہ ہے۔

راقم نے اپنی سہولت کیلئے حضرت اقدس کے حالات کو مختلف ادوار میں تقسیم کر دیا ہے، طفولیت و تعلیم اور قیام دیوبند و تھانہ بھون کے بعد بعض دیگر مقامات پر عارضی قیام کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اسکے بعد اپنے وطن فتحپور (تال نرجا اعظمگڈھ) میں مسند ارشاد پر آپ رونق افروز ہو کر اپنے مخصوص طریق کار پر جو کہ اپنے شیخ حکیم الامۃ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ کے طرز سے ماخوذ تھا آپ نے کام کرنا شروع فرما دیا۔ اسی دور کے حالات اصالۃً ذکر ہو رہے تھے اور اگر کہیں کسی دوسرے مقام کی کوئی بات آگئی ہو تو وہ ضمنی تھی۔

چنانچہ آپ کا یہی وہ دور زریں تھا جسمیں اکابر ہند کے دو عالم کی پہلی ملاقات حضرت اقدس سے ہوئی انہیں سے ایک عالم حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ اور دوسرے عالم حضرت مولانا ابوالحسن صاحب ندوی مدظلہ العالی تھے

ثانی الذکر عالم کے بہت سے حالات تو ابتدا ہی میں ناظرین کی نظر سے گذر چکے ہیں تاہم حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی مدظلہ العالی نے خود بھی اپنے قلم سے حضرت مصلح الامۃؒ کے ساتھ کے پیش آئے ہوئے اپنے واقعات اپنی ایک مشہور تالیف "پرانے چراغ" میں درج فرما دیئے ہیں، لیکن اول الذکر عالم کے حالات میرے علم میں نہ تھے اور نہ کوئی خط وکتابت ہی مجھے مل سکی اس لئے حالات میں یہ خانہ خالی تھا جس کے پُر کرتے کا مجھے برابر ہی خیال لگا رہا، چنانچہ حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ نے بھی اپنے مشہور رسالہ "الفرقان" مجریہ اگست ۱۹۶۷ء میں "تحدیث نعمت" کے عنوان میں حضرت مصلح الامۃ کا خاصا ذکر فرمایا ہے، جن میں بعض حالات اسی دور قیام وطن کے ہیں۔ اسلئے راقم نے مناسب جانا کہ اپنے ان دونوں بزرگوں کی تحریروں سے رسالہ وصیۃ العرفان کو بھی مزین کر دے تا کہ حضرت اقدس قدس سرہٗ کا تذکرہ جہاں تک ہو سکے یکجا ہو جائے۔ خدا معلوم کسے مطالعہ "تحدیث نعمت" کی توفیق ہوا ور کسے نہو، اور "پرانے چراغ" ہو سکتا ہے کہ کسی کو نہ مل سکے تو ایسے حضرات کے لئے انشاء اللہ یہ رسالہ ذریعہ عرفان ہو جائے گا۔

اب ہم پہلے حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ العالی کا تذکرہ "تحدیث نعمت سے نقل کرتے ہیں اسکے بعد "پرانے چراغ" سے حضرت مولانا ندوی مدظلہ العالی کا بیان پیش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے نفع بخشے۔ آمین۔

("تحدیث نعمت")

از (مولانا) محمد منظور نعمانی (مدظلہ)

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ علیہ الرحمۃ

حکیم الامۃ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے جلیل القدر خلیفہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ عقیدت و محبت اور اس عاجز و عاصی پر حضرت

ممدوح کی عنایت شفقت بھی اللہ تعالیٰ کی خاص قابل شکر اور لائق ذکر نعمتوں میں سے ہے۔ حضرت ممدوح کا اصل وطن ضلع اعظم گڈھ (یوپی) کے مشہور قصبہ کوپا گنج کے قریب ایک گاؤں "فتحپور تال نرجا" تھا ——— حضرت کا تذکرہ تو بارہا بہت پہلے سنا تھا لیکن زیارت کا اتفاق پہلی دفعہ اب سے تقریباً ۲۰، ۲۲ سال پہلے ۴۵ھ یا ۴۶ھ میں ہوا تھا۔ مہینہ غالباً جون کا تھا راقم السطور کا قیام اس زمانہ میں دہلی میں تھا اور تبلیغی جماعتوں کے ساتھ سفر کرنے کی سعادت اس دور میں اللہ تعالےٰ کی توفیق سے کچھ زیادہ نصیب ہوئی تھی (جس میں پہلے تو ضعف ہمت اور بعض مصروفیات کی وجہ سے کمی آئی اور اب سفر سے معذور ہو جانے کی وجہ سے بالکل ہی محرومی ہوگئی جسکو یہ عاجز اپنا بڑا خسارہ سمجھتا ہے بہرحال اسی دور میں) ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ مشرقی یوپی کے چند اضلاع اعظم گڈھ گورکھپور وغیرہ کے دورہ کا پروگرام بنا ——— اس جماعت میں ہمارے نہایت محترم بزرگ دوست صوفی سید عبدالرب صاحب (ایم۔اے) مرحوم بھی تھے اور ان کے خاص دوست اور رفیق مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری بی، اے بھی (جو ابھی پچھلے مہینے انتقال فرما کر انھیں کے ساتھ جا ملے) رحمہ اللہ تعالےٰ رحمۃً واسعۃً) اور ان کے ایک دوسرے خاص رفیق ماسٹر محمد ابراہیم صاحب الہ آبادی (ایم۔اے) بھی ساتھ تھے، یہ تینوں حضرات ہم مشرب و ہم مذاق تھے انگریزی تعلیم گاہوں اسکولوں یا کالجوں کے اساتذہ تھے تینوں کو حکیم الامۃ حضرت مرشد تھانوی سے بیعت کا شرف حاصل تھا اور تینوں کو تبلیغی جماعت کے ساتھ سفر کرنے کا یہ پہلا موقع تھا

ہماری یہ جماعت ضلع اعظم گڈھ کے مشہور قصبہ مئو پہونچی وہاں غالباً تین دن قیام کا پروگرام تھا یہ تینوں حضرات حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے اچھی طرح واقف بلکہ ان کے نیازمندوں میں تھے ——— میں صرف غائبانہ عقیدت رکھتا تھا ان تینوں حضرات نے کہا کہ مئو کے اس قیام ہی کے دوران میں ہم کسی وقت حضرت مولانا وصی اللہ صاحبؒ کی زیارت کے لئے فتحپور تال نرجا جانا چاہتے ہیں میں نے بھی ان حضرات کے ساتھ جانے کا ارادہ کر لیا۔ "جماعت" کے امیر ہمارے مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی تھے ان سے

اجازت لیکر فتحپور جانے کا پروگرام بنا لیا گیا۔ ہم چاروں میں سے کوئی بھی اس سے پہلے فتحپور نہیں گیا تھا ـــــ اتنا معلوم ہوگیا تھا کہ یہاں سے کوپا گنج کے لئے یکے جاتے ہیں وہاں سے فتحپور پیدل جانا ہوگا ہم لوگ شام کو بعد مغرب روانہ ہو سکے اور پروگرام یہ بنا یا کہ رات کو کوپا گنج کسی مسجد میں قیام کریں اور علی الصبح وہاں سے فتحپور کیلئے روانہ ہو جائیں۔ ہم لوگ رات کو کچھ دیر سے کوپا گنج پہونچ سکے کسی سے کھانے کی دوکان کے بارہ میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایسی کوئی دوکان یہاں نہیں ہے (یا یہ کہ اب بند ہو چکی ہے) جن صاحب سے ہم نے دوکان کے بارہ میں دریافت کیا تھا انکو ہم نے انکے دریافت کرنے پر یہ بتلا دیا تھا کہ ہم لوگ تبلیغی جماعت کے ساتھ مئو آئے تھے اسوقت فتحپور جانے کے لئے مئو سے آئے ہیں رات کو یہیں کسی مسجد میں قیام کریں گے اور صبح انشاء اللہ فتحپور حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کی زیارت کے لئے جائیں گے ـــــ

ـــــ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ اس وقت کھانا کسی دوکان سے نہیں مل سکے کا ہم لوگوں نے طے کیا کہ چنے یا دال موٹ یا مٹھائی جیسی کوئی بھی چیز مل جائے تو اسی سے کام چلا لیا جائے ا تنے میں کچھ صاحبان آئے اور انھوں نے کہا کہ آپلوگ کچھ نہ خریدیں ہم کھانا لاتے ہیں ہم لوگوں نے شکریہ اور دعا کے ساتھ مناسب انداز میں ان سے معذرت کر دی کیونکہ ہم اس سفر میں تبلیغی جماعت کے عام اصول کے مطابق کسی پر بار ڈالنا نہیں چاہتے تھے بہر حال اسوقت جو کچھ کسی دوکان سے مل گیا وہ لیکر مسجد میں آگئے، پہلے عشاء کی نماز ادا کی پھر کھانے کے ارادے سے بیٹھے ہی تھے کہ ایک حاجی صاحب ایک طشت میں ہم تینوں کیلئے پورا کھانا لیکر مسجد میں تشریف لائے اور کہا کہ میں حضرت مولانا کا خادم ہوں آپ حضرت کے مہمان ہیں اور یہ کھانا گویا حضرت ہی کی طرف سے ہے اسکو آپ قبول فرمالیں، ان کی بات سے یہ اندازہ کر کے کہ اللہ کے مخلص بندے اور حضرت کے تربیت یافتہ ہیں ان کے شکریہ اور اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ اسکا کھانا ہی سعادت سمجھا اور اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ سمجھکر کھایا کھانا بہت اعلیٰ قسم کا تھا جیسا کہ خاص مہمانوں کے لئے اہتمام سے تیار کیا جاتا ہے (یہ بات ظاہر تھی کہ فوری طور پر تیار نہیں کیا گیا تھا بلکہ پہلے سے تیار شدہ تھا یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان حاجی

صاحب نے کیوں تیار کرا کے رکھا تھا) پھر صبح کو انھوں نے ناشتہ بھی ایسا ہی کرایا اور اپنے ذاتی یکہ سے جو بہت اعلیٰ قسم کا تھا ہم لوگوں کو فتحپور تال نرجا پہونچایا۔ اللہ تعالیٰ انکو بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے، ۳۰، ۳۲ سال پہلے کی بات ہے افسوس ہے کہ انکا نام اب یاد نہیں رہا۔ (غالباً یہ صاحب حاجی سلیمان عطار مرحوم یا حاجی عبدالرب صاحب رہے ہونگے۔ جامی)

راقم السطور کے لئے حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری اور زیارت کا یہ پہلا موقع تھا، حضرت نے بڑی عنایت فرمائی، جتنی دیر مجلس میں حاضری رہی اصلاح نفس اور تزکیہ اخلاق ہی حضرت کی گفتگو کا موضوع رہا ـــــ اس وقت حضرت ممدوح میں ایک خاص اضطرابی اور سیمابی کیفیت محسوس ہوتی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ پورے وجود میں کوئی برقی رَو دوڑ رہی ہے۔ ہم لوگ صبح کو پہونچے تھے، اپنے پروگرام کے مطابق شام کو مئو واپس آگئے۔ حضرت کی خدمت میں اس پہلی حاضری اور زیارت کو راقم السطور نے اپنے حق میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص نعمت سمجھا۔

اسکے تین چار سال بعد ۱۹۴۷ء میں فتحپور تال نرجا ہی میں حضرت کی خدمت میں دوسری دفعہ حاضری کی سعادت حاصل ہوئی یہ وہ زمانہ تھا کہ کچھ ہی پہلے فرقہ وارانہ فسادات کی ایک طوفانی لہر بنگال سے اٹھ چکی تھی اور بہت سے مسلمانوں کے سامنے (۱۹۴۷ء کے بعد پھر یہ سوال اٹھ کھڑا ہوگیا تھا کہ وہ ہندوستان میں رہ سکیں گے یا نہیں ـــــ یہ عاجز انھیں دنوں میں کسی ضرورت سے مئو گیا تھا وہیں ایک خواب دیکھا جس نے ذہن میں یہ سوال پیدا کردیا کہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب ہندوستان ہی میں مقیم رہیں گے یا پاکستان تشریف لیجائیں گے؟ میں نے ضروری سمجھا کہ فتحپور حاضر ہوکر حضرت کی زیارت بھی کروں اور اگر موقع ملے تو اس بارہ میں دریافت کروں، چنانچہ حاضری کا پروگرام بنالیا (جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے مئو سے کوپا گنج تک یکے چلتے تھے آگے فتحپور کے لئے کئی میل پیدل چلنا ہوتا تھا) ایک دن میں ایک یکہ سے روانہ ہوگیا اس یکہ پر چار پانچ آدمی اور بھی سوار تھے جو سب کوپا جانے والے تھے ـــــ راستہ میں میں نے یکہ والے سے کہا کہ مجھے فتحپور تال نرجا جانا ہے اور آج ہی واپس لوٹنا ہے اگر تم مجھے فتحپور تک پہنچا سکو تو

پہنچادو کرایہ جو تم کہوگے میں خوشی سے دونگا اور تمھارا احسان بھی مانوں گا — یکہ والے نے راستہ کی خرابی کا عذر کیا بالآخر وہ اس پر آمادہ ہو گیا کہ جہاں تک راستہ زیادہ خراب نہیں ہے وہ مجھے وہاں تک یکہ سے پہونچادے گا —— اسی یکہ پر ایک تعلیم یافتہ ہندو نوجوان بھی تھا اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ فتحپور کس کے پاس جائیں گے؟ میں نے کہا وہاں ہمارے ایک بزرگ ہیں میں ان سے بس ملنے جارہا ہوں —— اس نے کہا اچھا وہ جو فتحپور کے شاہ صاحب ہیں آپ ان کے درشن کرنے جارہے ہیں، میں نے کہا ہاں میں انھیں کے درشن کرنے جارہا ہوں —— میں نے اس نوجوان سے پوچھا آپ انکو جانتے ہیں؟ اس نے کہا میں نے بس انکا نام سنا ہے، مجھے بھی ان کے درشن کرنے کا بہت شوق ہے —— میں نے کہا کہ آپ کو ان کے درشن کرنے کا کیوں شوق ہے؟ اس نے کہا میں کانپور کا رہنے والا ہوں میرے ہاں رنگ کا بیوپار ہوتا ہے میں اسکے سلسلہ میں ملک بھر میں گھومتا ہوں، ہزاروں ہندوؤں مسلمانوں سے میرا واسطہ پڑتا ہے یہاں کوپا میں بھی ہمارے ایک بیوپاری حاجی صاحب ہیں وہ بڑے ایمان دار سچے اور دھرمی آدمی ہیں، کہتا ہیں ایسا آدمی میں نے کہیں نہیں دیکھا نہ ہندوؤں میں نہ مسلمانوں میں۔ میں نے ان سے ایک دفعہ پوچھا تھا کہ تم میں ایسی سچائی اور ایمانداری کہاں سے آگئی تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ مجھ میں تو کچھ بھی اچھائی نہیں ہے میں تو بہت گندہ آدمی ہوں، ہاں یہاں سے قریب ہی فتحپور تال نرجا ایک گاؤں ہے اس میں ایک بزرگ ہمارے مولانا صاحب ہیں میں ان کے پاس آتا جاتا ہوں اگر تمھیں میرے اندر کچھ اچھائی نظر پڑتی ہے تو وہ انکا اثر ہوگا اور بھی کئی آدمیوں سے میں نے ان مولانا صاحب، شاہ صاحب کا ذکر سنا ہے اسلئے مجھے بھی انکے درشن کرنے کا شوق ہے۔ اس نوجوان نے اپنی یہ بات ختم کرتے ہوئے بڑے جوش سے کہا کہ میرا تو ایمان دھرم ہے کہ میرے ملک کا بگاڑ جب ہی ٹھیک ہوگا جب ملنگ (یعنی درویش لوگ) ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں گے۔

کوپا گنج پہونچکر یہ نوجوان اور دوسرے لوگ جو یکہ پر سوار تھے سب اتر گئے

مجھے اس یکہ والے نے میل دو میل آگے وہاں تک پہونچا دیا جہاں تک راستہ یکہ کیلئے زیادہ خراب نہیں تھا اسکے آگے میں پیدل چل کر فتحپور پہونچ گیا۔

میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ میری حاضری سے کچھ ہی پہلے سخت خونریز فسادات کا ایک سلسلہ بنگال سے شروع ہو چکا تھا جس نے مسلمانوں کے سامنے ۴۷ء کے فسادات کے بعد پھر یہ سوال کھڑا کر دیا تھا کہ وہ ہندوستان میں رہ سکیں گے یا انھیں یہاں سے جانا ہی پڑیگا اور ایک خواب کی بنا پر خود حضرت مولانا کے متعلق میرے ذہن میں یہی سوال پیدا ہو گیا تھا، میں ایسے وقت پہونچا کہ حضرت قیلولہ فرما رہے تھے —— جب حضرت ظہر کی نماز کے لئے باہر تشریف لائے تو ملاقات ہوئی —— اسی وقت فرمایا مجھے تم سے تنہائی میں کچھ بات کرنی ہے —— ظہر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت نے وہ گفتگو فرمائی اسوقت کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تھا حضرت نے مجھے ملکی حالات اور حکومتی معاملات کے بارہ میں باخبر اور صاحب رائے سمجھتے ہوئے دریافت فرمایا کہ تمھارا کیا اندازہ ہے جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کا اقتدار ہے کیا وہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ان فسادات اور لوٹ مار سے تنگ آکر مسلمان یہاں سے چلے جائیں یا یہ جو کچھ ہو رہا ہے انکی منشار کے خلاف ہو رہا ہے اور وہ قابو نہیں پا سک رہے ہیں —— میں نے اس بارے میں تفصیل سے اپنا خیال عرض کیا جسکا حاصل یہ تھا کہ حکومت کے جو اصل ذمہ دار ہیں یعنی پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے خاص رفقائے کار وہ تو نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کے ساتھ اس طرح کی زیادتیاں ہوں لیکن پچھلے سالوں میں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان جس طرح کی کشمکش رہی اس نے اور پھر تقسیم کے فیصلہ اور پاکستان کے قیام نے عام ہندو ذہن کو بہت زیادہ مشتعل کر دیا ہے ان کا خیال ہے کہ بٹوارہ کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی حق نہیں رہا۔ خود کانگرس والوں میں بھی اس مسلم دشمنی کے رجحان کا اچھا خاصا غلبہ ہو گیا ہے اسلئے ان فسادات کو روکنے کے لئے جس قسم کی سختی کی ضرورت ہے حکومت کے ذمہ دار اسکی جرأت نہیں کرتے۔

پھر میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ خود حضرت کا ارادہ ان حالات میں ہندوستان میں قیام کا ہے یا یہاں سے تشریف لیجانے کا؟ حضرت نے فرمایا کہ اگرچہ مشرقی پاکستان کے

بعض احباب بہت دنوں سے اصرار کر رہے ہیں کہ میں وہاں منتقل ہو جاؤں لیکن میرا ارادہ یہیں رہنے کا ہے اور میں نے یہی فیصلہ کر لیا ہے۔

تنہائی کی یہ گفتگو غالباً آدھ گھنٹے سے بھی کم میں ختم ہوگئی اور اس کے بعد حضرت کی عام مجلس شروع ہوگئی جس کا انداز حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی ظہر بعد کی مجلس ارشاد سے بہت ملتا جلتا تھا۔ مجلس میں بعض طالبین اصلاح کے خطوط پڑھے گئے جن میں انھوں نے اپنے احوال لکھے تھے اور ہدایت و رہنمائی چاہی تھی اور حضرت کی طرف سے ان کے جو جوابات دیئے گئے تھے وہ بھی پڑھے گئے ——— اس دوسری حاضری سے قلب میں حضرت کی عظمت میں اور اضافہ ہوا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں یہ حاضری ۱۹۴۹ء میں ہوئی تھی اسکے کافی عرصہ بعد تک حضرت کا قیام اپنے اصلی اور آبائی وطن فتحپور ہی میں رہا جہاں پہونچنا طالبین کے لئے آسان نہ تھا اسو جہ سے چند قریبی اضلاع کے سوا دوسرے علاقوں کے اہل طلب خال خال ہی پہونچتے تھے پھر تقدیر الٰہی سے کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ اپنے بعض اہل وطن کی کچھ بے عنوانیوں سے آزردہ ہو کر آپ گورکھپور تشریف لے آئے جو مشرقی یوپی کا بڑا اور مرکزی شہر ہے اور اسکو مستقر بنا لیا کئی سال وہاں قیام رہا اس زمانہ میں گورکھپور ایک دینی اور روحانی مرکز بن گیا اور طلب و استفادہ کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا۔ راقم السطور گورکھپور کے اس زمانۂ قیام میں بھی ایک عقیدت مند زائر کی حیثیت سے طلب دعا اور استفادہ ہی کی نیت سے چند بار حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا پھر کچھ مدت کے بعد آپ نے وہاں سے الٰہ آباد منتقل ہونے کا فیصلہ فرمالیا۔ یہاں پہونچکر حضرت کی مقبولیت کا اسی پیمانہ پر ظہور ہوا جو کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کیطرف سے اپنے بعض خواص اولیاء کے لئے ہوتا ہے۔

یہ عاجز اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہاں بھی حاضر خدمت ہوتا رہا اور اپنی نااہلی کے باوجود حضرت کی عنایت و شفقت میں برابر اضافہ محسوس کرتا رہا۔

الہ آباد وہی کے زمانۂ قیام میں حضرت کی آمد و رفت بمبئی شروع ہوئی جسکا ظاہری سبب تو یہ تھا کہ حضرت کو بعض ایسے امراض لاحق ہو گئے جن کی وجہ سے زیادہ گرمی بھی سخت مضر اور زیادہ سردی بھی سخت خطرناک اور چونکہ بمبئی میں نہ زیادہ سردی ہوتی ہے نہ زیادہ گرمی اسلئے حضرت کے معالج اطبا نے مشورہ دیا کہ سخت سردی اور گرمی کے موسم میں حضرت کا قیام بمبئی رہا کرے چنانچہ کئی کئی مہینے حضرت کا قیام بمبئی میں رہنے لگا ——— پھر اللہ تعالیٰ نے بمبئی میں حضرت کے اس قیام کو وہاں کے لوگوں کے لئے رحمت اور رشد و ہدایت کا ایسا وسیلہ بنا دیا کہ جس کے ظہور کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بمبئی میں نور ہدایت پھیلنے کے لئے ایک غیبی انتظام تھا ——— شاید ہی اللہ کے کسی بندے سے اہل بمبئی کو اتنے وسیع پیمانے پر اس طرح کا دینی فائدہ کبھی پہونچا ہو ——— اللہ تعالیٰ نے وہاں کے تاجروں اور دوسرے اونچے طبقوں میں حضرت کے سیکڑوں عشاق پیدا کر دیئے جو دنیا دار تھے وہ اللہ والے بن گئے اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ اِنَّہٗ ھُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ
پھر زندگی کے آخری سال سنہ ۶۶ء میں تو آپ کا قیام الہ آباد میں کم اور بمبئی ہی میں زیادہ رہا اس عاجز کو اس آخری ۶۶ء اور آخری سال میں دو دفعہ بمبئی میں حضرت کی خدمت میں کسی قدر طویل قیام بھی نصیب ہوا۔ پہلی بار فروری میں حضرت کی خدمت میں قیام ہی کی نیت سے بمبئی کا مستقل سفر کیا اور دو ہفتے تک حضرتؒ ہی کا مہمان رہ کر بے انتہا عنایتوں اور شفقتوں سے متمتع ہوتا رہا، پھر اسکے قریباً ۶ مہینے کے بعد مارشس اور حجاز مقدس جانے کے لئے میں ستمبر میں بمبئی پہونچا، اندازہ یہ تھا کہ ہوائی سفر کے قانونی مراحل ایک دو دن میں طے ہو جائینگے اور میں انشاء اللہ اپنے پروگرام کے مطابق روانہ ہو جاؤنگا لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ کچھ قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے مجھے ایک ہفتہ سے بھی زیادہ بمبئی میں قیام کرنا پڑ گیا ان دنوں میں بھی میں زیادہ تر حضرت ہی کی خدمت میں اور آپ کا مہمان رہا ——— بعد میں معلوم ہوا کہ قانونی رکاوٹوں کیوجہ سے میرا بمبئی میں جبری قیام میرے حق میں اللہ تعالیٰ کیطرف سے بڑی رحمت اور بڑی خیر و برکت کا اور اس سفر کے لئے حضرت کی صحبت و ہدایات سے بہترین زاد راہ حاصل کر لینے کا ایک وسیلہ تھا۔

اپنے اس سفر سے پہلے ہی یہ بات معلوم تھی کہ حضرت مولانا کا ارادہ اس سال اپنے خاص رفقاء اور اعزہ کے ساتھ سفر حج کا ہے اور یہ بھی کہ غالباً رمضان مبارک سے پہلے ہی تشریف لیجائیں گے یہ عاجز اپنے پروگرام کے مطابق پہلے مارشیش اور ری یونین گیا اور وہیں سے "رابطہ عالم اسلامی" کے اجلاس کی شرکت کے لئے مکہ معظمہ چلا گیا' اجلاس سے فراغت کے بعد مدینہ طیبہ حاضری ہوئی حجاز مقدس میں مجموعی طور پر قریباً ایک مہینہ قیام کے بعد ۲۰ر نومبر کی صبح بمبئی واپسی ہوئی رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں بھی واپسی سفر میں ساتھ تھے، ہم دونوں اسی دن ۱۰ بجے حضرت کی خدمت میں زیارت اور دعا کی درخواست کے لئے حاضر ہوئے ——— آپ دو ہی دن کے بعد ۲۲ر نومبر کو سفر حج کے لئے مظفری جہاز سے روانہ ہونے والے تھے لیکن ہم دونوں کو ایک اہم ضرورت سے جلد سے جلد لکھنؤ پہنچنا ضروری تھا اسی لئے اگلے دن ۲۱ر نومبر کی صبح بمبئی سے دہلی جانے والے طیارہ میں غالباً جدہ ہی سے ریزرویشن کرالیا گیا تھا اس مجبوری سے ہمارے لئے دو دن بھی قیام کی گنجائش نہیں تھی، اس لئے اسی ملاقات میں ہم دونوں حضرت ؒ سے رخصتی مصافحہ اور دعا کی درخواست کر کے واپس آ گئے ——— یہ عاجز حج سے متعلق اپنی دو کتابوں "آپ حج کیسے کریں؟" اور "آسان حج" کے چند نسخے حضرت کے قافلے کے لئے حضرت ؒ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے رات کو پھر حاضر خدمت ہوا، حضرت نے بڑی محبت کے ساتھ کتابیں قبول فرمائیں اس حاضری میں میں نے یہ بھی عرض کیا کہ اسکا امکان ہے کہ مجھے بھی اس سال حج میں شرکت کی سعادت نصیب ہو جائے اسکے لئے حضرت دعا بھی فرما دیں حضرت نے فرمایا میں دعا کرونگا کوشش کیجئے ضرور آئیے ——— وہم و وسوسہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ حضرت کی آخری زیارت اور آخری ملاقات ہے۔

یہ عاجز اور رفیق محترم مولانا علی میاں اپنے پروگرام کے مطابق ۲۱ر نومبر کی صبح بمبئی سے روانہ ہو کر دہلی آ گئے اور اگلے دن ۲۲ر کی صبح اپنے مستقر لکھنؤ پہونچ گئے ——— اسی دن حضرت اپنے قافلہ کے ساتھ مظفری سے حجاز مقدس کے لئے روانہ ہو گئے۔ تین ہی دن ہوئے تھے ۲۵ر نومبر کی شام کو بمبئی سے سیٹھ عبدالستار صاحب کا دیا ہوا تار ندوۃ العلماء میں موصول ہوا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ آج صبح مظفری جہاز میں حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کا

عنہ معلوم نہیں یہ غلط فہمی کہاں سے ہوئی حضرت والاؒ کا وصال ۱۱ بجے شب کو ہوا تھا۔ جامی ۱۲

وصال ہوگیا (اناللہ وانا الیہ راجعون) دو دن کے بعد، ۲ رکو ہمارے ایک دوسرے مخلص حاجی محمد یعقوب کا ۲۵ نومبر ہی کو لکھا ہوا خط ملا جس میں یہ تفصیل تھی کہ ــــــ حضرتؒ کے رفقار کا مظفری جہاز سے بذریعہ وائرلیس دیا ہوا تار آج دن کے گیارہ بجے بمبئی پہنچا جس بتایا گیا ہے کہ آج صبح ۶ بجکر ۵۰ منٹ پر حضرت کا وصال ہوگیا اور جہاز کے کپتان کا کہنا ہے کہ جہاز کے قانون و دستور کے مطابق نماز جنازہ پڑھکر میت کو سمندر کے سپرد کر دیا جائے اور ہم لوگ چاہتے ہیں کہ میت کو جدہ لیجائیں آپ لوگ مغل کمپنی سے کیپٹن کو تار دلوایئے کہ وہ جدہ تک لیجانے کی اجازت دے اور انتظام کرے ــــــ چنانچہ کوشش کی گئی اور مغل کمپنی نے جہاز کے کپتان کو تار کے ذریعہ اسکی ہدایت دے دی اور ایک تار سعودی عربیہ میں حکومت ہند کے سفیر جناب کامل قدوائی کو بھی دے دیا گیا تاکہ وہ سعودی حکومت سے حضرت کی میت کو جدہ میں اتارنے اور مکہ معظمہ میں تدفین کی اجازت حاصل کرلیں ــ ــــــ کامل قدوائی صاحب اور حجاز مقدس کے مقیم حضرت علیہ الرحمہ کے خدام مولوی امجد اللہ صاحب گورکھپوری وغیرہ نے انتہائی جد و جہد کر کے سعودی حکومت سے یہ اجازت حاصل بھی کرلی لیکن اللہ کی مشیّت کہ اس اجازت کی اطلاع مظفری کے کپتان کو نہ پہنچ سکی اسلئے جدہ کے ساحل کے قریب پہنچ کر اس نے حضرتؒ کے رفقار سے کہا کہ اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ آپ لوگ نماز جنازہ پڑھ کے میت کو سمندر کے سپرد کردیں چنانچہ ایسا ہی کرنا پڑا ــــــ اور اب معلوم ہوا کہ تقدیر الٰہی میں یہی طے ہو چکا تھا کہ بیت اللہ کے راستہ میں جہاز میں حضرت کا انتقال ہو اور حجاز پاک ساحل آپ کا مدفن بنے یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ ۔

کچھ صفات و امتیازات

حضرتؒ کے احوال حیات اور صفات و امتیازات سے متعلق کچھ لکھنے کا حق دراصل انھیں حضرات کو ہے جنھیں حضرت کی خدمت میں طویل قیام اور استفادہ کی سعادت حاصل ہوئی اس عاجز کی واقفیت کا طول و عرض تو بس وہی ہے جو اوپر کی سطروں میں لکھا گیا تاہم

ع۵ یہ وقت عام اطلاع کا رہا ہوگا، وصال کا نہیں تھا۔ جامی ۱۲

جی چاہتا ہے کہ اس موقعہ پر چند سطروں میں اپنے بعض احساسات و تاثرات بھی عرض کروں

جلال و جمال

حضرت کی خدمت میں حاضری اور زیارت سے پہلے آپ کے بارہ میں جو کچھ سنا تھا اس سے یہ سمجھا تھا کہ بڑے صاحب "جلال بزرگ" ہیں پھر جب پہلی دفعہ (۴۵ھ یا ۴۶ء میں) حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی ـــــ جسکا ذکر اوپر آچکا ہے ـــــ تو "جلال" کی وہ کیفیت تو نہیں تھی لیکن اسکا کچھ رنگ ضرور محسوس کیا تھا (اگرچہ میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا اور نہیں ہوں جنکا احساس ان امور میں کچھ زیادہ قابل اعتبار ہو) لیکن گورکھپور اور الہ آباد کے زمانۂ قیام میں جب حاضری ہوئی تو عنایت و شفقت اور رحمت و رافت ہی کا رنگ غالب پایا اور گذشتہ دو تین سالوں میں تو جب حاضری ہوئی تو محسوس کیا کہ رگ و ریشہ پیار و محبت سے بھرپور ہے۔

قرآن مجید میں "بالمؤمنین روف رحیم" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت بیان فرمائی گئی ہے اسلئے اہل اللہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی خلفاء اور نائبین ہوتے ہیں الوان کے اختلاف کے باوجود سب ہی اس صفت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس گنہگار کو اللہ تعالےٰ نے اپنے جن خاص بندوں کو دیکھنا نصیب فرمایا ان سب کو اس صفت سے بھرپور دیکھا لیکن حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر خاص کر حیات کے اس آخری دور میں اس صفت کا انتہائی غلبہ تھا جو بھی حضرت سے قریب ہوتا محسوس کرتا کہ رگ و ریشہ میں شفقت و عنایت بھری ہوئی ہے ـــــ جو طالب بنکر آنا چاہتے کہ اسکے اعمال و اخلاق کی پوری پوری اصلاح ہو جائے اور اسکو تعلق مع اللہ کی دولت نصیب ہو جائے اسی کے ساتھ بہت سوں کی دنیوی ضروریات کی بھی فکر فرماتے اور انکی تکلیفوں اور پریشانیوں سے سخت بے چین ہوتے۔

غیر معمولی تاثیر

اس کے اظہار میں ہرگز کوئی بے ادبی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت کو ظاہری وجاہت

والی شکل وصورت بالکل نہیں عطا فرمائی تھی، اسی طرح آپ صاحب زبان وبیان مقرر بھی نہیں تھے، آج کل کی اصطلاح کے مطابق صاحب قلم بھی نہیں تھے، اگرچہ مدت سے معمول تھا کہ روزانہ صبح ایک عام مجلس میں کچھ اصلاحی بیان فرماتے تھے، جسکا طریقہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ اگلے اکابر علما محققین ومصلحین میں سے کسی کی کوئی کتاب ہاتھ میں لیکر اسکی کوئی عبارت پڑھتے اور اس پر کچھ فرماتے۔ کبھی ماثورہ دعاؤں میں سے کوئی دعا پڑھتے اور اسکے مضمون کی وضاحت فرماتے لیکن اس بیان کی زبان اور اسکا انداز اکثر وبیشتر اس قدر علمی ہوتا تھا اور اس میں درسی اور فنی اصطلاحات کا اسقدر استعمال ہوتا تھا کہ خاص مناسبت رکھنے والے اہل علم ہی سمجھ سکتے تھے، پھر آواز کبھی کبھی اتنی دھیمی ہوتی تھی کہ مائیکروفون سامنے ہونے کے باوجود بہت سے حاضرین مجلس نہیں جانتے تھے کہ کیا فرمایا لیکن تواتر کے طور پر لوگوں سے سنا اور خود بھی محسوس کیا کہ تاثر سے شاید کوئی بھی طالب خالی اور محروم نہیں رہتا تھا اور اثر بھی ایسا جو اکثر وبیشتر کایا پلٹ کر دیتا تھا۔

وفات سے قریباً دو ہی مہینے پہلے آخر ستمبر میں جب ایک ہفتہ کے قریب حضرت کی خدمت میں رہنا نصیب ہوا تو ایک دن مجلس میں حضرت اپنی جگہ پر تشریف تو لے آئے لیکن دیر تک خاموش بیٹھے رہے مجھے وہ حدیث یاد آتی رہی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال بیان کیا گیا ہے کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل الصمت متواصل الاحزان یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ایک حال تھا کہ آپ بہت دیر تک خاموش رہتے اور محسوس ہوتا کہ مسلسل فکر وغم کی حالت میں ہیں۔ پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین مجلس کیطرف مخاطب ہوکے فرمایا کہ آپ لوگ یہ ضروری نہ سمجھیں کہ میں ضرور کچھ بیان کروں گا یہاں وہی لوگ آیا کریں جو بغیر کچھ سنے بیٹھنے میں بھی اپنا فائدہ سمجھیں۔

بہرحال حضرت کی مجلس اس حقیقت کی روشن دلیل تھی کہ دینی فائدہ کا زیادہ تعلق زبان وبیان سے نہیں بلکہ قلب سے ہے[1]۔ حضرت کی مجلس کے حاضر باشوں میں جو عظیم انقلاب آیا

[1] امام عبدالوہاب شعرانی کا مشہور مقولہ ہے من لم ینفعه سکوتنا لم ینفعه کلامنا یعنی جس کو ہماری خاموشی سے فائدہ نہیں ہوگا اسکو ہماری باتوں سے بھی فائدہ نہیں ہوگا۔ ۱۲

ہر آنکھوں والا صرف ایک شہر بمبئی میں ہی دیکھ سکتا تھا۔

علمی رسوخ اور وسعت مطالعہ

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عام شہرت اگرچہ ایک شیخ طریقت اور صاحب ارشاد مصلح و مربی کی حیثیت سے ہے لیکن علم میں بھی اتنا رسوخ اور استحضار تھا اور مطالعہ اتنا وسیع اور عمیق تھا کہ اس دور کے اصحاب درس و مصنفین میں بھی اسکی مثالیں کم ہی ملیں گی۔

ایک نیا انداز اور جذب و سلوک کا امتزاج

مشائخ طریقت میں اکثر و بیشتر وہ ہوتے ہیں جن کا ارشاد و اصلاح کا سارا کام بالکل اپنے شیخ کے منوال و منہاج پر ہوتا ہے لیکن بعض ایسے شہباز بھی ہوتے ہیں جو شیخ کی کامل محبت اور متابعت کے باوجود ایک مستقل انداز اور طریقہ کے بانی دیکھے جاتے ہیں اسکی مثال میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے خلفا میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ کا اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے خلفاء میں حضرت گنگوہیؒ اور حضرت تھانویؒ کا نام لیا جا سکتا ہے اگر چھوٹے منھ سے کسی بڑی بات کے کہنے کا کوئی جواز ہو تو یہ عاجز حکیم الامۃؒ حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا نام بھی اسکی مثال میں لے سکتا ہے۔ حضرت ممدوح میں جذب و سلوک کا ایسا واضح امتزاج تھا جس نے ایک نرالے قسم کا بانکپن پیدا کر دیا تھا ؎

در دست نہ تیر ہست نہ در دست کماں است ۔۔۔ ایں سادگی اوست کہ بسمل دو جہاں است
در مدرسہ از جنبش لعل تو حکایت ۔۔۔ در میکدہ از مستی چشم تو نشاں است

(ترجمہ: سبحان اللہ اس ممدوح کا بھی کیا کہنا کہ اسکے ہاتھ میں نہ تیر ہے نہ کمان ہے مگر اسکی اس سادگی کے ساتھ یہ حال ہے کہ دونوں جہان اسکا بسمل ہو رہا ہے۔ اور اے میرے ممدوح تیری جنبش لب سے مدرسہ میں رونق اور ہلچل ہے اور تیری آنکھ کی مستی کی وجہ سے میخانہ آباد ہے ــــــ اسکے ذریعہ مولانا نعمانی نے حضرت کے علم ظاہر اور علم باطن کی تعریف فرمانا چاہا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی اسکا کچھ حصہ عطا فرمائے۔ ۱۲ جامی)

حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ کا بیان "تحدیث نعمت" کا ختم ہوا اب آگے حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ کے تاثرات "پرانے چراغ" سے نقل کئے جاتے ہیں۔

"مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوریؒ"

فروری ۱۹۵۴ء کی کوئی تاریخ تھی کہ میرا ضلع اعظم گڑھ میں جہاں ایک تبلیغی دورہ میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ پہنچا ہوا تھا، میں نے مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوری کی زیارت کے لئے مولانا کے وطن و مستقر فتحپور تال نرجا حاضر ہونے کا ارادہ کرلیا، خوش قسمتی سے مولوی حکیم حبیب اللہ صاحب نے جن پر مولانا کی اس زمانہ میں خصوصی نظر عنایت تھی میری رفاقت منظور فرمائی، اسوقت تک مولانا کی صرف زیارت ہی زیارت ہوئی تھی، شاید پہلی بار اپنے محلہ کی مسجد میں اور ایک دو بار مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی لکھنؤ کی مجالس میں مولانا کو دیکھا تھا مگر وہ دیکھنا نہ دیکھنا برابر تھا نہ گفتگو کی نوبت آئی نہ پاس بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

مولانا ہمارے بزرگوں سے اچھی طرح واقف تھے، اعظم گڑھ کے تمام قصبات و دیہات جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ پھر ان کے معنوی جانشین مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی اور آخر میں مولانا سید امین نصیر آبادیؒ کی دعوت و اصلاح کی کوششوں سے واقف اور ان کے معتقد و حلقہ بگوش ہیں بالعموم حضرت سید احمد صاحب کو بڑے سید صاحب کے نام سے اور مولانا سید محمد امین صاحب کو چھوٹے سید صاحب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مولانا وصی اللہ صاحب کو بھی ہمیشہ اسی طرح ذکر کرتے سنا۔ مولانا کے ایک عزیز قریب نے والد مرحوم سے طب پڑھی تھی اور ان کے مطب میں بیٹھتے تھے، وہ مزید واقفیت و تعلق کا ذریعہ بنے ہونگے، بھائی صاحب مرحوم سے بھی مولانا کو اچھا خاصا تعلق اور موانست تھی اور غالباً انھیں سے ملنے کے لئے ایک بار ہماری مسجد میں تشریف لائے تھے بحیثیت طبیب کے بھی انکی طرف رجوع فرمایا ہوگا، وہ میری نوعمری اور طالب علمی کا زمانہ تھا نہ میں مولانا کے مقام و مرتبہ سے واقف تھا اور نہ انکو میری طرف خصوصی توجہ کرنے کا اسوقت

کوئی سبب تھا، اسلئے اصل زیارت و ملاقات کہنا چاہیئے کہ اسی سفر میں ہوئی۔

نکلتے جاڑے تھے ہم لوگ ایک یکہ پر مئوسے کوپا گنج گئے اور وہاں سے فتحپور کا رخ کیا۔ میرے ساتھ میرے ایک رفیق سفر مولوی اشرف علی صاحب لکھنوی تھے، دوپہر کا کھانا ہو چکا تھا اور لوگ قیلولہ کے لئے لیٹ چکے تھے ہم لوگ فتحپور پہنچے، مولانا کو اسی وقت خبر ہوگئی میرے نام سے غائبانہ طریقہ پر واقف تھے اسی وقت بالاخانہ سے نیچے تشریف لے آئے اور نہایت شفقت کے ساتھ مجھے اوپر لے گئے۔ دیر تک از راہ شفقت میرا ہاتھ پکڑ کر دباتے رہے اور یہ مولانا کی خاص ادا تھی پھر اسی وقت کھانا گرم کروایا، دسترخوان بچھوایا، مجھے اس طرح کھلایا جیسے مائیں پاس بیٹھکر بچوں کو کھلاتی ہیں کبھی کبھی لقمہ بنا کر میرے منھ میں دیتے مجھے حیرت تھی کہ میری بے کمالی اور اپنی بلند مقامی کے باوجود پہلی ہی ملاقات میں ایسی شفقت کیوں؟

کھانے سے فارغ ہو کر میں نیچے آگیا اور اس خانقاہ میں ٹھہر گیا جو مولانا کے دولت خانہ کے مقابل تھی، یہ ایک پختہ عمارت تھی جو کسی بڑے مدرسہ کا دارالاقامہ معلوم ہوتا تھا، غالباً دومنزلہ عمارت تھی اور نئی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اسوقت محترم حاجی ثناءاللہ صاحب رئیس گورکھپور سابق ام۔ ایل۔ سی جو مولانا کے مسترشدین اور محبین خاص میں سے تھے خانقاہ میں مقیم تھے ان سے اچھا لطف صحبت رہا، وہ بڑے دیندار اور با مذاق انسان تھے اور ان سے پہلے سے نیاز حاصل تھا۔ ایک شب خانقاہ میں قیام رہا اگلے دن وہاں سے واپسی ہوگئی لیکن اس غیر معمولی برتاؤ اور شفقت بزرگانہ کا اثر مہینوں باقی رہا

یہ پہلا تخم محبت و عقیدت تھا جو مولانا ہی کے وطن میں دل کی سرزمین میں ڈالا گیا اور بارآور ہوا والبلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ یہ بھی یاد ہے کہ ایک مجلس میں مولانا نے حاجی ثناءاللہ صاحب یا کسی حاضر باش سے دریافت فرمایا کہ جانتے ہو کہ مشہور مصرعہ ؏ "مے خانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے" کا پہلا مصرعہ کیا ہے؟ لوگوں نے سکوت کیا تو فرمایا کہ ؎

مستی کے لئے بوئے مے تند ہے کافی
میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

میں اسکو اپنے حق میں فال نیک سمجھتا ہوں کہ کیا عجب ہے کہ یہ اس عابرانہ بلکہ طائرانہ حاضری کیطرف اشارہ ہو۔

واپسی پر مولوی حکیم حبیب اللہ صاحب کو ۹ رجمادی الثانی ۱۳۷۳ھ (۱۱ فروری ۱۹۵۴ء) کو جو خط لکھا اس میں یہ الفاظ آئے ہیں:۔

"فتحپور کا مبارک اور پرلطف سفر برسوں نہ بھولے گا۔ آتے جاتے آپ کی مخلصانہ اور محبانہ ادائیں اور فتحپور میں حضرت والا دامت برکاتہم کی بزرگانہ شفقتیں اور نوازشیں اب بھی یاد آتی رہتی ہیں اور دل میں چٹکیاں لیتی ہیں، اللہ تعالیٰ پھر وہ پرمسرت لمحات نصیب فرمائے اور آپ کی معیت میں فتحپور کا سفر نصیب ہو"

اس درمیان میں دو گھنٹے کے لئے دوبارہ اپنے مخدوم و محترم دوست صوفی عبدالرب صاحب کی معیت میں حاضری نصیب ہوئی۔ صوفی صاحب کے فرزند اکبر میاں خالد عمر ایم۔ ایس۔ سی سلمہ حال انجینئر جدہ کی مختصر سی بارات ساتھ تھی، مولاناؒ نے انکا نکاح اپنے دوسرے خادم و محب مولانا امجد اللہ صاحب[1] رئیس گورکھپور کی صاحبزادی سے پڑھایا اور ہم لوگ رخصت ہوئے۔ اسی سفر میں مولاناؒ نے خصوصی شفقت فرمائی اور مجھے اپنے پاس ہی چارپائی پر بٹھایا، اسکے بعد عرصہ تک نہ ملاقات کی نوبت آئی نہ مکاتبت کا شرف حاصل ہوا۔ سب سے پہلا عریضہ ۱۳ رمضان ۱۳۷۴ھ کو لکھا جس میں اس ماہ مبارک میں دعا کی خصوصی درخواست تھی، مولانا نے اسکا بڑی شفقت سے جواب دیا اور تحریر فرمایا کہ

"انشاءاللہ للامر دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اپنی طلب صادق عطا فرمائے اور آپ کو اپنے مخلصین میں شامل فرمائے۔ آپ سے بھی اسی دعا کی درخواست ہے"

---

[1] مولانا امجد اللہ صاحب کا گذشتہ سال رمضان المبارک (۱۳۹۱ھ) میں مدینہ طیبہ میں انتقال ہوا اور بقیع شریف میں دفن ہوئے۔

اسکے بعد حضرت خواجہ محمد معصومؒ کے مکتوبات میں سے مکتوب بست و دوم کا ایک نہایت موثر مضمون نقل فرمایا کہ جس میں ماسوی اللہ سے انقطاع کلی اور عشق مولیٰ میں اپنے نفس کو بلکہ سارے جہان کو خیرباد کہہ دینے کی تلقین تھی۔

اس کے بعد سے مکاتبت کا سلسلہ جاری ہوگیا جس میں طویل طویل وقفے بھی ہوتے رہے۔ اپنے خطوط میں دعا کی درخواست اور محبت و مناسبت کا ذکر اور حضرتؒ کے گرامی نامہ میں شفقت و خصوصیت کا اظہار ہوتا رہا۔ اسکے بعد ایک مرتبہ گورکھپور میں حاضری ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا کہ فتحپور سے دل برداشتہ بلکہ آزردہ ہوکر گورکھپور تشریف لائے تھے اور حاجی نثار اللہ صاحب کی کوٹھی میں مقیم تھے۵ وہیں حاضری ہوئی، علالت کا سلسلہ کچھ عرصے سے جاری تھا اسلئے ملنے ملانے میں کچھ پابندیاں تھیں لیکن مجھے طلب فرمایا گیا اور نہایت شفقت فرمائی، جمعہ کی نماز کے لئے بھی میرے ساتھ ایک ہی رکشہ پر بیٹھکر تشریف لے گئے۔ گورکھپور سے واپس آکر میں نے ایک عریضہ لکھا جس میں ان شفقتوں اور خورد نوازی کا ذکر کرتے ہوئے شیخ سعدیؒ کا مشہور مصرعہ بھی لکھدیا کہ۔ ع۔

کلاہِ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید (دہقان کا سر تو مارے خوشی کے آسمان تک پہونچ گیا)

اس خط کے ساتھ میں نے اپنی نو تصنیف کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" کا پہلا حصہ بھی اس تمہید و تقریب کے ساتھ بھیجا کہ جناب والا نے ایک مجلس میں فرمایا تھا کہ "بیماری میں ہر چیز سے یہاں تک کہ گفتگو کرنے سے بھی طبیعت برداشتہ ہو جاتی ہے، ایسی حالت میں جی چاہتا ہے کہ کوئی اور گفتگو کرے اور ہم سنیں . . . . . میں نے اسکا بدل تجویز کیا ہے کہ اپنی ایک حقیر تصنیف "تاریخ دعوت و عزیمت" پیش خدمت کروں اور وہ کبھی کبھی حضرت

۵۔ مولانا ۷ رمضان المبارک ۶۲ھ کو فتحپور سے گورکھپور تشریف لے گئے وہاں ڈیڑھ سال قیام رہا۔ ۲ ربیع الثانی ۶۳ھ کو الہ آباد تشریف لے گئے اور آخر تک وہیں قیام رہا۔

کی مجلس میں پڑھ کر سنا دی جائے۔ اسکی جرأت اسلئے بھی ہوئی کہ اس کتاب کے بعض مضامین سے جو اکابر کے کلام و تالیفات سے ماخوذ ہیں حضرت کے اذواق و ارشادات کی تائید ہوتی ہے"۔

مولاناؒ نے سعدیؒ کے مصرعہ کا ایسا جواب دیا جس نے الٹا شرمندہ کیا، تحریر فرمایا کہ :-

" اسکا صحیح مصداق تو یہ تھا کہ میں پڑھتا کیونکہ ایک بادشاہ نے کسی دہقان کے یہاں نزول فرمایا تھا اس پر اس نے یہ کہا تھا تو آپ کی مثال بادشاہوں کی سی ہے کہ کبھی یہاں اور کبھی وہاں نزول فرماتے رہتے ہیں، چنانچہ ایک دہقاں کے یہاں بھی نزول فرما کر اسکو شرف بخشا، اسی لئے اگر میں کہوں تو حق بجانب ہوں' مع '

کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

بلکہ پورے قطعہ ہی کو دہراتا ہوں کہ ؎

ز قدر و شوکت سلطاں نگشت چیزی کم ۔ ز التفات بمہماں سرائے دہقانے

کلاہِ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید ۔ کہ سایہ برسرش انداخت چوں تو سلطانے

(دہقان کا سر تو مارے خوشی کے آسمان تک پہونچ گیا' شاہ کی قدر و منزلت میں کیا کمی آجائیگی اگر وہ ایک غریب دیہاتی کے غریب خانہ کا رخ فرمادے بلکہ دہقان کا سر تو آسمان سے باتیں کرنے لگے گا جبکہ آپ جیسے سلطان کا اس کے سر پر سایہ ہوجائے۔)

پھر کتاب کی پیشکش کے متعلق ایسی بات تحریر فرمائی جس سے اپنی غلطی پر تنبہ اور ندامت ہوئی اور مولانا کے مصلحانہ شان اور دیدہ وری کا اظہار ہوا' تحریر فرمایا گیا کہ

اور آپ نے اپنی بعض تصانیف کے متعلق جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ مرض کی وجہ سے گفت گو کرنے کو جی نہیں چاہتا تو مجلس میں اسکو پڑھ کر سنایا جائے تاکہ تفریح طبع کا ذریعہ ہوسکے اسکے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ چونکہ اسکے مضامین ارشادی ہیں جیساکہ آپ نے

بیان فرمایا تو میں ارشادی مضامین کو تفریح کا سبب نہیں بناؤں گا
کیونکہ یہ اسکی ناقدری ہوگی بلکہ میں یہ کروں گا کہ اسکا از خود مطالعہ
کروں گا اور جس طرح سے بزرگوں کے اقوال سے اثنا ے گفتگو
میں استدلال کرتا ہوں اسی طرح اسکے مضامین کو بھی لوگوں کے
سامنے پیش کرونگا لیکن یہ سب کچھ ابھی نہیں بلکہ معتد بہ قوت کے بعد
کروں گا"۔

(مکتوب ۲۴ ربیع الاول ۶۶ھ از گورکھپور)

اسکے کچھ عرصہ بعد مولانا گورکھپور سے الہ آباد تشریف لے آئے اور الہ آباد کیا تشریف لائے الہ آباد اور الہ آباد والوں کی قسمت جاگی اور وہ شہر جو عرصہ دراز تک تصوف و معرفت کا مرکز رہ چکا تھا اور یہاں کے بارہ دائرے مشہور تھے اب ذکر اللہ اور دعوت الی اللہ کی برکت سے اسم بامسمیٰ اور صحیح معنیٰ میں الہ آباد ہوگیا۔ مولانا گورکھپور سے ربیع الثانی ۷۵ھ میں الہ آباد تشریف لائے کچھ عرصہ حسن منزل میں قیام رہا پھر روشن باغ کا محلہ آپ کے قیام سے منور و روشن ہوا اور وہاں ایک خانقاہ اور دار التربیت قائم ہوگیا۔

اسی زمانہ میں محب محترم مولوی شاکر حسین خاں صاحب مرحوم نے انجمن اصلاح المسلمین کے جلسہ میں تقریر کے لئے مدعو کیا جو بڑے دھوم دھام سے ہر سال الہ آباد میں ہوا کرتا تھا، خان صاحب کئی سال سے مدعو فرما رہے تھے لیکن چونکہ میرا معمول جلسوں میں بہت کم جانے کا تھا برابر معذرت کرتا رہا اس مرتبہ اس میں ایک دوسری کشش شامل ہوگئی، یہ مولانا کی موجودگی تھی جلسہ کا تو ایک بہانہ تھا، میں نے الہ آباد کا قصد کر لیا کہ مولانا کی خدمت میں حاضری اور کچھ وقت گزارنے کا موقع مل جائے گا۔ مولانا نے حسب معمول نہایت شفقت فرمائی، مجالس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی جو اس سفر کی اصل قیمت تھی، اس وقت ذرا قریب سے اور کچھ زیادہ غور سے مولانا کو دیکھنے کا موقع ملا

ایک اضطرابی اور سیمابی کیفیت تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی کل چین نہیں، مسلمانوں کے حالات، اخلاق و معاملات کے بگاڑ، صدق و اخلاص کی کمی اور نفاق کے کھلی آنکھوں مشاہدے نے بے قرار و مضطرب بنا رکھا ہے، اصلاح حال اور دعوت فرار الی اللہ کا جذبہ قلب و دماغ و اعصاب پر مستولی ہو گیا (خدا کی جانب توجہ کرنے کی دعوت ۱۲) ہے اور وہ حال ہے جو اس شعر میں بیان کیا گیا ہے ؎

شعلہا آخر زہر موئیم دمید   از رگ اندیشہ ام آتش چکید

مولانا کی اس بیقراری اور سیماب وشی کو دیکھکر بے اختیار مولانا محمد الیاس صاحبؒ یاد آ گئے وہی نحیف جثہ، وہی گفتگو میں تکلفات، انداز خطابت سے بے نیازی، وہی موسوی رنگ کہ زبان سینہ کے جوش اور دل کا ساتھ نہ دے سکے، وہی فکر میں ڈوبا ہوا سکوت، وہی اضطراب سے لبریز تکلم، دعوت کے موضوع کا ضرور فرق تھا لیکن اپنے موضوع سے عشق اور اپنے کام کی فکر کا وہی حال تھا۔ صبح اور شام کی مجلسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا ایسے جذب کی کیفیت تھی جس پر عقل و سلوک کے پہرے بیٹھے ہوئے تھے، کبھی کبھی بعض مخلص خادموں کے سر پکڑ کر ہلاتے اور انکو کسی نکتہ یا ضرورت کی طرف متوجہ فرماتے

الہ آباد کی مجالس میں خاص طور پر تذکیر بالآخرت اور نعمائے جنت و عذاب جہنم کی ترغیب و ترہیب پر خاص طور پر زور تھا اور یہ کہ قرآن مجید کا اسلوب اور طریقۂ موعظت سب سے زیادہ مفید اور موثر ہے۔ نیز یہ کہ علماء اور واعظین نے آخرت کے مضمون اور جنت و دوزخ کے تذکرہ کو بالکل فراموش و نظر انداز کر دیا ہے اور انکو اس سے شرم آنے لگی ہے گویا وہ ایک خلاف فیشن بات ہے۔ الہ آباد سے واپسی پر ۲۵ر شوال ۱۳۷۷ھ کو لکھنؤ پہونچکر جو عریضہ لکھا اس میں انھیں تأثرات کا اظہار تھا خاص طور پر اس غیر معمولی شفقت پر اپنے گہرے تأثرات و تشکر کا اظہار کیا گیا تھا جو اس دو روزہ قیام میں دیکھنے میں آئی، مولانا نے اسکا جو جواب دیا وہ میرے لئے

سرمایہ سعادت ہے اور یہاں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے

حبیبی و محبی سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مکرمت نامہ نے شرحِ صدر بخشا، باعث ازدیادِ محبت و خلوص ہوا جو حضرات اہل علم میرے پاس آمد و رفت فرماتے ہیں ان میں غالباً سب سے زیادہ قلب کا رجحان جناب کی طرف ہوتا ہے، ارقام فرمایا ہے کہ "جس اہم و مبارک موضوع کی طرف توجہ دلائی ہے وہ میری اصلاح و تعلیم کے لئے بہت مفید تھی" ہم لوگوں نے اس موضوع و مضمون کو بالکل فراموش اور نظر انداز کر دیا ہے اسکو سن کر بیساختہ یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

لگ چلا تھا دل قفس میں پھر پریشاں کر دیا ہمصفیر و تم نے پھر ذکر گلستاں کر دیا

اب میں جناب سے اجازت چاہتا ہوں کچھ عرض کرنے کی، بعد آنے اجازت نامہ کے قدرے تفصیل سے عرض کرونگا۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہٗ

اس حاضری اور تاثر اور تحریک کا نتیجہ مولانا کا وہ بیش قیمت مضمون "التذکیر بالقرآن" تھا جو میری واپسی کے بعد سپردِ قلم فرمایا گیا اور "الفرقان" اور دوسرے رسالہ میں شایع ہوا اور علیحدہ کتابی شکل میں چھپ گیا۔ یہ مضمون باوجود عبارت آرائی اور تکلفات سے دور ہونے کے نہایت موثر اور مفید ہے اسکے بعد غالباً ایکبار اور اصلاح المسلمین کے جلسے میں اور حقیقتاً مولانا کی مجالس میں شرکت اور استفادہ کے لئے الٰہ آباد جانا ہوا، قیام تمام تر مولانا کے دولت خانہ پر رہا مجالس اور حلقہ افادہ واستفادہ کا وہی معمول تھا جو پہلے دیکھنے میں آیا تھا یہ دیکھکر بڑی خوشی ہوئی کہ شہر کے ذی علم اور فہیم حضرات حاضری دیتے ہیں اور اسکو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔

اسکے بعد پھر ایک بار ۱۹۶۴ء میں الہ آباد حاضری ہوئی تقریب حاضری یہ تھی کہ ۲۰، ۲۱ جون کو دینی تعلیمی کونسل جس کی صدارت کا شرف شروع سے حاصل رہا کی الہ آباد میں صوبائی کانفرنس تھی اسکا پہلے سے قصد تھا کہ قیام مولانا ہی کے یہاں رہے گا غلطی سے مولانا کو اپنی آمد اور پہنچنے کے وقت کی اطلاع دیدی، غلطی اس لئے کہ جب بیس جون کو صبح الہ آباد کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو معلوم ہوا کہ مولانا خود اسٹیشن تشریف لائے ہیں گاڑی ذرا تاخیر سے پہنچی تھی مولانا نے ملتے ہی فرمایا کہ اس خیال سے کہ وہ وقت چائے اور ناشتہ کا ہو گا میں چائے اور ناشتہ اسٹیشن پر لایا ہوں کہ تاخیر نہ ہو لیکن اب تو وقت زیادہ ہو چکا ہے اس لئے اب گھر ہی پر ناشتہ ہو جائے گا۔ میں اس لطف وکرم اور اہتمام کو دیکھکر پانی پانی ہو گیا اور اپنی اس غلطی کا شدت سے احساس ہوا کہ پہنچنے کے وقت کی اطلاع کیوں دی اس سفر میں محبی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی برادرم مولوی سید ابوبکر صاحب حسنی ایم۔اے (حال استاذ نہرو یونیورسٹی دہلی) جو مولانا کی زیارت و ملاقات کے بڑے مشتاق تھے اور عزیزی سید محمد مسلم حسنی بھی ساتھ تھے، ہم سب مولانا ہی کے مہمان رہے کیونکہ شدید گرمی کا زمانہ تھا اسلئے شب کا قیام ایک نو خرید مکان کے صحن میں رہا مولانا نے ہماری راحت کا بڑا اہتمام فرمایا تھا اس زمانہ قیام میں مولانا نے مسلمانوں کے حالات و مسائل سے اپنی گہری دلچسپی اور فکرمندی کا بار بار اظہار فرمایا بعض مرتبہ مولانا جامی صاحب یا مولانا سراج الحق صاحبؒ کو خصوصی پیغام دیکر میرے پاس اسوقت بھیجا جب میں کانفرنس کے سلسلہ میں کسی کمیٹی یا مجلس کے مذاکرات میں شریک تھا۔

مولانا کے قیام سے الہ آباد میں دینی رونق پیدا ہو گئی تھی، جس محلہ میں قیام تھا اس مسجد کی توسیع کی ضرورت جلد پیش آگئی، مدرسہ بھی قائم ہو گیا اور مولانا کی برکت سے لوگوں میں اپنی اصلاح و تربیت کی طرف توجہ پیدا ہو گئی

مولانا کو مساجد کی تعمیر کا بڑا ذوق تھا جہاں کچھ عرصہ قیام فرماتے وہاں ضرور کچھ نئی مساجد تعمیر ہو جاتیں۔ گورکھپور میں بھی ایسا ہی ہوا، اور الہ آباد کے اسٹیشن کے قریب کی مسجد جسکی بنیاد شاید پہلے پڑ چکی تھی مولانا کے حسن توجہ سے تکمیل کو پہونچی اور اسکا شمار خوبصورت مسجدوں میں ہونے لگا۔

مولانا کے اس تعلق قلبی اور شفقت بزرگانہ کا پورا اظہار اسوقت ہوا جب میں اپنی آنکھ کی تکلیف کے سلسلہ میں سنہ ۶۷ء میں سیتا پور میں مقیم تھا اور یکے بعد دیگرے آپریشن ہو رہے تھے کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا اسوقت مولانا کے نامہ و پیام برابر آتے تھے الہ آباد سے مولانا کے اہل تعلق میں جو بھی آتا وہ بیان کرتا کہ مولانا بہت فکرمند اور بیچین ہیں بعض اوقات لیٹے سے اٹھکر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میں انکی اس تکلیف میں کس طرح کمی کر سکتا ہوں؟ یہاں کے قیام کے آخر زمانہ میں مولانا کا گرامی نامہ آیا کہ "میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ آپ کو وہاں کے علاج سے فائدہ نہ ہوگا آپ لکھنؤ جائیں اور ہومیوپیتھک علاج کریں" — میں اور میرے تیماردار بھی اس قیام سے عاجز آگئے تھے یہ ایک اشارۂ غیبی معلوم ہوا اور میں لکھنؤ آگیا اور مجبور ہو کر ایک ہومیوپیتھ ڈاکٹر جو بہت زیادہ نامور بھی نہ تھا رجوع کیا، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جو تکلیف بار بار کے آپریشنوں سے بھی نہیں گئی تھی وہ باذن اللہ ایک خوراک سے جاتی رہی، اور الحمد للہ پھر کبھی نہیں ہوئی نام تو اس ڈاکٹر کا ہو گیا اور اس معرکۃ الآرا علاج سے خود اسکو بہت فائدہ ہوا لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں دوا سے زیادہ دعا اور ایک مرد خدا کی اور بہت سے مخلصین کی سوز قلبی اور دردمندی کا ہاتھ تھا ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

(اے محبوب! مشک کی خوشبو پھیلانا دراصل کام تو آپکی زلف کا ہے لیکن عاشقوں اور شاعروں نے کسی مصلحت سے اسکو چین کے ہرن کی جانب منسوب کر رکھا ہے)

اس تکلیف سے نجات پانے کے بعد میں نے الہ آباد کا مستقل سفر کیا، جس کا محرک محض جذبۂ تشکر اور مولانا کی مسرت قلبی کی توقع تھی۔

گرمی کا زمانہ تھا مولانا نے نیچے کی منزل میں قیام کا انتظام فرمایا تاکید کی کہ گرمی میں اوپر آنے کی زحمت بالکل نہ کی جائے۔ اسکا بھی اہتمام کیا گیا کہ کسی ضرورت کے لئے باہر نہ نکلنا ہو، کئی بار انار شیریں کے دانے اس پیغام کے ساتھ بھیجے گئے کہ یہ آنکھوں کے لئے مفید ہیں۔ پھر شام کو بڑی شفقت کے ساتھ ملاقات فرمائی، کھانے کا اہتمام فرمایا ان نوازشوں میں محض بزرگانہ نہیں بلکہ ماورانہ شفقت کی جھلک بھی نظر آئی تھی جو نائبین رسول کا امتیاز ہے عزیزٌ علیہ ما عنتم حریص علیکم

ایک بار مجلس مشاورت کے جلسے کے سلسلہ میں جو الہ آباد میں ہونا طے پایا تھا الہ آباد جانا ہوا، مولانا ہی کے دولت خانہ پر قیام تھا صدر مجلس ڈاکٹر سید محمود صاحب بھی تشریف لائے تھے، ڈاکٹر صاحب کو مولانا سے بڑی عقیدت پیدا ہوگئی تھی اور کچھ ایسا بھی سنا جاتا تھا کہ وہ داخل سلسلہ بھی ہوگئے ہیں مجلس کے بعض دوسرے قائدین بھی الہ آباد آئے ہوئے تھے وہ بھی مولانا کی خدمت میں حاضری دیتے رہتے تھے۔ مولانا ابواللیث صاحب ندوی (امیر جماعت اسلامی) خاص طور سے حاضری کا اہتمام کرتے تھے اور مولانا بھی ان پر خصوصی شفقت فرماتے تھے

اب وہ وقت آگیا کہ مولانا کے لئے اپنے مرض رعاف کیوجہ سے الہ آباد کی گرمیوں میں رہنا مشکل ہوگیا اور معالجین نے معتدل آب و ہوا کے کسی مقام پر گرمیاں وسردیاں گذارنے کا مشورہ دیا اس علاج و مشورہ میں ہمارے شہر لکھنؤ کے نامور طبیب یونانی شفاء الملک مولانا حکیم خواجہ شمس الدین صاحب پیش پیش تھے جنکو اپنی حذاقت نیز مناسبت و عقیدت کیوجہ سے مولانا کے خاص معتمد و مقرب بننے کا شرف حاصل ہوگیا تھا۔ اب بمبئی کی قسمت نے زور کیا، ظاہر بیں سمجھے کہ مولانا اپنے علاج کے لئے تشریف لے جاتے ہیں لیکن حقیقت میں اہل بمبئی کا علاج مقصود تھا اور وہاں ایک روحانی مطب کھلنے کا قضا و قدر میں فیصلہ ہو چکا تھا، مولانا کی دلبستگی (جسکے ساتھ اہل بمبئی کی دلکشائی وابستہ تھی) بمبئی اور اہل بمبئی سے بڑھتی گئی اور اہل بمبئی کو بھی مولانا کی ذات سے گرویدگی اور عقیدت آناً فاناً ترقی کرتی گئی، سارے قرائن و اسباب اسبات کے مؤید تھے کہ مولانا کی آمد و قیام سے ہندوستان کے اس عظیم ترین شہر (جسکا مزاج ہمیشہ سے تجارتی اور کاروباری رہا ہے اور کسی زمانہ میں مسلک دیوبند کے

داعیوں اور علم برداروں کے لئے ارض ممنوعہ کی حیثیت رکھتا تھا) کے ساکن سمندر کی سطح میں ادنیٰ سا تموج و حرکت بھی پیدا نہ ہوگی مولانا کے پاس ان اسلحہ اور وسائل میں سے کوئی ایک چیز بھی نہ تھی جو بمبئی کے لوگوں کو گرویدہ اور متاثر کر سکتی یعنی خطابت، ظاہری وجاہت پروپیگنڈا اور ظاہری شان شوکت وغیرہ لیکن قضا و قدر کے فیصلے ان میں سے کسی چیز کے بھی تابع اور پابند نہیں لوگوں نے جو کچھ دیکھا تمام تر قیاسات کے برخلاف تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیبی قوت کام کر رہی ہے اور لوگوں کے دلوں اور روحوں کو انکی طرف متوجہ کر رہی ہے میں نے ان تاجروں اور بمبئی کے چوٹی کے کاروباری لوگوں کی عقیدت و رجوع کو دیکھا جو اس سے پہلے کسی دینی دعوت و تحریک سے متاثر نہیں ہوئے تھے اور جو علمائے حق کی طرف سے شدید بدگمانیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا تھے انکا رجوع برابر بڑھتا گیا اور تیزی سے ان میں اصلاح و تغیر آنے لگا دیکھتے دیکھتے انکی صورت و سیرت میں نمایاں تبدیلیاں ہونے لگیں مجھے ۵۰ء سے بمبئی جانے کا برابر اتفاق ہوتا رہا اور اس میں مشکل سے کسی سال وقفہ ہوتا تھا لیکن اب مولانا کے قیام کے بعد جو بمبئی جانا ہوا تو وہاں کی حالت ہی دوسری دیکھی، جن لوگوں کو مولانا کی مجلس میں دیکھنے کی بالکل امید نہ تھی انکو وہاں سر بزانو پایا حالانکہ یہاں کشش کے وہ سب اسباب مفقود تھے جو بمبئی کے لئے ضروری تھے ۱۹۶۷ء میں حجاز جاتے ہوئے چند روز بمبئی میں ٹھہرا، میں ایک دن صبح "کرلا" جہاں مولانا کا قیام رہتا تھا ٹھیک صبح کے درس کے وقت پہونچا، مجھے مولانا کی کرسی کے پایہ کے پاس جگہ دی گئی، مولانا تشریف لائے میکروفون سامنے تھا کچھ بیان فرمانا شروع کیا درمیان میں تفسیر و حدیث کی کتابیں منگوا کر ان کی عبارتیں سناتے اور تقریر فرماتے میں پایہ سے لگا بیٹھا ہوا تھا مولانا کے لہجہ اور طرز کلام سے بھی مانوس تھا لیکن خود بھی گفتگو کا خاصا حصہ نہیں سمجھ سکا لیکن دیکھتا تھا کہ لوگوں کے چہرے اور آنکھوں میں گہرا اثر ہے، کئی بار کیطرح اس موقع پر بھی اندازہ ہوا کہ تاثیر کے لئے خطابت و الفاظ کی کوئی شرط نہیں، ع "بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست" ورنہ اس کے برخلاف بڑے بڑے شیوہ بیان مقرر تقریر کا سماں باندھ دیتے ہیں لیکن نہ قلوب پر کوئی اثر ہوتا ہے اور نہ زندگی میں کوئی انقلاب اسلئے کہ بقول جگر ؎

آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

اگر خدا کو منظور ہوتا اور مولانا کے سفر و قیام کا سلسلہ چند سال اور قائم رہتا تو شاید بمبئی میں خاصے وسیع پیمانے پر دینی بیداری، اصلاح حال، اتباع سنت کا ذوق اور بیسیوں نہیں بلکہ سیکڑوں زندگیوں میں انقلاب پیدا ہو جاتا لیکن خدا کی حکمت اور اسرار الٰہی کوئی نہیں جانتا نومبر ۱۹۶۸ء کو یہ سلسلۂ خیر و برکت اچانک ختم ہو گیا اور صرف بمبئی ہی نہیں بلکہ سارا ہندوستان اور عالم اسلام اس مبارک وجود سے محروم ہو گیا جس نے مشائخ پیشین اور مصلحین اولین کی یاد تازہ کر دی تھی اور اور ثابت کر دیا تھا کہ اخلاص و درد اپنے کام کی دھن اور لگن اور روحانی قوت بڑے سے بڑے ناسازگار حالات اور سخت سے سخت مادہ زدہ اور ظاہر پرست دور اور ماحول میں بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ ع

جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ مولانا کے قلب میں زیارت بیت اللہ اور کچھ عرصہ اسکے سایہ میں قیام کرنے کا جذبہ اور شوق اسطرح موجزن ہوا کہ کوئی طبی مصلحت اور اصلاحی ضرورت اس پر غالب نہ آسکی، مولانا نے حج کا عزم فرمالیا اور اپنے خصوصی مخلصین کو بھی اس پر آمادہ فرمانا شروع کیا، یہ جذبہ اس قوت اور شدت سے پیدا ہوا تھا کہ کوئی مشکل اسکی راہ میں حائل نہ ہو سکی ادھر خدا کی کچھ ایسی مدد ہوئی کہ موانع مرتفع ہوتے چلے گئے اور ہمرکابی کے لئے ایک اچھا خاصا قافلہ تیار ہو گیا، میں اسی زمانہ میں رابطہ کے جلسے میں شرکت کے لئے سفر حجاز پر روانہ ہو رہا تھا بمبئی میں جب بغرض ملاقات حاضر ہوا تو اپنے ارادہ کا جس کا عام طور پر اعلان نہیں ہوا تھا ذکر فرمایا، رخصت ہو کر جب موٹر پر آکر بیٹھ گیا تو مولانا جامی صاحب کو یہ خصوصی پیغام دیکر بھیجا کہ واپسی میں عجلت نہ کیجئے گا میرا انتظار کیجئے گا لیکن میں بعض اسباب کی بنا پر زیادہ نہ ٹھہر سکا اور جلسہ سے فارغ ہو کر بمبئی واپس ہوا، وسط نومبر ۱۹۶۷ء کی غالباً ۱۹، ۲۰ تاریخ تھی مولانا سے ملا عرض کیا کہ میں آتو گیا ہوں لیکن مجھے بعض اسباب کی بنا پر توقع ہے کہ میں رمضان المبارک میں حاضر ہونگا اور اس طرح کچھ عرصے وہاں آپ کی خدمت میں رہنے کا موقع ملے گا مولانا بہت خوش ہوئے

اور فرمایا کہ ضرور ضرور کوشش کرنا۔

واپسی کے سفر میں رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی بھی ساتھ تھے مولانا کی روانگی سے ایک دو روز بیشتر ہم لوگ لکھنؤ روانہ ہونے والے تھے، ایک شام ایک معتقد کے یہاں جو ایک بڑے تاجر تھے مولانا کی چائے کی دعوت تھی، ہم دونوں اور مولانا ابرار الحق صاحب بھی مدعو تھے مولانا نے اپنے گدے پر دائیں اور بائیں اپنے قریب ہم دونوں کو بٹھایا پھر بڑی رازداری سے لب مبارک کو میرے کان کے پاس لاکر فرمایا ــــ "دعا کرو کہ حاضری ہو جائے" ــــ میں اس جملہ کا مطلب بالکل نہیں سمجھا کہ اب حاضری میں کیا تردد رہا چند دن کا معاملہ ہے لیکن بعد کے واقعہ نے ثابت کر دیا کہ یہ جملہ بڑا معنی خیز تھا اور تقدیر الٰہی کو وہاں حاضری کے بجائے کچھ اور منظور تھا وکان امر اللہ قدرا مقدورا۔

روانگی چہارشنبہ کے روز ۲۲ر نومبر ۶۷ء کو ہوئی ابھی جہاز کو روانہ ہوئے دو ہی روز ہوئے تھے کہ ۲۴ر نومبر بعد نماز مغرب غشی کا دورہ پڑا اسی شب میں چند گھنٹے کے بعد گیارہ بجے شب میں بیت کے بجائے رب البیت سے جا ملے اور مکان کے بجائے مکین سے واصل ہوئے ان الی ربک الرجعیٰ

یہ خبر جب وائرلیس سے حجاز پہونچی تو وہاں کے مخلصین نے اور خود مدحت کامل صاحب سفیر ہند متعین سعودی عرب نے جنت معلیٰ میں تدفین کے لئے حکومت سعودیہ کی منظوری حاصل کرنے کی کوشش کی جو کامیاب ہوئی اور بالکل استثنائی طریقہ پر جسد مبارک کو البلد الامین لانے کی سرکاری طریقہ پر اجازت ملی، جنت المعلیٰ میں شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی لحد کی جگہ پر قبر تیار بھی کرلی گئی اور مدرسہ صولتیہ میں غسل کی تیاری بھی شروع کر دی گئی لیکن یہاں بھی اللہ تعالیٰ کا خصوصی معاملہ رہا اس غلط فہمی کی بنا پر کہ اجازت نہیں ہوئی ہے غسل وتکفین اور نماز جنازہ میں عجلت سے کام لیا گیا اور جسد مبارک جہاز کے قوانین کے مطابق سمندر میں اتار دیا گیا۔ سنا ہے کہ مولانا بمبئی سے رخصت ہونے سے پہلے بار بار یہ شعر پڑھتے تھے ؎

پھول تربت پر مری ڈالو گے کیا؟ — خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائیگی

یہ واقعہ جس طرح پیش آیا اس میں تدبیر کی بے بسی اور تقدیر کی قہاری صاف نمایاں تھی تفصیل کا یہ موقع نہیں "واللہ غالب علی امرہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون" اس طرح ان برگزیدہ افراد کی نورانی فہرست میں جن کے مدفن ہونے کا شرف بجائے آغوش خاک سمندر کے سینہ کو عطا کیا گیا اور جن میں حضرت مولانا مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی مصنف "علم الصیغہ" اور "تاریخ حبیب الہ" اور قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری مصنف "رحمۃ للعالمین" جیسے صلحا اور مقبولین شامل ہیں، ایک اور مرد کامل کا اضافہ ہوا اور سمندر کو یہ شکایت نہ رہی کہ وہ اس دولت سے یکسر محروم ہے جو زمین کے نصیب میں آئی ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہٗ کا بیان جو "پرانے چراغ" سے ماخوذ تھا ختم ہوا اس سے قبل حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہٗ کے قلم سے حضرت مصلح الامۃ رح سے ملاقات کے واقعات اور خود مولانا کے تاثرات ملاحظہ سے گذر چکے ہیں، اسی سلسلہ میں چند باتیں اور عرض ہیں جو راقم کے اپنے مطالعہ اور تاثر سے متعلق ہیں وہ یہ کہ :-

آخری دور میں مولانا نعمانی مدظلہٗ اور حضرت مصلح الامۃ میں بہت ہی قریبی اور مخصوص تعلقات ہو گئے تھے یعنی ایسے کہ مولانا نعمانی حضرت والا رح کو اپنے حق میں ایک ایک مربی سے کم نہ تصور فرماتے تھے اور حضرت والا بھی ان کے حالات اور انداز ملاقات سے یہ سمجھتے تھے کہ مولانا کو اب ماشاء اللہ طریق سے بھی خاصا تعلق ہو گیا ہے جس کی وجہ سے اہل طریق سے یہ انس و محبت ہے اس لئے حضرت والا کے قلب میں بھی مولانا نعمانی کی خاص قدر و محبت تھی۔ چنانچہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بمبئی کے زمانۂ قیام میں ایک مرتبہ مولانا نعمانی حضرت مصلح الامۃ کے یہاں کرلا تشریف لے گئے اور چند دن حضرت ہی کے مہمان رہے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ مجھے کسی کمرہ کے ایک گوشہ میں جگہ دیدی جائے اہل بمبئی سے مولانا نعمانی کا جو تعلق تھا ظاہر ہے۔ چنانچہ علم ہونے پر معتقدین اور مخلصین ملنے آئے اور ہر چند اصرار کیا کہ مولانا ان کے یہاں قیام کریں اور جب جب حضرت والا

کے یہاں آنا چاہیں گے کار کا انتظام رہے گا بے تکلف آجا سکیں گے۔ لیکن مولانا نعمانی نے وہاں کی خانقاہ کے گوشہ اور چٹائی کو ترجیح دی اور کسی پر تکلف اور آرام دہ قیام گاہ پر تشریف لیجانا پسند نہیں فرمایا اور یہی فرماتے رہے کہ میرا یہ سفر اپنی ایک ضرورت سے حضرت کی خدمت میں قیام ہی کی غرض سے ہوا ہے۔ چنانچہ اس سفر میں مولانا نے کسی وعظ و تقریر یا تبلیغی و غیر تبلیغی کسی پروگرام کو بھی منظور نہیں فرمایا اور یہی فرماتے رہے کہ اسوقت تو میرا یہ سفر ایک دوسری ہی ضرورت سے ہوا ہے اس میں دوسرے امور کو شریک نہیں کرنا چاہتا۔

اب آپ خود خیال فرمایئے کہ حضرت والا کو جب مولانا نعمانی کی اس نیت کا حال معلوم ہوا ہوگا تو آخر حضرتؒ پر بھی اسکا کچھ اثر ہوا ہوگا یا نہیں؟ بزرگوں کے پاس اس طرح کے آنے جانے والے آج دنیا میں کتنے ہیں؟ اور مشائخ اور بزرگ تو بجائے خود رہے آج حج کو جانے والوں اور زیارت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی غرض سے سفر کرنے والوں کی نیتوں کا خالص ہونا مشکل ہو رہا ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر اسی نیت کے مسئلہ کو خود حضرت مصلح الامۃؒ ہی کی زبان فیض ترجمان سے آپ یہاں بھی سن لیں۔ ایک سلسلۂ کلام میں فرمایا کہ

"سنیئے! ہر آدمی اپنے تجربہ و دیانت کا مکلف ہے۔ میں دیانت سے کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں سبھی لوگوں کی نیت بزرگوں کے پاس آنے جانے میں دین ہو، اس میں مجھے کلام ہے ——— لیکن آپ لوگ اس کو سنیئے گا نہیں اور میں یہ بھی کہتا ہوں کہ آج جو عوام خراب ہوئے ہیں تو خواص کی وجہ سے جب ہمارے خواص اچھے تھے تو عوام بھی اچھے تھے، صاف کہتا ہوں کہ عوام کو ان علماء نے خراب کیا ہے۔ اور میرے سوا تم اسکو کسی اور سے نہ سنوگے ہم لوگوں کا تم نے بہت امتحان لیا، ہمارا ایک تماشا بنالیا ہے، اس کو کہتا ہوں سنتے ہو تو سنو، اور یہ بھی کہتا ہوں کہ یہ باتیں تمکو سخت لگیں گی لیکن مجھے اسکی پرواہ نہیں ہے بہت نرم نرم کہکر دیکھ لیا جب سخت بات

کہی جائے گی تو سخت معلوم ہی ہوگی اسی لئے تو سخت کہہ رہا ہوں کہ آپ اثر لیں اور یہ میں عوام کو نہیں علماء کو کہہ رہا ہوں"

(ص۴ معرفت حق جنوری ۱۹۶۹ء)

سبحان اللہ! کیا کلام کی شان ہے، دیکھئے اصلاحی کلام ہے اور واقعی قدرے تلخ بھی ہے لیکن اخلاص کی شکر نے اسکو کیسا شیریں اور پیارا بنادیا ہے جی چاہتا ہے کہ حضرت والا اسی طرح کی باتیں فرماتے جائیں اور ہم سنتے جائیں افسوس آج اسی قسم کی باتیں سننے کو تو طبیعت ترس گئی ہے۔

"الحمدللہ مولانا نعمانی مدظلہ کے اس عمل میں ہمارے لئے یہ تعلیم ہے کہ کسی دینی سفر میں بڑا اہم معاملہ نیت کا ہے" چنانچہ میرے علم میں ہے کہ ایک دفعہ گورکھپور میں جب حضرت والا کا قیام تھا اور حضرت زیادہ علیل ہوگئے تھے اسوقت بھی مولانا نعمانی مدظلہ حضرتؒ کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے تھے ظاہر ہے کسی کی عیادت ایسی کوئی چیز نہیں کہ اسکے ساتھ کسی اور شے کی شرکت عرفاً کچھ قبیح شمار ہو، چنانچہ شہر کے اہل تبلیغ تشریف لائے اور مولانا نعمانی سے خواہش ظاہر کی کہ ایک تقریر اور ایک اجتماع تبلیغی سلسلہ کا آپ کی صدارت میں ہو جائے تو اچھا ہے، مولانا نے وہاں بھی اسکو منظور نہیں فرمایا اور کسی طرح تیار نہیں ہوئے بعض لوگوں نے کہا بھی کہ حضرت والا سے ہم اجازت لئے لیتے ہیں مگر مولانا یہی فرماتے رہے کہ نہیں بھائی اسوقت میرا یہ سفر صرف حضرت کی عیادت اور جتنا وقت مل سکے حضرت کی صحبت اور خانقاہ میں قیام کے لئے ہوا ہے اس سفر میں میرا اور کوئی پروگرام نہیں ہو گا۔ اس جواب پر اہل شہر تو مایوس ہو کر چلے گئے لیکن جب حضرت اقدسؒ کو اسکی اطلاع ہوئی تو دیکھئے حضرت نے کیا معاملہ فرمایا (سبحان اللہ! سبحان اللہ! حضرت واقعی حکیم تھے اور اللہ تعالیٰ نے موقع شناسی اور تیقظ اور مقتضائے حال کے مطابق کوئی حل تجویز فرما لینے کا تو ملکہ عطا فرمایا تھا) —— شہر کے باا ثر علماء مولانا افتخار احمد صاحب اور مولانا سید وصی الدین صاحب کو طلب فرمایا اور غالباً حکیم وصی الدین سلمہٗ کو بھی بلایا کہ ان دنوں حکیم صاحب ہی کے مکان میں حضرت کا قیام تھا اور فرمایا کہ آپ لوگ مولانا محمد منظور صاحب کے پاس

جائیے اور اپنی جانب سے ان سے یہ درخواست کیجئے کہ حضرت آپ جامع مسجد میں آج وعظ فرمادیں، اور ہم لوگوں نے حضرت سے اجازت لیکر آپ سے یہ درخواست کی ہے لہٰذا اب آپ ہماری اس درخواست کو رد نہ فرمائیے ہماری دلی خواہش ہے کہ آپ کا یہاں ایک وعظ ہو جائے۔ اب صورتِ حال ایسی آن پڑی تھی کہ مولانا کو یہ درخواست منظور ہی کرنی پڑی۔ چنانچہ جامع مسجد میں وعظ ہوا اور حضرت مولانا نعمانی مدظلہ نے جب ابتداءً اسقدر اخلاص کا معاملہ فرمایا تھا تو اللہ تعالےٰ نے انتہا تک اسے باقی رکھا یعنی مولانا نے کسی معروف عنوان پر وعظ نہیں فرمایا بلکہ خالص خانقاہی قسم کی باتیں بڑے اچھے اور موثرانداز میں بیان فرمائیں یعنی نفس کی شرارت، اصلاح نفس کی ضرورت، بزرگوں کی صحبت، طریق اور اہل طریق کے آداب کی رعایت غرض یہی ساری باتیں موضوع وعظ رہیں۔

غرض مولانا نعمانی نے ہر طرح سے حضرت کے ماننے کا ثبوت دیا تو پھر حضرت والا بھی دل سے مولانا کی طرف متوجہ رہے چنانچہ بمبئی کے اسی سفر میں یا کسی دوسرے سفر میں میرے ہی واسطہ سے حضرت والا نے مولانا نعمانی مدظلہ کے پاس کہلایا کہ مولانا سے جاکر کہو کہ میں آپ کو کچھ دینا چاہتا ہوں آپ بھی اسکے لینے کے لئے تیار ہیں؟ یہ سنکر مولانا نعمانی مدظلہ متاثر ہوئے اور کچھ توقف کے بعد فرمایا کہ چلئے اسکا جواب میں خود حضرت سے عرض کردوں اور حضرت والا کے کمرہ میں تشریف لے گئے خادم بھی ہمراہ تھا مولانا کچھ آبدیدہ سے تھے، حضرتؒ نے خادم سے فرمایا کہ تم نے میری بات مولانا سے کہدی؟ خادم نے عرض کیا کہ جی ہاں عرض کردی مولانا خاموش تھے حضرتؒ نے فرمایا پھر مولانا کیا فرماتے ہیں؟ استنے میں مولانا خود بمشکل لب کشا ہوئے کہ حضرت کا نہایت ہی کرم ہے اس پر میں اللہ تعالیٰ کا جسقدر بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ بس حضرت والا سے اپنے لئے دعا ر چاہتا ہوں۔ حضرت والا مسکرائے اور فرمایا کہ ہاں دعا ر تو آپ کیلئے کرتا ہی ہوں۔

اسی کو میں نے عرض کیا تھا کہ آخر آخر مولانا نعمانی مدظلہ کے تعلقات حضرت مصلح الامۃؒ سے دلی اور محبت کے ہو گئے تھے۔

(حضرت مصلح الامۃ کی اصلاحی مساعی)

حضرت والا کے مسند ارشاد پر فائز ہونے اور اصلاحی کام کے شباب پر ہونے کا ذکر کر رہا تھا درمیان میں حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ العالی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن صاحب ندوی مدظلہ کے بعض تأثرات کا جو انھیں کے قلم سے لکھے ہوئے تھے ذکر آگیا اس کے بعد پھر اپنا سلسلہ کلام سابق سے جوڑتا ہوں۔

حضرت مصلح الامۃ رح کی خانقاہ فتحپور میں طالبین اور سالکین کا ایک مجمع ہر وقت ہی رہا کرتا تھا، اعظم گڈھ کے دیہات اور قصبات کے علاوہ اطراف کے شہروں سے بھی جوق در جوق لوگوں کی آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ گورکھپور، غازیپور، بنارس' بلیا' دیوریا، جونپور اور الہ آباد کے علاوہ دور دور مثلاً کلکتہ 'کٹک، مدراس اور بھوپال وغیرہ سے بھی لوگ آنے لگے تھے، خانقاہ دو منزلہ بن چکی تھی' مسجد کی توسیع ہو چکی تھی، جمعرات اور اتوار کو باوجود اس وسعت کے بھی خانقاہ میں جگہ نہ رہ جاتی اس لئے زیادہ تر لوگ مسجد ہی میں آکر ٹھہرتے اور بعد ظہر مجلس میں شرکت کر کے بعد عصر واپس ہو جاتے اور یہ لوگ اطراف وجوانب کے ہوتے تھے طلبہ اور مدرسین کو پنجشنبہ کو موقع ملتا تھا اور اتوار کو مئو کا بازار بند ہونے کی وجہ سے اکثر وبیشتر لوگ اس اطراف کے اسی دن کو اپنی حاضری کے لیے مخصوص کئے ہوئے تھے اس طرح سے ہر طبقہ کو حضرت والا کی مجلس سے استفادہ کا موقع ملتا تھا اور خود حضرت رح کی نظر عوام وخواص سب ہی کی اصلاح پر تھی۔ چنانچہ عوام کی اصلاح کے لئے واعظین اور دُعاۃ کا بند وبست فرمایا اور قاری ریاست علی صاحب مرحوم مولوی محمد امین صاحب مرحوم مفتی نظام الدین صاحب مدظلہ' اور مولوی عبد الحکیم صاحب مدظلہ کو فتحپور اور اسکے اطراف جوانب کی بستیوں میں وقتاً فوقتاً وعظ کے لئے بھیجنا شروع فرمادیا۔ فتحپور میں تو خود حضرت رح ہی کی ذات موجود تھی یہاں کے لوگوں کو جمع فرما کر دین ودیانت کی ترغیب' اتفاق واتحاد کے ساتھ رہنے کا مشورہ اور دوسری جگہوں کے لوگوں کے لئے دین کا ایک عمدہ نمونہ بننے کی برابر ترغیب دیا کرتے تھے اور یہ فرمایا کرتے تھے کہ "میں اپنی بستی میں کچھ کام نکروں اور دوسری جگہ جاکر

ان سے دین کا مطالبہ کروں مجھے اس سے بہت شرم آتی ہے ہاں پہلے اپنے یہاں کچھ کام کرلوں تو پھر دوسری جگہ کہنے سننے کی ہمت پڑسکتی ہے اور وہ لوگ اسکی وجہ سے اثر بھی قبول کریں گے" اسکے لئے اصول تنظیم مقرر فرمائے اور انکو آنے جانے والوں کو سنائے بعضوں کو لکھوائے کہ لوگ بات کو خوب سمجھ لیں۔ چنانچہ اسی زمانہ میں یہ چند اصول ذریں مرتب فرمائے۔

اصول تنظیم

ا۔۔۔ "ہمارا کام آج اس لئے خراب ہوا کہ ہم میں کوئی تنظیم نہیں، ہمارا کلمہ مجتمع نہیں ہر شخص اپنی رائے میں آزاد ہے کوئی کسی کا اتباع کرنا نہیں چاہتا غیروں کو جانے دیجئے خود مریدین کو دیکھئے کہ اپنے مشائخ کی کامل اتباع نہیں کرتے اب آپ ہی بتائیے کہ جب کوئی مرید ہی اپنے شیخ کی بات نہ مانے گا تو اسکی آواز میں کیا قوت اور اسکے فعل میں کیا اثر ہوگا۔ لوگ اس بات کو تو دیکھتے نہیں اور کام بھی چاہتے ہیں، کسی کام کے جو اصول و شرائط ہیں انھیں اختیار نہیں کیا جاتا تو پھر کام ہو تو کیسے ہو؟

حدیث شریف میں حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی بیعت کا تذکرہ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات "بیعت" کے معنیٰ "کامل حوالگی" کے سمجھتے تھے اور اسکے بعد پھر اپنی رائے اور اپنے ارادہ کا نام تک نہ لیتے۔ حضرت عُبادۃ بن الصامت رضؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی کہ (آپ کی تمام باتیں) سنیں گے اور آپ کی اطاعت کریں گے تنگی میں بھی اور آسانی میں بھی، نشاط والے امور میں بھی اور ان امور میں بھی جو نفس پر شاق ہوں اور اس بات پر بھی کہ اگر کسی امر میں (مثلاً تقسیم غنائم یا تفویض مناصب میں) ہمارے غیر کو ہم پر ترجیح دی جائیگی تو ہمکو کوئی ناگواری نہ ہوگی (ہم دل سے اس پر راضی رہیں گے) اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم کسی معاملہ میں اس کے اہل سے منازعت نہ کریں گے اور جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت

کرنیوالے کے ملامت کی پرواہ نہیں کرینگے۔

آج اپنا حال دیکھئے کہ شیخ اگر کوئی کام کسی کے حوالہ کردے تو دوسروں کو اس شخص پر حسد اور شیخ کے فعل پر دل ہی دل میں انکار ہوتا ہے" —— تنظیم کا جو پہلا زینہ ہے وہی درست نہیں ہے

۲ —— آج مسلمانوں کا کام اسلئے بھی خراب ہو رہا ہے کہ لوگ مل جل کر کام نہیں کرتے اور کوئی شخص کوئی کام اٹھاتا ہے تو دوسرے لوگ اس کی پوری طرح اعانت نہیں کرتے اور وجہ اسکی یہ ہوتی ہے کہ لوگوں میں خلوص تو ہوتا نہیں دیکھتے ہیں کہ کام ہم کرتے ہیں اور نام دوسرے کا ہوتا ہے اسلئے علٰحدہ رہتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی مقام پر کسی ایسے شخص کے ذریعہ کام ہو رہا ہو تو وہاں کسی شخص میں حرکت ہوتی ہے کہ میرے یہاں یہ اپنا اثر پیدا کرلیں اور میں منھ دیکھتا رہ جاؤں اسلئے اسکا اثر زائل کرنے کے لئے خفیہ ریشہ دوانی شروع کر دیتے ہیں حالانکہ اس سے پہلے کبھی انکو اسکی ہوس بھی دل میں نہیں گذرتی اگر اخلاص ہوتا تو سوچتے کہ مقصود کام ہے نہ کہ نام اور یہ تو بہت اچھا ہے کہ کام میں ہماری شرکت ہو اور نام نہو، ہم اسکی وجہ سے ریا و نمود سے بچ جائیں گے ہمارے اجر میں اضافہ ہوگا اور جس کا نام ہو رہا ہے وہ تو آزمائش میں پڑ گیا، اگر اپنے کو نہ سنبھالا تو اجر سب برباد ہو جائیگا اور نام و نمود کا جو وبال ہوگا وہ الگ رہا

ایک وجہ لوگوں کے اعانت نکرنے کی یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کو کام کرنیوالوں سے حسد ہوتا ہے اور وجہ اسکی او پر گذر چکی ہے یہی انکو حمایت سے باز رکھتا ہے۔

۳ —— مسلمانوں کی جو حالت آج درست نہیں ہو رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہر بستی، ہر گاؤں، ہر قصبہ اور ہر شہر میں کچھ اہل علم حضرات یا چودھری صاحبان یا (وکیل اور) طبیب صاحبان ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں کا ہر ایک طالب جاہ ہوتا ہے اور ان میں آپس میں اقتدار کی لڑائی ٹھنی رہتی ہے، رہے ہمارے عوام الناس تو انمیں سے جس کسی کو جس سے عقیدت اور مناسبت ہوتی ہے اسکے ساتھ ہو جاتا ہے اس پر ساری قوم ٹولیوں ٹولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور انکے اتفاق و اتحاد کا شیرازہ بالکل

منتشر ہو جاتا ہے پھر کوئی کام سکون واطمینان کے ساتھ نہیں ہو پاتا۔

اس خرابی کی اصلاح کی یہی صورت ہے کہ پہلے ان مقتداؤں میں اتفاق ہو اور ایک دوسرے کی شکایت نہ کرے، اور اپنے معتقدین سے نہ دوسروں کی شکایت کرے نہ ان سے دوسروں کے معتقد فیہ کی شکایت سنے اور اگر کوئی کسی کی شکایت کرے تو سختی سے زجر کرے بلکہ اسکو اپنے یہاں سے نکالدے۔

۴ ــــــــ ایک خرابی آج مسلمانوں میں یہ ہوگئی ہے کہ لوگ ٹولی ٹولی میں تقسیم ہو گئے ہیں اور ہر شخص اپنی ٹولی کو بڑھانا چاہتا ہے یہ چیز نہ صرف یہ کہ عوام ہی میں پائی جاتی ہے بلکہ اس سے متجاوز ہو کر مدارس اور خانقاہ تک میں بھی موجود ہے اب لوگ مشائخ کے یہاں بھی جاتے ہیں تو اسلئے نہیں کہ انکا اتباع کریں گے بلکہ اس لئے کہ شیخ کو بھی اپنی ٹولی میں شامل کرنا چاہتے ہیں، الا ماشاء اللہ چاہتے یہ ہیں کہ مشائخ ہمارا اتباع کریں اور ہم انکی اتباع نکریں۔

۵ ــــــــ اس زمانہ میں عام طور پر دیکھا جاتا ہے اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ بعض لوگوں کو اپنے مقتداؤں پر اعتماد کم ہوتا ہے اور اعتماد کی کمی اعتقاد کی کمی سے ہوتی ہے۔ رائے میں، امانت میں اور مسلمانوں کی بہبودی پیش نظر رکھنے میں انکو اپنے برابر بھی نہیں سمجھتے۔ فواہ واو یلاہ و یا حسرتاہ۔

نیز اس زمانہ میں سب سے اہم مسئلہ مسلمانوں میں اتفاق واتحاد کا ہے۔ سب سے اہم چیز یہ ہے کہ مسلمانوں میں اتفاق واتحاد پیدا کرنے کی اور باقی رکھنے کی کوشش کیجائے اور یہ صرف اسی طور پر ہوسکتا ہے کہ دوسروں کی نسبت حسن ظن رکھا جائے اور زبان بند رکھی جائے اور طعن وتشنیع، اعتراض وانکار اور سب وشتم سے غایت درجہ اجتناب کیا جائے بالخصوص مجالس ومحافل میں لیکن آج ہم ان دونوں امر کے شکار ہیں (یعنی نہ ہم میں اتحاد ہے نہ دوسروں کے ذکر سے ہماری کوئی مجلس ہی خالی ہے۔)

(۶) ــــــــ آج مسلمانوں کی زندگی کا نہ کوئی اصول رہ گیا ہے نہ ان کے سامنے کوئی نصب العین ہی ہے، نہ کوئی نظام ہے اسلئے وہ ادہر ادہر دوسری جماعتوں

میں داخل ہوتے پھرتے ہیں، انکو اپنے گھر کی بھی خبر نہیں ؎

یک سبد پر ناں ترا بر فرق سر　　　　تو ہمی جوئی لب نان در بدر

قاعدہ ہے کہ "جس شخص کی اپنے گھر عزت ہوتی ہے وہ جہاں بھی جاتا ہے معزز ہی ہوتا ہے اور جس کی خود اپنے گھر ہی میں عزت نہ ہوئی وہ ہر جگہ ذلیل وخوار رہتا ہے" دیکھئے جو شخص اپنے گھر کا رئیس ہوتا ہے جہاں جاتا ہے اسکی خاطر تواضع کیجاتی ہے اور فقیر در در گھومتا ہے مگر کوئی ایک ٹکڑا روٹی کو بھی نہیں پوچھتا۔ اسی طرح آج مسلمان کا حال ہے کہ اپنے دین ومذہب سے بالکل غافل ہیں اسلئے کہیں بھی انکی قدر نہیں ہے

عزیزے کہ از در گہش روبتافت　　　　بہ ہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

(وہ ایسا عزیز اور غالب ہے کہ جس شخص نے بھی اسکی درگاہ سے منہ موڑا تو پھر وہ جہاں بھی گیا اسکو عزت نہیں ملی)

اگر دین کو مضبوطی سے پکڑے ہوتے تو جہاں کہیں جاتے انکی عزت ہوتی۔

(۷) ——— نوجوانوں کو معاملات اور اخلاق کی درستی کیطرف متوجہ کریں اور اسکی نگرانی رکھیں، اہم چیز معاملات کی اصلاح ہے کیونکہ سارے جھگڑے اسی (بد معاملگی) سے پیدا ہورہے ہیں۔ لیکن معاملات سے بھی اہم اخلاق کی اصلاح ہے۔ اخلاق کی اصلاح کی صورت میں بدمعاملگی کی نوبت ہی نہ آئیگی کیونکہ بداخلاقی ہی کی فرع بدمعاملگی ہے (جب اصل ہی موجود نہ ہوگی تو فرع کا تحقق کیونکر نہ ہوگا۔)

۸ ——— اہل اسلام کو چاہیئے کہ اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام کریں اور ہر شخص کے ذمہ لازم کردیں کہ وہ اپنے بچوں کو اتنی مقدار میں تعلیم دین ضرور دلائے جس سے وہ اپنی آئندہ زندگی میں اپنے دین وایمان سے ناواقف نہ رہیں اور جو بچے دنیوی تعلیم مثلاً (انگریزی یا ہندی) حاصل کررہے ہیں انکے لئے بھی انکے اوقات تعلیم کے علاوہ کوئی وقت مقرر کیا جائے جس میں وہ دین سیکھیں۔"

ان اصول کو عوام میں ترویج دینے کے ساتھ ساتھ علماء اور خواص پر بھی

نظر ہی اور مدرسین اور طلبہ کی اصلاح سے بھی غافل نہیں رہے کیونکہ حضرت اقدس
یہ سمجھتے تھے کہ اصلاح کا کام تو علماء ہی کر سکتے ہیں لیکن کب جبکہ وہ اپنی اصلاح خود
کر چکے ہوں اور رذائل نفس سے چھوٹ چکے ہوں اور اسکے عارف ہو چکے ہوں ورنہ تو
ع "خویشتن گم است کرا رہبری کند" کا مصداق ہوگا۔ چنانچہ ایک بڑے مدرسہ کے
بڑے عالم کے پاس تحریر ارسال فرمائی (اس مدرسہ کے اکثر مدرسین حضرت والا ہی سے
منتسب تھے اور بستی کے عوام وخواص کا اکثر طبقہ معتقد تھا اور حضرت کو مانتا تھا) تحریر یہ گئی

"یہ تحریر یعنی پیغام ہدایت حضرت والا مدظلہ العالی کی جانب سے گو
آپ کے نام ہے لیکن مخاطب جملہ مدرسین صاحبان مدرسہ ہیں امید کہ اس مختصر تحریر
کو کافی سمجھتے ہوئے اپنے اپنے حالات کا جائزہ لیں گے اور از سر نو
عزم اور اخلاص سے کام لیتے ہوئے اپنے مشاغل میں نہایت سکون و
اطمینان کے ساتھ لگے رہیں گے۔

اولاً: یہ سمجھئے کہ اصل چیز اخلاص ہے اسکے پیدا کرنے کی اور اسمیں
اضافہ کی برابر سعی کرنی چاہیے۔ ہر معاملہ میں اسکو پیش نظر رکھا جائے کہ ہمارے
اخلاص کا کیا تقاضا ہے اور اسکی رو سے ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

ثانیاً: مسلمانوں کے بچے جو مدرسہ میں آتے ہیں یہ قوم کی بیش بہا
امانتیں ہیں ہمیں انکا حق ادا کرنا چاہیئے ہماری ہی توجہ سے یہ کچھ بن سکتے
سکتے ہیں اور ادنیٰ عدم توجہی سے انکا ناقابل تلافی نقصان ہو سکتا ہے
ہر طالب علم کے متعلق یہ خیال ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیئے"

(راقم عرض کرتا ہے کہ یہ جو فرمایا کہ "انکا ناقابل تلافی نقصان ہو سکتا ہے" وجہ بالکل ظاہر ہے
کہ آج اسلام کے یہی ٹوٹے پھوٹے عربی دینی مدارس سے جو لوگ پڑھکر نکلتے ہیں آئندہ
چل کر یہی لوگ قوم کے دینی پیشوا ہوں گے کیونکہ نہ کوئی دوسرا دین کی تعلیم پڑھتا ہے
نہ اسکی ضرورت محسوس کرتا ہے تو جب اساتذہ کی بے توجہی سے یہ نونہالان اسلام
کج روی اختیار کرلیں گے اور راہ سے بے راہ ہو جائیں گے، دین کی اشاعت اور

اور دھن کی جگہ "الکشنی انداز" پیدا ہوجائے گا اور "اقتدار کی ہوس" قلوب میں جاگزیں ہوجائیگی تو پھر جس منصب کے لئے انھیں تجویز کیا گیا تھا اور جو کام ان سے متوقع تھا ظاہر ہے کہ وہ خاک حاصل ہوسکے گا اور ان حالات کے ساتھ وہ اگر کچھ پڑھ لکھ بھی لیں گے تو بقول حالی مرحوم ع " وہ کھوئے گئے اور تعلیم پاکر" اور بقول حضرت انور شاہ کشمیریؒ "یہ لوگ عالم جاہل ہوں گے" اور حسب ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم فضلوا و اضلوا کا مصداق ہی ہوں گے ۔ یہی ہے وہ ناقابل تلافی نقصان جسکا اندیشہ حضرت مصلح الامۃؒ فرما رہے تھے ۔ افسوس کہ حضرت کا یہ اندیشہ صرف اندیشہ ہی نہیں رہا بلکہ ہماری شامت اعمال نے ہمکو آج وہ دن دکھائی دیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون ۔

بس اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہے مدارس دینیہ کی صلاح و فلاح اور اصلاح غالباً سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے خواص امت کو خطاب کرکے فرمایا تھا یا ملح الارض اصلحوا اے وہ لوگو جو بمنزلہ نمک کے ہو خود اپنی اصلاح کرلو کیونکہ ہر نمکین چیز کا ذائقہ نمک ہی سے درست ہوا کرتا ہے لیکن اگر کہیں نمک ہی فاسد ہوجائے تو پھر اسکی اصلاح کی کوئی صورت نہیں یہ تھا وہ ناقابل تلافی نقصان جسکا رونا حضرت مصلح الامۃؒ رو رہے ہیں)

ثالثاً: "آپ حضرات کے باہمی اخلاق کا اثر طلبہ پر ضرور پڑے گا اور دوسرے لوگ بھی اپنے بچوں کے مستقبل کو آپ ہی کے آئینہ میں دیکھیں گے چنانچہ عوام کا اپنے اپنے بچوں کو عربی پڑھانا اور آپ ہی کے مدرسہ میں پڑھوانا آپ ہی حضرات کے اخلاق پر موقوف ہے ۔ لہٰذا اخلاق کے اس قحط کے زمانہ میں اہل مدارس کو اخلاق نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مکمل نمونہ ہونا چاہیئے اس میں جو صاحب جتنی زیادہ بھی ترقی کرسکیں کریں ۔"

(راقم عرض کرتا ہے کہ یہ جو فرمایا کہ "دوسرے لوگ بھی اپنے بچوں کے مستقبل کو آپ کے آئینہ میں دیکھیں گے" مطلب یہ ہے (واللہ تعالیٰ اعلم) کہ ہر انسان اپنے بچے کو اسی شاہراہ پر لگانا چاہتا ہے جس کو وہ بہتر سے بہتر سمجھتا ہے چنانچہ آج قوم کا جوق درجوق

کیا لڑکے اور کیا لڑکیاں ہر ایک کا دنیوی تعلیم کیجانب رخ کرنا بھی اِسی امر کی ایک کڑی ہے کہ لوگ دنیوی تعلیم میں نفع عاجل (فوری نفع) دیکھ رہے ہیں کہ اسے پڑھکر کوئی انجینیر، کوئی کمشنر کوئی جج کوئی کلکٹر کوئی وکیل کوئی ڈاکٹر کوئی پروفیسر کوئی ٹیچر ورنہ کم از کم کلرک تو ہو ہی جاتا ہے اور عربی تعلیم میں انتہائی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بھی ہو سکتا ہے کہ ایک کلرک کی تنخواہ سے اسکی تنخواہ کم ہی ہو اسلئے کون اپنے لخت جگر کو فقیر بنانا پسند کر سکتا ہے عوام کے اسی جذبہ کی ترجمانی کرتے ہوئے اکبرؔ مرحوم نے کہا تھا کہ ؎

نہیں پرسش ہے اسکی طاعتِ اللہ کتنی ہے ؟ یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے؟

لیکن یہ اس طبقہ کا حال ہے جسکے نزدیک بس دنیا ہی دنیا ایک چیز ہے ۔ اخلاقی اقدار اللہ تعالیٰ کی طاعت، خصلت نیک اور دینداری، دیانت وامانت، خدمت خلق وغیرہ سے اتصاف ان کے نزدیک کوئی قابل قدر چیز نہیں۔ تاہم دنیا ابھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہے جنکے نزدیک دنیا کی ضرورت تو ہے لیکن دین کی وقعت ان کے یہاں ابھی دنیا سے زیادہ ہے اور وہ اہل دنیا کی (دنیا کی بہتات کے باوجود) بداخلاقیوں سے تنگ آکر وہ راہ نہ خود چلنا چاہتے ہیں نہ اپنی اولاد کے لئے پسند کرتے ہیں اور اکبرؔ مرحوم کے اس شعر کو دل سے پسند کرتے ہیں

انھوں نے دین کب سیکھا ہے رہ کر شیخ کے گھر میں پلے کالج کے چکر میں مرے صاحب کے دفتر میں

چنانچہ اپنے بچوں کے لئے یہ درجہ انھیں قطعی ناپسند تھا اس لئے اس سے ہٹکر اہل دین کیطرف انکا قدرے جھکاؤ ہوا دیکھا کہ ایک بچہ مکتب میں عربی پڑھ رہا ہے بڑے سلیقہ کا انسان ہے نہایت مہذب اور شائستہ، پڑھنے میں محنتی، استاد کا ادب بیحد، ماں باپ کی خدمت کے لئے مستعد نماز باجماعت کا پابند صفائی معاملہ اور صدق گفتار و کردار و احوال سے متصف نہ کسی سے لڑائی نہ باہم بھائی بہنوں میں گالم گلوج ۔ چونکہ ان صفات کی بھی اللہ تعالیٰ نے ایک قیمت رکھی ہے اسکی لالچ سے اس نے طے کر لیا کہ اپنے بچے کو دینی تعلیم دیگا کہ بلا سے میرا بچہ دنیا زیادہ نہ کما سکے گا لیکن "مال" سے بھی بڑھکر جو شے ہے یعنی "عزت" وہ اس جماعت کو نصیب ہے

چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ مدرسہ کے مولانا صاحب کس قدر بارعب اور باعزت رہتے ہیں ہر شخص کے دل میں انکی وقعت ہر شخص کے نزدیک انکا ادب و احترام۔ اس لئے میں بھی اپنے بچہ کو ایسا ہی دیکھنا چاہتا ہوں قوم کی دینی خدمت لوجہ اللہ کرے جس کا لازمی نتیجہ انکی جانب سے اکرام و تعظیم کا ہے خلق بھی خوش اور خدا بھی راضی۔

تو ملاحظہ فرمایا آپ نے ایک شخص کو دین اور دینی تعلیم کا خیال مدرسہ کے مولوی صاحب کے کردار کی خوبی، اخلاق کی بلندی اور طلبہ کے حسن تربیت کیوجہ سے ہوا اب اگر کسی دینی مدرسہ کا حال اس سے مختلف ہو جائے یعنی وہاں کے طلبہ کے یہاں صرف مطالبات کا انبار ہو اساتذہ کا ادب و تعظیم بجائے خود رہی وہاں کے ہر استاد کو اپنی عزت بچانی مشکل ہو رہی ہو اور درس حدیث میں المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ پڑھکر آنے کے بعد اسکی تکرار اس طرح کیجا رہی ہو کہ کہ باہم کسی بحث میں دست و گریباں ہو جانا تو معمولی بات ہے لاٹھی ڈنڈے وغیرہ کے استعمال میں بھی تکلف نہو تو آپ خود فرمائیے کہ اس منظر کے دیکھنے کے بعد کون شریف اور ذی حس انسان اپنے بچے کے لئے اسی ماحول کی زندگی دیکھنا پسند کرے گا اور اگر سب مدارس دینیہ اسی انداز کے ہو جائیں یہ کہکر کہ ہمارے ایک بڑے مرکزی مدرسہ کا یہی حال ہے تو پھر بتائیے دین کا کیا حشر ہوگا؟ بادی النظر میں تو یہ لاٹھی اور چاقو انسانوں پر چلتے نظر آرہے ہیں لیکن ارباب حقیقت جانتے ہیں کہ اسکے ذریعہ دین کو شکست کیا گیا اور اخلاق کو ذبح کیا گیا۔

ایک طبقہ نے تو پہلے ہی سے تعلیم دین سے بیزاری اختیار کرلی تھی، دوسرے نے اب ان حالات کو دیکھکر اس میدان میں قدم رکھنے سے کان پکڑا، اب آپ ہی فرمائیے کہ والبادی اظلم اور من سن سنۃ سیئۃ کا کیا مطلب ہوا؟ اور اگر ہمارے اس طرز سے اسلام یا تعلیم دین کو کچھ نقصان پہونچ رہا ہے تو خدا تعالیٰ کے یہاں ہمارے لئے اس سے عہدہ برآری کی کیا صورت ہے؟ اپنی ان صفات کے ساتھ ہم لوگ چشمہ کے منھ کا پتھر بن گئے ہیں کہ نہ خود اس سے پانی پیتا ہے اور نہ دوسروں کو پینے دیتا ہے۔ پھر ایسی حالت میں کسی کو دین اور دینی علم کی جانب رغبت ہو تو کیونکر ہو اور کوئی کیا نفع دیکھکر اپنے لخت جگر کے لئے دینی تعلیم تجویز کرے کیونکہ ——— "دوسرے لوگ اپنے بچوں کے مستقبل کو آپ ہی کے آئینہ میں دیکھنا چاہیں گے" ———

اس موقع پر ایک بات یاد آگئی حضرت مصلح الامۃ نے ایک دفعہ فرمایا کہ حضرت مولانا تھانوی نے اپنے کسی عزیز بچے سے پوچھا کہ میاں فلاں تمھیں انگریزی پڑھنا پسند ہے یا عربی۔ اس نے برجستہ کہا کہ عربی۔ حضرت نے پوچھا کہ کیوں اس بچے نے کہا کہ اس لئے کہ بڑے بڑے انگریزی داں ڈپٹی کلکٹر وغیرہ آپ کا جوتا اٹھاتے ہیں اور آپ کسی کا جوتا نہیں اٹھاتے یعنی آپ کو ان سب میں گویا جاہ میں تقدم حاصل ہے۔ یہ اس نے اپنے فہم کے مطابق ایک بات کہی اور اس میں شک نہیں کہ خوب بات کہی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اخلاص تو ہم لوگوں میں ہے نہیں کسی لالچ ہی سے لوگ کوئی کام کرتے ہیں مال کا خیال ہو یا جاہ کا، دین پڑھنے والوں کے لئے اول دنیا کا نفع تو اہل دنیا نے پہلے ہی ختم کر دیا تھا رہا عزت و جاہ کا نفع وہ ہم نے اپنے ہاتھوں خود ختم کر لیا ـــــ انا للہ وانا الیہ راجعون (شاید ایسے ہی حالات میں ایک مسلم کو ابھارنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ من احیا سنتی عند فساد امتی فلہ اجر مائۃ شہید جو شخص میری امت کے فساد کے وقت میں میری سنت کو زندہ کریگا اسکو سو شہید کا ثواب ملیگا)

آپ خود غور فرمائیے کہ ایسی حالت میں دین کس قدر غریب اجنبی اور کس مپرسی کے حال میں ہو جائیگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بالکل صادق آجائیگا کہ ان الاسلام بدأ غریبا وسیعود غریباً فطوبی للغرباء اسلام اپنے ابتدائی دور میں بالکل ایک اجنبی مسافر غریب الدیار سا ہو کر آیا تھا جس کا نہ کوئی شناسا ہوا اور جس سے کسی کی راہ و رسم ہوا اور آخر زمانہ میں پھر ایسا ہی ہو جائیگا۔ حالات زمانہ نے وہی دور ہمارے سامنے رکھدیا ہے۔ لیکن اسکے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ فطوبی للغرباء یعنی جو لوگ سارے ماحول کے خلاف میری سنت کو زندہ کرنے کے درپے ہوں اور دین کو اختیار کئے ہوئے ہوں ان کے لئے خوشخبری ہو جنت کی، خدا کی رضا کی، میری خوشنودی کی۔ آج یہی زمانہ ہے کہ بلاشبہ علم دین کی تحصیل کے دواعی کم بلکہ ختم ہو گئے ہیں لیکن اسکے باوجود جو اللہ کا محبوب بندہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محب امتی اس راہ کو اپنے لئے پسند کریگا وہ لائق صد مبارکباد ہے۔

انھیں حالات کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہؓ سے فرمایا کہ سنو! آج کے

وں دین کے دس حصوں میں سے اگر تم لوگ نو پر عمل کروگے اور ایک کو ترک کروگے تو ہلاک ہوجاؤگے
اور میرے بعد ایک ایسا زمانہ آئیگا کہ لوگ اگر دین کے دس حصوں میں سے صرف ایک حصہ کو اختیار کرینگے
تو کامیاب ہوجائیں گے، اسکی وجہ اس قسم کے حالات کا پیدا ہوجانا ہے کہ جس میں دین اختیار کرنا انسان
کے لئے ہاتھ میں انگارہ لینے سے زیادہ دشوار ہوگا اسلئے ناامید ہونے کی اور مایوسی کی کوئی ضرورت
نہیں ہے ہمت کے ساتھ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
ارشاد پر ایمان لاتے ہوئے اپنی جانب سے سعی و کوشش میں کمی نہ کرنی چاہیئے، حالات کو
ساز گار بنا دینا کارساز حقیقی کا کام ہے

کارساز ما بساز کار ما ۔ فکر ما در کار ما آزار ما

رابعاً : "طلبہ میں اس زمانہ میں بالعموم پست ہمتی، کم ظرفی، کم حوصلگی اور بچپن و
بزدلی کا مرض عام طور پایا جاتا ہے، شروع ہی سے ان امور کے انسداد کی ضرورت
ہے، اور ضرورت ہے کہ ان میں عالی ظرفی، بلند حوصلگی، جرأت وغیرہ پیدا کیجائے
اور غصہ و کبر، چوری و جھوٹ وغیرہ کی سختی کے ساتھ نگرانی کیجائے۔ نیز بڑے طلبہ
میں دوسرے قسم کی بداخلاقیاں جو ہوجاتی ہیں انکی طرف سے کبھی غافل نہ رہا جائے"

خامساً :- "اپنی جانب سے سعی و کوشش کے ساتھ ساتھ حق تعالےٰ
سے اعانت طلب کیجائے کیونکہ بدون انکی امداد کے ہمارے کسی کام میں برکت
نہ ہوگی اور فضل خداوندی ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہماری طرف سے تعلق و
نسبت قوی ہو جتنی نسبت قوی ہوگی اسی قدر ادھر سے اعانت عام و تام دیکھئے گا"

والسلام ۔ وصی اللہ عفی عنہ

ملاحظہ فرمایا آپنے اصلاح امت کے سلسلے میں حضرت مصلح الامۃ نے عوام کے اتفاق واتحاد
کے لئے اصول تنظیم مقرر فرمائے اور خواص یعنی علماء اور طلبہ کو الگ فرمان جاری فرمائے گئے کہ
مدرسہ میں کیا ہونا چاہئے اور کیا ہو رہا ہے۔ اہل مدارس خدا تعالیٰ کے یہاں کی بازپرس سے غافل نہ ہوں
اور یہ امر پیش نظر رکھیں کہ انکے اخلاق و کردار کا اثر متعدی ہوا کرتا ہے۔ اب انکے طلبہ میں حسن خلق،
حسن ادب، حسن سیرت پیدا ہو رہی ہے یا کچھ اور اسکے وہ خود ذمہ دار ہیں۔

اسکے ساتھ ساتھ خواص اہل سلوک سے بھی غافل نہیں ہوتے تھے حتیٰ کہ اگر کسی کو اجازت تک دیدی ہے تب بھی اسکے ہر حرکت و سکون پر کڑی نگاہ رکھتے تھے کہ "ایک انسان بڑی مشکل سے انسان بنتا ہے"۔ اسکا بھی ایک نمونہ ملاحظہ ہو ـــــ ایک جزئی غلطی پر اپنے ایک خلیفہ کو کسقدر زجر و توبیخ فرمائی جارہی ہے۔ مضمون خط سے کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والا کے کسی مجاز (خلیفہ) کے یہاں کوئی دوسرے صاحب ملنے گئے غالباً وہ بھی خلیفہ اور مجاز ہی تھے لیکن اول الذکر ذرا آن بان سے رہتے تھے اور خلافت کی ظاہری شان سے بھی متصف تھے اور ثانی الذکر ایک فانی قسم کے آدمی سادہ وضع بلکہ کچھ دیہاتی وضع و قطع رکھتے تھے جسکی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ انکی اجازت اور ان کے باطنی نظام کا علم ان اول الذکر بزرگ کو ابتک نہ رہا ہو، انھیں اول الذکر بزرگ کے نام حضرتؒ کا یہ عتاب نامہ گیا:-

"آپ کو معلوم ہے کہ میرے یہاں اخلاق کی درستگی کا کس قدر اہتمام رہتا ہے باوجود اسکے آپ نے یہ کیا کہ آپ کے یہاں ... صاحب گئے اور اپنا آدمی سمجھکر آپ سے ملے تو آپ نہایت ہی بے التفاتی اور بے توجہی سے ان سے پیش آئے اور انکو زجر کردیا (یعنی کسی بات پر انکو ڈانٹ دیا)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ تعلیم و تلقین کرنیکے اہل نہیں ہیں لہٰذا میں آپکی اجازت کو فسخ کرتا ہوں اور آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ اب آپ میری طرف سے کسی کو تعلیم و تلقین نہ کیجئے اور نہ مجھ سے) خط و کتابت رکھیئے اور نہ یہاں آنے کی زحمت گوارا کیجئے، اور دوسرے لوگوں کو بھی اس امر کی اطلاع کر دیجئے۔

(بحکم حضرت والا ۲۶ شوال ۷۰ھ) (کاپی نقل خطوط غیر مجلد ۳)

یہ تھی حضرت مصلح الامتؒ کی شان اصلاح کہ لاتاخذکم رافۃ فی دین اللہ کا گویا مکمل نمونہ تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کے زندہ فرمانے والے تھے کہ جس میں آپؐ نے مسجد کی دیوار پر نخامہ (تھوک کو) ملاحظہ فرماکر تمام صحابہؓ سے سختی کے ساتھ مواخذہ فرمایا تھا اور مارے غصہ کے چہرۂ مبارک سرخ ہوگیا تھا حتیٰ کہ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ گویا آپ کے رخسار مبارک پر انار نچوڑ دیا گیا ہو ـــــ تو یہ ناراضگی اور اتنا شدید مواخذہ اسی لئے تھا کہ توقع کے خلاف معاملہ وقوع

میں آیا تھا یعنی اللہ تعالیٰ کے گھر (مسجد) کی صفائی اور ستھرائی کا خیال تو ایک معمولی مسلمان کو ہونا چاہیئے چہ جائیکہ صحابی رسولؐ سے اس امر میں کیسے یہ چوک ہوگئی اور تاکہ سارے مجمع کو عبرت ہوجائے کہ اس جیسے امر سے اجتناب کرنا چاہیئے ۔۔۔۔ بس یہی منشار حضرات مشائخ کے مواخذات کا بھی ہوا کرتا ہے جہاں نہ بد اخلاقی کا کچھ گذر اور نہ غصہ کا کچھ سوال ۔

اب آپ خود خیال فرمائیے کہ اس تحریر کا ان صاحب پر کیا اثر ہوا ہوگا پیر تلے کی زمین ہی تو نکل گئی ہوگی اور اسوقت نفس پر کیا کچھ آرہ چلا ہوگا جب اسکی اطلاع اپنے اس حلقہ کو دی ہوگی جو کل تک سر جھکائے دست بستہ شریک مجلس ہوتے ہونگے آج ان سے یہ کہا جارہا ہے کہ میں آپلوگوں کے کام کے لائق نہیں ہوں کہیں اور تشریف لے جائیے ۔ بلا شبہ یہ ہے جہاد اکبر اور رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر کا صحیح مصداق ۔" اصلاح نفس کچھ کھیل نہیں ہے" اجازت اور خلافت کے بعد بھی انسان کے لئے اس سے غفلت روا نہیں اور کیسے ہو بھی سکتی ہے جبکہ یوسف نبی علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام یہ فرماویں کہ وَمَا اُبَرِّیٔ نَفْسِی اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ تو ایک امتی کس شمار و قطار میں ہوسکتا ہے ؟ اللہ تعالیٰ کے طالبین نے اللہ تعالیٰ کیلئے طریق میں ایسے ایسے ہزار نشتر برداشت کئے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں اسکا صلہ تام عطا فرمائے اور ایسے حضرات کے اخلاص کے طفیل میں ہمارے حال و بال کی اصلاح فرمادے ۔

بہر حال حضرت والا نے بھی انکو پیش آنے والی تکلیف کا احساس فرماکر دوسرے ہی دن راقم کو حکم فرمایا کہ فلاں صاحب کو جنکو کل ایسا ایسا خط گیا ہے تم اپنی جانب سے یہ مضمون لکھدو' حضرت والا کے بتانے پر میں نے انھیں جو خط لکھا وہ یہ تھا :-

احقر (جامی) عرض کرتا ہے (اگرچہ اسکا آپ سے کچھ کہنا چھوٹا منہ اور بڑی بات کا مصداق ہے) کہ اقسام اخوت میں سے دینی اخوت سب سے زیادہ مستحکم اور قوی ہوا کرتی ہے ۔ انسان کو اپنے حقیقی بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنے کی توقع کم ہوتی ہے لیکن اپنے دینی بھائی اور پیر بھائی سے زیادہ (توقع اسکی رکھتا ہے) اب اسکے خلاف معاملہ دیکھکر انسان کو جتنی بھی تکلیف ہو کم ہے کیونکہ ایک ایسے محل سے اسکا وقوع ہوگا جہاں سے توقع نہیں ہوتی' خاصکر اس شخص کو اور بھی زیادہ

تکلیف ہوگی جبکو مساویانہ درجہ بھی حاصل ہے۔ اس لئے آپ جیسے مردم شناس اور قدرداں حضرات سے واقعی تعجب ہے کہ ایک شخص کے بارے میں یہ معلوم ہوجانے کے باوجود کہ یہ بھی (ہمارے) شیخ کو اخلاص کے ساتھ ماننے والا ہے اس کے ساتھ ایسی بے اعتنائی کیونکر وقوع میں آئی۔ رہا کسی کا ظاہری وضع میں سادہ اور دیہاتی ہونا تو حقیقت بیں حضرات کی نگاہوں میں کوئی چیز نہیں لہٰذا بہت ممکن ہے کہ جسے ہم دیہاتی سمجھتے ہوں وہ بھی ہمارے ہی مرتبہ کا ہو، یہ احتمال آپ کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ گیا، میرا خیال ہے کہ سب سے بڑی چوک آپ سے یہی ہوئی

راقم جامی، ۲۰ شوال سنہ ھ

ملاحظہ فرمایا آپ نے ایک خاص بلکہ کہنا چاہیئے کہ اخص الخواص سے ایک اخلاقی لغزش پر کتنا سخت مواخذہ فرمایا۔ عبادت کی کمی اور کوتاہی کو حضرت معاف فرما دیتے تھے لیکن اخلاقی گراوٹ کو بالکل برداشت نہ فرماتے تھے کہ حسن اخلاق ہی سے متصف ہونا تو تصوف کہلاتا ہے۔ آدمی صوفی ہوکر پھر بدخلق ہو حضرت اقدس کی تعلیمات میں اسکی گنجائش نہیں تھی۔"

بہرحال باب اصلاح میں نہ کسی عزیز و قریب کے لئے رعایت تھی نہ خلیفہ کے لئے استثنار تھا اسکو حضرت والا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے اور خود کو اس سلسلہ میں خدا کے یہاں جوابدہ خیال فرماتے تھے اسلئے جو بھی ہوتا اسکو اس بارے میں کھرا کھرا پرچہ پڑھنا ہی پڑتا تھا۔

ایک عربی مدرسہ کے ایک ناظم صاحب نے ایک جدید جماعت اور اسکے موجد کی کتابوں کے مطالعہ کے بارے میں حضرت سے دریافت کر لیا اسکا جو جواب مرحمت فرمایا گیا ملاحظہ ہو تحریر فرمایا کہ:-

"نہایت افسوس کی بات ہے کہ عالم ہوکر اور ایک ادارے کے ناظم و مہتمم ہوکر بھی حق و باطل کی ابتک تمیز نہ ہوسکی اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کی کتابوں اور مواعظ کو دیکھنے سننے والا اتنا فیصلہ نہ کرسکے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ حضرت قدس سرہٗ کے مقابل یہ شخص آفتاب کے مقابل ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا پھر

آپ لوگوں کے دل میں اسکی اتنی اہمیت کیوں ہے ؟"

والسلام، وصی اللہ عفی عنہ

دیکھئے ایک جملے میں اپنے خیالات اور اس جماعت کے متعلق اپنے نظریئے کی کیسی ترجمانی فرمادی جس کے لئے لوگ بڑی بڑی تصانیف لکھ ڈالتے ہیں۔ اب جو لوگ حضرت حکیم الامۃ یا حضرت مصلح الامۃ کے ماننے والے ہیں اور جنکو ان سے اعتقاد ہے ان کے لئے اس سلسلہ میں بس اتنا ہی کافی ہے۔ یہ بزرگ سائل مدرسہ کے مہتمم تھے (حضرت سے مرید رہے ہونگے) اس لئے ایسا سخت انکو لکھا کہ آپ لوگوں کو دوسروں کی رہنمائی کرنی چاہیئے اور جب آپ خود ہی ریب و تردد میں پڑ جائیں گے تو عوام کا تو بیڑا ہی ہو جائے گا، اپنے منصب کو سمجھئے اور اپنے علم کو بروئے کار لائیے یہ کیا کہ عوام کیطرح اس قسم کی باتوں میں آپ بھی دوسروں کے محتاج ہیں۔ اس طرح گویا انکو کام پر ابھارا گیا۔

حضرت اقدسؒ کی شہرت کی وجہ سے کبھی لوگ نہایت اہم سوالات امت کی صلاح و فلاح کے سلسلے میں حضرت سے کرلیا کرتے تھے بعض دفعہ سائل دنیوی وجاہت کی رو سے بڑا شخص ہوتا تھا لیکن حضرت والا سے وہ تو متعارف ہوتا حضرت اس سے بے تکلف نہوتے اس لئے ایسے موقع پر حضرت مصلح الامۃ کا انداز جواب ملاحظہ ہو لکھنؤ سے ایک صاحب نے جو سکرٹریٹ میں کسی بڑے عہدے پر مقرر تھے حضرت والا کو لکھا کہ :-

"پچھلا خط میں نے خدمت اقدس میں قریب ڈیڑھ ماہ ہوا جب لکھا تھا اور اب اتنی تاخیر کے بعد دوسرا عریضہ لکھ رہا ہوں امید ہے کہ حضرت معاف فرمائیں گے حضرت کے ارشادات عالیہ سے بڑی تقویت ہوئی گو سہل پسند طبیعت ایک آسان سے نسخے کی متمنی تھی مگر حقیقۃً یہ وسوسہ شیطانی تھا جس سے بحمداللہ اثر پذیر نہوا اب کوشش یہی ہے کہ عمل صالح ہی زندگی کا شعار بنے، حضرت کی دعاؤں کا محتاج ہوں۔

یوں تو میں نے بہت سلجھی ہوئی طبیعت پائی ہے کسی چیز پر "رائے زنی" کرتے وقت روشن پہلو ہی سامنے رہتا ہے، غیبت کو عیب جانتا اور عیب جوئی سے

پرہیز کرنا طبیعت ثانیہ بن چکا ہے مگر ان دنوں عجیب الجھن میں مبتلا ہوں، دل کی بات زبان تک لاتے ہوئے ڈرتا ہوں، حضرت ہی اس معاملہ میں میری رہبری فرمائیں اور صحیح راستہ دکھلائیں۔

میرے خیال میں فی زمانہ مسلمان کے لئے فلاح و بہبود اس میں ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول پر عمل کرے اور خاموش زندگی گذار دے لیکن چونکہ مسلمان کا مقصد حیات یہیں نہیں پورا ہوتا بلکہ اسکے آگے منزلیں اور بھی ہیں مثلاً استقامت دین کے لئے جد وجہد سو جب وہ اس منزل کے لئے قدم اٹھاتا ہے تو نہ صرف اسکی دنیوی زندگی بلکہ دینی زندگی بھی متزلزل ہو جاتی ہے اور بہت کم لوگ ہیں جو اس راہ میں ثابت قدم رہ پاتے ہوں۔ فی زمانہ یہ فریضہ صرف علمار کے لئے محدود ہو کر رہ گیا ہے مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ انکی بڑی تعداد (الا ماشار اللہ) ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کی عادی ہے ایک دوسرے کو گمراہ اور دوسرا اسے کافر تک کہنے سے نہیں چوکتا۔ نام ونمود کی خواہش، دنیا کی چاہت، خودنمائی اور خود پرستی۔ ریار اور غیبت کون سا عیب ہے جس کے وہ مرتکب نہیں ہوتے اپنے اپنے طور پر عوام کے سامنے نیا نیا اسلام پیش کرتے ہیں کبھی غیر مسلموں سے مناظرے ہوتے تھے اب آپس میں ہوتے ہیں وہ لڑتے ہیں اور بیچارہ مسلمان سیدھا سادہ ہکا بکا رہ جاتا ہے کون ہے جو اسکی رہنمائی کرے؟ وہ کیا کرے اور کہاں جائے؟ یہ باہمی فرقہ بندی، اہل قرآن اور اہلحدیث کے جھگڑے جماعت اسلامی اور دیگر علمار کا ٹکراؤ یہ سب کیا ہے؟ اگر مدعا و مقصد ایک ہی تو اشتراک عمل کیوں نہیں کرتے، دین تو روز روشن کی طرح عیاں ہے مگر اسکے برتنے کی راہیں نت نئی بنکر سامنے آتی ہیں اور ہر رہبر اپنی برتری کا دعویدار ہوتا ہے، بیچارے عوام اندھوں کی طرح پیچھے لگ جاتے ہیں اور اس طرح جماعتی کشمکش میں مبتلا ہو کر دین کی اعلیٰ قدروں سے کوسوں دور ہو جاتے ہیں

اسلام کی شان تو ان سب سے بالاتر ہے۔ خواص و عوام اور عالم و جاہل سب کے سمجھنے سمجھانے کا وافر ذخیرہ ہر زمانے میں موجود رہا ہے مناسب تو یہ تھا کہ انھیں کی تشریح و توضیح کیجاتی۔ آج اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ وہ اسلام جو اپنی سادگی کے سبب مقبول ہوا ان اغراض پرستوں کے ہاتھوں غیر مسلموں کیلئے اور گنجلک بن کر رہ گیا ہے۔

حضرت! یہ خیالات میں جو اکثر و بیشتر پریشانی کا سبب بنتے ہیں۔ سوچتا ہوں اور کڑھتا ہوں۔ صالح علماء اور بزرگان دین کی موجودگی سے انکار نہیں مگر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیوں انکا فیض عام نہیں؟ للہ میری رہبری فرمائیے اور دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ دین حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمادیں"

ناچیز۔۔۔۔۔
سول سکریٹریٹ ۔ لکھنو

دیکھئے کتنا زبردست خلجان ہے جسمیں یہ حضرت مبتلا ہیں اور ایک یہی کیا آج ایک دنیا اسی میں مبتلا ہے اسکا حل تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی فہم سلیم اور طبع مستقیم سے کسی کو نوازدے تو سارے خلجانات کا خاتمہ ہو جائے ورنہ انسان تو ایک معمولی سے خار میں الجھکر زندگی ختم کردے اور اس سے نہ نکل سکے۔ بس حق تعالیٰ کیجانب انابت اور ان ہی سے طلب ہدایت و استقامت صحیح طریق ہے اور بالعموم اس قسم کے خلجانات جن لوگوں کو پیش آتے ہیں انکی نظر اپنے سے زیادہ دوسروں پر ہوتی ہے، اگر وہ خود اپنے حالات کا جائزہ لیں اور یہ سمجھیں کہ انھیں کیسا ہونا چاہیے اور وہ ویسے کیوں نہیں ہیں؟ کیا کرنا چاہیے اور کیوں نہیں کر رہے ہیں تو جو رکاوٹیں وہ اپنے لئے تجویز کریں گے اسی سے انشاء اللہ تعالیٰ دوسروں کا حال معلوم کرسکیں گے۔ پھر اپنے پر تو اختیار بھی ہے جب ہم ہی درست ہو رہے ہیں تو دوسروں کا کیا شکوہ اُن پر تو ہمارا اختیار بھی نہیں ہے لیکن حضرت والا نے اس نوع کا کوئی جواب انھیں نہیں مرحمت فرمایا بلکہ تواضع کی خاص شان کے ساتھ انکی عقیدت کو ٹٹولا کہ مجھ سے جو یہ بات دریافت فرما رہے ہیں تو میرے کہنے کی تصدیق بھی کریں گے؟ مجھ پر اعتماد بھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ ظاہر ہے کہ بدون اعتقاد اور اعتماد

کے کسی کی کوئی بات نہ وقیع ہوگی نہ لائق عمل پھر سوال و جواب سے فائدہ؟ بہرنوع حضرت اقدس نے ان صاحب کو جو جواب مرحمت فرمایا وہ ملاحظہ فرمائیے، انکو لکھا کہ:-

"آپ کا عنایت نامہ ملا اسکو پڑھکر آپ کے خلجانات کا علم ہوا آپ نے اس سلسلہ میں مجھ سے جو رہبری کی خواہش کی ہے اور صحیح راستہ دکھانے کی خواہش کی ہے یہ محض آپ کا حسن ظن ہے میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ اپنے کو اسکا اہل نہیں سمجھتا لیکن آپ کی اس طلب پر یہ مشورہ ضرور دونگا کہ اس قسم کے اہم سوالات بذریعہ تحریر حل ہونے نہایت دشوار ہیں لہٰذا اسکا آسان طریقہ یہ ہے کہ کسی محقق متدین عالم کی خدمت میں جاکر ان سے زبانی حل کرلیا جائے بشرطیکہ انپر اعتقاد ہو اور انکے کہنے پر اعتماد ہو اور ایسے حضرات کا وجود اب بھی بحمداللہ معدوم نہیں گو کم ہے یوں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں اور اپنے نیز جملہ مسلمانوں کی ہدایت کے لئے آپ سے بھی دعا کا طالب ہوں

والسلام۔ وصی اللہ عفی عنہ"

میں نے ابھی اوپر جو عرض کیا کہ ایک یہی بزرگ نہیں بلکہ آج ایک دنیا اسی الجھن میں گرفتار ہے کہ آخر جب ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی ہدایت، کتاب وسنت موجود ہے اور اور اسکے پیش کرنیوالے علمائے حق بھی ہیں تو پھر امت کو ہدایت کیوں نہیں ہوتی؟ اسکا جواب ہر دور میں مشکل رہا ہے اور صرف اللہ تعالیٰ ہی جسکی فہم و بصیرت کھولدے اسی کیلئے تو آسان ہے باقی ہر شخص کو اس سلسلہ میں جلدی اور بآسانی مطمئن کرنا مشکل ہے۔ اسی ضیق کو حضرت مصلح الامۃ نے ایک موقع پر بیان کرکے اسکے ازالہ کی سعی فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں کہ:-

"یہ زمانہ جہالت و گمراہی کا ہے لوگ اپنے باپ دادا کے رسمی دین کے پابند ہوگئے ہیں اب ایسے وقت میں انکو صحیح اور حقیقی دین پر لانا کوئی آسان کام نہیں ہے، اسکے لئے ضروری ہے کہ انکو پہلے دین سمجھایا جائے اور انکے شک و شبہات کو دور کیا جائے اور اسمیں انکے فہم اور استعداد کی رعایت کرنی ہوگی مختصر اور اجمالی کلام ان کے لئے

مفید نہیں ہوگا چنانچہ میں کرتا ہوں کہ ایک بات کو خواہ مکرر سہ کرر کیوں نہ کہنا پڑے کہتا ہوں اور کوشش اس امر کی کرتا ہوں کہ اپنی بات لوگوں کو سمجھا دوں اور انکے ذہن نشیں کرادوں

اخبار صدق میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی کا ایک مضمون دیکھا چونکہ وہ مجھ سے محبت فرماتے ہیں اور میری باتوں کو پسند فرماتے ہیں اسلئے کبھی میرے متعلق اور کبھی میری کسی بات کے متعلق کچھ تحسینی کلمات نقل اور شایع فرما دیتے ہیں، مولانا تو ایسا اپنی محبت کی بنا پر فرماتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ نقل در نقل ہو جانے کے بعد اور اختصار کے باعث میری پوری بات واضح نہیں ہو پاتی اور اسکا پورا فائدہ بھی مرتب نہیں ہو پاتا مثلاً مسلمانوں کے موجودہ حالات کے سلسلہ میں میں نے کبھی یہ کہا ہوگا کہ اسکا علاج بس ایک ہی ہے اور اسکے سوا دوسرا علاج نہیں اور وہ ہے ایمان و اتباع اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ یعنی جو لوگ اللہ کے ولی ہیں انکو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ لوگ غمگین ہونگے اور ولی کون لوگ ہیں اسکے متعلق فرماتے ہیں کہ الذین اٰمنوا وکانو یتقون دیکھئے اس میں ولایت کا طریق ایمان اور تقویٰ ہی کو فرمایا گیا ہے اور اسکا ثمرہ فلاح دارین کو ارشاد فرمایا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے طریق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں منحصر فرمادیا ہے تو یہ ایمان و اتباع خود قرآن میں موجود ہے اور مسلمان اسکا مکلف ہے کہ وہ اس پر عمل کرے اور اسی پر فلاح کا وعدہ ہے۔

لیکن جس طرح ایمان و اتباع لفظوں میں مختصر ہے ویسا مراد میں نہیں ہے کیونکہ مراد اس سے ایمان کامل اور اتباع کامل ہے اور ناقص الایمان اور ضعیف الایمان اور ناقص الاتباع اور تارک الاتباع مراد نہیں ـــ بس یہیں سے لوگوں کو مغالطہ ہو جاتا ہے کہ اتنے مسلمان موجود ہیں اور نماز روزہ بھی کر رہے ہیں مدارس و مساجد بھی آباد ہیں پھر بھی ہم اپنے کو کامیاب نہیں دیکھ رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں بیشک مسلمان موجود ہیں لیکن ہم میں سے آج کتنے ہیں جو کامل الایمان اور کامل الاتباع ہیں اور کامل الایمان ہونا

تو بجائے خود رہا آج کتنے ہیں جو ایمان کے صحیح مفہوم سے واقف ہیں۔ ایمان کے معنی لوگ بالعموم یہی سمجھتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو زبان سے پڑھ لینا لیکن آپکے علماء یہ فرماتے ہیں کہ ایمان نام تصدیق قلبی کا ہے۔ شامی میں ہے کہ الایمان وھو التصدیق بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم فی جمیع ماجاء بہ عن اللہ تعالیٰ مما علم مجیئہ ضرورۃ یعنی ایمان اسکا نام ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو چیزیں خدا تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں جنکا ہمیں یقینی طور پر علم بھی ہے ان سب میں آپؐ کی دل سے تصدیق کیجاوے اور تمام امور میں تصدیق کیجاوے آج ایمان کے یہ معنی کتنے لوگوں کو معلوم ہیں اور جنھیں معلوم ہیں ان میں سے کتنوں کا عمل اسپر ہے، دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہیں لوگ انھیں مسلمان سمجھتے اور وہ خود بھی اپنے آپ کو اس سے باہر نہیں سمجھتے ہیں لیکن اسکے ساتھ ساتھ انکے اقوال وافعال وحالات ایسے ہیں کہ جنکا اسلام کے ساتھ جوڑ لگانا مشکل ہے خدا کا انکار، رسالت کا انکار، آخرت کا انکار۔ دین واہل دین کے ساتھ استہزاء وتمسخر، مذہب کی چیزوں سے مذاق، ان سب چیزوں کی اسلام میں کہاں گنجائش ہے ایسے لوگ اس زمانے میں بہت ہیں اب انکی اصلاح محض اتنی بات سے نہ ہوگی کہ آپ ایک مضمون اخبار میں نکالدیں بلکہ کام کا طریقہ وہی متعین ہے جو ہمارے اسلاف نے کیا کہ جس بات کی ضرورت سمجھی اپنے پاس آنے جانے والوں کو مختلف عنوان سے اور مختلف اوقات میں سمجھادیا۔ اخبار وغیرہ کو اس زمانہ میں پوچھتا کون ہے اس سے مبتذل "ردی" شاید کوئی چیز ہو آج آپ کے مکان میں ہے کل بنئے کی دوکان میں۔

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس ایمان کو سبب فلاح کہا گیا ہے اس سے مراد ایمان کامل ہے اور اسکے لئے ضروری ہوگا کہ جن چیزوں سے اصل ایمان میں خلل پڑے ان سے اجتناب کیا جائے یعنی جو چیزیں مضرت تصدیق ہیں ان سے بچا جائے اسی طرح جو چیزیں کمال ایمان میں مخل ہوں ان سے بھی اپنے کو بچایا جائے اور وہ ہے اتباع شہوات قرآن شریف میں اسکی بھی مذمت وارد ہے فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ۙ (بس ان لوگوں کے بعد ایسے ناخلف لوگ ہوئے جنھوں نے کہ نمازوں کو ضائع کیا اور خواہشات نفس کی اتباع کی عنقریب وہ لوگ دوزخ میں ڈالے جائینگے)

اور یہ اتباع کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ ایمان ہی کی فرع ہے جسقدر ایمان کامل ہوگا اسی قدر اتباع کامل ہوگا اور جتنا ایمان میں ضعف ہوگا اسی قدر اتباع میں نقص ہوگا اب اتباع کا مصداق تو بہت ہی مشکل ہے اسکا مفہوم بھی لوگ نہیں سمجھتے اتباع کہتے ہیں پیروی کرنے کو اور پیروی احکام کی ہوا کرتی ہے اور اسکے لئے شرط ہے ترک منازعت، ترک رائے وعقل۔ جسکی اتباع کرنا چاہتا ہے اسکے آگے اپنی رائے وعقل کو دخل دینا یہ منافی ہے اتباع کے اتباع اس سے فوت ہوتا ہے لہٰذ جب کہا گیا کہ مسلمانوں کی فلاح اتباع دین میں ہے تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ حکم شریعت کے آگے اپنی رائے اور اپنی عقل کو قطعی دخل نہ دے کیونکہ عقل کی تقدیم شرع پر جائز نہیں۔

شیخ اکبر فتوحات میں فرماتے ہیں :۔

من ارادالدخول الی فہم غوامض الشریعۃ وحل مشکلات التوحید فلیترک مایحکم بہ عقلہ ورأیہ ویقدم بین یدیہ شرع ربہ	جو شخص شریعت کے غوامض کو سمجھنے کا ارادہ کرے اور توحید کی مشکلات کو کشف کرنا چاہے تو اسکو چاہئے کہ اپنی عقل اور رائے کے حکم کو ترک کرکے اپنے رب کی شریعت کے آگے زانو ٹیک دے۔

اسی طرح پر کشف وغیرہ کی تقدیم بھی شرع پر جائز نہیں ہے۔

واعلم ان تقدیم الکشف علی النص لیس بشئی عندنا لکثرت اللبس علی اھلہ و الاالکشف الصحیح لایأتی قط الاموافقاً لظاھرالشریعۃ فمن قدم کشفہ علی النص فقد خرج من الانتظام فی مسلک اھل اللہ اولٰئک	جانو کہ کشف کی تقدیم نص پر ہمارے یہاں تو اس کی قطعی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ اہل کشف کو التباس بکثرت ہوتا ہے ورنہ تو کشف صحیح ظاہر شرع کے موافق ہی ہوا کرتا ہے ۔ پس جس نے کشف کو نص پر مقدم کیا وہ اہل اللہ کے مسلک سے خارج ہوا اور یہی لوگ ہیں جو عمل کی رو سے خسارہ

اخسرین اعمالاً (ص۹ تنبیہ الطربی) میں پڑے ہوئے ہیں۔

تو میں نے اپنے کلام میں جس ایمان و اتباع کا ذکر کیا ہے اس سے مراد ایمان و اتباع کامل ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ آج اگر مسلمان دین کے تمام شعبوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرلیں اور آپ کی اتباع کو اپنے اوپر لازم کرلیں تو انکی حالت آج بھی بدل سکتی ہے طبیب کا کام تشخیص مرض اور تجویز نسخہ ہی ہے باقی صحت کے لئے دوا کا استعمال تو مریض ہی کو کرنا ہوگا' اگر کوئی مریض نسخہ حاصل کرکے دوا کا استعمال نکرے تو اس میں طبیب کا قصور نہیں۔ ہاں وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ دوائیں کہاں ملیں گی اور اسے کس طرح تیار کیا جائے کوئی ناصح اور شفیق طبیب ہوگا تو اسے بتادیگا جب علاج جسمانی کا یہ حال ہے تو اسی طرح علاج روحانی کو بھی سمجھا جائے۔ اب اس پر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ "تشخیص[عہ] کی صحت میں کس کو کلام ہوسکتا ہے، سوال یہ ہے کہ پھر اس پر عملدرآمد کیوں نہیں ہوتا"؟ اسکا یہ کہنا صحیح نہیں اور نہ علما اسکے ذمہ دار ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ جس طرح اس تشخیص کی صحت میں مسلمان کو کلام نہیں ہوسکتا اسی طرح ایمان و اتباع کی تحصیل اور اس پر عمل درآمد میں بھی کسی مسلمان کو کلام نہیں ہوسکتا اس چیز کو اس نے کیوں علحدہ کردیا گیا۔ باقی عمل جو نہیں ہوتا تو اسلئے کہ ایمان میں ضعف اور نقص پیدا ہوگیا ہے اور لطف یہ ہے کہ عوام سے ان کے اس مرض کو بیان بھی نہیں کیا جاتا ظاہر ہے کہ جب انکو اپنے مرض ہی کا علم نہ ہوگا تو اس سے نکلنے کی کیا فکر کریں گے البتہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں آیۃ: وَلَن يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (اور اللہ تعالیٰ نے کافرین کیلئے مؤمنین پر غلبہ کی کوئی سبیل ہی نہیں رکھی) کے تحت تحریر فرمایا ہے کہ مراد اس سے آخرت میں غلبہ ہے یا باعتبار حجت اور دلیل کے غلبہ ہے اور ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ مؤمنین سے مراد اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ ان پر کفار کو ظاہری غلبہ کبھی نہ ہوسکا بلکہ وہی غالب رہے اور اسکے بعد لکھتے ہیں و اما ظهور الكافرين على المومنين في هذا الزمان فلضعف ايمانهم و كثرة عصيانهم (ص۲۴۲ پ۵) (باقی آج جو کفار بظاہر مسلمانوں پر غالب نظر آتے ہیں تو یہ مغلوبیت ان کے ضعف ایمان کیوجہ سے اور حق تعالیٰ کی نافرمانی کی کثرت کی وجہ سے ہے)

عہ۔ "کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا الخ" دراصل یہ جملہ مولانا عبدالماجد صاحبؒ کا ہے جو انھوں نے مولانا عبدالباری صاحبؒ کے ایک مضمون میں آئے ہوئے حضرتؒ کے اس قول پر کہ "علاج بس یہی ہے ایمان و اتباع" بطور ریمارک کے تحریر فرمایا تھا کہ "تشخیص کی صحت میں کسکو کلام ہوسکتا ہے مگر الخ" جو صدق میں طبع بھی ہوچکا ہے اور معرفت حق میں بھی نقل ہے۔ جامی

اسی طرح سے ملا علی قاری بھی مرقاۃ کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ان همم اخوان الزمان قد قصرت ومجاهدهم فی تحصیل العلوم لاسیما فی هذا الفن الشریف ضعفت وهو مقتضی الوقت الذی تجاوز عن الالف وبقی ضعف العلم والعمل بل ضعف الایمان علی ضعف والله ولی دینه وناصر نبیه (بلاشبہ اس زمانے میں لوگوں کی ہمتیں قاصر ہوگئی ہیں اور علوم دینیہ کی تحصیل میں انکی کوششیں ضعیف ہوچکی ہیں خصوصاً اس شریف فن (یعنی علم حدیث کی تحصیل میں) اور ایسا ہوجانا وقت کا تقاضا بھی ہے کہ آج (نبی کا زمانہ ہزار سال سے متجاوز ہوچکا ہے اور علم وعمل کا ضعف موجود ہے بلکہ مزید براں ایمان کا ضعف بھی ہوگیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ ہی اپنے دین کا متولی اور وہی اسکا محافظ ہے)۔

عمل ایمان کے تابع ہے آدمی ایمان ہی کیوجہ سے عمل اختیار کرتا ہے اسی کو کسب کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے کسی کو اسکی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بنایا ہے جو جیسا کریگا ویسا اسکو بھگتنا پڑے گا لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (اللہ تعالیٰ نے کسی نفس کو اسکی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بنایا ہے نفس کے حق میں اسکے اعمال خیر نفع بخش اور اعمال شر مضر ہونگے) لہٰذا طریقہ تو فلاح کا ایمان واتباع ہی ہے ہاں یہ البتہ آپ دریافت کرسکتے ہیں کہ یہ چیز حاصل کیسے ہو؟ تو اسکے متعلق سنیئے:۔

اسکا طریقہ "صحبت" ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرات مشائخ اس باب میں آپ کے نائب ہیں، ان حضرات کی خدمات میں جانے سے غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ آدمی نفس اور شیطان کی منازعت سے چھوٹ جائے اور نصوص کی اتباع کرنے لگے کیونکہ اتباع کا جذبہ اور شوق اس حالت کا ثمرہ ہے جو بزرگوں کی صحبت سے انسان میں پیدا ہوتی ہے حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ شاگرد رشید حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ اور خلیفہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کا یہ ارشاد جو انھوں نے ارشاد الطالبین میں نقل فرمایا ہے ہمارے اس دعوی پر شاہد ہے

فرماتے ہیں :۔

"بے شمار لوگوں کی ایک جماعت نے جنکا جھوٹ پر متفق ہونا عقل محال سمجھتی ہے اور وہ اس قسم کی جماعت ہے کہ اسکا ہر فرد بشر تقویٰ اور علم کے باعث ایسا درجہ رکھتا ہے کہ اس پر جھوٹ کی تہمت لگانا جائز نہیں (ایسی جماعت) زبان قلم سے اور قلم زبان سے خبر دیتی ہے کہ ہمکو مشائخ کی صحبت کی وجہ سے جنکی صحبت کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچتا ہے عقائد وفقہ کے سوا جن سے وہ انکی صحبت سے پیشتر بہرہ یاب تھے، باطن میں ایک نئی حالت پیدا ہوگئی ہے اور اس حاصل شدہ حالت سے ان کے دل میں خدا اور خدا کے دوستوں سے محبت اور اعمال صالحہ کا شوق اور نیکیوں کی توفیق اور سچے اعتقادات اور زیادہ راسخ ہوگئے ہیں۔ یہی حالت ہے جسکو کمال کہنا چاہیئے اور یہی حالت بہت سے کمالات کی موجب ہے"

دیکھا آپ نے علمار نے مشائخ کی صحبت کے کس قدر فوائد بیان فرمائے ہیں اسمیں شک نہیں کہ جس کو جو کچھ ملا ہے صحبت ہی سے ملا ہے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو جو امت پر شرف حاصل ہے تو اسی صحبت کیوجہ سے۔ لیکن یہاں یہ سمجھنا ضروری ہوگا کہ جس طرح صحبت نیک مفید ونافع ہوتی ہے اسی طرح سے صحبت بد مضر بھی ہوتی ہے علمار نے لکھا ہے کہ "صحبت نیک بہتر از کار نیک اور صحبت بد بدتر از کار بد" چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے

عن جابرؓ ابن عبد اللہ مرفوعاً وموقوفاً الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ انہ قال لا تجلسوا عند کل عالم الا عالم یدعوکم من خمس الی خمس، من الشک الی الیقین ومن الریاء الی الاخلاص ومن الرغبة الی الزھد ومن الکبر الی التواضع ومن العداوة الی النصیحة (فاتحۃ العلوم للغزالی)	حضرت جابرؓ بن عبد اللہ سے مرفوعاً وموقوفاً دونوں طرح سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر عالم کے پاس نہ بیٹھا کرو بجز اسکے جو تم کو پانچ چیزوں سے نکالکر پانچ چیزوں کیطرف دعوت دے شک سے یقین کیطرف ریا سے اخلاص کیطرف رغبت فی الدنیا سے زہد کیطرف کبر سے تواضع کیطرف اور عداوت سے نصیحت کیطرف۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عالم کی صحبت بھی نہ اختیار کر لینا چاہیئے۔ اسی مضمون کو "حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ نے اپنے رسالہ "بعیت" میں بھی بیان فرمایا ہے" لکھتے ہیں کہ :۔

" وہم چنیں بقول ہر عالمی عمل کردن موجب تحیر است کہ ہر یکے صحیح الفکر و صحیح الحواس نمی باشد"

دیکھئے حضرت شاہ صاحبؒ نے کسقدر تیز فرمایا ہے" فرماتے ہیں کہ "ہر عالم صحیح الفکر و صحیح الحواس بھی نہیں ہوتا" اب ظاہر ہے کہ جب مُقتدیٰ و متبوع کا یہ حال ہوگا تو جو شخص اسکا اتباع کریگا اسکو بھی بدحواسی ہی ملے گی اسلئے صحبت اختیار کرنے کیلئے اور کسی کا انتخاب کرنے میں تیقظ سے کام لینا چاہیئے"

حدیث شریف میں اہل اللہ کے یہ اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں :۔

خیارکم من ذکرکم باللہ رویتہ وزاد علمکم منطقہ و رغبکم فی الاخرۃ عملہ (جامع صغیر ج ۲)	تم میں سے بہترین وہ لوگ ہیں کہ جنکی زیارت تمھیں اللہ تعالیٰ کی یاد دلائے اور جنکا تکلم فرمانا تمھارے علم کو بڑھائے اور جنکا عمل (طور طریقہ) تمھارے اندر آخرت کا شوق پیدا کرے۔

علامہ عبدالرؤف منادی نے فیض القدیر میں اسکی نہایت عمدہ شرح فرمائی ہے اسکو بعینہ نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ

ھذہ کلمۃ النبویۃ وافق فیھا نبینا عیسی علیھما السلام قال ابن عُیَینہ قیل لعیسی یا روح اللہ من نجالس قال من یزید فی علمکم منطقہ و یذکرکم اللہ تعالیٰ رویتہ و یرغبکم فی الاخرۃ عملہ قال الحکیم اما الذی یذکر	یہ کلمات نبویہ ہیں جنھیں ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی موافقت فرمائی ہے۔ ابن عینیہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ یا روح اللہ ہم کس کے پاس بیٹھا کریں فرمایا کہ جسکا کلام تمھارے علم کو اور جسکی زیارت اللہ تعالیٰ کی یاد کو اور جس کا علم تم میں آخرت کے شوق کو زیادہ کرے (ایسا شخص

بالله رويته فهم الذين عليهم من
الله سمات ظاهرة قد علاهم بها
نور الجلال وهيبة الكبرياء والانس
الوقار فاذا نظر الناظر اليه ذكر الله
لما يرى من آثار الملكوت عليه فهذه
صفة الاولياء فالقلب معدن
هذه الاشياء ومستقر نور
وشرب الوجه من ماء القلب
فاذا كان على القلب نور سلطان
الوعد والوعيد تاوى
الى الوجه ذالك النور
فاذا وقع بصرك اليه ذكرك
البرّ والتقوى ووقع عليك
مهابته الصلاح والعلم و
ذكرك الصدق والحق فوقع
عليك مهابة الاستقامة
واذا كان نور سلطان الله على
وجهه تادى ذكرك عظمة جلاله
وجماله واذا كان على القلب
نوره وهو نور الانوار تهتك
رويته على النقائص فشان
القلب ان يسقى عروق الوجه
ويشرقه من ماء الحياة الذى

لائق صحبت ہے)
حکیم ترمذی کہتے ہیں کہ بہرحال وہ لوگ جنکی
رویۃ اللہ تعالیٰ کی یاد دلائے سو وہ ہیں کہ جنکے اوپر
حق تعالیٰ کی جانب سے کچھ ظاہری علامات ہوں
مثلاً یہ کہ ان کے ظاہر پر بھی جلال کا نور، کبریائی کی
ہیبۃ اور انس وقار کا رعب چھایا ہوا ہوگا چنانچہ
جب کوئی دیکھنے والا انکو دیکھے گا تو اللہ تعالےٰ
کا یاد آجانا ناگزیر ہوگا اسلئے کہ وہ اسکے اوپر ملکوت
کے آثار شاہد کرے گا۔ پس اولیاء اللہ کی یہی
صفات ہوتی ہیں کہ ان حضرات کے قلوب ان
اشیاء کا خزانہ ہوتے ہیں اور مستقر اور مرکز۔ اور
چہرہ بھی قلب کے پانی سے سیرابی حاصل کئے
ہوتا ہے۔ لہٰذا جبکہ ان کے قلوب پر حق تعالےٰ
کے وعد وعید کا نور مستولی ہوتا ہے تو کبھی اس
میں سے کچھ چہرہ پر بھی چھلک پڑتا ہے تو جب
تمھاری نظر اسپر پڑتی ہے تو وہ تمھیں بھی برّ (نیکی) اور
تقویٰ کی یاد تازہ کرادیتی ہے اور تمھارے قلب
میں بھی صلاح اور علم کا ایک رعب اور ہیبۃ پڑجاتی
ہے نیز تمکو اسکی وجہ سے حق اور صدق کی
بھی یاد آجاتی ہے جس کے سبب تم پر ان حضرات
کی استقامت کا ایک دبدبہ چھاجاتا ہے، اور
جب حق تعالےٰ کے سلطان کا نور مذکورہ بالا طریق
سے ان پر جلوہ فگن ہوتا ہے تو وہ تمھیں اللہ تعالےٰ

يرطّب به و تيادى الى الوجه
منه ما فيه لاغير ذالك
فكل نور من هذه الأنوار
كان فى قلب فشربه وحبه
منه فاذا سر القلب يرضى
الله عن العبد و بما يشرق
به صدره عن وجهه
نضرةً و سرورا و اما رؤية
العالم فتزيد فى منطقه
لانه عن الله ينطق
فالناطق صنفان
صنف ينطق بالعلم
عن الصحف حفظاً
و عن افواه الرجال
تلقفا فالذى ينطق
عن الصحف والافواه
انما يلج آذانهم
عريان بلا كسوة
لانه لم يخرج
من قلب نورانى
بل من قلب دنس
و صدر مظلم مغشوش
ايمانه يحب الرياسة

کے جلال و جمالِ عظمت کی یاد تازہ کردیتا ہے پھر
پھر جب قلب میں یہ نور آجاتا ہے جسکو نور الانوار
کہنا چاہیئے تو اسکا مشاہدہ تم سے نقائص کا خاتمہ ہی
کردیتا ہے پس قلب کا حال یہ ہوتا ہے کہ
ان حضرات کے چہرے و بشرے کی رگیں کھلی
اسی آب حیات سے سیراب ہوتی ہیں اسکے غیر
سے نہیں جن سے قلب نے شادابی حاصل کی
اور خود سیرابی حاصل کرنے کے بعد چہرے کی
جانب جسکو بڑھادیا ہے، تو جب قلب کو اس
بندے سے اللہ تعالےٰ کے راضی ہونے کی
اور جس چیز سے اسکا سینہ منور ہوا ہے اسکی مسرت
حاصل ہوتی ہے تو اسکے چہرے سے کھلی تروتازگی
اور خوشی کے آثار ظاہر ہوجاتے ہیں رہا یہ کہ عالم کی
رویت کھلی تو انسان کی گویائی کو بڑھا دیتا ہے
تو یہ اسلئے کہ وہ کھلی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ناطق
ہوتا ہے۔ پس ناطق کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ ناطق
جو علم کی باتیں اپنی یاد کی بنا پر کتابوں کے حوالہ سے
یا لوگوں کے منہ سے سنی ہوئی بیان کرتا ہو تو جو شخص
اسطرح سے کتب سے اور لوگوں سے سنکر بیان کرتا
ہے تو اسکی باتیں لوگوں کے کانوں میں عریاں یعنی
بلا لباس کے داخل ہوتی ہیں اسلئے کہ یہ باتیں کسی نورانی
قلب سے نہیں نکلی ہوتیں بلکہ ایک گندہ قلب اور
تاریک سینہ اور ایسے شخص کی زبان سے نکلی ہوئی

والعز والشح على الحطام ونفسه قد استولت على قلب نازع الله في ردائه والذي ينطق عن الله انما يلج آذان السامعين بالكسوة التي تخرق كل حجاب وهو نور الله خرج من قلب مشحون بالنور وصدره مشرق به فيخرق قلوب المخلطين من رين الذنوب وظلمة الشهوات وحب الدنيا الخلعه الى نور التوحيد فاشاره كجمرة وصلتها النفحة والتهبت نارًا فاضاء البيت ۔

ہوتی ہیں جسکے ایمان میں حُبِ ریاست، جاہ و شہرت اور حکام دنیا سے غایت تعلق و الفت کے کھوٹ کی آمیزش بکلی موجود ہوتی ہے اور جسکا نفس اسکے قلب پر غالب آکر اسکی ردا (چادر) (یعنی کبریائی) میں منازعت کرتا ہے۔ باقی وہ ناطق جو ناطق عن اللہ ہوتا ہے تو اسکا کلام سامعین کے کانوں میں لباس سے مزین ہوکر اس طرح سے داخل ہوتا ہے کہ ہر حجاب کا پردہ چاک کردیتا ہے اور کیوں نہو وہ ہوتا بکلی تو ہے اللہ تعالےٰ کا نور جو نور بھرے قلب سے نکلا ہوتا ہے اور اس متکلم کا سینہ اسکے کلام کے لئے بمنزلہ مشرق کے ہوتا ہے (جس طرح سے اس سے سورج نکلتا ہے اسی طرح سے یہاں کلام) تو اسکا اثر یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے قلوب میں ایمان و عمل صالح کے ساتھ ساتھ معصیۃ کا زنگ اور شہوات کی ظلمت اور حُبِ دنیا کی تاریکی موجود ہوتی ہے اسکا پردہ چاک کرکے اسے نور توحید سے منور کردیتا ہے اسکی مثال ایسی سمجھو کہ جیسے کوئی چنگاری ہو اور اسپر پھونک پڑے تو اسکی وجہ سے اس سے آگ کی لپٹیں نکلنے لگیں اور سارا گھر روشن ہوجائے۔

وأما قوله يزيد كم في العلم منطقه فانه اذا نطق نطق بآلاء الله وصنعه

بہر حال یہ جو فرمایا کہ اسکے کلام سے تمہارے علم میں زیادتی ہوگی تو یہ اسلئے کہ وہ جب گویا ہوگا تو اللہ تعالیٰ کے انعامات و صناعات ہی کے متعلق

فهذا اصل العلم والعلم
الذی فی ایدی العامة
فرع هذا والآء الله ما
ابدی من وحدانیته
وفردانیته کالجلال و
الجمال والعظمة و
الهیبة والکبریاء والبهاء
والسلطان والعز والوقار
علی قلوب الاولیاء

واما قوله یرغبکم فی
الآخرة عمله فلان علی
عمله نوراً و علی ارکانه
خشوعًا وعلی تصرفه
فیها صدق العبویة مع
بهاء ووقار و طلاوة
وحلاوة فاذا رأه الرائی
تقاصر الیه عمله ونفسه۔

واما علماء الدنیا فلیس
لاعمالهم ذلک النور والبهاء لانه
علی الرغبة والرهبة لانه رغب فی
الجنه والوعد والوعید نصب عینه
فیستعین بذلک علی نفسه حتی یقمعها

واما اهل الیقین فاذا

کلام کرے گا اور یہی اصل علم ہے اور جو علم کہ
عام لوگوں کے پاس ہے وہ اسی کی فرع ہے
اور اللہ تعالیٰ کی الآء سے مراد وہ چیزیں ہیں جنکو
وہ عالم اسکی وحدانیت اور فردانیت میں سے
ظاہر کرے مثلاً حق تعالیٰ کے جلال وجمال عظمت
وہیبت۔ بہار وکبریار۔ سطوت وسلطنت اور عزت و
وقار جو کہ اسکے اولیار کے قلوب پر ہوتی ہیں۔

باقی یہ ارشاد کہ اسکا عمل تمکو آخرت کی ترغیب
دے تو یہ اس لئے کہ اسکے علم پر نور ہوتا ہے اور
اسکے اعمال پر خشوع ہوتا ہے اور اسکے ان چیزوں
میں تصرف کرنے میں عبودیت ہوتی ہے۔ اور
رونق ووقار تروتازگی اور حلاوت جو ہوتی ہے
مزید براں۔ تو جب کوئی دیکھنے والا ایسے شخص کو
دیکھتا ہے تو اپنا عمل اور اپنا نفس اسکی نگاہوں میں
حقیر معلوم ہونے لگتا ہے (اسلئے وہ اس میں اور
کوشش کرتا ہے تاکہ اسکو آخرت کا توشہ بنا سکے)

رہے علمار دنیا تو ان کے اعمال میں یہ نور نہیں ہوتا
اور نہ ایسی رونق ہوتی ہے اسلئے کہ وہ جو کرتا ہے
کسی لالچ یا ڈر سے کرتا ہے جنت کی لالچ ہوتی ہے
اور وعدۂ خداوندی کی اور وعیدیں اسکی آنکھوں کے
سامنے ہوتی ہیں پس انھیں کی مدد سے اعمال کو ادا
کرتا ہے۔

اور اہل یقین کے سامنے جب کوئی حکم طاعت

عرض لهم بشارت قبلو بهم من الشوق اليه والحب فعاملو على بشر و طيب نفس فاذا عرض لهم ذنية عرقت جباههم حياء منه فشتان مابين عبد ين احدهما يعمل لمولاه ولولا خوفه من وعيده وحرمان وعده ماعمل- وآخر يعمل مولاه تذللاً وتخشعًا ومحبة له و القاء نفسه بين يديه و شغفا به لايستويان
(ص۴۶۸ فیض القدیر للمناوی)

آتا ہے تو ان کے قلوب میں امتثال کا شوق اور خدا کی محبت کا ایک جوش ابھرتا ہے جسکی وجہ سے وہ نشاط طبع اور خوش مزاجی کے ساتھ کام کرتے ہیں اور اس درمیان میں اگر کبھی برائی کا وسوسہ آتا ہے تو انکی پیشانی پر خدا سے شرم کی وجہ سے پسینہ آجاتا ہے۔ پس ان دونوں انسانوں میں کتنا تفاوت ہے کہ ایک تو عمل کرتا ہے اپنے مولیٰ کے لئے لیکن اگر اسکا خوف نہو کہ سزا دیگا یا انعام نہ ملے گا تو پھر یہ عمل نہ کرتا۔ اور دوسرا شخص ایسا ہے کہ وہ بھی اپنے مولیٰ کے لئے کام کرتا ہے مگر بطور عاجزی کے اور خشوع کے اور اسکی محبت کے تقاضے سے اور اسکے سامنے پیشی کا خیال کرکے اور ایک شغف اور انہماک کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ یہ اور وہ کب برابر ہوسکتے ہیں۔

بیان یہ کررہا تھا کہ وطن میں حضرت مولاناؒ کا دینی کام اس نوع سے جاری تھا کہ عوام کی جانب الگ مستقل توجہ تھی، خواص یعنی طلبہ اور مدرسین حضرات میں سے جو لوگ حضرت سے وابستہ تھے ان پر کڑی نگرانی تھی پھر سالکین میں سے جو لوگ اخص الخواص کا درجہ رکھتے تھے یعنی خلفاء، مجازین حضرات انکے اخلاص وخلق اور معاملات کا مسلسل امتحان لیا جارہا تھا (جیسا کہ سابق صفحات میں ناظرین کے ملاحظہ سے ابھی گذرا) نیز ملک کے خدام قوم قسم کے وہ صالح افراد جو مسلمانوں کی بگڑی ہوئی حالت اور انکی پستی کو دیکھ دیکھکر خون کے آنسو روتے تھے اور انکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ قوم کو اسکی اس موجودہ بیماری سے شفا کی کیا سبیل اختیار کی جائے ایسے حضرات بھی کبھی کبھی بزرگوں سے بھی رجوع فرمالیتے تھے اور اپنی دل کی لگن بلکہ گھٹن بیان کرکے اسکا مداوا طلب فرماتے تھے اسکا بھی نمونہ پیش کیا جاچکا ہے

(ہو سکتا ہے کہ بعض باتیں ان امور میں سے تھجورے سے تشریف لے جانے کے بعد کی ہوں کیونکہ تاریخ کا اہتمام نہیں رکھا گیا) بہرحال مقصود صرف نمونہ دکھلانا تھا کہ اس طور پر حضرت اقدس کی زندگی مشاغل کثیرہ میں گھری رہتی تھی کسی وقت سکون نہ رہتا تھا اور جب قوم کا اتنا درد کسی کے قلب میں ہوتا ہے کہ وہ انکے لئے اپنا شب و روز ایک کر دے نہ دن کو راحت نہ رات کو چین و سکون کی نیند نصیب ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اسے محبوب خلائق بنا دیتے ہیں۔ حضرت اقدس کی گوشہ نشینی کی زندگی، اعلان و اشتہار سے پاک، تصانیف بھی جو ہوئیں تو وہ دوسروں کی درخواست بلکہ اصرار پر شایع ہوئیں، اور پھر اسکے بعد عرب و عجم میں آپ کا شہرہ اور چرچا سن لیجئے یہی ہے وہ مقبولیت عامہ جو خدا تعالیٰ کی جانب سے محض ایک موہبت ہوتی ہے کسی کوشش اور طلب اور جد و جہد سے ہاتھ نہیں لگا کرتی ؂

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اسی مضمون کے بیان کے سلسلہ میں لکھنؤ سکریٹریٹ کے ایک صاحب کا خط بھی نقل کیا تھا، جس میں آخر سے کچھ قبل انھوں نے لکھا تھا کہ — "اگر مدعا و مقصد ایک ہے تو اشتراک عمل کیوں نہیں؟" — یعنی اپنی اس خلش کو بیان کرنا چاہا بلکہ اسکا تسلی بخش جواب معلوم کرنا چاہا تھا کہ جب تمام دینی جماعتوں کا مقصد ایک ہے تو پھر ہر ایک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علحدہ کیوں بنائے ہوتا ہے اور جب اتنے کہنے والے موجود ہیں تو قوم کی حالت سدھرتی کیوں نہیں نظر آتی؟

راقم کو یہاں اسی نوع کا ایک اور بزرگ کا سوال یاد آگیا جو انھوں نے حضرت اقدس سے براہ راست نہیں کیا لیکن حضرت والا کے ایک مضمون کو اپنے اخبار میں نقل کر کے اس جملے میں جو حاشیہ لکھا تھا وہ اسی کے قریب قریب تھا، ان لکھنوی صاحب کے خط کا جو مضمون ہے وہی حضرت کا مضمون تھا اور صدق میں مولانا عبدالباری صاحبؒ نے اسی کا کچھ حصہ نقل فرمایا تھا جس پر مولانا دریاآبادی کا حاشیہ تھا واقعہ یہ ہوا کہ حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ نے ہمارے حضرتؒ سے ایک ملاقات کے بعد اپنے کچھ تاثرات "وقت کے ایک بزرگ" کے عنوان سے لکھکر اخبار صدق میں

جو ۵ جولائی ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں طبع بھی ہوا ، مولانا عبدالباری صاحبؒ نے حضرت اقدسؒ کا ارشاد نقل فرمایا کہ :۔

"ایک دن تقریری مجلس میں عرب وعجم ہر جگہ مسلمانوں کی تباہ کاریوں اور بربادیوں پر غلبۂ قلق وتاسف کے ساتھ بار بار فرمایا کہ ـــــ بس علاج ایک ہی ہے دوسرا ہرگز نہیں (یعنی) "ایمان واتباع" جسکو خود یہ سراپا بدحال "ایمان وعمل صالح" کی ٹھیٹ قرآنی اصطلاح میں مسلمانوں کی دینی و دنیوی، انفرادی واجتماعی ہر مرض کا علاج کہا کرتا ہے"۔ انتہی۔

ظاہر ہے کہ اصل عبارت اور علاج تو حضرت اقدسؒ کا ہوا اور مولانا عبدالباری صاحب کی بات اسی کی تائید اور شرح ہوئی، اسپر مولانا دریاآبادی نے یہ حاشیہ تحریر فرمایا کہ :۔

"تشخیص کی صحت میں کس مسلمان کو کلام ہو سکتا ہے لیکن عملی دنیا میں بات وہیں کی وہیں رہ جاتی ہے اور سوال یہی اٹھتا ہے کہ پھر اس پر عمل درآمد کیوں نہیں ہوتا؟"

دیکھئے دونوں حضرات کا شبہ یکساں ہے ہو سکتا ہے کہ کسی ایک کا قول دوسرے ہی سے ماخوذ ہو، بہرحال آج چاہے لوگ زبان سے نہ کہیں لیکن قلب میں یہ خلجان بہت لوگوں کو پریشان کئے ہوئے ہے۔

جب صدق کا یہ پرچہ حضرت مصلح الامۃؒ کی نظروں سے گذرا اور حضرتؒ نے اس میں مولانا دریاآبادی کا یہ نوٹ ملاحظہ فرمایا تو اپنے مزاج کی روسے مناظرہ تو نہیں فرمایا لیکن اپنے لوگوں کو بات سمجھانے کے لئے بیاض میں جہاں یہ مضمون نقل فرمایا تو اس نوٹ پر اپنا ایک جوابی نوٹ بھی تحریر فرمادیا، فرمایا کہ :۔

(قولہ) "تشخیص کی صحت میں کس مسلمان کو کلام ہو سکتا ہے" الخ

(اقول) جس طرح اسکی صحت میں کسی مسلمان کو کلام نہیں ہو سکتا اسی طرح سے اس پر عمل کرنے میں بھی تو کسی مسلمان کو کلام نہیں ہو سکتا اس جزو کو اس سے علیحدہ کیوں فرمادیا گیا"

(مطلب یہ کہ یہ تشخیص صرف ذہنی اور اعتقادی ہی نہیں بلکہ ایک عملی پروگرام ہے تو جس طرح سے قلباً لوگ اسکے مصدق ہیں عملاً بھی اس سے کسی مسلمان کو انکار نہونا چاہیے)

(قولہ) پھر آخر اس پر عمل درآمد کیوں نہیں ہوتا؟ ــــ (اقول) عمل اس لئے نہیں ہوتا کہ ایمان میں نقص اور ضعف پیدا ہو گیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو اسکی طاقت سے زیادہ احکام کا مکلف نہیں بنایا ہے۔ جو کچھ وہ خیر کرے گا اسکا نفع اسکو ملیگا اور جو شر کمائے گا اسکا خمیازہ اسکو بھگتنا پڑے گا)

(راقم عرض کرتا ہے کہ عمل نہ ہونا دو وجہ سے ہو سکتا ہے یا تو عمل دشوار ہونا جو خارج از طاقت بشریہ ہوتا ایسا تو ہے نہیں یہ نص اسکا صریح رد کرتی ہے۔ دوسری وجہ عمل نہونے کی لوگوں کی اپنی سُستی۔ ضعف ایمان، کاہلی، نفاق، اور انکی آرام طلبی۔ نفسانی خواہشوں پر چلنا ہو تو اسکی ذمہ داری نہ شرع پر ہے نہ صاحبِ شرع پر معاذ اللہ۔ یہ تو اپنے پیر میں خود کلھاڑی مارنا ہے اور بقول قائل ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

کا مصداق بننا ہے ظاہر ہے کہ اسکا علاج کسی کے پاس نہیں ہے اور مرض کا یہی وہ درجہ ہے جسکے متعلق حکیم بقراط فرما چکے ہیں اسکی دوا خدا نے بھی نہیں پیدا کی ہے ؎

مگر وہ مرض جسکو آسان سمجھیں کہے جو طبیب اسکو ہذیان سمجھیں

لہٰذا بات وہیں کی وہیں پہونچتی ہے کہ اگر اسکا علاج ہے تو وہی ایمان و اتباع یا بقول مولانا ندویؒ ایمان و عمل صالح۔ حاصل یہ ہے کہ یہ سوال تو امت سے کرنے کا تھا نہ کہ مصلحین امت سے؟)

اسکے آگے مولانا دریا آبادیؒ نے ایک بات اور تحریر فرمائی تھی اسکو بھی سن لیجئے فرماتے ہیں:۔

"مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم و مغفور سے متعلق ایک حکایت مشہور ہے کہ جب اسٹالن کے پاس روس پہونچے تو اسکے سامنے اسلام

کے دستور اساسی پر مؤثر اور مفصل تقریر کی اسٹالن خاموش سنتا رہا
جب مولانا اپنا وعظ (یعنی وہی تقریر) ختم کر چکے تو بولا کہ مولانا اس
نظام کا عملی نمونہ دنیا کے کسی گوشہ میں بھی موجود ہو تو مجھے اسکا پتہ بتائیے"
راقم عرض کرتا ہے کہ انداز سے کچھ ایسا لگتا ہے کہ مولانا دریاآبادیؒ نے
اس واقعہ کو اپنی کہی ہوئی بات کی تائید میں پیش کیا کہ بہت سی اسکیمیں ایسی ہوتی
ہیں کہ صرف اسکیم کے درجہ میں نہایت خوشنما اور خوش منظر معلوم ہوتی ہیں لیکن عملی طور پر
انکا وجود مشکل بلکہ متعذر ہوا کرتا ہے دیکھو مولانا عبیداللہ سندھی کی تقریر محاسن اسلام
پر سنکر اسٹالن نے بھی یہی کہا کہ اس مفید حسین اور خوبصورت نظام کا کہیں دنیا میں
عملی اور خارجی طور پر نمونہ دکھلائیے۔

مولانا دریاآبادیؒ تو بس اتنا فرماکر خاموش ہو گئے کیونکہ علامہ سندھی کی
صرف اتنی ہی گفتگو انکے مفید مطلب تھی باقی میرے علم میں بھی نہیں کہ حضرت
علامہ عبیداللہ صاحب سندھی نے آخر اسکا کچھ جواب دیا یا ندامت کے ساتھ لاجواب ہوکر
سر نیچا کرلیا۔ مولانا سندھی کی تبحر علمی اور بزرگوں کی صحبت اور ان سے اخذ فیض کا
تقاضا تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اسکا جواب ضرور دیا ہوگا اور اسلام کے
جن محاسن اور اسکے اصول اور نظام کی جس پختگی کو مولانا نے بیان کیا ہوگا اس کا
عملی نمونہ خیرالقرون میں تو یقیناً دنیا میں موجود رہ چکا ہے اور اسٹالن اور لینن بھی اس سے
خوب واقف ہیں ہاں آج کی دنیا میں طابق النعل بالنعل کسی حکومت کو کامل اسلامی نظام
پر پیش کرنا بلاشبہ مشکل ہے تاہم الحمدللہ بہت سی جگہیں ایسی موجود ہیں کہ وہاں
اسلام کی برکات اور اسکے انوار آج بھی بقدر عمل اور خلوص کے موجود ہیں، پھر یہ دعویٰ
تو کسی نے کبھی نہیں کیا کہ قیامت تک خیرالقرون جیسی خیر باقی رہیگی جبکہ خود رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ خیرالقرون قرنی ثم الذین یلونهم
ثم الذین یلونهم سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے پھر جو لوگ ان سے
ملے ہوئے ہوں گے پھر جو ان سے ملے ہونگے، اور یہ فرمایا کہ دین کے دس

حصوں میں سے آج کے دن اگر تم لوگ نو پر عمل کروگے اور ایک ترک کردوگے تو تو ہلاک ہو جاؤگے اور ایک زمانہ آخر میں ایسا آئے گا کہ دس حصّے میں سے لوگ اگر نو حصہ ترک کر دیں گے اور ایک پر عمل کرلیں گے تو کامیاب ہو جائیں گے آخر یہ تفاوت کیوں ہوا؟ ظاہر ہے کہ وہ ایمان وہ اخلاص اور وہ جذبہ لوگوں کا نہ رہ جائیگا اسقدر دین میں ضعف آجائیگا ایمان کمزور ہو جائے گا دواعیٔ عملی کمزور ہو جائیں گے اور موانع عمل بیشتر ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں تھوڑا سا عمل بھی بڑا درجہ رکھا کرتا ہے اور معمولی سعی بھی مشکور ہو جایا کرتی ہے آج بھی دنیا میں مشکلات میں گھرے معمولی کام کرنے والے کو غیر معمولی صلہ دیا جاتا رائج اور جاری ہے۔

پھر اسٹالن نے جو یہ کہا تو کیا وہ یا انکی جماعت آج یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ جن اصولوں کو ان لوگوں نے بہتر جانکر دنیا میں رواج دیا تھا اور اس وقت لوگوں نے بھی دل و جان سے اسکو قبول کیا تھا وہی جذبہ اور وہی پابندیٔ نظام اور وہی روح آج بھی انکی جماعت میں باقی ہے؟ اس بات کا اثبات میں جواب دینا مشکل ہے۔ باقی جماعتی ترقی جو دیکھی جارہی ہے وہ دوسرے لوگوں کی کمزوری کے سبب سے ہے نہ کہ ان کے اصولوں کی خوبی اور پختگی کے باعث جماعت کو جس مساوات کا دعویٰ تھا خود ان کے عوام کو اپنے بڑوں سے اسکی شکایت شروع ہو گئی ہے، مساوات کا صرف ڈھونگ ہے امیر و غریب کی تفریق وہاں آج بھی موجود ہے افراد میں تبدیلی ضرور ہو گئی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہم جیسے کم علموں کم فہموں کے ذہن میں یہ جواب آسکتا ہے تو مولانا سندھی با آں علم و دانش یہ سنکر خاموش کیسے ہو گئے ہوں گے غالب گمان ہے کہ انھوں نے ضرور جوابدیا ہوگا اور دندان شکن جواب دیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ ناقلین کے تصرف سے وہ ہم تک نہ پہونچ سکا ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم)

الغرض یہاں زیادہ تر جو باتیں مذکور ہوئیں وہ ضمنی تھیں مقصود حضرت اقدسؒ

کے دینی اور اصلاحی حالات کا بیان تھا کہ اس طرح سے ہر چہار طرف سے مشاغل نے گھیر رکھا تھا اور الحمد للہ کام خوب ہو رہا تھا۔ فتحپور کے اکثر لوگ تو اصلاح کی جانب متوجہ ہو چکے تھے بیشتر ان میں سے صالح، نیک، خوش اخلاق اور خوش کردار بن چکے تھے اور اپنے اندر دین کا فہم پیدا کر چکے تھے، انکی دیکھا دیکھی اطراف کے لوگوں میں بھی حرکت ہو چلی تھی، ہر جانب سے وفود کے وفود اور لوگوں کی جماعتیں آنے لگی تھیں فتحپور کی وسیع و عریض خانقاہ انکے قیام کیلئے ناکافی سی معلوم ہوتی تھی اور اتنی بڑی مسجد بھی ماشاء اللہ کبھی کبھی نمازیوں سے پُر ہو جایا کرتی تھی۔ غالباً توسیع مسجد کا پہلا ہی سال تھا، رمضان شریف کا مہینہ تھا باہر سے بھی سالکین آئے ہوئے تھے دین کا کام شباب پر تھا اور فتحپور اپنے مجمع کی رُو سے ایک دیہات اور گاؤں نہیں بلکہ قصبہ سا معلوم ہوتا تھا۔

لیکن انسان صرف کوشش ہی کر سکتا ہے حالات میں کیا انقلاب آ جائیگا اسکا علم تو عالم الغیوب ہی کو ہے، حضرت والاؒ فرمایا کرتے تھے کہ "جہاں دین کا کام جس قدر بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے وہیں ایک بڑا شیطان بھی ضرور موجود رہتا ہے۔ چونکہ ابلیس اور اسکی جماعت کو دین کا کام بالکل پسند نہیں وہ بھی برابر اس فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح سے اس کام کو تباہ و برباد کرے سو جب اللہ تعالیٰ ہی کو منظور ہوتا ہے تو اسکو غلبہ دیدیا جاتا ہے اور ان حالات میں اہل دین کو کوئی شکست بھی نہیں ہوتی بلکہ انکا اجر تو اللہ تعالیٰ کے یہاں ثابت ہو جاتا ہے نیز ایسے مواقع پر یہ اہل حق کی بظاہر شکست بھی انکے لئے آئندہ کسی فتح کا ہی پیش خیمہ بنتی ہے"۔

چنانچہ یہاں بھی موسم بہار میں دفعتہً خزاں کا جھونکا آیا اور دیکھتے دیکھتے نقشہ ہی بدل گیا یعنی اب جو دیکھنے والوں نے فتحپور کو دیکھا تو بدلا ہوا پایا یعنی ع

نہ پھول تھا نہ چمن تھا نہ آشیانہ تھا

اس اجمال کی تفصیل تو بڑی طویل ہے پھر ہر موقع پر راقم موجود بھی نہ تھا واقعات و حالات سنے سنائے ہی بیان کئے جائیں گے اور روایت میں فی زمانا

جو بے احتیاطیاں ہو جایا کرتی ہیں وہ ظاہر ہے اسلئے ہم چند باتوں ہی کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں حالات کی نوعیت کے سمجھنے کے لئے وہ بھی کافی ہیں۔

ہندوستان کے تقریباً ہر گوشہ میں ہی جس طرح سے آج دیوبندیت اور بریلویت کا مسئلہ ایک فتنہ بنکر پھیلا ہوا ہے اس سے حضرت اقدس کا دیار یعنی فتحپور (تال نرجا) بھی نہ بچ سکا تھا، یہاں مولوی علیم اللہ صاحب نامی ایک مقامی میلاد خواں مولوی تھے ہمارے حضرت سے شاید عمر میں کچھ بڑے ہی تھے گاؤں میں انکا حلقہ بلکہ سکہ جما ہوا تھا کہ اس درمیان میں حضرت اقدسؒ کا قیام مستقلاً وطن ہی میں ہوگیا اور اللہ تعالیٰ نے تدریجاً ترقی بھی عطا فرمائی، حضرت کے علم وعمل اور اور حال و کمال کا شہرہ سنکر نیز یہ معلوم کر کے کہ یہ حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ اور مجاز ہیں آپ کی جانب مرجوعہ بڑھا کہ حضرت والاؒ کے سامنے دوسرے مقامی لوگ بالکل ماند پڑ گئے چنانچہ مولوی مستحسن صاحب مدظلہ (مولوی محمد یونس صاحب سلمہ کرٹھی والے کے والد بزرگوار) اپنا واقعہ خود بیان کرتے تھے کہ حضرت اقدسؒ سے متعلق ہو جانے کے بعد میں اکثر فتحپور آتا جاتا رہتا تھا ایک دفعہ گاؤں کے متصل جو نالہ ہے اسکو کشتی سے پار کر کے جب آگے بڑھا تو ایک بزرگ صورت معمر شخص نظر پڑے میں نے سلام کیا انھوں نے جواب دیا اور دریافت فرمایا کہ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟ میں نے کہا محمدی ضلع شاہجہاں پور سے، پوچھا کہاں جا رہے میں نے کہا یہیں فتحپور ہی تک آنا ہوا ہے حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اس پر انھوں نے فرمایا کہ۔ بھائی اگر وہ وصی اللہ ہیں تو میں بھی تو علیم اللہ ہوں" — اب اس سے انکا مقصد کیا تھا یہ محلِ کلام ہو سکتا ہے اسکی واقعی مراد تو اللہ تعالیٰ کے حوالہ ہے باقی ظاہراً اس سے کیا سمجھا جا سکتا ہے اسکو بھی میں ناظرین کی فہم پر محول کرتا ہوں۔ غرض فریق ثانی کے عوام و خواص سبکی نگاہوں میں حضرت کا وجود کھٹک رہا تھا، لیکن لوگ کر ہی کیا سکتے تھے مجبور تھے بالآخر انکا ظاہری غیظ و غضب کینہ بنکر قلب کے اندر اُتر گیا اور کینہ اور حسد کا سرمایہ لیکر

کسی موقع کے منتظر رہنے لگے۔

اس جماعت کے لئے مزید پریشانی کا یہ امر بھی بنا کہ آہستہ آہستہ مولوی علیم اللہ صاحب کے خیالات حضرت اقدسؒ کی جانب سے نرم ہوتے گئے اور ان کے حالات بدلنے لگے جس کا حقیقی سبب تو اللہ تعالیٰ کا ان پر فضل ہوا باقی ظاہری سبب یہ ہوا کہ حضرت اقدسؒ کے کریمانہ اخلاق نے ان کے قلب کو جیت لیا یعنی اُدھر سے گالی دیجاتی تھی تو اِدھر سے پھلوں کی ڈالی پیش کیجاتی تھی۔ اپنے بزرگوں کے اسی نوع کے اخلاق دیکھکر یہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎

اولئک ابائی فجئنی بمثلھم　　اذا جمعتنا یا جریر المجامع

یہ تھے ہمارے اسلاف ان جیسے اسلاف تم بھی پیش کرو اگر تمھارے یہاں ہوں تو۔

اور لوگ جب حفیظؔ کے سلام کے یہ اشعار پڑھتے ہیں کہ ؎

سلام اسپر کہ جس نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں　　سلام اسپر کہ جس نے دشمنوں کو یوں قبائیں دیں

تو اسباب میں بھی اپنے بزرگوں کے متبع سنت ہونے کے واقعات کو دیکھکر ان پر وجد سا ہو جاتا ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

سارا گاؤں ایک ہی برادری تو تھا اس لئے بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو مولوی علیم اللہ صاحب سے قرب یا قرابت کا تعلق رکھتے تھے اور تھے وہ حضرتؒ والا کے خدام میں سے، راقم الحروف نے بچشم خود دیکھا ہے کہ گرمی کا رمضان ہے ظاہر ہے کہ ہر شخص ٹھنڈے سے ٹھنڈا پانی یا شربت پینا چاہتا ہے، اور یہاں دیہات میں کوسوں برف نایاب لامحالہ لوگ کنوئیں ہی کے پانی پر اکتفا کرتے تھے، اِدھر گوپا گنج سے جو یہاں سے چھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا حضرت اقدسؒ کے ایک خادم خاص سیٹھ عبدالرب صاحب نے بطور خود یہ انتظام کر دیا تھا کہ ایک غیر مسلم ملازم کے ذریعہ دس پانچ سیر برف حضرت اقدس کے لئے روزانہ سائیکل سے بھیجدیتے تھے جو افطار سے دس پندرہ منٹ قبل حضرت کو ملجاتا تھا، حضرت اقدس یہ کرتے تھے کہ ایک کٹورہ میں تھوڑی سی برف رکھکر انھیں صاحب کو دیتے (جنکا تعلق اور جنکی

بے تکلفی مولوی علیم اللہ صاحب سے ہوتی تھی) کہ جاؤ یہ برف مولوی علیم اللہ صاحب کو دے آؤ، ہدیہ محبت کو بڑھاتا ہی ہے (حدیث شریف میں آتا ہے کہ تھادوا تحابوا) چنانچہ حسب قاعدہ ؎

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل — تو گھس جائے بے شبہ پتھر کی سِل

اس معاملہ نے بھی مولوی صاحب کے قلب کو پگھلا دیا اور اسکی سوزش کو ٹھنڈک سے بدل دیا جسکا ایک اثر یہ ہوا کہ مولوی صاحب اپنے وعظ وغیرہ میں اب حضرت والا کے متعلق کچھ کہنے سننے سے بالکل رک گئے اور صرف اتنا ہی نہیں ہوا غائبانہ دعا بھی دینے لگے اور حضرت کے کام کو سراہنے لگے۔ غرض دل سے خوش ہو گئے یہاں تک کہ ایک مرتبہ ٹہلتے ٹہلتے خانقاہ اور مسجد کیجانب بھی آنکلے اور دونوں کو اندر سے دیکھا بات عرصے کی ہوئی یاد آتا ہے کہ کسی نے بیان کیا تھا کہ خانقاہ اور مسجد کو دیکھکر خوش ہوئے اور یہ شعر پڑھا ؎

خوشا مکتب و مسجد و خانقاہے — کہ آنجا بود قیل و قالِ محمدؐ

اسی طرح سے دلی قرب بڑھتا رہا یہاں تک کہ ایک دن حضرت اقدسؒ کی مجلس میں بھی تشریف لائے اور آج یہ پہلا دن تھا کہ انکو حضرت والا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا حضرت کا ایمانی وروحانی بیان سنکر بہت زیادہ محظوظ اور مسرور ہوئے اور فرمایا کہ پھر آؤنگا نیز حضرتؒ نے بھی چلتے وقت ہدیہ میں انکیں ایک رومال اور ایک عمدہ تسبیح عنایت فرمائی۔ وہ صاحب جو ان کے لانے میں وسیلہ بنے تھے کہتے تھے کہ ایک دن میں مولوی علیم اللہ صاحب کی مسجد سے گذرا تو اندر صحن مسجد میں ٹہل ٹہل تسبیح پڑھ رہے تھے دور سے مجھے تسبیح دکھائی مطلب یہ تھا کہ یہ دیکھو مولانا ہی کی دی ہوئی تسبیح استعمال کر رہا ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا بڑا انقلاب تھا کہ جسکا مشاہدہ اہل دنیا نے کم ہی دیکھا اور سنا ہو گا یعنی یہ کہ اللہ تعالے نے مخالفین کے سردار کو حضرت اقدس کا محب اور معتقد بنا دیا۔ اب آپ خیال فرمایئے کہ فوج کا کمانڈر ہی جب مقابل سے مل جائے تو پھر

فوج میں زہ ہی کیا جاتا ہے۔ مخالفین کی جماعت میں جو حیرانی اور قلق اس واقعہ سے ہوئی ہوگی اسکو وہی جانتے ہوں گے، چنانچہ ان لوگوں کو فکر ہوئی کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟ مولوی علیم اللہ صاحب سے تو کسی کی کہنے کی ہمت پڑتی نہ تھی اور اگر کوئی کچھ کہتا بھی تو وہ ڈانٹ دیتے تھے آخر قبیلہ کے سردار اور بڑے تو تھے ہی۔ لہٰذا جماعتی تجویز یہ ہوئی کہ اسکی اطلاع بریلی شریف کے پیر صاحب سے کرنی چاہیئے اور مولوی احمد رضا خانصاحب کے صاحبزادے جو اندنوں صاحب سجادہ تھے اور کبھی کبھی فتحپور تال نرجا بھی مولوی علیم اللہ صاحب کے پاس انکا آنا جانا ہوتا تھا ان کے گوش گذار یہ معاملہ کر دیں تو وہ اگر منع کر دیں گے تو مولوی علیم اللہ وہاں آنا جانا ضرور ترک کر دینگے چنانچہ صاحب سجادہ کی تشریف آوری پر لوگوں نے ان سے تنہائی میں تمام ماجرا بیان کیا، انھوں نے بھی موقع پاکر مولوی علیم اللہ صاحب سے دریافت کیا کہ سنا ہے کہ آپ مولوی وصی اللہ صاحب کے یہاں انکی مجلس میں جاتے ہیں؟ مولوی علیم اللہ صاحب نے فرمایا کہ ہاں جاتا تو ہوں۔ سجادہ نشین صاحب نے فرمایا ایسا نہ کیجئے اس میں پوری جماعت کی بدنامی ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ وہاں اللہ و رسول اور بزرگان دین کے ذکر کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں ہوتی پھر میں ایسی جگہ جہاں کی باتیں سنکر ایمان تازہ ہوتا ہو آخر کیوں نہ جاؤں؟ اچھا اگر وہاں نہ جاوں تو اسکے مقابلہ کی کوئی دوسری مجلس یا نشستگاہ آپ تجویز فرما دیجئے! اسپر وہ لاجواب ہو گئے، اور یہ سمجھکر خاموش ہو گئے، کہ اب یہ نہ مانیں گے۔

غرض فتحپور میں ہمارے حضرت اقدسؒ کی فتح پوری تو اسی واقعہ سے ہو چکی تھی کہ مولوی علیم اللہ صاحب جیسا انسان جو عرصہ دراز تک مخالف رہ چکے تھے بلکہ مخالفت ان ہی کی وجہ سے اور انکے ہی سہارے انتہار کو پہونچ چکی تھی وہ اب خود حضرت والا سے محبت فرمانے لگے۔ اور بے تکلف ملنے لگے اور حضرت کے یہاں آنے جانے لگے بس اب اور فتح کسے کہتے ہیں؟

باقی سلاطین یا کمانڈر چونکہ فہیم اور دانشمند لوگ ہوا کرتے ہیں اس لئے حق
اور صداقت واضح ہو جانے کے بعد پھر انکی طبعی شرافت ابا کرتی ہے کہ حق کے خلاف
کوئی اقدام کریں اور عام رعایا یا سپاہی قسم کے افراد اپنی کم علمی اور کج فہمی، نفسانیت
اور طبعی شرارت کے پیش نظر ایک گونہ کینہ اور الجھاؤ قائم ہی رکھتے ہیں اور کسی موقع
کے منتظر رہتے ہیں اور جہاں اپنی گرفت ڈھیلی پائی نہیں کہ اپنے نفسانی تقاضے کو
بروئے کار لانے کی سعی کرنے لگ جاتے ہیں چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا کہ مولوی
علیم اللہ صاحب کے ادہر آجانے کو قوم نے اپنی شکست فاش جانا اور اسمیں اپنی ذلت محسوس کی
اور سمجھانے بجھانے کے بعد بھی جب وہ نہ مانے تو بہت سے ان کے لوگ
ان سے بھی دل ہی دل میں ناخوش رہنے لگے ۔

اب وہ جس جماعت کے پیشوا ہیں وہ جماعت ہی ان سے ناراض ہے
لوگوں کو اگر نیک مشورہ دیتے ہیں اور بھلائی کی راہ دکھاتے ہیں تو لوگ ان کی
بات سننے کے لئے تیار نہیں اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ جماعت بلا امیر کے ہو کر
شتر بے مہار ہو گئی اور اسکے افراد کسی ایسے رہبر کی تلاش میں رہنے لگے جس سے
انکی مقصد برآری ہو سکے ۔ جس طرح کہ ابتک تو اہل حق کی جماعت کے مدمقابل
مولوی علیم اللہ صاحب رہے جنکو اب ہم رحمۃ اللہ علیہ کہنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں
اسی طرح سے انکی مخالفت ختم ہو جانے کے بعد فخلف من بعدهم خلف کے
طور پر ایک دوسرے صاحب مدمقابل ہوئے جو کہ پولیس کی ملازمت سے الگ
ہونے کے بعد فتحپور آئے تھے یہیں کے باشندے تھے اسلئے یہیں رہنے لگے
پولیس میں رہا ہوا آدمی خاموش زندگی کب گوارا کر سکتا ہے اسکو تو کوئی نہ کوئی
محاذ درکار رہے تاکہ اسکی افسری قائم رہے یعنی خود افسر ہو جائے اور
سب لوگ اسکے ماتحت ہو کر رہیں، مذہبی خیالات سے اسی جماعت کے فرد
تھے یہاں لیڈری کی جگہ بھی حسن اتفاق سے خالی تھی اس لئے اُس جماعت نے
اسکو اپنا لیڈر بنا لیا، دوسروں کے کندھے سے بندوق چلانا تو زمانہ حال کا

مانا ہوا کمال ہے اب جو شخص اپنے مقابل جماعت سے لڑنے والا ملجائے تو لوگ اسکی کیوں نہ قدر کریں گے ؟ اب کیا تھا کہیں میلاد کیا جارہا ہے کہیں کوئی اسکیم بن رہی ہے کہیں کسی کو تنہا پاکر اس پر آوازہ کسا جارہا ہے اور چھیڑا جارہا ہے کہیں الکشن کے میدان میں ذاتی انتقام کی کوشش کیجارہی ہے غرضیکہ مختلف محاذ چھیڑ دیئے، ادہر یہ سب ہورہا تھا اور مخالفت اپنی انتہا پر تھی، اور یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت والا نوراللہ مرقدہ کا کام بھی اپنے شباب پر تھا یہ صاحب جو یوپی سے آئے تھے حضرت مصلح الامۃؒ کے ایک خادم خاص کے حقیقی بھائی تھے، اللہ کی شان ایک بھائی حضرت کا محب اور ایک بھائی حضرتؒ کا دشمن اور مخالف۔ اور ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ بھی تھا ایک ہی جگہ رہتے سہتے تھے۔ اب اندر اندر کمانڈر کو پاکر مخالفین جو اسکیم بناتے رہے ہوں اسکا صحیح علم تو خدا ہی کو ہے باقی حضرت اقدسؒ کے وہ خادم جو ان لیڈر صاحب کے بھائی تھے وہ کبھی کبھی اپنے لوگوں سے اتنا بیان کرتے تھے کہ آجکل اُنکے بھائی کا دماغ بہت خراب ہورہا ہے اور ہر وقت اُوّل فوّل بکتا رہتا ہے۔ حضرت اقدس کے علم میں بھی کبھی کبھی کچھ کچھ باتیں پہونچ جاتیں ورنہ عام طور سے تو لوگ ان سب باتوں کو چھپاتے ہی تھے کہ کہیں حضرت خفا نہ ہوجائیں اور بجائے ان لوگوں کے کچھ کہنے کے ہم ہی لوگوں کو اپنے یہاں سے نہ نکالدیں اور آنا جانا بند کردیں (اور اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بنیادی غلطی تھی جو اپنے لوگوں سے ہوئی کہ کسی فتنہ کا دفعیہ اسکے وقوع سے پہلے کرنے کی نہ تو خود صلاحیت تھی اور نہ حضرت اقدسؒ ہی کے علم میں اسکو لائے ورنہ شاید اس ہنگامہ کی نوبت ہی نہ آتی اور حضرت والا نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ معاملہ کو ختم فرما دیتے، لیکن ما قدر اللہ کان خدا کو جو منظور تھا ویسے ہی اسکے اسباب ہوتے چلے گئے)

بات بالکل صحیح تھی اُدھر اسکے دماغ میں سرداری کا سودا سمایا ہوا تھا

اور اسکے ملنے کے کچھ آثار بھی اسکو دکھائی دے رہے تھے، ادھر حضرت اقدس کو اندرونی گفتگو اور باہم پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات سے ناواقف رکھا گیا اور مخالفین کے جو دوسرے فتنہ پرور لوگ تھے وہ بذریعہ غیبت وچغلخوری اسکے دماغ کو اور خراب کئے جارہے تھے یعنی چھوٹی چھوٹی باتیں اسکے بھائی کی جانب منسوب کرکے بھائی کی جانب سے اسکے خیالات خراب سے خراب تر کرتے چلے جارہے تھے، ان تمام حالات نے بالآخر اسکے دماغی توازن کو خراب کرکے رکھدیا یہاں تک کہ وہ اس پر آمادہ ہوگیا کہ گاؤں میں ایک بڑے پیمانہ پر فساد کرادے ایسے طور پر کہ اسکے لوگ تو محفوظ رہیں اور حضرت والاؒ کے ماننے والے لوگ (اہل حق) پیٹے جائیں اور مجروح وزخمی ہوں، چنانچہ اسکے لئے ایک مستقل پلان تیار کیا گیا اور اپنی چالاکی اور اہل حق کی لاعلمی اور حالات سے ناواقفیت سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا اور وہ اسکی بنا پر بزعم خود کامیاب بھی رہا۔

رمضان شریف کے ایام تھے چھٹی یا ساتویں تراویح ہورہی تھی جدید مسجد کی توسیع ہوچکی تھی باہر سے آئے ہوئے سالکین اور طالبین کا خاصا مجمع رمضان گذارنے کے لئے حسب معمول خانقاہ آیا ہوا تھا گاؤں کے لوگوں میں سے جو حضرت اقدس ہی کے ساتھ تراویح اداکرنا چاہتے تھے وہ موجود تھے اور کمانڈر صاحب کے بھائی صاحب بھی موجود تھے،

اس نے کیا یہ کہ گاؤں کے اندر ہر ہر موڑ پر اپنے آدمی لاٹھی وغیرہ کے ساتھ ہتھیار بند مقرر کردئیے اور اپنے بھائی کے گھر جاکر اسکی عورتوں اور بچوں کو مارنا اور زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کیا وہ سب بچے روتے ہوئے اور فریاد کرتے ہوئے مسجد کیجانب آئے کہ اپنے والد کو صورت حال سے مطلع کریں (یہاں ان لوگوں کو حالات کی رو سے اندیشہ تو تھا ہی) یہ سنتے ہی کہ فلاں شخص نے لاٹھی سے سب کو مارا ہے حضرتؒ کے ان خادم کی حمایت میں انکے گھر کی طرف نہتے

بے تحاشا بھاگے اور جو جس طرف سے آگے بڑھا اُسکے آدمیوں نے اس پر حملہ کردیا جسکی وجہ سے یہ لوگ جو مسجد سے گئے تھے زیادہ تعداد میں زخمی ہوگئے اور اصل ملزم فرار ہوگیا بعد میں گاؤں سے اور لوگ بھی جب پہونچے تو چند لوگوں کے سوا سب بھاگ چکے تھے۔ مسجد کے لوگوں نے حتیٰ کہ خود حضرت والا نے بھی فوراً نہ سمجھا کہ آخر یہ کیا قصہ ہے تاہم اجمالی خبر پاکر مولوی عبدالقیوم صاحب مرحوم کو بھیجا کہ آپ جاکے اور دور سے اعلان کیجئے کہ اپنے سب لوگ واپس آجائیں۔ لوگ یہ سنکر واپس تو آگئے مگر اتنی دیر میں جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ یہ فساد تھا جو واقع ہوا حضرت والا اسی تصادم کو بچانا چاہتے تھے کیونکہ یہ حضرت اقدسؒ کے اتبک کے کام پر ایک قسم سے پانی پھیر دینے والا تھا مگر قدر وقع ما یخاف ان یکون انا للہ وانا الیہ راجعون (جس بات سے ڈرتے تھے وہ واقع ہوکر رہی' انا للہ وانا الیہ راجعون)۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا وہ میری عام معلومات تھیں اب مقامی حضرات کا بیان سنیئے:۔

فتحپور کے بعض لوگوں سے معلوم ہوا کہ شمس الدین عرف سُدّیا نامی ایک شخص جو پولیس میں ملازم تھے ملازمت سے آکر جب وہ گھر پر رہنے لگے تو دوسرے لوگوں نے اسکو اپنی جماعت کا لیڈر (نیتا) بنالیا' اہل حق سے خود اسکو بھی مسلک کا اختلاف تو تھا ہی نیز انکے حقیقی بھائی شمس الحق عرف حقن حضرت والاؒ کے خادم خاص تھے خانقاہ کے مہمانوں کے کھانے وغیرہ کا انتظام بھی ان سے رہتا تھا' اسلئے اکثر باہم ان میں تو تو مَیں مَیں رہا کرتی تھی، انھیں حالات میں الکشن کے اختلافات رونما ہوگئے، خود ہمارے حضرتؒ تو الکشن وغیرہ میں پڑتے ہی نہ تھے عام لوگوں کو ہدایت فرماتے کہ میں اختلاف اور فتنہ و فساد کو بالکل پسند نہیں کرتا بس اسکے بعد کسی کو کسی بات پر مجبور نہیں کرتا ہر شخص اپنی اپنی دنیوی مصلحت میں آزاد ہے جس کا جو جی چاہے کرے یعنی ووٹ دے یا نہ دے یا جسکو چاہے دے۔ چنانچہ

حضرت والا کے یہاں آنے جانے والے لوگ جس کی جانب تھے شمس الدین اسکے خلاف تھا اور اب معاملہ کریلا اور نیم چڑھا کا مصداق ہوگیا تھا ہر وقت دینی بحث کے علاوہ دنیوی تخ تخ بھی لوگوں میں باہم ہونے لگی مزید برآں یہ ہوا کہ وہ شخص جسکی حمایت میں شمس الدین بھی تھا الکشن میں ہار گیا اور اسکی وجہ سے اسکا سابق غم وغصہ پوری جماعت ہی کی جانب سے کینہ بنکر اس کے دل میں اتر گیا۔ چنانچہ رمضان شریف کا مہینہ آگیا اور ایک دن وہ قریب ہی کے کسی گاؤں میں گیا ہوا تھا ادھر حضرت والا گاؤں کے لوگوں میں اختلاف کی خلیج کو بڑھتے دیکھکر بستی کے معزز اور چودھری قسم کے لوگوں کے پاس کہلا رہے تھے کہ آپس کا اختلاف بہت بری چیز ہے آپ لوگ اپنے اپنے لوگوں کو سمجھائیں میں تو برابر سب ہی کو کہتا سنتا رہتا ہوں کہ سب لوگ مِل جُل کر رہیں جسکا جو مذہب ہو وہ اس پر رہے مگر باہم اتفاق واتحاد کے ساتھ سب کو رہنا چاہیئے۔

حضرت والاؒ کے اس پیغام پر سمجھدار لوگوں نے لبیک کہا اور قریب تھا کہ الکشن سے مکدر شدہ فضا درست ہوجائے کہ درمیان میں پھر شیطان نے فتنہ طرازی کی ایک نئی صورت پیدا کردی یعنی کسی نے شمس الدین سے وہاں جاکر جہاں وہ گیا ہوا تھا کہا کہ تمھارے خلاف گاؤں میں محاذ بنایا جارہا ہے اور تم کو مارنے کی سازشش کیجارہی ہے (یہ ہے فتنہ کہ صلح کی میٹنگ کو محاذ جنگ سے ظالم نے تعبیر کیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔) یہ سنکر وہ چراغ پا ہوگیا اور وہیں سے گاؤں میں اپنے آدمیوں کے پاس کہلا بھیجا کہ سب مسلح ہوجاؤ میں بھی آرہا ہوں اور پھر شب میں عین تراویح کے وقت آکر وہ فتنہ برپا کیا جسکا ذکر پہلے آچکا ہے۔ بعض تحریرات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فتنہ ۱۹ اپریل ۱۹۵۶ء کو پیش آیا۔ واللہ اعلم۔

میں نے گاؤں کی فضا سمجھنے کے لئے ذرا تفصیل سے وہاں کی تاریخ بیان کردی ہے، باقی یہ جھگڑا جو ہوا تو اسوقت نہ تو کوئی دیوبندی بریلوی کا مسئلہ

تھا اور نہ مدرسہ سے متعلق کوئی بات تھی بلکہ نزاع کی ابتدا دونوں بھائیوں کا نجی معاملہ بنا تھا جن میں ایک حضرت والاؒ کے خادم تھے دوسرے صاحب دوسری جماعت سے متعلق تھے درمیان میں ریشہ دوانی کرنے والوں کو لڑانے کا موقع مل گیا اور اسکو دیوبندی اور بریلی کا جھگڑا بنا کر شہرت دیدی اور ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے حضرت اقدسؒ کا بھی نام اس موقع پر لیا جانے لگا حالانکہ حضرت اقدسؒ کا نزاع سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ حضرت اقدسؒ کا مزاج اور مذاق تو یہ تھا کہ ؎

تو برائے وصل کردن آمدی ‌ ‌ ‌ ‌ نے برائے فصل کردن آمدی

بہر حال اپنے لوگوں کی اس نادانی اور ناسمجھی کیوجہ سے لوگوں کے بدنی اور مالی موجودہ پریشانی میں مبتلا ہو جانے کا رنج اور قلق حضرت اقدسؒ کو بھی بیحد ہوا چنانچہ اہل بستی سے سخت ناراض ہوئے اس پر کہ ان لوگوں نے ابتدائی حالات کو حضرت سے کیوں چھپایا؟ اور فرمایا کہ اس جرم میں نہ صرف اہل فتحپور بلکہ پوری برادری کو شریک سمجھتا ہوں لہٰذا سب سے میرا مواخذہ ہے اور میں سب سے ناراض ہوں۔

چنانچہ اس زمانہ میں حضرت والا نے مختلف لوگوں کے پاس جو تحریریں بھیجیں یا پیغام کہلایا حضرت اقدس کا جلال اور غصہ اس کے مضمون سے عیاں ہے، مثلاً برادری کے کسی چودھری کے پاس کچھ لکھوایا اس میں فرمایا کہ :-

"میں نے شروع میں بھی بیان کیا ہے کہ یہ معاملہ ووٹ سے شروع ہوا تھا اسلئے آخر میں پھر یہی کہتا ہوں کہ میں ایک دینی کام کر رہا ہوں (اصلاح و تربیت کا) مجھے اور میرے متعلقین کو دنیوی امور سے کوئی سروکار نہیں وہ آپ لوگ جانیں اور جو چاہے کریں، باقی کوئی صاحب مجھے اس میں شریک کریں نہ مجھ سے کوئی توقع رکھیں۔ اس بات کو میں اخبار میں بھی دونگا تاکہ سب لوگوں کو حقیقت حال سے واقفیت ہو جائے" انتہی

ایک اور صاحب سے کچھ فرمانے کے بعد یوں جواب طلب فرمایا:۔
فرمایا کہ ۔۔۔ "رام لیلا کے موقع پر (بھی آپ لوگوں کی بے عقلی سے تنگ آکر) جب میں گاؤں سے چلا آیا تھا تو آپ لوگوں نے بہت رو گا کر کے مجھ سے وعدہ (اخلاص اور اخلاق وغیرہ اختیار کرنے کا) کر کے گھر چلنے کے لئے کہا تھا اور مجھکو لے گئے تھے۔ اس جماعت میں آپ بھی تھے اس لئے اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیوں مجھے لے گئے تھے؟ جب میں چلا ہی آیا تھا تو آپ کا مقصد حاصل تھا، پھر مجھے کیا اسی لئے لے آئے تھے کہ اس طرح سے میری مخالفت کرو اور مجھے بدنام کرنے کی کوشش کرو الخ اسکا جواب دو"

ایک اور صاحب کو تحریر فرمایا کہ :۔
"اس وقت دو باتیں اور کہنا ہوں ایک تو یہ کہ (اُس نے تھانہ میں جو بیان دیا ہے اس میں) میرے متعلق یہ لکھا دیا گیا تھا کہ ۔۔۔ "یہ با اثر شخص ہیں اور بہت سے اہل ثروت انکے مرید ہیں" ۔۔۔ اس چیز کو میرا عیب گردانا گیا۔ میں نے آجتک ایسا مقدمہ ہی نہیں دیکھا سنا کہ جسمیں کسی کی خوش حالی کو بھی اسکا نقص اور عیب شمار کیا گیا ہو۔ نیز یہ کہ میں تو فقیر نہیں ہوں مگر جو لوگ کہ حقیقی (بزرگ ہوئے ہیں) فقراء گذرے ہیں بہت سے ان میں ایسے بھی ہوئے ہیں کہ ظاہر میں مال و دولت میں بڑے بڑوں سے زیادہ شان وشوکت والے ہوئے ہیں (اس سے بھی معلوم ہوا کہ مریدوں کا یا خود پیر کا شان وشوکت والا ہونا اسکی دنیا طلبی کی بھی دلیل ہو ایسا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مالدار ہو اور بزرگ ہو دنیا طلب نہو نہیں سنا ہے کہ ؎

نہ مرد است آں کہ دنیا دوست دارد اگر دارد برائے دوست دارد)

(وہ انسان اللہ والا نہیں جو دنیا کو دوست رکھے، ہاں اگر دنیا کو دوست، دوست کی خاطر رکھے تو خیر۔)

امسال باہر سے آنے والے طالبین میں گورکھپور کے مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم اور ان کے برادرِ خورد مولوی امجد اللہ صاحب مرحوم بھی موجود تھے

انھوں نے اور بعض حضرات سے مشورہ فرمایا اور باہم یہ طے ہوا کہ حضرت اقدسؒ کچھ دنوں کیلئے گورکھپور تشریف رکھیں، واقعہ کے دوسرے دن یا تیسرے دن کار منگوائی گئی اور حضرت والا ظہر کی نماز سے فارغ ہوکر بجائے دولت خانہ پر تشریف لے جانے کے کار ہی میں بیٹھ گئے اور دونوں مولوی صاحبان گورکھپور والے بھی بیٹھے اور غالباً سیٹھ عبدالرب صاحب بھی ہمراہ ہوئے اور کار روانہ ہوگئی، اب تک کسی کو نہ معلوم ہوسکا کہ حضرت کہاں تشریف لے جارہے ہیں۔؟ ہم لوگوں نے خیال کیا کہ شاید واقعہ سے ذہن متاثر ہے کہیں آس پاس تفریح طبع کے لئے گئے ہوں گے لیکن جب عصر میں بھی تشریف نہ لائے مغرب میں بھی نہ آئے حتیٰ کہ عشاء تک نہ واپس آئے تو اندازہ ہوا کہ خفا ہوکر کہیں دور چلے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ گھر کے اندر صاحبزادیوں کو اسکا صحیح علم شاید دوسرے دن ہوسکا۔

پھر اسکے بعد مولوی امجداللہ صاحب تشریف لائے اور حضرتؒ کے سب بچوں کو بھی گورکھپور لے گئے۔ اسکے بعد باہر سے آنے والے مہمان بھی ایک ایک کرکے واپس چلے گئے، صرف چند طلبہ اور چند طالبین خانقاہ میں رہ گئے چنانچہ تھوڑے عرصے کے بعد بقیہ طلبہ اور طالبین کو بھی حضرت والا نے گورکھپور ہی میں طلب فرمالیا، راقم الحروف بھی اسی آخری قسط میں تھا۔

رحلت از وطن

وطن کا یہ سانحہ بھی حق تعالیٰ کے ان ہی امور میں سے تھا جنکے متعلق فرمایا گیا ہے کہ عَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ یعنی ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو اپنے لئے مضر سمجھو اور دراصل اس میں تمھارے لئے کوئی خیر نہاں ہو اور بھلائی کا کوئی پہلو مضمر ہو چنانچہ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایسا ہی ہوا۔

فتحپور تال نرجا میں حضرت اقدس کے قیام کی بنیاد ایسی مستحکم تھی کہ بظاہر اس میں تزلزل پیدا ہوجانا ممکن نہ تھا۔ مکان پختہ بن چکا تھا، خانقاہ کی توسیع اور استحکام ہوگیا تھا اور آخر میں مسجد بھی نہایت ہی عالیشان اور وسیع ترکیبا چکی تھی گاؤں کا ہم عقیدہ طبقہ دل و جان سے فدا تھا، باہر سے آنیوالے مسترشدین کی تعداد روز افزوں تھی، اطراف واکناف کے قصبات اور گاؤں سے وفود آآ کر سلسلہ میں داخل ہو رہے تھے بظاہر نقشہ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کا سامنے تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی مصلحت چونکہ ہمارے سب امور پر غالب ہے اسلئے ادہر سے کچھ اور ہی سامان کیا جارہا رہا تھا یوں اللہ کا معاملہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے تاہم بعد میں پیش آنے والے حالات سے اندازہ ہوا کہ خدا تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ایسا زبردست شیخ اور ایسا مصلح امت ایسی کوردہ جگہ میں گھر کر رہ جائے یہ مناسب نہیں انھیں کسی بڑی جگہ جانا چاہیئے اور ایسی جگہ جانا چاہیئے جہاں کے لوگوں میں دین کی طلب ہو، اور محبت خداوندی کی تڑپ ہو۔ چنانچہ تدریجاً علم الہٰی میں اسکے لئے پہلے گورکھپور تجویز ہوا، پھر الہٰ آباد اور پھر یہاں سے علی گڑھ جونپور، فتحپور اور لکھنؤ وغیرہ میں فیض پہونچا اور بالآخر بمبئی تک یہ سلسلہ پہونچکر ختم ہوگیا گویا الف سے لیکر یا تک کام کو پورا فرما دیا گیا (یا رسے تو بمبئی کی یا متعین ہے باقی الف سے مراد چاہیئے تو اعظم گڈھ کا الف لے لیجئے یا الہٰ آباد کو سمجھ لیجئے، اور اس الف و یا کی جانب ذہن یوں منتقل ہوا کہ اسی سلسلہ کے چند اشعار ایک بار حضرت نے سنائے تھے اور یہ فرمایا تھا کہ حضرت تھانویؒ نے ان اشعار کو اپنے کسی وعظ میں پڑھکر یہ فرمایا تھا کہ بھلا کوئی شاعری کرے تو ایسی تو کرے وہ اشعار یہ تھے ؎

ابوبکرؓ یکسو علیؓ ایک جانب — خلافت کو گھیرے ہیں با صد صفائی

الف اور یا رکی طرح انکو جانو — کہ محصور ہے جس میں ساری خدائی

یہ تشبیہ ہے واقعی تو جگہ بھی — الف اور یار نے بہ ترتیب پائی

یہ اول خلیفہ کے اول میں آیا — وہ آخر خلیفہ کے آخر میں آئی

یہاں گو خلیفہ نہیں بدلا تاہم مقامات میں تبدیلی ہوتی رہی۔ چنانچہ کبھی وہ مرکز اعظم گڈھ

بنا کبھی گورکھپور کبھی الہ آباد تو کبھی بمبئی ہوگیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس تبدیل مکانی سے حضرت اقدسؒ کا فیض دوبالا ہوگیا اور لائق فائق اہل علم اور اہل دول مخاطبین کی وجہ سے حضرت کے کمالات باطنی خوب ظاہر ہوئے۔ گورکھپور رئیسوں کا شہر کہلاتا ہے ان لوگوں نے یہی سمجھ رکھا تھا کہ پیر کو ہماری کوٹھیوں پر آنا چاہئے، وہاں ہم اس کے اعزاز و اکرام کے لئے دست بستہ حاضر رہیں گے لیکن حضرتؒ کے قیام گورکھپور سے انکی اس سلسلہ میں اصلاح فرمائی اور کم از کم لوگوں نے اتنا تو سمجھ ہی لیا کہ دین بمقابلہ دنیا کے ایک قیمتی شئے ہے لہٰذا اسکو حاصل کرنے کے لئے ہمیں خود اپنے کو خاک میں ملانا چاہئے۔ مال تو پھر بھی ہاتھ کا میل کہلاتا ہے لوگوں نے تو اپنے مزعومہ علم کو بھی خاک میں ملا دیا ہے تب جاکر باطنی دولت ان کے ہمکنار ہوئی ہے۔ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

گفتم مرا بتربیت از جہل پاک کن در خاک بیلقاں برسیدم بعابدے
یا ہر چہ خواندۂ ہمہ در زیر خاک کن گفتا برو چوں خاک تحمل کن اے فقیہ

فرماتے ہیں کہ میں نے مقام بیلقان میں ایک عابد کی زیارت کی اور ان سے عرض کیا کہ حضرت باطنی تعلیم و تربیت فرماکر (خدارا) مجھ ناچیز کو جہالت کے مرض سے نکال دیجئے اور پاک فرما دیجئے انھوں نے فرمایا کہ جاؤ اور مٹی کی طرح تحمل کرنا سیکھ کر آؤ (کہ غریب کتنی لتیائی جاتی ہے اور اسکے صلہ میں کس قدر انواع و اقسام کے پھل اور میوے اور سب ہی طرح کے اجناس ہم کو تحفۃً پیش کرتی ہے) اور یا نہیں تو یہ کرو کہ اپنے پندار علم کو خاک میں دفن کر کے آو۔

اللہ والے کہاں نہیں ہوتے لیکن خدا تعالیٰ تک پہونچانے والے بزرگ کم ہی ہوتے ہیں۔ حضرت اقدس کو دیکھکر گورکھپور والوں کی بھی آنکھ کھلی کہ ہاں بزرگ ایسے ہوا کرتے ہیں۔ بزرگوں سے کوئی کوئی بزرگ جلالی بھی ہوتے ہیں وہ جب کسی سے کوئی امر خلاف ملاحظہ فرماتے ہیں تو پھر بد عا بھی کر دیتے ہیں، ایسے بزرگ سے بھی یہاں کے لوگوں کو پالا پڑ چکا تھا۔ خود حضرتؒ ہی سے سنا فرماتے تھے کہ

ایک دن میں مولوی امجد اللہ صاحب کے ساتھ رکشے پر جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک شخص آتا ہوا نظر پڑا مولوی صاحب نے کہا کہ اسکو دیکھ لیجیے اسکا عجیب واقعہ ہے۔ یہ رئیس زادے تھے انکی بڑی حویلی تھی کسی بزرگ سے تعلق تھا وہ برابران کے یہاں آتے جاتے تھے ایک دن یہی صاحب اپنی بیٹھک میں بیٹھے احباب سے گفتگو کر رہے تھے کہ سامنے سے یہ بزرگ آتے نظر پڑے بس فوراً بجائے بڑھکر استقبال کرنے کے وہ صاحب گھر کے اندر چلے گئے یعنی اپنے اس رویہ سے ان بزرگ کے اس وقت آنے پر گویا ایک طرح کی ناگواری ظاہر کی چنانچہ اسکو ان بزرگ نے محسوس کر لیا ایک شعر پڑھا اور وہیں سے الٹے پاؤں واپس ہو گئے۔ فرمایا کہ ؎

خانقاہے بلند و ہمت پست   اے خدا ہر دو را برابر کن

حویلی تو اتنی بڑی ہے اور ہمت ایسی پست ہے (لا حول ولا قوۃ الا باللہ) اے خدا تو دونوں کو برابر کر دے۔ انھوں نے تو جملہ ایسا فرمایا تھا کہ وہ اسکے لئے دعا بھی بن سکتا تھا کہ آئندہ اسکی ہمت اسکی حویلی کی طرح بلند ہو جاتی لیکن چونکہ دکھے ہوئے دل سے فرمایا تھا اسلئے انکا یہ کلمہ بھی بددعا بن گیا اور اسکے بعد روز بروز انکی حالت گرتی ہی چلی گئی چنانچہ اب یہ حال ہے کہ نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے ہیں اور اسی طرح سے مارے مارے پھرتے ہیں۔ حضرتؒ نے فرمایا ان سے اس واقعہ کو سنکر بڑی عبرت ہوئی۔

راقم عرض کرتا ہے کہ یہ منصب پالینا بھی آسان ہے کہ انسان خدا تعالے کے آگے گڑ گڑا کر کسی کے متعلق کچھ کہدے اور وہ اسکی وجہ سے کسی آزمائش میں پڑ جائے لیکن انکی بزرگی سے انکو فیض کیا پہونچا؟ حضرت اقدس کے اندر شان جلالی دیکھی اور شان جمالی بھی دیکھی۔ کیسے کیسے متکبروں کی اصلاح ہو گئی اور کتنے خدا کے بندے جو خدا سے بھٹکے ہوئے تھے راہ راست پر آ گئے اور ہے بھی معاملہ یہی کہ ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے   مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

ہمارے حضرت اقدس نے اہل گورکھپور میں سے بہتوں کو تھاما، کتنوں ہی کی شخصی اور ذاتی اصلاح فرمائی، کتنے گھرانوں کے اختلافات و نزاعات کا خاتمہ فرمایا۔ چنانچہ اہل گورکھپور نے بھی پھر حضرت کو کتنا مانا اسکا کچھ اندازہ ناظرین کو وہاں سے ہجرت فرمانے کے بعد وہاں کے لوگوں کے حالات سے ہوگا کہ نہ معلوم کتنے طالبین تو بس ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہے۔

حضرت اقدسؒ کو وطن سے گورکھپور لے جانے والے چونکہ مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم تھے اسلئے قیام بھی حضرت والا کا مولوی صاحب موصوف کی کوٹھی میں ہوا۔ پھر چند دنوں کے بعد جب عورتیں اور بچے بھی گورکھپور پہونچ گئے تو بچوں کا قیام مولوی امجد اللہ صاحب کے مکان میں تجویز ہوا جو اسی کے متصل تھا اور مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم کے مکان کی حیثیت خانقاہ کی سی ہوگئی یعنی کوٹھی کے اندرونی حصہ میں حضرت والاؒ کا قیام تھا اور باہر کے بڑے ہال میں آنے والے مہمان مقیم ہوتے تھے پھر کچھ دنوں کے بعد جب خانقاہ فتحپور سے حضرت والا نے سب طلبہ اور طالبین کو بلالیا تو طلبہ کا قیام تو مدرسۂ سعیدیہ کے بعض کمروں میں کردیا گیا اور طالبین نے بڑے ہال میں اپنا اپنا بستر بچھایا۔ بس مجلس کے اوقات میں لوگ بستروں کو سمیٹ کر کنارے کر دیتے تھے اسی ہال میں ایک جانب تخت بچھتا اس پر گاؤتکیہ اور تپائی رکھی جاتی اس پر تشریف فرما کر حضرت مجلسی افاضہ فرماتے پھر مجلس کے بعد سارا ہال طالبین خانقاہ اور آمد و شد رکھنے والوں کے لئے بمنزلہ مہمان خانہ کے ہوجاتا تھا۔ اس ہال کے ایک گوشہ میں مکان کے اندر جانے کا دروازہ تھا جو گھر کے ایک نہایت طویل وعریض دالان میں کھلتا تھا۔ دالان عبور کر کے دوسری جانب حضرت والاؒ کا کمرہ یعنی آرامگاہ اور خلوت خانہ تھا چنانچہ حضرت اقدس کبھی کبھی اپنے کمرہ سے نکلکر اسی دالان میں ٹہلا کرتے تھے جس کے دونوں جانب گملوں کی روش نے اسے بھی مختصر سا چمن بنا دیا تھا، اور کبھی کبھی ٹہلتے ٹہلتے ہال میں کھلنے والے دروازے تک تشریف لے آتے اور وہیں سے جھانک کر مقیمین کا عمومی جائزہ لیتے کہ کون کیا کر رہا ہے۔ اس خیال

سے لوگ یہاں نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ قیام کرتے تھے چنانچہ ہنسی اور قہقہہ تو الگ رہا آپس میں باتیں بھی نہایت آہستہ آہستہ کرتے تھے کیونکہ ہر آن یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں حضرت والا نہ آجائیں۔ نہ شور وشغب تھا نہ گپ کی مجلس جمتی تھی نہ سگریٹ بازی ہوتی بلکہ لوگ ہر وقت نہایت متانت اور سکون سے رہتے تھے۔ باتیں اگر ہوتی بھی تھیں تو مجلس کی اور لکھنا پڑھنا بھی جو جاری تھا تو حضرت کے ملفوظات اور تعلیم کا۔

حضرت والا کے مکان کے دالان میں چہل قدمی فرمانے کے سلسلے میں دو واقعے یاد آگئے۔ ایک تو یہ کہ حضرت والاؒ کے خدام میں سے ایک خادم تھے حاجی مطیع اللہ صاحب گورکھپوری مرحوم انکو اللہ تعالیٰ نے جسمانی ساخت میں بہت کچھ حضرت والا سے مشابہت عطا کر رکھی تھی پھر لباس اور ٹوپی میں انھوں نے شیخ کی متابعت اختیار کر لی تھی اسلئے بعض مرتبہ حاجی صاحب کو اچانک دیکھکر لوگ سمجھتے کہ حضرت تشریف لا رہے ہیں اور سہم جاتے قریب آنے پر معلوم ہوتا کہ یہ تو حاجی صاحب ہیں۔ ایک دن مولوی نثار اللہ صاحب نے حاجی صاحب کی موجودگی میں حضرت والا سے فرمایا کہ حضرت! یہ حاجی صاحب بہت اچھے آدمی ہیں لیکن ان میں بس ایک خرابی ہے وہ یہ کہ یہ ذرا دھوکے باز ہیں۔ یہ سنکر حضرت کو تعجب سا ہوا، اتنے میں مولوی صاحب موصوف نے اس دھوکے کی تشریح یوں فرمائی کہ حضرت بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ سامنے سے حاجی صاحب تسبیح لئے ہوئے آتے ہوتے ہیں تو ہم لوگ ڈر جاتے اور سہم جاتے ہیں یہ خیال کر کے کہ حضرت تشریف لا رہے ہیں بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نہیں بلکہ یہ حضرت ہیں یہی انکا دھوکا ہے جو ہم سب کو پریشان کر دیتا ہے۔ یہ سنکر حضرت والا تو ہنس دیئے اور حاضرین بھی اس لطیفہ سے محظوظ ہوئے۔ پھر معاملہ جب حضرت سے مشابہت ہی کا تھا تو جس طرح سے حاجی صاحب کو لوگ حضرت والاؒ سمجھ لیتے تھے اسی طرح بالعکس بھی ایک معاملہ ہوا وہ یہ کہ ہمارے دوست حکیم وصی احمد صاحب (مالک علی گڑھ دواخانہ گورکھپور) ایک خوش مزاج اور مزاح پسند انسان ہیں کبھی بچپنے میں گھوسی کے مدرسہ میں بھی پڑھ چکے تھے اس لئے حضرت اقدس سے قدیمی تعارف تھا

اور ولی محبت بھی گورکھپور تشریف آوری پر حضرت اقدس کی خدمت میں صبح شام، دوپہر جب بھی موقع ملتا حاضر ہوتے رہتے تھے، ایک دن دوپہر کو آئے حضرت والا کھانا کھاکر اسی دالان میں چہل قدمی فرما رہے تھے حکیم صاحب نے دور سے سمجھا کہ یہ حضرت نہیں ہیں بلکہ حاجی مطیع اللہ صاحب ہیں اور سمجھا کہ حضرت والا اپنے کمرہ میں آرام فرما رہے ہوں گے یہ خیال کر کے اپنے مخصوص مزاج اور ظریفانہ طبیعت کے مطابق زمین کے قریب جھک کر وہاں سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے زبان سے بڑی زور سے کہا "اخاہ جناب حاجی صاحب السلام علیکم" یہ کہتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بھی بڑھایا جب قریب ہوئے تو دیکھا کہ حضرت اقدس ہیں۔ یہ دیکھکر حکیم صاحب کی تو گویا جان ہی نکل گئی بالکل دم بخود ہی تو ہوگئے، اور بڑی لجاجت سے عرض کیا حضرت بڑی گستاخی ہوئی معاف فرما دیجئے! بڑی بے ادبی ہوئی معاف فرما دیجئے! حضرت والا نے حکیم صاحب کے سر کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے فرمایا کہ جان کے تو ایسا نہیں کہا تھا نا ؟ کہا حضرت نہیں بالکل نہیں مجھے حاجی مطیع اللہ صاحب کا دھوکا ہوگیا۔ حضرت نے فرمایا جاؤ اب نہ ایسا کرنا۔ خیر یہ دونوں واقعے تو دالان پر ضمناً یاد آگئے تھے۔ عرض یہ کرنا تھا کہ حضرت اقدس کے گورکھپور تشریف آوری کی اطلاع آناً فاناً شہر میں اور اطراف میں ہوگئی اور اب گویا یہاں دینی بہار کا موسم ہی آگیا مجلسیں ہونے لگیں اور ہر طبقہ (رؤسا، تجار، اہل دفاتر نیز عوام) وقتاً فوقتاً آنے لگے اور آآکر فیضیاب ہونے لگے۔ مجلس کا وقت مقرر ہوا اور وقت مقررہ پر باقاعدہ مجلس ہونے لگی جس میں اہل طلب جوق در جوق شرکت فرمانے لگے۔

اہل وطن سے حضرت کا کچھ مواخذہ تھا اس کے باوجود حضرت اقدس کی جدائی کا ان پر جو اثر تھا ظاہر تھا، فتحپور کا مکان خالی ہوگیا خانقاہ خالی ہوگئی مسجد خالی ہوگئی، محبین اور مخلصین اب جو ادھر سے گذرتے تو بغیر روئے نہیں گذر سکتے تھے اللہ تعالیٰ کی مصلحت سب پر غالب ہے اس میں دم مارنے کی مجال کسی کو نہیں بہرحال سینہ پر پتھر باندھکر لوگ کبھی کبھی خانقاہ میں بھی جاتے اور نماز پڑھنے پانچوں وقت

مسجد میں آتے ہی تھے۔ چنانچہ تھوڑا عرصہ گذرنے پراعزہ و اقربا یا مخصوص خدام نے گورکھپور حاضری کی ہمت کی ڈرتے ڈرتے مولوی ثناء اللہ صاحب مرحوم کی کوٹھی میں قدم رکھا کسی سے کہلا بھیجا کہ فتحپور سے فلاں فلاں حاضر ہوئے ہیں بس پھر کیا تھا حضرت پر ایک اثر ہوجاتا جس کو دیکھنے والے ہی جانتے تھے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوجاتا۔ حضرت والا لوگوں کے اصلاحی مقصد کے پیش نظر کڑی سے کڑی گرفت فرماتے حتی کہ جو شخص واسطہ بنتا وہ پریشان ہوجاتا کبھی کبھی سنا ہے کہ ایسا بھی ہوا کہ گورکھپور کے مخصوص لوگ واسطہ ہوئے ہیں اور حضرت اقدس کے غصہ اور ناراضگی کو دیکھ کر اسی لہجہ میں ان وطن سے آنے والوں سے اسی لہجہ میں انھوں نے بھی گفتگو کرلی (مثلاً یوں کہدیا کہ آپ لوگ یہاں کیوں آتے ہیں جبکہ حضرت والا کو ایذاء ہوتی ہے؟ کچھ دنوں نہ آیئے تو کیا حرج ہے بلا وجہ آپ لوگوں کے آنے کی وجہ سے حضرت والا سخت تکلیف میں پڑ جاتے ہیں اور انکا اچھا خاصا سکون مکدر ہوجاتا ہے) میں نے سنا کہ جب حضرت اقدس کو اسکی اطلاع ہوئی کہ واسطہ صاحب نے میرے گاؤں کے لوگوں کو بطور خود اس اس طرح ڈانٹا ہے تو خود ان سے اس پر مواخذہ ہوگیا۔ یعنی یہ کہ حضرت والا کا کہنا سننا تو اصلاح کے لئے ہوتا تھا باقی حضرتؒ ان لوگوں کی محبت کو جانتے تھے اور وطن میں جو جو قربانیاں حضرت کے لئے ان حضرات نے دی تھیں اسکا عُشر عشیر بھی کوئی دوسرا نہیں دے سکا تھا اسلئے حضرت انکی محبت کی قدر فرماتے تھے اور دوسرے لوگ اعتدال پر نہ رہتے، گو منشا انکا بھی حضرت کی راحت رسانی ہی ہوتی تھی مگر ذرا لہجہ ترش اور الفاظ سخت فرماجاتے جسکا اثر ان آنے والوں پر تکلیف دہ ہوتا اسلئے یہ طرز بھی حضرت کو پسند نہ ہوتا۔

راقم عرض کرتا ہے کہ واقعی حضرت کے کسی سے مواخذہ کرنے کی حالت میں کسی کا واسطہ بننا کچھ کھیل نہیں تھا اسکا بھی پورا امتحان ہوجاتا تھا خود حضرتؒ فرماتے تھے کہ واسطہ بنانے میں میری مصلحت یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ شخص سامنے ہوگا تو شاید مجھے ہی غصہ آجائے تب کام بن نہ سکے گا اور سامنے ہونے کی صورت میں

وہ مرعوب بھی ہو کر سوالات کا جواب بھی نہ دے سکے گا، اس لئے واسطہ کے ذریعہ سے سوال وجواب کرتا ہوں اس میں دونوں کی مصلحت ہوتی ہے، اور یہ بھی کہ مواخذہ والے کا تو دماغ پریشان ہوتا ہے واسطہ والے صاحب کو چاہیئے کہ بات کے سمجھنے سمجھانے میں اسکی اعانت کریں۔ چنانچہ ہم لوگوں کی کج فہمی کم عقلی سے کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ واسطہ خود شیخ بن جاتا تھا یہی حضرت کو ناگوار ہوتا۔ اس پر کبھی کبھی تو مجرم کی معافی ہو جاتی اور واسطہ صاحب شکنجہ میں آجاتے تھے۔

بہر حال وطن سے آنے جانے والوں سے مواخذہ بھی ہوتا رہا مگر اہل محبت یہ سمجھکر برابر آتے بھی رہے کہ ؎

داغ جاتے تو ہیں مقتل میں پہ اول سب سے دیکھئے وار کرے وہ ستم آرا کس پر

جانتے تھے کہ حضرت سخت ناراض ہی جائیں گے تو ڈانٹ پڑے گی اور ہو سکتا ہے کہ جھپڑ یا بھی دیئے جائیں اور دوچار تھپڑ بھی لگ جائے مگر انکا حال تو یہ تھا کہ ؎

تو ہو کے ترشرو مجھے گالی ہزار دے یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

جس طرح سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہوتا ہے کہ مومنین میں سے اہل فسق اور اہل غفلت پر خود تو نکیر فرمائی ہے انکو زجر بھی فرمایا ہے لیکن عام مخلوق کو اسکی اجازت نہیں دی کہ وہ کسی بے عمل مسلمان کی غیبت یا شکایت کریں یا اسکے عیوب کا تجسس کریں یا اسکو حقیر جانیں اسی طرح سے یہ حضرات مشائخ بھی جو متخلق باخلاق اللہ ہوتے ہیں اپنے موافق اور مخالف کو پہچانتے ہیں اور انکو سمجھکر ان کے ساتھ کوئی معاملہ فرماتے ہیں۔ کسی پر نکیر بھی فرماتے ہیں تو اسکی اصلاح کے لئے، غصہ بھی ہوتے ہیں تو اس کے نفع کے لئے اور خود تو یہ معاملہ فرماتے ہیں مگر اسکو بالکل پسند نہیں فرماتے کہ دوسرے لوگ انھیں اپنی نظروں سے گرا دیں اور حقیر گردانیں چنانچہ یہاں بھی موافقین اہل وطن سے حضرت ناراض تھے اور ظاہر ہے کہ انکی ادنی ناسمجھی سے حضرت والا کو کس قدر زبردست نقصان پہونچا، کیسی ایذا ہوئی کہ وطن ہی کو خیرباد کہنا پڑا اور یہ سب جانتے ہیں کہ وطن کا ترک کس قدر تکلیف دہ اور نفس پر شاق ہوا کرتا ہے۔

مگر جو ایذائے قلبی وروحانی حضرت والا کو پہونچی تھی وہ اس قدر زیادہ تھی کہ اسکے مقابلہ میں ترک وطن جیسا مرحلہ بھی معمولی اور آسان تھا۔ پس گو حضرت والا بطور خود انسے خفا تھے لیکن اسکا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہر شخص انکو ملامت اور ہر شخص کو کرے کیونکہ بہت سے حضرات ان میں صاحب نسبت اور پابند اوقات بھی تھے اسی طرح سے صاحب معمول اور بے قصور بھی تھے لیکن عموم مواخذہ میں وہ بھی ماخوذ تھے اب انہیں کون کس درجہ کا تھا ظاہر ہے کہ اسکو تو حضرت اقدسؒ ہی سمجھ سکتے تھے، اس لئے کسی دوسرے کو اجازت نہ تھی کہ اپنی جانب سے کسی کو کچھ کہے ہاں جبکو حضرت والا خود ہی کسی کے معاملہ میں واسطہ بنا دیں تو اسکے لئے بطور نصح نصیح کے یا صلاح و مشورہ کے کچھ کہنے سننے میں مضائقہ نہ تھا۔

اس طور پر حضرت والا کے گورکھپور آجانے پر بھی وطن کے محبین اور مخلصین برابر آتے رہے اور حضرت اقدسؒ سے برابر ملتے رہے اور معافی طلب کرتے رہے اور حضرت اقدس سے اپنے اس ناقابل تلافی نقصان کا ذکر کر کے روتے بھی رہے اور ایسی جلیل القدر نعمت سے محروم ہو جانے پر کف افسوس بھی ملتے رہے۔ حضرت والا بھی بالآخر انکی آہ و فغاں سنکر اور ان کے قلبی رنج و غم کو محسوس فرما کر متاثر ہوتے اور نرم ہو جاتے اور پھر انھیں تسلی دیتے اور ہجرت کے فوائد ان سے بیان فرماتے اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہنے کی تلقین فرماتے معتقدین محبین اور طالبین کے ساتھ تو حضرت اقدسؒ کا یہ معاملہ رہا —— اور مخالفین و معاندین نے اس اتنے ظلم وستم پر بھی اکتفا نہیں کیا بلکہ فساد کرنے کے بعد مقدمہ کا بھی سلسلہ شروع کر دیا یہاں تک کہ حضرت اقدسؒ کے نام کو بھی شامل مسل مقدمہ کر لیا گیا اسلئے کہ ان کو وکلا نے یہ مشورہ دیا کہ تمھارا مقدمہ بہت کمزور ہے تم لوگ سزایاب ہو جاؤ گے، لہٰذا اس سے بچت کی شکل صرف یہ ہے کہ کسی بڑے آدمی کا نام مثلاً مولانا ہی کا نام داخل مقدمہ کرو تاکہ صلح پر بات آجائے ظاہر ہے کہ حضرت مولانا کچہری جانا پسند نہ فرمائیں گے باہم صلح ہو جائیگی اور تم لوگ سزا سے بچ جاؤ گے۔

یہاں مجھے روداد مقدمہ بیان کرنا نہیں ہے اور اب اسکے بیان سے کوئی فائدہ بھی نہیں لیکن فساد کی تفصیل اور بانی فساد کا ذکر ہم نے نام لیکر اس لئے کیا ہے تاکہ آپ کے پیش نظر خدا کی شان اور حضرت اقدس کی کھلی ہوئی کرامت آجائے کیونکہ مولوی علیم اللہ صاحب کی طرح یہ سپاہی صاحب بھی مقدمہ ہو جانے کے بعد تائب ہو گئے تھے اور اسوقت حضرت والا گورکھپور سے الہ آباد تشریف لا چکے تھے وہ صاحب یہیں آئے روئے گائے اور معافی چاہی، حضرت والاؒ نے اپنے کرم سے استنے بڑے مجرم کو دل سے معاف فرما کر سنتِ یوسفیؑ کی یاد تازہ فرمادی انھوں نے بھی عزیزِ مصر ہونے کے بعد اپنے بھائیوں سے فرمایا تھا لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (جاؤ تم پر آج کے دن کوئی ملامت نہیں ہے تمہیں اللہ بخشے اور تمہارا قصور معاف فرمائے وہ سب رحم فرمانے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے)

اسکے توبہ کی اور حضرت اقدس کے معاف فرمانے کی داستان ذرا طویل بھی ہے اور کسی قدر سبق آموز بھی اسلئے ہم اسکا مفصل بیان انشاء اللہ تعالیٰ قیام الہ آباد میں کریں گے یوں کہنے کو تو کسی شاعر نے محض شاعری کے طور پر کسی موقع پر یہ کہا تھا لیکن ہم نے تو اپنے حضرت مصلح الامۃؒ کے حالات میں شمس الدین مرحوم کی توبہ کو اسی کا پورا مصداق پایا کہ ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اور یہ اندازہ ہوا کہ حالات و بیان کے سلسلہ میں کسی ایسے شخص کا کوئی سابقہ واقعہ بیان کرنا جو پہلے دور جہالت و مخالفت سے گذر کر بعد میں مخلص ہو گیا ہو بڑا مشکل ہوتا ہے کیونکہ گذشتہ حالات کا تقاضا ہوتا ہے کہ اسکے بیان میں مطلقاً ادب و تعظیم کا کچھ بھی لحاظ نہ کیا جائے لیکن چونکہ علم میں یہ بھی ہوتا ہے کہ آئندہ تو یہ شخص راہ راست پر آگیا تھا اسکے ساتھ بے ادبی کو بھی جی نہیں چاہتا، چنانچہ ان مہربان

موصوف کا جنکی وجہ سے حضرتؒ نے اپنا وطن چھوڑا تھا) اصلی نام تو شمس الدین خاں تھا لیکن جیسا کہ اہل دیہات کا قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ سیدھا نام کسی کا نہیں لیتے بلکہ اسے کچھ توڑ مروڑ ہی دیتے ہیں چنانچہ اسی قاعدہ کے مطابق گاؤں کے لوگ انھیں عام طور پر سُدّی یا بطور محبت کے سُدیا کہکر پکارتے تھے، مہمل ہونے میں تو دونوں یکساں تھے کہ سُدّی بھی شمس الدین کا ناتمام جزو تھا اور سُدیا اسی کا بگاڑا ہوا ایک لفظ تھا' اس لئے میں نے کہیں کہیں انھیں شمس الدین مرحوم کو ان کے معروف فی القریہ نام سے بھی تعبیر کر دیا ہے، آئندہ حالات میں جہاں کہیں شمس الدین آئے گا تو اس سے یہی حضرت مراد ہوں گے۔

غرض جب حضرت والا گورکھپور تشریف لے آئے تو خود حضرتؒ ہی سے اپنی تشریف آوری کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ میں نے دیکھا کہ اب یہاں (وطن میں) رہ کر سکون کے ساتھ اپنا کام نہ کر سکوں گا یہ لوگ مجھے بھی اپنی ہی جماعت میں لینگے اور مجھے دین کا کام کرنا ہے اس لئے ان دنیا داروں سے دوری اختیار کر و جب ہی کچھ کام کر سکو گے چنانچہ وطن سے چلا آیا۔

اور کرمفرماؤں نے اعظم گڈھ میں مقدمہ دائر کر کے ایڑی چوٹی کا زور اس پر صرف کیا کہ کسی طرح سے حضرت والا کو بھی عدالت میں طلب کرالیں لیکن اللہ تعالے نے نصرت فرمائی اور مخالفین اپنی اس کوشش میں ناکام رہے اور حضرت والا کو نہ صرف یہ کہ عدالت میں نہ جانا پڑا بلکہ سرے سے حضرتؒ کا نام ہی مقدمہ سے خارج کر دیا گیا۔ چنانچہ مولوی علیم اللہ صاحب کی خانقاہ میں حضرت والا کی مجلس میں تشریف آوری ان کے لئے پہلی شکست تھی تو یہ عدالت کی عدم حاضری دوسری شکست تھی جس کے ذریعہ خدا نے حضرت والا کا بول بالا اور ہجرت کو ابتدا رفتح کا پیش خیمہ اور تکمیل فتح (یعنی فتح پوری) کا مقدمہ بنایا۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

یوں مظلوم ہو کر کسی کا عدالت حاضرہ میں چلا جانا کچھ عیب بھی نہیں لیکن مخالفین نے کچھ ایسی ہوا باندھ رکھی تھی کہ گویا حضرت کو طلب عدالت ہی کرالینا انکی عین کامیابی

تھی اللہ تعالیٰ کو چونکہ اپنے مخلص بندوں کی لاج رکھنی ہوتی ہے ارشاد ہے
وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ وہی صالحین اور نیکو کاروں کا معین اور مددگار ہوتا ہے
اسلئے اس موقع پر بھی مخالفین کو شکست فاش ہوئی اور بری طرح زک اٹھانی پڑی
کہ حاضری تو بجائے خود رہی اصل مقدمہ سے نام ہی خارج ہوگیا، باقی چلنے کو
تو مقدمہ چلتا رہا جس سے حضرت اقدس کا اب نام کا بھی تعلق نہیں رہ گیا تھا
صرف اہل بستی اپنے مقدمہ کی پیروی کرتے رہے اور حضرت والا سکون واطمینان
کے ساتھ گورکھپور میں اپنا کار منصبی ادا فرمانے لگے اور مقامی حضرات کے علاوہ
ہند کے اطراف واکناف سے لوگوں کو آنے میں اور حضرت سے زیارت وملاقات
میں بہت آسانی پیدا ہوگئی، یہ خدائی حکمت تھی جس نے اس طور پر حضرت والا کو
یہاں لا پہونچایا

(گورکھپور کا تقریباً ۱½ سالہ قیام)

(رمضان ۱۳۷۵ھ تا ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ مطابق اپریل ۵۶ء تا نومبر ۵۷ء)

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں وطن سے سفر کے وقت مولوی ثناء اللہ صاحب مرحوم
مولوی امجد اللہ صاحب مرحوم ہمراہ تھے ہی اس لئے حضرت والا نے گورکھپور میں
انھیں حضرات کے مکان پر قیام فرمایا۔ تھوڑا عرصہ مزید گذرنے پر حضرت نے راقم سے
فرمایا کہ تم بھی اپنے بچوں کو یہیں بلالو چنانچہ مولوی امجد اللہ صاحب ہی کے مکان
کے ایک حصہ میں میرے متعلقین کا بھی قیام ہوا، ان دنوں مجلس حضرت والا اپنے
شباب پر تھی جس میں شہر کے ہر طبقہ کے لوگوں کا آہستہ آہستہ آنا ہونے لگا یعنی
عمائدین اور رؤسار شہر بھی ہوتے تھے، تاجرین کا خاصا طبقہ ہوتا، انگریزی اسکول
کے مدرسین اور طلبار بھی ہوتے، پروفیسر اور لکچرار صاحبان بھی تشریف لاتے،
شہر کے معزز اطباء، علمار اور ذی احترام حضرات بھی آتے اور آئے دن
لکھنؤ، تھانہ بھون، بریلی، الہ آباد، بنارس، غازی پور، بلیا، مئو، اعظم گڈھ سے

بعض اہل علم حضرات بھی تشریف لاتے رہتے۔ ان کے علاوہ شہر کے عوام کا مرجوعہ بھی خاصا ہونے لگا تھا جسکی وجہ سے بڑا ہال روزانہ ہی قریب قریب بھر جاتا تھا جہیں ہر روز صبح آٹھ بجے سے نو بجے تک مجلس عام ہونے لگی۔

مجلس کا انداز وہی تھا جو وطن میں تھا کہ کتابوں کے حوالے سے بلکہ ان کے صفحات کھول کھول کر مضامین نکالتے اور حاضرین کو سناتے اور اسکے لئے کچھ روح المعانی، احیاء العلوم، فتح الباری اور حجۃ اللہ البالغہ ہی لازم نہ ہوتی بلکہ اصلاحی کام گلستان، بوستان، اخلاق محسنی اور تصوف کی ضرورت مالابد سے بھی بیان فرماتے تھے۔

اس درمیان میں جب جب یہ واقعہ ہوتا کہ وطن سے کوئی صاحب تشریف لے آتے تو پھر مواخذہ اور عتاب از سرنو شروع ہوجاتا اور اچھا خاصا جمالی ماحول شانِ جلالی میں تبدیل ہوجاتا۔ چنانچہ یہ معاتبہ اور مواخذہ اوقاتِ مجلس کے علاوہ دوپہر یا شام کو بھی جاری رہتا اور حضرت کا انداز مواخذہ بھی وہی ہوتا جو وطن میں تھا بڑی زور سے تڑپتے گرجتے اور مارے غصہ کے چہرہ سرخ ہوجاتا اور بولتے بولتے منھ سے کبھی کبھی جھاگ بھی نکل پڑتی تھی۔ جب کبھی یہ کیفیت زیادہ ہوجاتی تو اکثر مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم ہی سامنے آتے اور کسیکی تو ہمت ہی نہ پڑتی تھی مولوی صاحب ہی حضرت سے نہایت عاجزی سے عرض کرتے کہ حضرت بس کیجئے، آپ کو تکلیف ہوجائے گی اور اس صاحب واقعہ کو سامنے سے ہٹا دیتے۔ اس نوع کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے تھے یہ نقشہ بھی اہل گورکھپور کے لئے کیا مرد کیا عورتیں سب کے لئے جدید ہی تھا اور عجیب بھی۔

چنانچہ ایک دن مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم نے (حضرت والا کو نشاط کی حالت میں پاکر) عرض کیا کہ حضرت کل آپ فلاں صاحب پر خفا ہو رہے تھے اور زور زور سے انکو ڈانٹ رہے تھے اسکی آواز میرے گھر میں بھی جا رہی تھی (جس مکان میں حضرت کا قیام تھا اسی سے متصل دوسرے مکان میں مولوی نثار اللہ صاحب

رہتے تھے اس طرح پر کہ اگر درمیان کے دروازے کھول دیئیے جائیں تو دونوں مکان گویا ایک ہی معلوم ہوتا) اہلیہ نے سنا اور اسکو سنکر وہ بہت ڈر اور سہم گئیں اور گھبرا گئیں اور کہتی تھیں کہ مجھے تو اختلاج ہونے لگ گیا تھا۔ مولوی صاحب نے تو بطور تفریح کے ایک واقعہ بیان کیا چنانچہ حضرت والا بہر بڑی زور سے ہنسے بھی لیکن حضرت والا کی طبع حساس نے اسکا دوسرا اثر بھی لیا اسوقت تو سنکر خاموش ہو گئے مگر دل ہی دل میں یہ طے کر لیا کہ اب کسی پر اس طرح سے مواخذہ نہیں کروں گا اور چند دنوں کے بعد غالباً مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم ہی کے ذریعہ اہل مجلس سے اصلاح پر دل سے متوجہ نہ ہونے کے سلسلہ میں کچھ عام جواب طلب ہوا اسی سلسلہ میں مولوی صاحب نے یہ بھی آکر حاضرین سے کہا کہ حضرت والا نے فرمایا ہے کہ " میں نے تو اپنے کو بدل لیا ہے اب آپ لوگ اپنے کو کب بدلیں گے؟ " اس اپنے کو بدلنے سے مراد حضرت کی وہی مواخذہ میں نرمی فرمانا تھی اور اسکے ذریعہ سے ہم لوگوں سے عمل کا مطالبہ تھا کہ مجھے مواخذہ میں نرم کرتے ہو تو تم بھی عمل میں سخت ہو جاؤ۔ لیکن خیال یہ ہے کہ حضرت والا نے یہ کیوں فرمایا اسکو بہت دنوں تک کسی نے نہیں سمجھا تھا خود حضرت ہی نے ایک دن اسکی وضاحت فرمائی تو وجہ سمجھ میں آئی سچ ہے ع۔ بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست۔

گورکھپور کے قیام میں چند حضرات نے خصوصی طور پر حضرت والا کی خدمت میں اپنے کو پیش کر رکھا تھا۔

۱۔ ایک تو یہی مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم تھے ماشاء اللہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ساتھ ساتھ دین سے بھی خوب ہی خوب نوازا تھا اتنا بڑا شخص جو ایم۔ اے بھی رہ چکا ہو اور اپنے وقت میں کسی کو خاطر میں نہ لاتا ہو حضرتؒ کے آگے جس تواضع سے پیش آئے وہ ہم جیسوں کے لئے باعث عبرت ہے ؎

تواضع زگردن فرازاں نکوست | گدا گر تواضع کند خوئے اوست

(تواضع بڑے لوگوں کی جانب سے ہو تو زیب دیتی ہے باقی فقیر اور غریب اگر تواضع کریگا تو کیا کرے گا)
قرآن شریف کے حافظ تھے اور حافظہ بھی بے مثل تھا، فارغ اوقات میں بس تلاوت قرآن ہی فرماتے تھے، قرآن شریف سے گویا عشق تھا، بڑے ہی خوش مزاج، خوش مذاق اور خوش پوشاک اور خوش خلق انسان تھے مدینہ شریف میں مکان بنوالیا تھا خیال تھا کہ ہجرت کر کے وہیں آخری ایام گذار دیں گے۔ جن دنوں حضرت والا کا قیام الہ آباد میں تھا ہجرت کے خیال سے گورکھپور سے سفر کر کے حضرت سے آخری ملاقات کرنے کے لئے الہ آباد تشریف لائے، حضرت اقدس بھی بہ نفس نفیس انکو رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن تشریف لے گئے ہم سب خدام بھی گئے اسوقت عظمت و محبت شیخ کا جو مظاہرہ مولوی صاحب مرحوم نے فرمایا ہے آج بھی وہ نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے حضرت اقدس سے آخری مصافحہ اور معانقہ چشم گریاں اور دل بریاں کے ساتھ کرتے کرتے حضرت کے قدموں میں گر گئے اور حضرت کا جوتہ حضرت کے پیروں سے نکالکر اپنے سینے سے لگا لیا اور پھر پلیٹ فارم میں اپنے سر پر رکھ لیا چنانچہ جاننے والوں نے دیکھا کہ نعم الامیر علی باب الفقیر کا یہ مصداق تھے۔ اور حضرت والا نے انتہائی مسرت کے ساتھ انھیں دعائیں دیں اور خوشی خوشی رخصت کیا یہ محبت اور عشق کے جذبات اور حالات ہیں ہر ایک کو نہ میسر نہ ہر ایک کو اسکی قدر

سرمد غم عشق بو الہوس را ندہند   سوز دل پروانہ مگس را ندہند

(سرمد عشق (حقیقی) کا غم اہل ہوس کو نہیں عطا فرماتے نہ پروانہ کے دل کا سوز مکھی کو بخشتے ہیں)
اللہ کی مرضی کہ مدینہ شریف میں جا کر بیمار ہوئے قلب کے مریض تھے دورہ شدید پڑا لوگوں نے علاج کے لئے ہندوستان آنے کا مشورہ دیا چونکہ یہاں کے علاج سے پہلے نفع ہوتا رہا تھا کوئی یہ کہنے والا نہ ملا کہ جب مدینہ شریف مرنے ہی کیلئے آئے ہیں تو پھر یہ رجعت قہقری کیسی؟ لیکن ماشاء اللہ کان خدا ہی جو چاہتا ہے ہوتا ہے بمبئی اترے تو حالت نازک سے نازک تر ہوگئی جھانسی پہونچتے پہونچتے اس عالم فانی

سے عالم جاودانی کو رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بالآخر لکھنؤ میں نعش اتار دی گئی اور وہیں انکی آخری آرام گاہ بنا نا تجویز ہوا اللہ تعالیٰ کو منظور یہی تھا۔ واقعی خدا تعالیٰ کو جو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ انسان کیا کیا خیال قائم کرتا ہے لیکن اسکی بے کسی و بے بسی مولوی صاحب کے اس واقعہ سے نمایاں ہے۔ خود مدینہ میں رہنے بلکہ مرنے کا ارادہ کیا لیکن خمیر لکھنؤ کی تھی چاروناچار وہاں سے آنا پڑا اور اپنے وطن بھی نہ پہونچ سکے۔ مولانا محمد علی جوہر کا شعر قدرے تغیر کے ساتھ انکے حسب حال ہوا کہ ؎

مارا دیار ہند میں مجھکو وطن سے دور　　رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی لاج

بہر حال ع۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

۲ — گورکھپور کے خدامِ خاص میں سے دوسرے بزرگ ہمارے محترم اور عزیز مولوی امجد اللہ صاحب مرحوم تھے۔ آپ یوں تو مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم کے برادرِ خورد تھے لیکن حضرت اقدس سے تعلق کے باب میں آپ کو تقدم کا شرف حاصل تھا چنانچہ اپنے برادرِ محترم مولوی نثار اللہ صاحب کو حضرت سے روشناس بلکہ متعلق ہونے میں واسطہ آپ ہی بنے تھے گورکھپور کے بڑے رؤسا میں سے شمار تھا لیکن بڑے ہی خلیق۔ منکسر المزاج۔ مہمان نواز غریب پرور تھے اور ہر ایک سے نہایت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے تھے۔ جب حضرت کے متعلقین کا آپکے مکان پر قیام تجویز ہوا تو نہ صرف آپ ہی بلکہ آپ کا سارا گھرانہ ہی حضرت والا کی محبت کی وجہ سے سب گھر والوں کی راحت رسانی میں پیش پیش نظر آتا تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب مرحوم کی حسن تربیت نے آپ کی سب صاحبزادیوں کو بھی حسن خُلق کے زیور سے آراستہ کر رکھا تھا جسکی وجہ سے حضرت کے متعلقین کو سچ پوچھئے تو گورکھپور میں وطن ہی جیسی راحت ملی اور ترک وطن کا جو زخم قلب میں ہو گیا تھا ان سب کے اخلاق اور خدمات نے اس پر مرہم رکھدیا تھا۔ پورے طور پر انصارؓ کی سنت ادا کی اور مہاجرین کو پردیس، پردیس ہی نہ معلوم ہونے دیا۔

اور حضرت والاؒ نیز حضرت کے مہمانوں کا قیام چونکہ مولوی نثار اللہ صاحب کے عریض و وسیع مکان میں ہوا تھا اسلئے ان سب کی راحت رسانی میں مولوی نثار اللہ صاحب کے بڑے داماد بھائی مسعود احمد صاحب نے نمایاں طور سے حصہ لیا اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ بہت ہی خوش مزاج اور نیک خصلت آدمی تھے حضرت والا کے گورکھپور سے الہ آباد تشریف لے آنے کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انکا انتقال ہوگیا اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

یہ ہمارے مولوی امجد اللہ صاحب بڑے ہی پرلطف انسان واقع ہوئے تھے، مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ فتحپور میں مجلس میں کسی سلسلہ سے مال اور امراء کا تذکرہ آگیا مولوی صاحب بھی موجود تھے حضرت والا یہ فرمارہے ہے کہ مالداری کا ایک خاص اثر اور زہر ہوتا ہے اور کم و بیش وہ ہر امیر میں ہوتا ہے الا ماشاءاللہ اور اسکے بعد مولوی امجد اللہ صاحب کی جانب اشارہ کرکے فرمایا کہ آپ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں آپ اس سے نکل گئے ہیں۔ سبحان اللہ شیخ کے ساتھ کس طرح سے پیش آئے ہونگے کہ حضرت سے یہ کہلوا ہی لیا ورنہ کسی کی تعریف وغیرہ کرنیکا وہ بھی اس طرح سے اس کے منہ پر حضرت کا مذاق اور معمول نہ تھا۔ مولوی صاحب آخر آخر میں (یعنی بھائی صاحب مولوی نثار اللہ صاحب کے وصال کے بعد) مدینہ کی جائداد کے نظم و انتظام کے لئے سال کا اکثر حصہ وہیں گذارتے تھے صرف آموں کی فصل میں چند مہینے کیلئے اپنے وطن گورکھپور آجاتے اور فارم پر زمانہ گذارتے، چنانچہ اس بار بار ہر سال آنے جانے کی وجہ سے اہل عرب سے تعلقات ہوگئے تھے اسکے پیش نظر اپنے ملک کا تحفہ یعنی آم امرود وغیرہ اور اسکے پودے بکثرت عرب لیجاتے تھے حتیٰ کہ لطف مجلس کے لئے اور اہل عرب کو نئی سوغات سے روشناس کرانے کے لئے کبھی کبھی ہوائی جہاز کے سفر سے بھی اپنے فارم سے کٹھل لے جاتے جو وہاں کے لئے نئی چیز ہوتی شیوخ عرب کی دعوت کرتے اور خوب کھاتے کھلاتے ان کے اس خلق سے عرب کے علماء اور

وہاں کے بڑے بڑے لوگ بھی متاثر تھے۔ بہت سے لوگوں کے باغات میں آپ نے آم کا درخت لگا بھی دیا تھا۔ یہی سبب ہوا کہ جب حضرت اقدسؒ نے سفر حج کا ارادہ فرمایا تو مولوی صاحب موصوف مدینہ شریف ہی میں تھے بڑے خوش تھے اور اپنا پورا مکان حضرتؒ اور حضرت کے رفقار کے لئے خالی کر رکھا تھا۔ جدہ پر استقبال کے لئے موجود تھے لیکن ملاقات مقدر نہ تھی کیونکہ حضرت اقدس جدہ یعنی باب مکہ سے ذرا پہلے ہی اپنی آخری آرامگاہ میں تشریف لے جا چکے تھے جسکی تفصیل ناظرین حضرت والا کے آخری سفر حج میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ اور پھر حضرت اقدس کی جدائی سے چند ہی سال بعد یہ محب و شیدا بھی اپنے شیخ سے جا ملا جسکا واقعہ یہ ہوا کہ ایک روز (عید کا دن گذار کر) شب میں تقریباً ۱۱ - ۱۲ بجے تک مدینہ شریف کے علمار اور شیوخ عرب کو اپنے مکان پر مدعو کیا تھا خاطر مدارات کے بعد بھی باہم تفریحی گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا بالآخر سب لوگ اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے اور مولوی صاحب بھی اپنے بستر پر لیٹے اور سو گئے، مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد حوالی قلب میں شدید درد کی وجہ سے آنکھ کھل گئی اور بستر پر تڑپنے لگے گھر کے سب لوگ بیدار ہو گئے۔ ڈاکٹر بلایا گیا اس نے بھی پوری کوشش کی لیکن وقت موعود آ چکا تھا کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی شب ہی میں انتقال ہو گیا صبح چاشت کے وقت مسجد نبوی میں جنازہ کی نماز ہوئی اور جنت البقیع میں دفن کر دیئے گئے۔ عید کا دوسرا دن تھا اسلئے بہت سے احباب آج بھی امجد اللہ صاحب سے ملنے کے لئے آئے تو معلوم ہوا کہ صبح جو جنازہ پڑھا گیا تھا وہ مولوی صاحب ہی کا تھا ان حضرات کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ ابھی رات تو ہم سب کے ساتھ گفتگو کی تھی، بہرحال آپ کی اس اچانک جدائی نے ان کے رنج اور قلق میں مزید اضافہ کر دیا اور گھر والوں کے حال کا کیا پوچھنا وہاں بھی اور یہاں بھی جس جس نے سنا انتہائی افسوس کے ساتھ اس خبر کو سنا مگر اس غم میں سکون اور زخم پر مرہم کا کام اس خیال نے کیا کہ "مدینۃ النبی" کو تا صبح قیامت آپ کے سونے کا

مقام ہونا خدا کی جانب سے مقدر ہوا ہے۔ ع

خدا یہ موت دے سب کو ہم اس مرنے پہ مرتے ہیں

اس میں شبہ نہیں کہ مولوی صاحب موصوف کو حضرت والا سے قلبی تعلق تھا اور آپ نہایت ہی مخلص شخص تھے۔ حضرت والاؒ سنایا کرتے تھے کہ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ "مقادیر الاموال موازین المحبۃ" یعنی مال کی مقدار محبت کے ناپنے کا آلہ ہوا کرتا ہے اس اصول کی رو سے کہا جا سکتا ہے کہ مولوی صاحب موصوف حضرت والا کے محب صادق تھے کیونکہ جان و مال ہر شے کو حضرت پر قربان کر رکھا تھا ورنہ تو بالعموم آج ابنائے زمانہ کا انداز یہ ہے کہ ؎

گر جان طلبی مضائقہ نیست ۔۔۔ ور زر طلبی سخن دریں است

لیکن مولوی صاحب مرحوم اور آپ کے بھائی مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم دونوں کو دیکھا گیا کہ ان حضرات کا ایثار بے مثال تھا یعنی حضرت والا کے متعلقین خاص کا نیز طلبہ اور طالبین سب کے قیام و طعام کا نظم آپ ہی حضرات سے متعلق تھا اور وہ بھی دو چار دن کے لئے نہیں بلکہ تقریباً سال ڈیڑھ سال رہا۔ اللہ تعالےٰ ان حضرات کو انکی خدمات کا پورا پورا صلہ عطا فرمائے۔

مولوی امجد اللہ صاحب چونکہ راقم کے پیر بھائی ہونے کے علاوہ عزیز خاص بھی تھے کہ میرے چھوٹے بھائی میاں حافظ عبد العزیز سعدی سلمہ کے خسر تھے اس لئے ناظرین سے راقم کی مکرر درخواست ہے کہ مولوی امجد اللہ صاحب کے لئے دعائے مغفرت فرما دیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ راقم نہ تو مضمون نگار ہے اور نہ سوانح نویس اسلئے تحریر کا نہ طریقہ معلوم نہ سلیقہ ہی آتا ہے لیکن ایک کام جب سر ہی آپڑا تو کسی نہ کسی طرح اسے بنا ہنا ضروری ہے اس لئے میں نے یہ خیال کیا کہ حالات قیام گورکھپور کو اس نہج سے لکھوں کہ پہلے وہاں کے چند مخصوص مخلص حضرات کا تعارف کراتے ہوئے ناظرین کی خدمت میں ان کے کچھ

احوال پیش کردوں جو حضرت اقدسؒ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے گویا حضرت ہی کے حالات شمار ہونگے اور پھر درمیان میں جہاں کہیں انکا نام آئے گا تو آپ کے سامنے وہ اپنے ان حالات کے آئینہ میں متصور نظر آئیں گے۔ نیز کسی بھی جگہ کے جزئی جزئی حالات تمام کے تمام ہمکو مستحضر بھی نہیں ہیں تاہم اس طرح سے ذکر رجال اور انکے احوال کے ذریعہ کچھ نہ کچھ روشنی حضرت اقدس کے احوال پر بھی پڑ ہی جائیگی۔ چنانچہ دو مخصوص حضرات کا ذکر کر چکا ہوں اب اور چند مخصوص حضرات کا ذکر سنیئے:۔

۳۔ مولوی سید وصی الدین صاحب مرحوم مدرس مدرسہ سعیدیہ۔ چھوٹا قاضی پور گورکھپور۔ آپ ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے تھے مفتی نظام الدین صاحب مفتی دیوبند اور ڈاکٹر محمد ظفر صاحب اردلی بازار بنارس کے اور خود اس راقم کے بھی خاص عزیز تھے یعنی راقم کے سب سے چھوٹے بھائی میاں عبدالعلیم عیسی خطیب جامع مسجد فیروزآباد کے سسرالی رشتہ دار تھے دیوبند کے فارغ تھے حضرت قاری محمد طیب صاحب کے ساتھ بے تکلف تھے اور ہمارے حضرت کے قدیمی خدام میں سے تھے سید تھے چنانچہ انکی سیادت ان کے معاملات اور خلق سے نمایاں تھی۔ فہیم اور سمجھدار شخص تھے اور حضرت والا کے مزاج شناس بھی ہوگئے تھے۔ روزانہ بعد عشاء حضرت اقدس کے سر پر تیل لگانا ان کے اور ان کے ایک رفیق خاص مولوی غیاث الدین صاحب کے ذمہ تھا حضرت کو سلا کر کچھ دیر ہم لوگوں کے پاس آبیٹھتے اور ہمارے دن بھر کے تعب کو کچھ ہنس ہنسا کر اور کبھی کچھ کھا کھلا کر دور کر کے ابھی اپنی مسجد چلے جاتے اور ہم سب خدام حضرت والا بھی سو رہتے۔ گورکھپور میں عرصہ سے قیام ہونے کی وجہ سے تقریباً ہر شخص کے مزاج سے اور اس کے حالات سے یہ واقف تھے اسلئے حضرتؒ کو ان کے مشورہ پر اطمینان تھا آپ مدرسہ سعیدیہ کے صدر مدرس ہونے کے علاوہ مولوی امجد اللہ صاحب کے چھوٹے بچوں اور بچیوں کے اتالیق بھی تھے مولوی صاحب مرحوم یاد آجاتے ہیں تو گورکھپور کا قیام یاد آجاتا ہے۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین بطور یادگار کے جناب سید وصی الدین صاحب مرحوم کا ایک عریضہ اور حضرت مصلح الامۃ کی جانب سے اس کا مصلحانہ جواب ملاحظہ فرمالیں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ حضرت والا کے یہاں تقرب اور مقرب ہونے کا کوئی منصب نہیں تھا اور بڑا ہی صالح اور مخلص خادم بھی جب اصلاح کی کسوٹی پر آجاتا تھا تو حضرت کے یہاں اپنی مصلحت سے زیادہ اسکی مصالح پیش نظر ہوتیں اور پھر کسی قسم کی رعایت روا نہ ہوتی تھی اور اپنی راحت کے خیال سے طالب سے ترک مواخذہ کو تو حضرت والا دیانت کے بھی خلاف سمجھتے تھے بلکہ اسکے حقوق واجبہ کی ادائیگی میں خیانت تصور فرماتے تھے چنانچہ یہی اور اس قسم کی بیشمار ادائیں تھیں جنکی بناء پر لوگ حضرتؒ پر فدا تھے اور خدا حضرتؒ کا ناصر و مددگار تھا سچ ہے من کان للہ کان اللہ لہ جو اللہ تعالیٰ کا ہوگیا خدا اس کا یقیناً ساتھ دیتا ہے۔

ایک دفعہ انھیں مولوی صاحب نے حضرت اقدس کو خط لکھا جس کے مضمون کا حاصل تو یہ تھا کہ ایک جیّد عالم صاحب تھے جن سے انکی بے تکلفی تھی (حالانکہ خود وہ بڑے شخص تھے حضرت تھانویؒ کے مجازین میں سے تھے) انکو حضرت اقدس کی جانب انھوں نے متوجہ فرمانا چاہا اور مقصد صرف یہ تھا کہ حضرت والا کے پاس آمدورفت کا تعلق ہوجائے تو نکھر کر بڑے کام کے لوگوں میں ہوجاویں گے۔ کچھ یہ اپنی مشکلات کو حضرت سے حل کرلیا کریں گے کچھ حضرت اقدس کے تجربات و تعلیمات سے نفع اٹھالیں گے اسکو انھوں نے ان الفاظ میں حضرت کو لکھا کہ:۔

" فلاں مولانا صاحب تشریف لائے تھے عاصی کے یہاں قیام کیا انکی خاطر مدارات میں کمی نہ ہوئی۔ حضرت والا کے مسلک (طور طریق) پر برابر احقر روشنی ڈالتا رہا (اسی سلسلہ میں) میں نے یہ بھی سنایا کہ ؎
مجلسِ حضرتِ وصی اللہ ہے نمودِ بہار تھانہ بھون
چونکہ مولانا ـ ـ ـ صاحب کی معیت میں حضرت تھانویؒ کی مجلس میں

بھی کافی شرکت کرچکا تھا اس لئے (بے تکلف تھے اور ان سے گفتگو میں) بہت آسانی ہوئی وہ حضرت سے اپنی ملاقات ہونے کی مدت چالیس سال بتلاتے تھے۔ حالات والا (دربارۂ اصلاح وارشاد) سنکر فرمایا کہ ___ اللہ تعالیٰ جس بندہ سے اپنا کام لے لیں۔ اب وہ حضرت والا (کی زیارت و ملاقات) کے خود مشتاق ہیں اور استفادہ کے لئے تیار ہیں"

حضرت والا نے اس پر لکھا کہ (**تحقیق** : توبہ توبہ۔ یہ انکی بزرگی (اور تواضع ہے)

(اور اسکے ساتھ ساتھ یہ تحریر بھی گئی)

" آپ نے لکھا ہے کہ فلاں صاحب استفادہ کے لئے تیار ہیں اس کے متعلق یہ کہتا ہوں کہ فلاں صاحب تو خیر بڑے لوگ ہیں وہ مجھ سے کیا استفادہ کر سکتے ہیں مجھ ہی کو استفادہ کرنا چاہیئے البتہ اگر آپ خود استفادہ کی فکر کریں گے تو وہ آپ کے لئے بھی نافع ہے اور میرے لئے بھی مفید ہے۔ باقی کسی دوسرے کے استفادہ سے تو آپکو نفع ہوگا نہیں۔ اسلئے پہلے آپ خود ہی توجہ فرمایئے اپنی تکمیل کی طرف پھر دوسرے کی تکمیل تو اپنی تکمیل کی فرع ہے کیونکہ جبکہ آپ نے ابھی توجہ بھی نہیں فرمائی اور اس قابل ہو گئے ہیں کہ اتنے اونچے شخص کو کتنے نیچے اتار لائے تو اگر آپ خود بھی توجہ فرماتے تو نہ معلوم کتنے نیچے والوں کو کتنی اونچائی پر پہونچا دیتے اور اسوقت بجھے بھی آسانی ہوتی کہ گورکھپور آپ ہی کو دیدیتا۔

یہ جو عرض کیا گیا ہے اسکو سمجھئے اور پھر مجھے لکھیئے کہ آپ نے اس سے کیا سمجھا؟ ملاحظہ فرمایا آپ نے کیسے محبوب خادم تھے اور بات بھی خط میں ایسی ایسی لکھی تھی کہ عام طور پر مشائخ کو یہ کچھ خوش ہی کر دینے والی تھی کہ نیک نیتی

کے ساتھ وہ ایک بڑے شخص کو افادہ و استفادہ کے لئے حضرت کی جانب متوجہ کر رہے تھے۔ کیا بُرا تھا؟ لیکن حضرت اقدسؒ کے جواب سے ظاہر ہوا کہ حضرت والاؒ کی نظر "کار خود کن کار بیگانہ مکن" پر زیادہ تھی اور گوناگوں مصالح کے پیش نظر حضرتؒ نے اسکو کچھ زیادہ پسند نہیں فرمایا بلکہ یہیں سے استنباط فرمالیا کہ آپکو جب اتنے بڑے آدمی کی اصلاح کی فکر ہے جو بطور خود شیخ ہیں تو ظاہر ہے کہ اگر آپ اپنی اصلاح کر لیتے تو دوسرے لوگوں کی اصلاح تو ضرور ہی کر لیتے اور اسوقت مجھے اپنے کام میں ایک معین کار مل جاتا اور ہو سکتا تھا کہ میں اسوقت اقلیم گورکھپور کو آپ ہی کے حوالہ کر دیتا ـــ اب یہ تو معلوم نہیں کہ مولوی صاحب موصوف نے اسکا کیا جواب دیا لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ بہت ہی شرمندہ ہوئے ہوں گے اور پھر اپنی اصلاح کی جانب دل سے متوجہ ہو گئے ہونگے اسنکے فہم و تواضع سے اسکی امید تو نہیں تھی کہ حضرت اقدس کے اس نوع کے ارشادسے کہ ـــ "اسوقت مجھے بھی آسانی ہوتی کہ گورکھپور آپ ہی کو دے دیتا" انھوں نے اجازت وخلافت کو ہی نہیں بلکہ باب اصلاح میں گورکھپور کی ایجنسی کا اپنے لئے اثبات کرلیا ہو کیونکہ مولوی صاحب اس مزاج کے انسان تھے نہیں ورنہ تو بعض حضرات کے متعلق سنا گیا ہے کہ اس سے کم الفاظ میں خلافت ونیابتِ شیخ سے کم درجہ مراد لینے پر راضی نہیں ہوئے ہیں۔

اس موقع پر ایک واقعہ مولوی صاحب مرحوم کا اپنے ساتھ کا بھی پیش آیا ہوا بیان کر دینے کو جی چاہتا ہے امید ہے کہ ناظرین دلچسپی کے ساتھ سنیں گے اور ممکن ہے کہ کسی کو اس سے نفع ہی ہو جائے۔ حضرتؒ کے وصال کے بعد ایک مرتبہ مولوی صاحب سخت بیمار ہوئے سرطان کی قسم کا کوئی دُنبل اُن کی پشت پر نکل آیا تھا جس کی سوزش سے سخت پریشان تھے اور کسی کل چین نہ آتا تھا میرا بھی کسی ضرورت سے گورکھپور جانا ہوا مولوی صاحب کی علالت کا علم ہوا عیادت کے لئے حاضر ہوا بڑی شفقت آمیز محبت سے ملے لیکن تکلیف سخت

تھی اسلئے میری مزاج پرسی پر انھوں نے یہ شعر پڑھ دیا کہ اپنا حال کیا بتاؤں بس یہ حال ہے کہ ؂

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے

جواب سے اندازہ ہوا کہ بیچارے اپنی زندگی سے بھی مایوس ہو چکے ہیں اب ایسے مریض کو تسلی دوں تو کیسے دوں کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اللہ نے مدد فرمائی اور یہ مضمون ذہن میں آیا میں نے ان سے کہا کہ مولوی صاحب آپ کی بیماری بلاشبہ سخت ضرور ہے لیکن آپ کو اس پر انشاء اللہ تعالیٰ اجر بھی بڑا ملے گا رہا وہ شعر جو آپ نے پڑھا ہے تو میرے نزدیک تو وہ آپ کے حسب حال نہیں ہے اب دوبارہ اس شعر کو نہ دہرائیے گا۔ یہ غالب دہلوی کا شعر ہے جو کوئی با خدا خدا ترس، ولی اللہ تو نہیں تھا بلکہ اس شعر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دین اور نسبت مع اللہ سے بھی شاید کورا ہی تھا کہ اس نے موتِ مومن کو ایک آخری اور بڑی مصیبت سے تعبیر کیا ہے موت کا یہ اسلامی تصور تو نہیں ہے بلکہ اسلام تو کہتا ہے الموت جسرٌ یوصل الحبیب الی الحبیب موت ایک پُل ہے جس پر چڑھنے میں ڈر بھی لگتا ہے مگر وہ ایک محب کو اپنے محبوب سے ملا بھی دیتا ہے اور یہ مومن کا تحفہ ہے اسی لئے اسی دلی ہی کے ایک صاحب نسبت بزرگ مرزا مظہر جان جاناںؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ موت سے چند گھنٹے پہلے اپنے عزیز و اقارب کو تسلی دینے کیلئے خود یہ فرما گئے کہ ؂

لوگ کہتے ہیں کہ مظہر مر گیا درحقیقت مظہر اپنے گھر گیا

اور واقعی جنت مومن کا وطن اصلی اور دنیا اسکے لئے قید خانہ ہے۔ لہٰذا جب آپ کو الجھن ہو تو اس شعر سے تسلی حاصل کیجئے اللہ تعالیٰ سے رجاء زیادہ ہو گی اور قلب میں سکون بھی پیدا ہو گا ــــ جب میں نے اپنی تقریر ختم کی تو آپ نہیں کہہ سکتا کہ مولوی صاحب مرحوم کس قدر خوش ہوئے کہنے لگے ارے جامی تم نے تو قلب پر برف ہی رکھ دیا۔ اس شعر کو اپنی کاپی میں نوٹ کرا لیا اور مجھے بہت دعائیں دیتے ہوئے رخصت کیا۔ پھر اس مرض سے مولوی صاحب کو صحت ہو گئی تھی اور بہت دنوں بعد انکا انتقال ہوا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

۴ ۔ مولانا افتخار الحق صاحب ۔ امام مسجد مولوی سبحان اللہ صاحب مرحوم ۔ جعفرا بازار گورکھپور ۔ آپ حضرت مولینا عبدالغفار صاحبؒ تلمیذ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے صاحبزادے ہیں ۔ والد صاحب کا قیام مئو میں تھا غالباً مولوی حبیب الرحمان صاحب اعظمی نے ان سے پڑھا بھی ہے ۔ بڑے ذی استعداد ذی علم اور بزرگ شخص تھے ۔ راقم نے خود حضرت اقدس سے سنا فرماتے تھے کہ کسی مسئلہ پر ایک نہایت ہی محققانہ مقالہ آپ کا حضرت مولانا تھانویؒ کی نظر سے گذرا حضرت نے فرمایا کہ "میں مضمون کو پڑھتا جاتا تھا اور دل باغ باغ ہوتا جاتا تھا سوچتا رہا کہ مئو میں کون صاحب ایسے ہیں جنکا یہ مضمون ہو سکتا ہے اور سمجھ میں نہ آیا آخر میں جب نام دیکھا تو میں نے کہا کہ بیشک مولانا عبدالغفار صاحب ہی ایسا مضمون لکھ سکتے تھے انھیں کا حق تھا"۔

ہم نے تو گورکھپور میں جب بھی دیکھا مولوی سید وصی الدین صاحب کو اور مولوی افتخار الحق صاحب کو ساتھ ہی دیکھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ دونوں ایک جان دو قالب ہیں ۔ بہر حال اہل گورکھپور کے اکثر لوگوں کی اصلاح میں ان دونوں حضرات کی نمایاں کوششیں شامل تھیں شہر کا ایک گوشہ ایک صاحب سنبھالے ہوئے تھے اور دوسرا دوسرے صاحب لئے ہوئے تھے ۔ اب مولوی وصی الدین صاحب کا تو انتقال ہو گیا ہے اللہ تعالیٰ مولوی افتخار الحق صاحب کی عمر میں برکت عطا فرمائے حضرت اقدس کو خوش رکھتے تھے اور بڑے باپ کے بیٹے ہونے کے ناطے حضرت بھی ان سے بہت محبت اور پیار فرماتے تھے ۔ اللہ تعالےٰ مولانا موصوف سے حضرتؒ کی تعلیمات کی اشاعت کا خوب خوب کام لے اور حضرت ہی کے طریقہ پر چلا دے ۔ آمین ۔

۵ ۔ حکیم مولوی وصی احمد صاحب ۔ مالک علی گڈھ دواخانہ گورکھپور ۔ محترم سے راقم کی پہلی ملاقات سہارنپور مدرسہ مظاہر علوم میں ہوئی تھی میرے ہم سبق تو نہ تھے البتہ ہم قرن تھے پھر اسکے بعد انھوں نے علی گڑھ جاکر طب پڑھی اور

آکر مطب فرمانے لگے اپنی طبعی ذہانت کی وجہ سے نو عمری کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انھیں گورکھپور کی ہر مجلس اور ہر میٹنگ میں نمایاں مقام عطا فرمایا۔ انجمن اسلامیہ سے بھی خاص تعلق رہا اور حضرت اقدس کے حالات گورکھپور میں تو آپکا ایک اہم باب ہی ہے جو آگے ناظرین کی نظر سے گذرے گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

۶۔ حکیم ابوالکلام صاحب مدظلہ۔ آپ دہلی کے طبیہ کالج سے غالباً فارغ تھے۔ نہایت ہی مہذب، شائستہ، کم سخن اور باوقار شخص تھے حضرت کی خدمت میں ایک بار کسی طرح آگئے پھر تو حضرت ہی کے ہوگئے۔ حضرت کو بھی انکی تواضع، ادب اور مسکنت پسند آگیا۔ چنانچہ معمول یہ بن گیا کہ صبح و شام کی تفریح میں حکیم ابوالکلام صاحب ہی رکشہ پر حضرت کے ہمراہ آیا جایا کرتے تھے۔

ایک بات یہاں اور واضح کردوں جو بار بار آئیگی اور ہر نئے مقام پر آئیگی اور علم نہونے کے سبب سے منشار غلط فہمی بن سکتی ہے وہ یہ کہ حضرت اقدس کی تفریح عام لوگوں کی تفریح کیطرح نہ ہوتی تھی بلکہ صبح و شام کی تفریح جو یہاں بالعموم رکشہ پر ہوتی اس میں حضرت اپنے تلاوت قرآن کا معمول پورا فرماتے۔ لوگوں کے مجمع میں سکون کے ساتھ موقع نہ ملتا اسلئے شہر سے کہیں دور پر چلے جاتے اور آتے جاتے میں مقدار معینہ تلاوت فرمالیتے تھے پھر بعد اسکے رفیق سفر سے گفتگو بھی فرماتے یہی حضرت کی تفریح ہوتی تھی۔

جناب حکیم صاحب ایک زیرک اور فہیم شخص تھے نیز اہل شہر کی نظروں میں بھی باعزت اور خود شہر میں شہرت یافتہ شخص تھے اور حضرت مصلحۃً اپنے ساتھ ایسے ہی شخص کو رکھنا پسند فرماتے تھے جو شہر والوں میں شناسا ہو اور قدرے جاہ وعزت بھی رکھتا ہو اسلئے کہ اہل حق کے مخالف کم نہیں ہوتے بالخصوص نئی جگہ اور نئے شہر میں جہاں کسی سے یہ حضرات واقف نہ ہوں ایک ایسے آدمی کا ساتھ رہنا عقلاً بھی ضروری تھا جس کو لوگ احترام اور وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں خواہ وہ عظمت دنیوی جہت سے ہو یا دینی۔

اور حضرت والا خود بھی اسباب کو بڑے اہتمام کے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ حضرت تھانویؒ کے زمانہ میں خود اپنے لوگوں میں سے بعض اہل علم کو یہ اعتراض تھا کہ حضرت جہاں تشریف لیجاتے ہیں تو امراء اور کسی صاحب جاہ و منصب ہی کے یہاں قیام فرماتے ہیں کسی غریب مسلمان کے یہاں خواہ وہ حضرت کا کتنا ہی محب ہو نہیں ٹھیرتے، حضرت ایسا کیوں کرتے ہیں؟ (راقم عرض کرتا ہے کہ وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ حضرت مولانا تھانویؒ اپنے خلوص میں ضرب المثل ہو چکے تھے ورنہ تو شیطان نے ایسے حضرات کے بارے میں دنیا طلبی اور امراء نوازی کا الزام لگانے میں یہ ایک بڑا کامیاب ہتھیار یعنی وسوسہ ان حضرات کے دل میں ڈالا ہی تھا) ہمارے حضرت فرماتے تھے کہ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ خود وہی معترض صاحب جو بڑے آدمی تھے ایک جگہ تقریر کے لئے گئے اور کسی چھوٹے سے عربی مدرسہ میں ٹھہرے تقریر ہوئی لیکن اہل بدعت نے مدرسہ کو گھیر لیا مولوی صاحب پر حملہ کے ارادہ سے، اب مدرسہ والے بھی پریشان اور پبلک میں بھی اکثریت مخالفین ہی کی تھی سب حیران تھے کریں تو کیا کریں؟ اس شہر میں حضرت مولانا تھانویؒ کے ایک خاص خادم جو شہرت بھی رکھتے تھے اور با اثر بھی تھے رہتے تھے انکو کسی طرح اطلاع ہو گئی کہ فلاں مولانا صاحب کو اہل بدعت نے فلاں جگہ گھیر رکھا ہے بس فوراً اپنی ٹمٹم پر تشریف لائے اور مجمع کے درمیان سے گذرتے ہوئے مدرسہ کے پھاٹک پر ٹمٹم روک کر وہیں سے آواز دی کہ مولانا تشریف لائیے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ارے یہ تو فلاں حاجی صاحب ہیں۔ مولانا کو اطلاع کیا مولانا تشریف لائے اور ٹمٹم پر بیٹھکر مخالفین کے اسی جھرمٹ میں سے ہوتے ہوئے نکل گئے اور کسی کو کچھ بھی کہنے سننے کی ہمت ہی نہیں پڑی اسکے بعد وہ مولانا صاحب خود فرماتے تھے کہ اجی آج حضرت تھانویؒ کے کسی اہل منصب اور جاہ و جلالت نیز صاحب جاہ شخص کے یہاں قیام فرمانے کی مصلحت سمجھ میں آگئی اور واقعی موٹی سی بات ہے کہ بڑا آدمی بس اشاروں ہی اشاروں سے

بڑے سے بڑے فتنہ کو رفع کر سکتا ہے اور چھوٹا آدمی اگرچہ محب ہی تو کیا فتنہ کو تو رفع نہیں کر سکتا بیش از بیش اپنی جاں جوکھوں میں ڈالے گا تو اس سے کیا ہوا ؟

راقم عرض کرتا ہے کہ حل یہ نکلا کہ بزرگوں کے معمولات پر اعتراض نہیں کرنا چاہیئے۔ بات قدرے طویل ہو جائیگی لیکن ہو بڑے لطف اور تجربہ کی اور بڑے ہی کام کی اسلئے اس قسم کا ایک اور واقعہ حضرت اقدس سے سنا ہوا اور سن لیجے فرمایا کہ مولانا تھانوی پر اپنے بھی لوگوں کو (بلکہ کبھی یہ بھی فرمادیا کہ حضرات اہل دیوبند میں سے بعض کو) یہ اعتراض تھا کہ کسی کی دعوت پر ہم لوگ تو تنہا چلے جاتے ہیں اور مولانا تھانوی کا اصول یہ ہے کہ یوں فرماتے ہیں کہ آپ کے یہاں سے کسی شخص کو آنا چاہیئے وہ آوے اور آکر مجھے اپنے ہمراہ خود لے چلے تب سفر کر سکتا ہوں۔ لوگ کہتے تھے کہ بلا وجہ لوگوں کا دُہرا کرایہ خرچ کراتے ہیں (مگر یہ پہلے زمانہ کا اعتراض تھا جبکہ علماء تیسرے درجہ میں سفر کیا کرتے تھے اور اب تو ایک فرسٹ کلاس کا اور ایک سرونٹ کے کرایہ کا مطالبہ عام سا ہو گیا ہے) حضرت فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان معترضین کو بھی اس فعل کی مصلحت سمجھا دی اس طرح سے کہ ایک مرتبہ دہلی سے کوئی رئیس حاجی صاحب دیوبند آئے لوگوں سے تعلقات تو تھے ہی اسلئے ان سے سب روشناس تھے انھوں نے چند حضرات سے درخواست کی کہ فلاں تاریخ کو آپ لوگ دہلی تشریف لائیں اور غریب خانہ پر ماحضر تناول فرمائیں تو کرم ہوگا میرا آدمی اسٹیشن پر موجود ملے گا موٹر بھی آجائیگی مکان پر آپ لوگ بآسانی پہونچ جائیں گے۔ سب لوگوں نے وعدہ کر لیا۔ وہ دن آیا ٹکٹ لیکر لوگ دہلی تشریف لے گئے اور پلیٹ فارم پر اتر کر میزبان کے خادم کو تلاش کرنے لگے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک کئی بار گاڑی دیکھ ڈالی مگر کہیں کسی کا پتہ نہیں تھا۔ گاڑی جب پلیٹ فارم سے چلی گئی تو اب سب لوگوں نے سر جوڑ کر سوچنا شروع کیا کہ کرنا کیا چاہیئے ؟ آپس میں ایک نے دوسرے سے دریافت کیا کہ اجی ان حاجی

صاحب کا نام کیا ہے جہاں چلنا ہے لوگوں کو بس حاجی جی کے علاوہ نام کبھی نہیں معلوم تھا پھر کسی نے پوچھا کہ اچھا کس محلہ میں چلنا ہے وہیں چلکر شاید پتہ لگ جائے لطف یہ کہ محلہ کا نام بھی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے ۔اب معلوم نہیں کہ واپسی کا کرایہ بھی پاس تھا یا نہیں لیکن یہ تو یقینی تھا کہ کسی کے پاس ایک چادر رہ بھی نہ تھا کہ بچھا کر اسی پر بیٹھ رہتے ۔حضرت اپنے لفظوں میں فرماتے تھے کہ بس لوگ شیروانی پہن پہن کر پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے اور نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کا مصداق ہو رہے تھے ۔جب خوب تھک گئے تو ہوش آیا اور انہیں سے کسی نے کہا کہ بھائی حضرت تھانویؒ کا معمول بالکل صحیح اور تجربہ پر مبنی ہے کہ ایک آدمی کو سفر میں ہمراہ ہونے کے لئے بلاتے ہیں آج اگر ایسا ہم بھی کئے ہوتے تو یہ مصیبت نہ آتی بس جیسے ہی یہ ریزولیشن پاس کیا ویسے ہی سامنے سے ایک شخص ہانپتا کانپتا ہوا آیا اور کہا کہ آپ لوگ دیوبند سے تشریف لا رہے ہیں اور آپکو فلاں حاجی صاحب کے یہاں جانا ہے نام سنکر سب نے کہا ہاں ہاں! وہیں جانا ہے اس نے کہا معاف فرمایئے گا حاجی صاحب نے مجھ سے ابھی ابھی فرمایا ہے اور یہ فرمایا کہ ارے گاڑی آئے ہوئے تو دیر ہو گئی میں بالکل ہی بھول گیا تھا جاؤ جلدی جاؤ تو آپ حضرات تشریف لے چلئے موٹر حاضر ہے ۔

سبحان اللہ کیا خوب واقعہ ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے کس کس طرح تنبیہ ہوا کرتی ہے ۔لیکن ان واقعات سے عبرت لینے والے کہاں ہیں؟ کس قدر حکمت و دانش پر حضرت تھانویؒ کے یہ دونوں اصول مبنی تھے لیکن اہل دنیا کو ان پر بھی اعتراض تھا ۔

بات دور جا پڑی عرض یہ کر رہا تھا کہ حضرتؒ اپنے ساتھ کسی با اثر آدمی کو کیوں لے چلتے تھے امید کہ موجودہ بالا تفصیل کی روشنی میں یہ مسئلہ بے غبار ہو گیا ہو گا ۔بس یہی مصلحت جو گورکھپور میں حکیم ابوالکلام صاحب یا بعد میں کبھی کبھی مولوی امجد اللہ صاحب یا حکیم وصی احمد صاحب کے برادر بزرگ ولی محمد صاحب کو ہمراہ

لینے کی تھی وہی وجہ الٰہ آباد میں کبھی ڈاکٹر صلاح الدین احمد صاحب کو اور کبھی عبدالمجید صاحب مالک اسرار کریمی پریس کے لینے کی تھی اور یہی بمبئی میں ڈاکٹر محمد اسحٰق صاحب یا بھائی احمد کو ساتھ رکھنے کی تھی کیونکہ دوست دشمن کس کے نہیں ہوتے اللہ والوں کے مخالف بھی بہت سے بدذات اور بدقسمت قسم کے لوگ ہو جاتے ہیں اور کیوں نہ ہوں جبکہ انبیاء کی جماعت اس سے نہ بچ سکی اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ اور ہم نے اسی طرح سے ہر نبی کے لئے دشمن بنا دیئے ہیں شیاطین انس میں سے بھی اور شیاطین الجن میں سے بھی۔ لہٰذا اسباب کے درجہ میں اپنا تحفظ اختیار کر لینا مطلوب شرعی تھا اور اسی پر حضرت اقدس کا عمل تھا۔

زمانہ قیام گورکھپور تک تو حکیم ابوالکلام برابر حضرت اقدس کی خدمت میں آتے رہے پھر وہاں سے جب حضرت الٰہ آباد تشریف لائے تب بھی وہ ایک دو بار یہاں آکر ملے ہیں اسی دور کا ایک خط ہے اسکو بھی بطور یادگار ہی کے سن لیجئے

(خط حکیم ابوالکلام صاحب بنام حضرت مصلح الامۃ رح)

حال:۔ الٰہ آباد کی واپسی کے بعد حضرت والا کی خیریت برابر ہی ملتی رہی جس سے ایک گونہ اطمینان سا رہا ادھر کچھ غیر معمولی مصروفیت اور گوناگوں مشاغل بلکہ سچ تو یہ ہے کہ غفلت اور کاہلی ہی کی بناء پر حضرت والا کی خدمت میں کوئی عریضہ ارسال نہ کرسکا جس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔

تحقیق: آپ کی تسلی کے لئے معافی کا لفظ لکھے دیتا ہوں ورنہ آپکی محبت کا مجھے یقین ہے کہ آپ مجھکو فراموش نہ کریں گے

حال: گورکھپور کے قیام میں حضرت والا نے جس الطاف و اکرام محبت و شفقت سے اس عاجز اور گنہگار کو نوازا اسکے لئے حضرت والا کا کس طرح شکریہ ادا کروں سوا اسکے کہ حضرت والا کا جو پیغام اور اصلاح امت کے لئے

جو طریقہ کار ہے اس پر عمل کروں اور دوسروں تک پہونچاؤں۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ عمل خیر کی توفیق عطا فرمائے اور سیہ کاریوں اور خطاؤں سے درگذر فرمائے

تحقیق: کیا خوب بات آپ نے لکھی ہے۔ بہت پسند آئی بس یہی کیجئے یہی طریق خیر ہے خیر لازمی اور خیر متعدی۔ آمین۔ آمین۔

حال: حضرت والا خاص طور سے میرے لئے دعاء فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ میرے قلب کو خوف خدا اور فکر آخرت سے معمور فرمائے

تحقیق:۔ اللہ تعالیٰ خوف خدا اور فکر آخرت سے قلب کو معمور فرمائے

ماشاء اللہ کیا عمدہ خط ہے اس سے حکیم صاحب موصوف کی زندہ دلی استعداد قلبی، خوف خدا پیدا ہونے کی فکر اور فکر آخرت سے معموری قلب کا شوق معلوم ہوا کسی بزرگ سے کسی کو جو چیزیں حاصل ہوا کرتی ہیں وہ آخر یہی چیزیں تو ہوتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ قلب نے پورا نفع حضرت اقدس کی صحبت کا اٹھالیا تھا لیکن ذاتی اور قومی مشاغل دنیویہ اور اختلاط عوام نے اس لگائے ہوئے پودے کا ناس ماردیا یوں بھی حکیم صاحب کا کچھ قومی اور عوامی مشاغل سے تعلق تھا اور مطب تو بہرحال کا منصبی ہی تھا اس لئے مجلس میں انکی عدم شرکت کی تلافی شیخ کامل نے تو صبح شام کی تفریحی معیت سے پوری ہی فرمادی تھی اور دل میں اللہ تعالیٰ کی لو بھی لگ گئی تھی مگر اچانک فراق کی ہوا چل گئی اور اس نے اسے بار آور نہ ہونے دیا کیونکہ اسکے بعد پھر ملاقات یا مکاتبت کا پتہ نہ چل سکا۔ اللہ تعالیٰ ان کے حال و بال میں ترقی عطا فرماوے آمین اور ان کے جذبات دلی کو بروئے کار لاوے اور حضرت اقدس کی اس دنیوی معیت کو آخرت کی معیت کا پیش خیمہ بنادے۔ آمین

۷۔ جناب قاضی محمد شکیل صاحب عباسی ندوی۔ آپ جناب عدیل عباسی صاحب کے برادر خورد ہیں۔ میاں صاحب جارج اسلامیہ کالج گورکھپور میں اردو فارسی کے مدرس تھے۔ ذی علم اور فہیم شخص تھے اس لئے حضرت اقدس کی صحیح قدر پہچانی

بیعت ہوئے مجلس میں آنے جانے لگے اور اپنی خداداد استعداد ظاہری اور باطنی کیوجہ سے حضرت سے بہت زیادہ قریب ہوئے یوں ظاہری آنا جانا تو زیادہ نہوتا تھا بس ضابطہ ہی کا تھا لیکن احوال سے خاص رابطہ کا پتہ چلتا ہے۔ حضرتؒ کے محب تھے اور حضرتؒ کو بھی محبوب تھے۔

آپ ہی کا وہ واقعہ ہے کہ ایک دن مجلس والا سے واپسی میں ان کے کوئی دوست ملے انسے دریافت کیا کہ آپ کہاں سے آرہے ہیں مولوی شکیل صاحب نے فرمایا کہ گلستاں بوستاں کا سبق پڑھکر آرہا ہوں۔ (اسدن حضرت والا نے مجلس میں انھیں کتابوں کے مضامین بیان فرمائے تھے) ان کو تعجب ہوا کہ مولوی صاحب نے تو نجانے کتنوں کو گلستان بوستاں پڑھا دیا ہے آج یہ کیا فرما رہے ہیں کہ پڑھکر آرہا ہوں۔ ان کے تعجب کو بھانپتے ہوئے مولوی صاحب نے فرمایا کہ بھائی مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کی مجلس سے یعنی چھوٹے قاضی پور سے اور مولوی نثار اللہ صاحب کی کوٹھی سے آرہا ہوں اور آج حضرت مولانا نے گلستان و بوستاں کے بعض مقامات سنا کر اسکی جو تشریح فرمائی ہے تو کیا کہنا سبحان اللہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ آج گلستاں پڑھا ہے۔ اسی لئے میں نے آپ سے کہا کہ آج گلستاں پڑھکر آرہا ہوں۔ یہ جملہ اپنی حقیقت پر تھا اس میں مبالغہ اور مجاز نہ تھا۔ دوسرے دن انھوں نے اس واقعہ کو خود حضرتؒ سے بیان کیا سب لوگ بہت محظوظ ہوئے آپ کو بھی اگر حضرت والا کی نسبت سے مولوی صاحب موصوف سے ملاقات کا اشتیاق ہوگیا ہو تو الحمدللہ مولوی صاحب ابھی بقید حیات ہیں اور اپنے وطن بستی میں رہتے ہیں تاہم اگر ان تک رسائی نہ ہوسکے تو انکی جانب سے کہتا ہوں کہ ؎ ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بنید مرا۔ ان کے بعض مکاتیب پیش خدمت ہیں جن سے حضرت والا سے انکا تعلق، محبت و عقیدت آشکارا ہے۔

(خطوط شکیل عباسی ندوی بنام حضرت مصلح الامۃ رح)

(۱)

حال :۔ بکمال ادب عرض گذار ہوں کہ حضرت والا جس وقت الہ آباد تشریف لے گئے اسی کے ایک گھنٹہ کے بعد ایک نہایت والہانہ شوق زیارت کے ساتھ یہ خادم حاضر بارگاہ عالی ہوا دو ہفتے تک بعض مادی و روحانی معذوریوں سے حاضر نہ ہوسکنے کے باعث اس عقیدتمند کی حیثیت اس پیاسے کی سی تھی جو چشمے کی طرف دوڑتا ہوا گیا ہو لیکن وہاں پہونچنے پر وہ اپنے احساس کی دنیا میں ایک ایسے مجرم کے مانند تھا جسے اسکی کوتاہی کی سزا دیجا چکی ہو۔ لوگ قیاس آرائی کر رہے تھے کہ آب وہوا کے راس نہ آنے کی وجہ سے اب وہیں رہیں گے لیکن دل اس رائے کو قبول نہیں کرتا تھا آدمی اپنے نقصان کے یقین پر آسانی سے راضی نہیں ہوتا اور یہ نقصان تو ایسا تھا جسکی تلافی ممکن نہیں ہے ۔ میرا حال تو یہ تھا کہ جب بھی طبیعت بے سکون ہوتی تھی دوڑکر حضرت والا کے آستانے پر پہونچتا تھا اور سکون لیکر چلا آتا تھا ایک عجیب شفقت نگاہ عالی میں دیکھتا تھا ہر طرح کے اضطراب کے لئے نوشدارو بن جاتی تھی اکرام تو میں نے بہت پایا ہے لیکن وہ اکرام جس میں کسی طرح کا تکلف کا شبہ نہ کیا جاسکے حضرت والا ہی کے نگاہِ کریمانہ میں دیکھا، ایک ایسا گرامی تخاطب جس میں خلش جہنی اخلاص کی کرنیں جگمگا رہی تھیں ۔ میں اسی کریمانہ نظر کو حضرت والا کی سب سے بڑی کرامت سمجھتا تھا جس نے مجھ جیسے باغی کو بھی منقاد بنالیا۔

یاحضرت! اس موقع پر میں اپنے ایک جرم کا اعتراف بلکہ اقبال کر کے حضرت والا کی عالی ظرفی سے عفو ودرگذر کی فریاد کرتا ہوں ۔ میں حضرت والا کی مجالسِ گرامی اور صفاتِ عالی سے نابلد ہونے کے باعث بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ محض اپنی بدبختی اور نفس کی شرارت سے حضرت والا کے مسلک پر سخت گستاخانہ تنقیدیں کرچکا ہوں ۔ حضرت والا کی مجلس میں باریاب ہوکر اس گنہگار پر جو سب سے پہلا اثر پڑا وہ ایک مجرمانہ ندامت تھی جس کے بوجھ سے سر اٹھایا نہیں جاتا تھا اور شفقتِ عالی اس

محروم سعادت پر جوں جوں بڑھتی جاتی تھی اس شرمسار کی ندامت اور ترقی کرتی جاتی
تھی۔ کئی مرتبہ سوچا کہ زبان سے نہیں تو قلم ہی سے اپنی کیفیت درونی کا اظہار
کر دوں لیکن پھر خیال ہوا کہ حضرت والا کو اس خادم کے اخلاص عقیدت پر کچھ اور
اعتماد ہو لے تب عرض مدعا کروں۔ اتنے میں بدسرشتوں نے کیچڑ اچھالنا
شروع کر دیا۔ سوچا کہ اس سلسلے میں کچھ خدمت انجام دے لوں تب کہوں۔ پھر
میری حالت میں مدوجزر اور حاضری میں کوتاہیاں ہونے لگیں اور آخرکار اچانک
وہ واقعہ سامنے آگیا جسے میں کبھی سوچ نہیں سکا تھا یعنی خانقاہ ناگاہ منتقل ہوگئی
اور جو نعمت اللہ کریم نے گورکھپور کو دی تھی وہ ہماری قدرناشناسی کی شامت
سے الہ آباد کو تفویض کر دی گئی۔ فیا حسرۃً علی العباد

ابتدا میں تو امید بہت سہارا دیتی رہتی تھی۔ مسجد کی نئی تعمیر زبان حال سے
اسکی تائید کرتی تھی اور اندر سے ایک آواز آتی تھی کہ دلوں کی جس تعمیر میں حضرت
نے ہاتھ لگایا تھا اسکا ناتمام رہنا گوارا نہیں فرمائیں گے اور کم سے کم کچھ دنوں کیلئے
ضرور تشریف لائیں گے۔ احساس محرومی تڑپ کے کہتا تھا کہ حضرت اب تشریف
لائیں گے تو ایک دن کی بھی حاضری ناغہ نہ ہوگی۔

اس قسم کے تصورات نے ایک دن ایک خواب کی شکل اختیار کی جس میں
حضرت والا یہاں کی مجلس میں رونق افروز تھے میں وہیں پاس ہی نماز پڑھ رہا تھا
نماز ہی کی حالت میں جیسے مجھے اس موہبت عظمیٰ کی بشارت ملی اور میں بیتاب زیارت
ہو کر حضرت والا کو دیکھنے لگا۔ جبین اقدس پر تبسم کے انوار چھائے ہوئے تھے
اور جسم مبارک پر ایک گرم اچکن تھی۔ یہ جذب صرف ایک لمحہ طاری رہا دوسرے
لمحہ پھر میرا رخ قبلہ کیطرف ہو گیا لیکن نماز پوری کر کے قدمبوس ہونے کی آرزو آنکھ
کھل جانے کیوجہ سے برباد ہو کر رہ گئی۔

حضرت کے تشریف لیجانے کے بعد تنفس کے سخت حملوں سے میری صحت پھر
وہیں آگئی تھی جہاں چار چھ مہینے پیشتر تھی۔ اب کچھ دنوں سے کچھ سکون ہو چلا ہے

دعا فرمائیں کہ اللہ کریم پوری صحت عطا فرما کر اجر و ثواب کے کاموں کی توفیق مرحمت فرماتے رہیں۔

(تحقیق)

محب محترم زاد اللہ عرفانکم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا محبت اور عقیدت نامہ آیا اسکے ایک ایک لفظ کا خاص اثر قلب پر ہوا سچ پوچھئے تو بڑی ہمت افزائی ہوئی اور عزائم میں استحکام ہوا اور دل نے یہ فیصلہ کیا کہ دنیا اب بھی قدر دانوں سے خالی نہیں۔ میں تو آپ کے اس خط سے سچ جانیے آپ کا معتقد ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے ہوتے ہیں۔ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے ایسے لوگوں سے ربط و ضبط پیدا کر دیا جن سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں میں اپنے آپ کو اس لکھنے پر مجبور پا رہا ہوں کہ آپ سے مجھکو محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں خلوص دے اور قیامت میں ہمارے لئے ذریعہ نجات بنے۔ میں آپکو بتاتا ہوں کہ گورکھپور کے تعمیر کا کام ادھورا اور ناتمام نہ رکھا جائیگا جبکہ آپ جیسے بزرگوں کی توجہ شامل حال ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا یہ جواب آپ میرے دوستوں کو سنا دیں انھیں مسرت کا باعث ہوگا زیادہ بجز شوق ملاقات کے کیا عرض کروں۔

آپ کا خط میں نے رکھ لیا ہے اسکی نقل اور یہ جواب روانۂ خدمت ہے والسلام مسک الختام خیر تمام۔

وصی اللہ عفی عنہٗ

(۲)

حال :۔ بکمال ادب عرض گذار ہوں کہ عالی ہوں کہ دوسرے عریضے کی ترتیب کے لئے خیالات جمع کر رہا تھا کہ ناگاہ صحت کی خرابی نے شدت اختیار کرلی اور چکر اور ضعف نے دماغ کو شکنجہ میں کس لیا اور حالت دیکھتے دیکھتے یہ ہوگئی کہ دعا ر درخواست کے لئے بھی قلم نہ اٹھا سکا بس تصور کی نگاہ سے حسرت کے ساتھ حضرت والا کی شفقت بے پایاں کیطرف دیکھتا رہتا تھا۔ حضرت جب یہاں جلوہ فرما تھے تب

ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے حضرت کی بارگاہ کی حاضری کی برکتیں ساتھ لے لیتا تھا
اس مرتبہ جب خاص اضطرابی چبھن اور دماغی الجھن کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف چلا تو حضرت
کی دعا کا تصور ساتھ ہو لیا تھا۔ بستر علالت پر بھی بیچینی سے تڑپتے ہوئے حضرت والا
کی بے مثال کریم النفسی کو یاد کرتا رہتا ہوں۔ یہ عریضہ بدقت تمام عالم اضطراب میں محض دعا
کی درخواست کے لئے لکھ رہا ہوں۔

زندگی اپنے گناہوں کے کفارے کے لئے چاہتا ہوں اور دین کی حسب استعداد
خدمت کے لئے۔ دماغ چاہتا ہوں دین کی فکر کے لئے۔ اور دل مانگتا ہوں اللہ
کے ذکر کے لئے۔

آج پچھلے پہر کو اس رشک سے سو نہ سکا کہ عالم شب قدر کا خیر مقدم کر کے
اسکے نزول کی برکتیں جمع کر رہا ہے اور ہائے میں محروم ہوں۔ اللہ کریم کاش
اس احساس محرومی کو اسکی خامیاں درگذر فرما کر قبول فرمالیتے۔ اے کاش!

تحقیق: — محب من! زاداللہ تعالیٰ عرفانکم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ
الحمدللہ بخیریت ہوں آپکے خط کا انتظار تھا عین انتظار میں آج محبت نامہ نے
مسرور فرمایا۔ جیسے خط کے آنے سے خوشی ہوئی بیماری کی خبر سے رنج ہوا۔ اللہ تعالیٰ
سے دعا کرتا ہوں کہ کامل صحت عطا فرمائے۔ زندگی عطا ہو جس سے تدارک مافات
اور دین کی خدمت ہو سکے اور دماغ بھی وہ عطا ہو جو دین کی فکر کرے اور دل
اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے عطا ہو۔

آپ نے لکھا ہے کہ لیلۃ مبارکہ میں "اس رشک سے سو نہ سکا کہ عالم شب قدر
کا خیر مقدم کر کے برکتیں جمع کر رہا ہے اور ہائے میں محروم ہوں" — یہ رشک میرے
خیال میں باطنی طاعت ہے جو ظاہری طاعت سے بڑھکر ہے۔ اللہ تعالیٰ
ہم سب کو یہ نصیب فرمائے اور اسے قبول فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

آپ نے خط کے ابتدائی جملوں میں جس عقیدت و محبت کا اظہار فرمایا ہے
اللہ تعالیٰ اسکے نیک ثمرات عطا فرمائے۔ والسلام

(۴)

حال :۔ مرجع اہل وفا، مجمع صدق وصفا دامت برکاتہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
بکمال ادب ملتمس ہوں کہ ایک عرصے سے کوئی عریضہ خدمت عالی میں رسال نہ کرسکا اس محرومی کو سوچتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غفلت نے اس نادان کو نقصان پر راضی کرلیا ہے۔ مراسلت کی جو برکتیں ہیں میرا شعور اس سے نابلد نہیں اور ان برکتوں کے حصول کے لئے جو تڑپ ہوتی ہے دل کو اس سے بلکل خالی نہیں پاتا۔

تحقیق :۔ دیر آید درست آید انھیں مواقع کیلئے چسپاں ہے۔ دل کو تڑپ سے خالی نہ پانا اور غفلت سے ڈرنا اور تصور کا سمایا رہنا یہ سب مقاصد طریق سے ہیں

حال :۔ باینہمہ جو کوتاہی ہوئی اسے ایک مہینہ سے برابر سوچتا رہا ہوں اور اپنے اندرون کو اسکے اسباب کی کرید میں مصروف پاتا رہا ہوں۔

تحقیق :۔ یہ سوچ بچار اور اندرون کو کرید میں مصروف کرنا طریق کے لوازم سے ہے۔

حال :۔ ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اچانک مجلس عالی سے دور اور مواعظ گرامی سے محروم ہوجانے کے بعد طلب وشوق کو گم کردہ راہ ہوجانے کا موقع ملا، میری طبیعت اس بچے کی سی تھی جس کی آوارہ طبیعت ایک باکمال استاد کی حکیمانہ توجہ سے ابھی اچھی طرح مانوس بھی نہ ہونے پائی تھی کہ مکتب کی بساط ہی لپیٹ دی گئی اور اسکا نظام ہی ختم کردیا گیا۔ کچھ دنوں تو وہ بچہ کھویا کھویا سا رہا اسکے بعد اسکی طبیعت کی افتاد نے اسے پھر اسکی پرانی ڈگر پر ڈال دیا اور وہ پھر اپنے پرانے مشغلوں کی بھیڑ میں گم ہوگیا۔

تحقیق :۔ ایسا ہوتا ہے مگر یہاں واقعہ اسکے خلاف ہے الحمدللہ کہ آپ پرانے مشغلوں میں گم نہیں ہوئے۔

حال:۔ (۲) دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو خاص نسبت مراسلت کا محرک اور بناتی ہے یہ عقیدت مند ابھی اس تک پہونچ نہیں سکا تھا ابھی تو وہ ایک زینے طے کئے تھے کہ طلسماتی طور پر وہ عمارت ہی اٹھالی گئی جس میں وہ زینے لگے تھے اور اچانک ایسا محسوس ہوا کہ جیسے خواب میں ایک مرد کامل کے سامنے زانوئے ادب تہ کئے بیٹھا تھا کہ اتنے میں آنکھ کھل گئی

تحقیق : ــــ یہ صحیح ہے مگر طالب صادق کیلئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنے کو عقیدت میں ناقص سمجھے یہی اسکے لئے ازبس مفید ہے

حال : ــــ اس واقعہ کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ طلب کا ایک پودا حضرت کی گرامی توجہ کی برسات میں اگ رہا تھا تھا اتنے میں باران فیض کا رخ ایسا بدلا کہ وہ ننھا سا پودا کرم کی چھینٹوں اور لطف کی پھواروں کو ترس ترس کر مرجھانے لگا۔

تحقیق : ــــ مگر مرجھا نہ سکا لطف کی پھواروں نے اسے تروتازہ کردیا فللہ الحمد والمنۃ

حال : ــــ (۳) تیسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دل کی طرف سے جب عرض احوال کی تحریک ہوئی تو دماغ نے طرح طرح کی موشگافیاں شروع کردیں، اور کیا لکھا جائے اور کس اسلوب سے لکھا جائے کے مسئلے آکھڑے ہوئے ۔ زبان کیطرح چونکہ قلم بھی بے راہ روی کا عادی رہا ہے اسلئے کبھی اس نقص کا احساس بھی عناں گیر ہوا۔ کبھی یہ ہوا کہ تصور کی بیاض میں حضرت کی یاد کے ہاتھ سے لکھے ہوئے جو نوشتے تھے کاغذ جب انکا عکس لینے لگا تو ادب نے احتساب کا ہاتھ بڑھایا کہ تجھے اس تصدیع کا حق بھی حاصل ہے ؟

تحقیق : ــــ یہ بھی وہی ہے جو اوپر عرض کرچکا ہوں یہ حضرت عشق کی نیرنگیاں ہیں۔

حال :۔ (۴) کبھی عام بیدینی کے ہولناک مناظر سے گھبرا کر اور کبھی اپنے باطنی انقباض سے اکتا کر حضرت سے فریاد کرنے کو جی چاہا تو اندر سے کسی نے ڈرایا کہ بے تربیت قلم کی گفتگو کہیں بکواس نہ بن جائے

تحقیق : ــــ یہ طلب صادق میں ہوتا ہے یہ ڈر لازم حال رہتا ہے

حال :۔۔ یہ عریضہ اسی لئے ارسال کر رہا ہوں کہ جناب والا سے اگرچہ میری نسبت ضعیف ہے اور جو تربیت حضرت کی مجلس سے کچھ دنوں تک ملی تھی وہ اگرچہ بہت خام ہے پھر بھی مجھے اجازت دی جائے کہ اپنے دینی تاثرات اور اپنے باطنی حالات اور کچھ دینی استفسارات کو حضرت سے مراسلت کرنے کا وسیلہ بناؤں تاکہ اس سبزۂ انتساب کے پنپنے کے لئے جسے حضرت کے ابرکرم نے اس بے معرفت کے دل میں اُگایا تھا کم سے کم شبنم کی تری ملتی رہے۔

تحقیق :۔۔ نہایت خوشی سے اجازت ہے۔ اللہ تعالیٰ روزافزوں ترقی نصیب فرمائے۔

حال :۔۔ میری صحت بزرگوں اور بالخصوص حضرت والا کی دعاؤں اور اللہ کریم کے فضل وکرم سے اب اچھی ہے، اور جو دینی مشاغل ناتندرسی کے باعث چھوٹ گئے تھے انکا دامن پھر ہاتھ میں آگیا ہے۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہر دینی کام میں اخلاص عطا فرماکر اسے قبول فرمائیں۔ اور حضرت والا سے جو ہدایتیں ملتی رہی ہیں مشعل راہ کا کام دیتی رہیں۔ تحقیق :۔ آمین۔

حال :۔۔ ایک مرتبہ کا واقعہ یاد آرہا ہے کہ ایک دینی مجلس میں خطاب کے ارادہ سے جارہا تھا راہ میں وسوسہ پیدا ہوا کہ اس مجلس کی رونق میرے دم سے ہے میں نہ ہوتا تو وہ کب کی درہم برہم ہوچکی ہوتی اس خیال کے آتے ہی حضرت کی ایک تازہ ہدایت نے رہنمائی کی اور آدھی راہ سے واپس آگیا۔

تحقیق :۔۔ یہ سب ہدایات غیبیہ ہیں جن سے طالب کی دستگیری کیجاتی ہے۔

حال :۔۔ گھوم پھر کر حضرت کی بارگاہ ارشاد میں اسلئے جاتا تھا کہ دینی خدمات کے لئے حضرت کی رہنمائی حاصل کروں۔ آہ وہ چراغ رہنمائی اب بھی ہے لیکن میری کم بیں نگاہ سے بہت دور آسمان کے اس ستارے کی طرح جو عام نگاہوں کی دسترس سے اونچا ہوتا ہے۔

تحقیق : نظروں سے دور رہنے کا پیارے گلہ نہیں دل سے قریب ایسے ہو کچھ فاصلہ نہیں

حال :۔ البتہ اس منزل میں جب قدم رکھتا ہوں تو ان ایام کو یاد کرلیتا ہوں جب اس ستارے کی چھاؤں میں چلنے کی توفیق حاصل تھی۔ تحقیق : الحمد للہ

حال :۔ اللہ کریم ہمیں اسکی سچی قدردانی عطا فرمائے اور اسے ہمارے سروں پر ہماری دینی و دنیاوی فلاح کے لئے قائم رکھے۔ آمین ثم آمین تحقیق : آمین۔

(۴)

حال :۔ چند ماہ پیشتر ایک عریضہ ارسال خدمت اقدس کیا تھا اور امید تھی کہ نصف ملاقات کا شرف جلد جلد ملا کریگا لیکن نفس وشیطان کے غلبہ سے ایسا نہ ہوسکا۔ میرے جیسے سراپا عصیاں کیلئے جناب کے فیض صحبت کی سخت ضرورت ہے لیکن بدقسمتی سے اسکی نوبت نہیں آرہی ہے دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کی خدمت میں حاضری اور فائدہ حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جناب کی صحبت سے مجھے جو فائدے حاصل ہوئے ہیں ان میں میرے خیال کیمطابق سب اہم فائدہ یہ ہوا ہے کہ اللہ والوں سے عقیدت میں اضافہ اور ان پر نکیر سے نفرت پیدا ہوگئی ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے کیونکہ اپنے اعمال تو پریشان کن ہیں البتہ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (انسان اپنے محبوب کے ساتھ ہوگا) کی بشارت باعث تسلی ہے۔ میں اعمال کی دنیا میں بالکل تہیدست ہوں، اگر جناب والا دعائے خیر سے سرفراز فرماتے رہیں تو کامرانی سے ہمکنار ہونے کی قوی توقع ہے۔

تحقیق :۔ ضرورت صحبت کا احساس کرتے ہوئے تشریف آوری اور فائدہ حاصل کرنے کے توفیق کی جو دعا کرائی ہے میں آپ کو تبلانا چاہتا ہوں کہ مجھکو آپ سے دلی محبت و مناسبت ہے اس لیے دل سے دعا کرتا ہوں اور اسکو چاہا کرتا ہوں کہ یہ کیا کروں۔ آپنے تحریر فرمایا ہے کہ سب سے اہم فائدہ الخ (دیکھئے عبارت خط کشیدۂ بالا) سبحان اللہ کیا کہنا ہے اس مضمون کے استحسان کا۔ کاش یہ مضامین بہت سے دلوں میں پیدا ہوجائیں۔ میں آپ جیسے مخلص کیلئے دعا کو اپنا فرض سمجھتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی نسبۃ صحیحہ صادقہ عطا فرمائے اور اپنے صالحین بندوں میں داخل فرمائے۔ آمین

والسلام خیر ختام

وصی اللہ عفی عنہٗ

(۵)

مخدوم مخدومانِ زمان خلاصۂ ارباب عرفاں دامت برکاتکم العالی

السلام علیکم و رحمۃ اللہ

حال: بکمال ادب ملتمس ہوں کہ معذرت نامے کا جواب پاکر قلم جانے کتنی بار کاغذ پر سنبھل سنبھل کر چلا ہے لیکن اپنی ہر تحریر کو ناقص سمجھکر مسترد کرتا رہا ہوں اور یہی اصل سبب اپنی کاغذی حاضری کی تاخیر کا ہے ورنہ التماس کے لئے بہت سے ایسے موقعے آئے جو بڑے ہی اہم تھے۔ ان میں سے ایک موقع وہ تھا جب میرے بڑے بھائی نے موت و زندگی کی کشمکش کے کئی مرحلوں سے گذرتے رہنے کے بعد ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ مرحوم کے لئے سکون کی دعا کی درخواست کرچکا تھا اب ضرورت تھی کہ اپنے اس محسن کی دعا مغفرت کیلئے فریاد کروں جس کے ایثار و اخلاص کے سائے میں میں نے دینی علوم حاصل کئے تھے۔

دوسرا موقع وہ تھا جب ٹھنڈک کی شہ پاکر میرے پرانے مرض تنفس نے میرے سینے میں ہیجان پیدا کیا۔ حضرت جب یہاں رونق فروز تھے میں دوا سے پہلے حضرت کی دعا کی طرف لپکتا تھا لیکن اس مرتبہ قلم جب بھی اٹھا اس پر ایک ہراس طاری ہوا اور میرا کام نہ ہوسکا البتہ حضرت کے تصور میں گم ہوکر اشعار کہتا رہا اور حضرت کی یاد سے استفاضہ کرتا رہا اور دل میں سکون اور روح میں ایک روشنی سی محسوس کرتا رہا۔ اکثر ایسا نظر آتا تھا کہ جیسے حضرت واقعی میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے ہیں اور میرے لئے دعا فرما رہے ہیں۔ اسکے بعد آج گیارہ روز ہوئے ایک شدید حملہ تنفس کا ایسا پڑا جس سے سولہ گھنٹے تک تڑپتا رہا۔ نماز بستر پر اشارے سے ادا ہوئی اسوقت حضرت کی یاد بہت آتی رہی دو روز کے بعد بستر سے اٹھکر روز دو ایک صفحے حضرت کو لکھ لکھکر پھاڑتا رہا اور آج تہیہ کیا کہ جیسا بھی بن پڑے حضرت سے اپنے مرحوم بھائی کی مغفرت اور اپنی صحت کے لئے دعا کی درخواست کر ہی دوں

حضرت کے تصور کو میں اپنا ایک بڑا قیمتی سرمایہ سمجھتا ہوں کیونکہ اس صورت میں قلب و نظر میں دین کیطرف رجحان رہتا ہے اور ایسا محسوس کرتا رہتا ہوں جیسے

ایک تاریک راہ میں ایک چراغ میری رہنمائی کر رہا ہے ۔

معذرت نامے کے جواب میں جو ارشادات صادر ہوئے وہ میری امید کے مطابق تھے میں جانتا تھا کہ میرے شوق کی لغزش کو حضرت کی کریم النفسی دل سے معاف کردے گی ۔ صحیفہ عالی کو پاکر برجستہ ایک قطعہ موزوں ہوگیا تھا جسے ڈرتے ڈرتے عرض کر رہا ہوں ؎

دامن نگاہِ لطف کا پھر ہاتھ آگیا　　پھر شوق اپنی دولتِ نایاب پا گیا
جیسے کوئی بجھی ہوئی قندیل جل اٹھی　　جیسے کوئی چراغ سرِ راہ آگیا
پھر اک تبسم کرم آگیں نظر میں ہے　　پھر ایک نور دل کی سیاہی پہ چھا گیا
جب بھی چلا شکیلؔ قدم تھرتھرا اٹھے
لغزش کا خوف ایسا قلم میں سما گیا

خادم عقیدت کیش محمد شکیل عباسی

تحقیق: عنایت فرمائے بندہ ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محبت نامہ عرصہ کے بعد آیا ۔ حالات معلوم ہوئے بھائی صاحب کے انتقال سے رنج ہوا اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس درمیان میں آپ کے مرض نے بھی کچھ شدت اختیار کرلی تھی اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عاجلہ کاملہ مستمرہ عطا فرمائے

باقی حالات جو آپ نے اپنے لکھے ہیں ان سے بہت خوش ہوا ۔ اس سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو بھی دولتِ باطنی ملے گی اور آپ محروم دنیا سے نہ جائیں گے ۔ اللہ تعالیٰ آپ کی باطنی کیفیات اور حالات میں روزافزوں ترقی نصیب فرمائے ۔

میں بحمد اللہ بخیریت ہوں ۔ والسلام خیر ختام

وصی اللہ عفی عنہ

(۶۱)

حال ؛ چراغ طور عرفاں - سراپا نور ایماں دامت برکاتکم

باادب ملتمس ہوں کہ صحیفۂ ہدایت اوائل رمضان میں صادر ہوا تھا جس کے جواب کے مسودے میں قوت ممیزہ کاٹ چھانٹ کرتی رہی اور تاخیر کی مدت بڑھتی رہی اس واقعہ کا تذکرہ کل ایک کارڈ میں کرچکا ہوں اس عریضے میں اس حادثہ کا بھی ذکر آچکا ہے کہ ٹھنڈی ہواؤں کے تند و تیز طوفاں کی زد میں آکر میری صحت کا یہ حال ہوا کہ ماہ مبارک کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور جو سلسلہ حضرت کی دعا سے روزے کا قائم ہوا تھا اچانک ٹوٹ گیا اسی لئے ایک کارڈ دوبارہ دعا فرمانے کے لئے فریاد کی تھی۔ میرا اب یہ عقیدہ ہوگیا ہے کہ کسی خدا دوست سے دعا کی التجا اسکے ہاتھ اٹھانے سے پہلے ہی قبول ہو جاتی ہے جیسا کہ اسی سال رمضان میں مشاہدہ ہوا کہ ادہر حضرت کی خدمت میں درخواست لکھکر فارغ ہوا ادہر مجیب الدعوات کی طرف سے در اجابت وا ہوگیا یعنی صحت کی ناہمواری میں ایک تبدیلی نظر آئی اور تنفس کی گرفت ڈھیلی نظر آئی، اللہ کا نام لیا اور دوڑ کر ماہِ مبارک کا دامن تھام لیا۔ حضرت کی نسبت کا شرف کام آیا اور اس مایوس العلاج کے ہاتھ میں نشاط رمضان کا جام آیا تب سے شب میں صرف ایک خوراک دوا کی لے لیتا تھا اور روزے کی ناؤ کو حضرت کے دست دعا کے فیض سے کھے لیتا تھا ہوا میں جتنی نمی ہوتی تھی اس مستفیض کے ایمان میں اتنی ہی ہما ہمی ہوتی تھی دواؤں سے جو کام نہیں ہو سکا تھا دعا کی درخواست سے چند لمحوں میں ہوگیا اور دل ایک مستجاب الدعوات کی چشم مروت کی یادمیں کھوگیا۔

کل سے اس سلسلے کے جوڑنے کا ارادہ ہے جو خاص طور پر حضرت کی دعا سے چل رہا تھا ڈاکٹر نے آج اجازت بھی دیدی ہے۔ دعا فرمائیں کہ یہ سفینہ ناسازگاری کی کسی چٹان سے اب نہ ٹکرائے اور ہلالِ عید کے ساحل تک بسہولت پہونچ جائے بلکہ اتنی طاقت آجائے کہ چھوٹے ہوئے روزوں کو عید کے بعد ہی

پورا کر لوں۔

حضرت والا کی خدمت میں ارسال کرنے کے لئے عریضہ ترتیب دینے بیٹھتا ہوں تو شوق کچھ اس طرح خیال کے پیچھے پڑ جاتا ہے کہ نثر کو نظم کا لباس پنھانے کے لئے اڑ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خالی اوقات کا اکثر حصہ حضرت کے تصور میں مصروف رہتا ہے اور اس توفیق پر دل وجد کرتا ہے۔ خیال کی خوش نصیبی ہے کہ حضرت کے مکارم اخلاق سے رنگ و روغن مانگ کر سنورتا ہے۔ چنانچہ حضرت کی دعا سے جو توفیق روزہ رکھنے کی ملی تھی اس کے تصور نے فوراً چند اشعار ترتیب دیئے میرے شوق کا ارمان ہے کہ حضرت اسے ملاحظہ فرمالیں ؎

مری صحت کو جو روزے یہ آج قدرت ہے — دعائے حضرت والا کی استجابت ہے
ہے اندنوں تو مرے دل میں ایک خواہش بس — نہ زندگی کی تمنا نہ تازگی کی ہوس
دلادے مجھکو شریعت سے رخصت افطار — نہ اتنا تنگ ہو سینے میں میرے سانس کا تار
یہ ناؤ اب کسی چٹان سے نہ ٹکرائے — ہلال عید کے ساحل سے جا کے لگ جائے
میں چل رہا ہوں عزیمت کے کاروان کے ساتھ — ہے میرے ساتھ مرے شیخ کی دعا کا ہاتھ
چراغ راہ ہدیٰ، با خدا وصی اللہ — ضیائے دین و شریعت ہے جنکا نورنگاہ

شکیل دیدہ و دل کو جوان سے نسبت ہے
انھیں کی چشم عنایت کی یہ کرامت ہے

اس عریضے کی ترتیب و تہذیب کی اثناء میں دو خواب بھی دیکھے ہیں۔

(الف) ایک خواب یہ تھا کہ اپنے ایک شاگرد عزیز کے ساتھ جنکی دوکان پر اکثر بیٹھا کرتا ہوں اور کبھی کبھی سہ پہر کو ان کے ساتھ ناشتہ کرنے کا بھی اتفاق ہوتا ہے بیٹھا ہوا کچھ کھا رہا ہوں اتنے میں محترم واجد علی خاں صاحب سامنے آجاتے ہیں جنھیں دیکھکر یاد آجاتا ہے کہ یہ مہینہ رمضان کا ہے۔ فوراً منھ کے لقمے کو تھوک دیتا ہوں اور دل میں یہ کہتا ہوں کہ بھولکر کھالینا معاف ہے۔

(ب) دوسرا خواب اُس رات میں دیکھا جسکی شام سے مندرجہ بالا اشعار کی ترتیب دماغ پر مستولی رہی بالخصوص آخر کے دونوں اشعار نے فکر کو حضرت والا کے محاسن صفات کی یاد میں مستغرق رکھا۔ خواب یہ تھا کہ بعض تشویشناک ہنگاموں سے گذرتا ہوا اس مقام پر پہونچا ہوں جہاں حضرت کی حیات ہی میں حضرت کا مزار بنایا جا رہا ہے۔ یہ مزار ایک مسجد کے اندر اسکے اندرونی صحن کے جنوبی مشرقی حاشیے پر واقع ہے۔ ہے تو یہ مزار بہت سادہ و بے تکلف سا لیکن اس میں سنگ مرمر نصب ہیں سرہانے ایک چھوٹی سی محرابی دیوار کھڑی کی گئی ہے اور اسکی پشت پر لوگ بیٹھتے جا رہے ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے حضرت کا عرس کیا جا رہا ہے اور دماغ میں تیزی سے یہ خیال بھی ایک لمحے کے لئے دوڑ گیا کہ قوالی بھی ہوگی۔ میرے دل پر غم کا دباؤ اور حیرانی سی ہے لوگ کہہ رہے ہیں کہ تم تو آگے کی صف میں بیٹھو انکا مطلب یہ ہے کہ حضرت کی مجلس میں چونکہ اس خادم کو انتہائی قرب حاصل رہتا تھا اسلئے آج بھی مجھے ممتاز صف میں جگہ ملنی چاہئیے ۔ لیکن میں ایک تأثر کے ساتھ سب سے پیچھے کی صف میں بیٹھ گیا اور دل یہ سوچکر ڈوبنے لگا کہ جو کچھ ہو رہا ہے حضرت کے مسلک کے خلاف ہو رہا ہے۔ بس اسی حالت میں آنکھ کھل گئی۔

(تحقیق)

محبی سلکم اللہ تعالیٰ ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

پہلے آپ کا کارڈ ملا اسکو پڑھکر اور احباب کو سنا کر دلِ حزیں کو تسلی دے رہا تھا کہ دوسری ڈاک سے آپکا لفافہ بھی مل گیا سبب حزن تو اب آپ کو معلوم ہی ہو گیا ہوگا۔ اس واقعہ فاجعہ کا ہم سب پر بہت اثر ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی چونکہ صبر بھی مرحمت فرماتے ہیں اسلئے تدریجاً غم کم ہو رہا ہے ورنہ صدمۂ عظیم تھا اور ایسے وقت میں پیش آیا کہ خود میں کئی دنوں سے اپنے مرض کی تکلیف اور سخت ریاحی دورہ میں مبتلا ہو چکا تھا اور ابھی اس سے طبیعت پوری طرح سنبھلی بھی نہ تھی کہ یہ لڑکی بیمار ہوئی بعارضہ چیچک اور پھر اس سے جانبر نہ ہو سکی اسی واقعہ کیجانب میں نے

اوپر ذکر کیا ہے کہ اپنے دل حزیں کو تسلی دے رہا تھا۔
خط سے آپ کی علالت اور روزوں کے چھوٹنے کا حال معلوم ہوا اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کلی عطا فرمادیں اور بقیہ ایام نشاط کے ساتھ گذار دیں۔
محبت میں تو آدمی نجانے کیا سے کیا کرنے لگتا ہے اور نثر سے نظم کی طرف منتقل ہوجانا یہ تو کچھ ایسی بات ہی نہیں یہ سب آثار محبت سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس میں ترقی عطا فرمادیں اور اسکے برکات و ثمرات سے جانبین کو بہرہ ور فرمادیں۔
خط کے آخر میں آپ نے دو خواب اپنے لکھے ہیں، پہلے خواب میں آپکے قلب میں رمضان شریف کی جو عظمت واحترام ہے جیسا کہ آپ کے خط کے مضمون سے ظاہر ہوا کہ آپ کو ان روزوں کے چھوٹنے کا بڑا قلق ہوا اسی کو ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ افطار بھی کر رہے ہیں اور پھر بھولے کھا رہے ہیں اور پھر یاد آنے پر فوراً اس سے باز رہتے ہیں یہ سب اسی عظمت کی جانب مشیر ہیں جو اس سلسلہ میں آپ اپنے قلب میں پاتے ہیں چنانچہ واجد سے اسی بات کیجانب اشارہ ہے۔
اور دوسرا خواب طویل جو آپ نے دیکھا تو فوراً یہ بات سمجھ میں آئی کہ خواب میں بعض مرتبہ بہت لطیف مناسبات ہوتے ہیں۔ پس مزار کے وہ معنی نہیں جو نبادر ہیں بلکہ مزار سے مراد زیارت گاہ کے ہیں اور قبر کو مزار اسی اعتبار سے کہا بھی جاتا ہے تو وہاں ہجوم کا ہونا اور قوالی کا ہونا یہ سب اس کو ظاہر کرتا ہے کہ لوگوں کی توجہ میری جانب نشاط کے ساتھ ہو رہی ہے تو کیا عجب آپ عنقریب کوئی ایسی خبر سنیں یا ایسا واقعہ دیکھیں جس سے یکبارگی لوگوں میں جوش و خروش پیدا ہوکر کچھ کام ہوجائے یہاں الہ آباد میں ایک دینی دارالعلوم کی بنیاد رکھنے کا خیال ہے اور بستی کے لوگ بھی اب کچھ متوجہ نظر آتے ہیں۔ باقی حیات میں مزار یہ موتوا قبل ان تموتوا کے قبیل سے ہے۔ اہل اللہ اختیاری موت زندگی ہی میں حاصل کرلیتے ہیں اور اسکا حکم ہے۔ چنانچہ یہ حضرات اپنے ارادہ کو اپنے نفس کو سب ہی کو فنا کردیتے ہیں۔ یہی موت ہے پس چونکہ آپ کو مجھ سے محبت ہے اسلئے ہوسکتا ہے ایسی کوئی بات اور نمایاں

کوئی کام میری ذات سے انجام پانے والا ہو جو زیارت گاہ خاص و عام بنے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تعلق خاطر کی وجہ سے یہاں بچی کی قبر اور وہاں احباب کا ہجوم صبح و شام یہ سب آپ پر منکشف ہوا ہو کیونکہ اولاد کی مزار باپ ہی کی مزار ہے۔

والسلام خیر ختام

(صاحب مکتوب کا ایک اور مکتوب ملاحظہ فرماتے چلئے یہ خط مولوی شکیل صاحب مدظلہ نے اپنے ایک لائق اور محبوب شاگرد پروفیسر عبدالحمید صاحب ڈگری کالج بلرام پور کے نام لکھا تھا دیکھئے حضرت اقدس کا تذکرہ کس محبت سے کیا ہے ماسٹر صاحب موصوف میرے بھی کرم فرما اور مخلص دوستوں میں سے ہیں انھیں کے واسطے سے یہ جواہر پارے ملے جو درحقیقت امت کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ انکو جزائے خیر عطا فرمائے اور صاحب مکتوب جناب شکیل عباسی صاحب کو صحت عطا فرمائے اور حضرت اقدس کے ساتھ ان کے اس مخلصانہ تعلق کا بھرپور صلہ عطا فرمائے۔ آمین)

(مکتوب مولوی شکیل عباسی صاحب بنام پروفیسر عبدالحمید صاحب)

۹/۱۰
۷۷

عزیزم سلمکم اللہ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ

میرے حال پر مالک کا خاص کرم ہے کہ روزے نبھ رہے ہیں تراویح میں بحمداللہ کوئی تکان محسوس نہیں ہوتی۔

اپنا ایک نہایت قیمتی سرمایہ تمھارے سپرد کرتا ہوں ایک یہ کہ تمھارے پاس زیادہ محفوظ رہ سکے گا ہمارے گھر میں تو اس طرح کی چیزوں کی قیمت بہت گھٹ گئی ہے ریٹائرڈ ہونے کے بعد گھر آکر دین کے استخفاف اور دنیا کے اعزاز کو دیکھا تو دل خون ہو گیا اور اسکی ایک بوند ٹپک کر شعر بن گئی ؎

تکلف سے دم گھٹ رہا ہے یہاں بھی شکیل آہ اب وہ بیارہ نہیں ہے

دوسرے یہ کہ اس کے کچھ مکتوبات معرفت حق میں شایع ہو سکیں گے۔ ان مکتوبات کو بہت غور سے مطالعہ کرنے کے بعد دیکھو کہ کون سا جزو لائق اشاعت ہو سکتا ہے

الہ آباد کو کوئی بہت معتبر جانے والا ملے تو اسکو بھیجدینا، لیکن زیادہ بہتر شکل یہ ہے کہ جب بھی الہ آباد جانا ہو تو خود لیتے جانا اور کسی ذمہ دار کو خود اپنے ہاتھ سے دے دینا۔

حضرت والا کی یاد کبھی کبھی ایک تیز جھونکے کی طرح آتی ہے اور خیالات منتشر ہو جاتے ہیں اور چند واقعات کرم خاص کے یاد آتے ہیں تو دل کا ایک عجیب حال ہو جاتا ہے۔ لاوارثی سی محسوس ہوتی ہے ـــــ ایک مرتبہ میرے ہونٹ کو انگشت مبارک سے پکڑ کر فرمایا " ذکر ہونٹ سے نہیں دل سے ہوتا ہے "۔ اسوقت یہی موضوع مجلس میں چل رہا تھا

ایک مرتبہ فرمایا " آپ سمجھئے ۔ (پھر مجمع کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) یہ لوگ نہیں سمجھ پائیں گے " ـ

الہ آباد سے کہلایا کہ " تبلیغ میں خوب کام کرو " ـــ خادم اور مخدوم کے درمیان طریقے کا جو ایک فاصلہ سا تھا وہ بھی ختم ہو گیا لیکن آہ اتنے میں بساط ہی لپیٹ دی گئی اور ایک لمبے چوڑے اندھیرے میں نورانی تبسم کی یاد کا سہارا رہ گیا اور بس۔

اپنے اور بچوں کے احوال لکھکر بھیجو مجھے انتظار رہے گا ۔ فقط ۔ دعائیں ۔

(اس موقع پر صاحب مکتوب کی ایک نظم جو انھوں نے " حضرت والا کی یاد " کے عنوان سے کہی تھی یاد آگئی ناظرین بھی ملاحظہ فرماتے چلیں) :۔

تصور کو ہے نسبت ایک نورانی تبسم سے ۔۔۔ اسی سے دل میں بھی اک روشنی معلوم ہوتی ہے
بساط اس بزم کی کب کی لپیٹی جا چکی لیکن ۔۔۔ نظر اسکی تجلی سے بھری معلوم ہوتی ہے
وہی اک بات جو سو بار گذری ہے نگاہوں سے ۔۔۔ زبان شیخ پر آکر نئی معلوم ہوتی ہے
یہ تو نے کیا کیا اے شوق عرض مدعا کر کے ۔۔۔ نگاہ شوق میں مجھکو کمی معلوم ہوتی ہے

تشکیل اک رند اور اسدرجہ گم سم بات کیا ہے یہ
کسی اہل نظر کی رہبری معلوم ہوتی ہے

(مکتوب میں جس دار العلوم کا ذکر ہے وہ یہی مدرسہ " وصیۃ العلوم " ہے اور حضرتؒ کا رسالہ معرفت حق کے بجائے اب " وصیۃ العرفان " نکل رہا ہے)

مولوی شکیل عباسی مدظلہٗ کے نام حضرت مصلح الامۃ کا ایک اور خط

(نوٹ: اس خط میں حضرت اقدسؒ نے خود اپنے ہجرت از وطن کا اجمالی حال بیان فرمایا ہے اور اہل گورکھپور کی دعوت تشریف بری گورکھپور سے معذرت ظاہر فرمائی ہے۔ جامی)

مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

میں نے فتحپور کا قیام اپنی مصالح ذاتیہ کی بنا پر ترک کیا تھا اور جب اپنے مولد ومسکن کو ترک کیا تو کہیں رہنا ضروری تھا۔ گورکھپور کے لوگ وہاں موجود تھے انکے ہمراہ گورکھپور آگیا۔ جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا وہاں رہا جب وہاں زیادہ بیمار رہنے لگا یہاں کے آنیکا ارادہ کیا اپنی صحت کے خیال سے اللہ تعالیٰ کا شکر ہے فائدہ ہوا۔ وہاں کی بہ نسبت یہاں بحمد اللہ صحت ہے۔ قیام یہاں (الہ آباد میں) بھی اپنی ذاتی مصلحت کی بنا پر ہوا ہے۔ جب رہنا طویل ہوگیا تو مکان بھی خرید لیا گیا، لوگ بھی آمد و رفت رکھنے لگے۔ اسکو کیا کروں، انکو کیسے روک سکتا ہوں؟ تدریس کا بھی سلسلہ ہے اور بھی کام ہیں جو مجھی کو کرنے ہوتے ہیں۔ آنے جانے میں سب فوت ہو جاتے ہیں۔ صحت خود کہیں آنے جانے سے مانع ہے اور دوسرے امور بھی مانع ہیں۔ طبیعت اب ڈر گئی ہے سہم گئی ہے ہر امر میں خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ بہت جگہ سے لوگ بلانا چاہتے ہیں اور بار بار کہتے ہیں، اپنے اعذار بیان کر دیتا ہوں خاموش ہو جاتے ہیں اولاً تو تعلیم و تربیت میرے بس کی بات نہیں دوسرے تھوڑا وقت اسکے لئے کافی نہیں کہیں جم کے آدمی رہتا ہے تب ہی کام ہوتا ہے۔ میں نے وہیں قیام کا ارادہ کیا تھا مگر منظور نہ ہوا۔ اب کیا کروں بالکل اپنی مجبوری کا اظہار کر رہا ہوں آپ

مجبور سمجھکر معاف فرمائیں ۔ والعذر عند کرام الناس مقبول ۔

والسلام خیر ختام وصی اللہ عفی عنہ

ملاحظہ فرمایا آپ نے حضرت والا ترک قیام فتحپور کی وجہ اپنی ذاتی مصالح کو فرما رہے ہیں ۔ اور وہ یہی تھی کہ مفسدوں نے یہاں کی فضا ایسی مسموم کردی تھی کہ یہاں دین و اصلاح کا کام سکون و یکسوئی کے ساتھ کرنا مشکل ہوگیا تھا ۔ اور حضرت اقدس کا جو مشن تھا یعنی خانقاہی طرز کا کام وہ کامل سکون کو چاہتا تھا ۔ پس حضرت والا نے یہاں اپنے دینی کام کے ضیاع کو محسوس فرماکر وہاں سے ہجرت کرجانا ہی مناسب سمجھا ۔ باقی یہ بات ہرگز نہیں تھی کہ حضرت اقدس کی پوزیشن یا احترام خدانخواستہ وہاں باقی نہیں رہ گیا تھا اس لئے آپ نے وطن چھوڑ دیا تھا یا وہاں کے فتنہ میں کوئی قتل کا کیس ہوگیا تھا ۔ توبہ توبہ ان چیزوں کا تو وہاں دور تک پتہ نہ تھا جن حضرات کے لغزش قلم سے اس قسم کی باتیں سرزد ہوگئی ہیں وہ ان کے انتہائی غیر تحقیقی رویہ اور بے احتیاطی کے ماتحت وقوع میں آئی ہیں ۔ اور غلطی کا منشا ریہ ہوا کہ واقعات کی تحقیق غیر محل سے کی گئی حضرت اقدس کی خدمت میں رہنے والے اور بوقت واقعہ موجود رہنے والے بہت سے لوگ اب بھی زندہ ہیں کاش ان سے ہی دریافت کرلیا جاتا تو یہ بے احتیاطی راہ نہ پاتی ۔

اسی طرح سے آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرتؒ خود ارشاد فرما رہے ہیں کہ گورکھپور کے لوگ وہاں موجود تھے ان کے ہمراہ گورکھپور چلا آیا ۔ اب یہ کہنا کہ حضرت پاکستان جانا چاہتے تھے اور گورکھپور کے حضرات وہاں جانے سے مانع ہوگئے اور اپنے یہاں باصرار حضرتؒ کو لائے اور لاکر معاذ اللہ حضرت کو پریشان کیا اور ذلیل کیا' اس قسم کی باتیں کسی مقصد کے پیش نظر تو کہی جاسکتی ہیں باقی واقعاتی دنیا سے انکا کچھ بھی تعلق نہیں ہے ۔ پاکستان کا سفر اسوقت حضرت اقدسؒ کے ارادے میں تو کیا گوشہ تصور میں بھی نہ تھا ۔ اور کسی معاملہ میں اصرار کی کس کی مجال تھی حضرت والا خوشی خوشی گورکھپور تشریف لے گئے تھے اور جو لوگ حضرت کو لے گئے تھے انکا احسان حضرت

عمر بھر مانتے رہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ باب اصلاح میں کبھی کسی کو کچھ تنبیہ فرما دیا ہو یا کسی مرید کی غفلت پر اس سے کچھ مواخذہ فرما لیا گیا ہو، تو یہ تو اس طریق کے اور باطنی تعلقات کے لوازم ہی سے تھا ۔ کوئی بھی مخلص اپنے شیخ کی اس نوع کی اصلاحات سے بچا نہیں کرتا بلکہ وہ مخلص ہی بنتا ہے اس قسم کی آزمائشوں میں پڑنے اور انکے سہنے اور برداشت کرنے کے بعد ہی ؎

آئینہ بنتا ہے رگڑیں لاکھ جب کھاتا ہے دل
دوستو! یہ دل بڑی مشکل سے بن پاتا ہے دل

اب اس نوع کے واقعات کو دیکھکر کسی کو غیر مخلص کہدینا ایسا مغالطہ ہے کہ کوئی مخلص ہی اس سے بچ سکتا ہے اسی طرح سے حضرت اقدس کے متعلق یہ کہنا کہ وطن میں لوگ آپ کے دشمن بہت ہو گئے تھے جسکی وجہ سے آپ کو اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا اس لئے آپ نے ترک وطن فرمایا تھا اس قسم کے پروپا گنڈے اہل غرض نے تو بہت کئے تھے اور ان کے لئے یہ مناسب بھی تھا باقی اہل حق بالخصوص حضرت والا سے کچھ بھی عقیدت یا تعلق رکھنے والوں سے تو اس قسم کی باتیں کسی طرح زیب نہیں دیتیں ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب کوئی شخص کسی بزرگ کے صحیح حالات سے واقف نہ ہو تو اسے ان بزرگ کی سیرت اور حالات لکھنے کی مصیبت ہی کیا آپڑی ہے کیونکہ اس طرح غلط سلط حالات بیان کرنے سے ان بزرگ سے بجائے قرب و عقیدت پیدا ہونے کے بُعد پیدا ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے جو کہ صاحب سیرت کی اعانت نہیں اہانت ہے ۔

حضرت اقدسؒ کا رعب وطن میں نہ صرف اپنوں ہی پر تھا بلکہ غیروں پر بھی بہت کافی تھا کسی کی مجال نہیں تھی کہ کوئی حضرت والا کے سامنے زبان ہلا سکے یا آنکھ ملا سکے ۔ اسی طرح سے محبت کا یہ عالم تھا کہ اپنے تو فدا تھے ہی غیر مسلم بھی بے انتہا عقیدت سے پیش آتے تھے ۔ الہ آباد تشریف لانے کے بعد جب آپ دوبارہ وطن تشریف لے گئے ہیں تو حضرتؒ کے ہمراہ الہ آباد سے چند معزز حضرات بھی

تشریف لے گئے تھے اگر کسی کو حضرت والا کی عزت واحترام اور اپنے پرائے کی نظروں میں حضرت کا مقام کا اندازہ کرنا ہو تو ان حضرات سے دریافت کرلے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے خود قدر و منزلت کے مناظر دیکھے تھے۔

غرض وطن میں نہ قتل کا واقعہ پیش آیا تھا نہ لوگ حضرت کے جانی دشمن ہوئے تھے، نہ حضرت پاکستان جارہے تھے، نہ وطن میں بے قدری تھی یہ سب باتیں بالکل غلط اور بے بنیاد مشہور کی گئی ہیں۔

رسالہ البلاغ کراچی کی چند ماہ قبل کی اشاعت میں ایک مضمون حضرت کے حالات کا نظر سے گذرا تھا جو اسی قسم کے بہت سے غیر تحقیقی واقعات پر مشتمل تھا۔ آپ خود خیال فرمائیے کہ کسی بزرگ سے مخلوق کو ایسی دشمنی ہو جانا کہ لوگ اسکے جانی دشمن ہو جائیں اسکے مرید قتل و قتال میں حصہ لیں، وہ شیخ اپنے وطن میں بے وقعت اور بے عزت ہو جائے، اسکے ہی مریدین خود اسکو دھوکا دیں، دوسری جگہ وہ شیخ وقت ہو کر بھی اپنے متعلقین کو چھوڑ کر دوسروں سے پناہ طلب کرے اور ایسا ہو جائے جیسے کوئی بے بس اور بے سہارا شخص ہوتا ہے، لاحول ولا قوۃ الا باللہ، یہ سارے امور اسکے کن صفات عالیہ کے مظہر ہیں اور سیرت کے کون سے درخشندہ موتی ہیں جن سے کسی بزرگ کی سیرت سجائی جائے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وطن سے سبب ہجرت صرف یہ ہوا کہ حضرت والا نے وہاں سکون اور یکسوئی کو مفقود پایا اور اب اس جگہ کو تعلیم و تربیت کے لئے مناسب نہ جانا اس لئے وہاں سے ہجرت فرمائی۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اب یہاں فتنہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ کی جگہ سے پناہ مانگی ہے اور ایسی جگہ سے دوری اختیار فرمائی ہے اسلئے اب میں یہاں رہنا مناسب نہیں سمجھتا

اوپر حضرت اقدس کا ایک مکتوب مولوی شکیل صاحب کے نام نقل کیا گیا درمیان میں بعض ضروری باتیں آگئی تھیں اب اسی سلسلہ کی ایک اور تحریر ایک دوسرے مولوی صاحب کے توسط سے مولوی شکیل صاحب کو بھیجی گئی چونکہ حالات کیلئے وہ بھی

کاشف ہے اسلئے اسکو بھی ملاحظہ کے لئے پیش کرتا ہوں

حضرت مصلح الامۃ کا ایک اور خط مولوی شکیل صاحب کے نام

مجبی سلکم اللہ وزادعرفانکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

الحمد للہ بخریت ہوں مولوی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب کے جواب کے ہمراہ آپکا بھی محبت نامہ ملکر مزید مسرت کا سبب بنا۔ میں نے اپنے خط میں "گورکھپور کیوں آؤں اور آؤں کہ نہ آؤں" کا جو سوال کیا تھا تو اسکی وجہ یہ بھی تھی کہ آپ نے پہلے کبھی مجھے یہ تحریر فرمایا تھا کہ ـــ " اندر سے ایک آواز آتی تھی کہ دلوں کی جس تعمیر میں حضرت نے ہاتھ لگایا تھا اسکا ناتمام رہنا گوارا نہ فرمائیں گے اور کم ازکم کچھ دنوں کے لئے ضرور تشریف لائیں گے۔ احساس محرومی تڑپ کر کہتا ہے کہ حضرت اب تشریف لائیں گے تو ایکدن بھی حاضری ناغہ نہ ہوگی"ـــ یہ بات مجھے یاد تھی تو میں نے یہ دریافت کرنا چاہا کہ دیکھوں اور لوگ اسکے متعلق کیا کہتے ہیں؟ کیونکہ مجھے بھی یہ پسند نہیں کہ ایک کام کو شروع کرکے اسکو ناتمام رہنے دیا جائے اسلئے مجھے آپ کی یہ بات بہت پسند ہوئی تھی اور میں بھی دل سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کی زیادہ سے زیادہ خدمت کروں، گو اسکا اہل تو نہیں تاہم آپ حضرات کی محبت وعقیدت کی وجہ سے اگر اللہ تعالےٰ مجھ سے ہی کوئی کام لے لیں تو کیا بعید ہے لیکن اس خدمت کے لئے میرا جسمانی قرب (کہ میں وہاں آؤں) نہ ضروری ہے نہ کچھ زیادہ مفید ہے۔ ہاں روحانی قرب البتہ ضروری ہے جو الحمد للہ کہ میرے یہاں ہوتے ہوئے بھی آپ حضرات کو حاصل ہے۔ بس کام کیجئے۔

باقی وہاں آنے کا مجھے انکار بھی نہیں ہے مگر اسکے لئے ایک شرط ضرور ہے وہ یہ کہ میں یہ سمجھ لوں کہ یہاں کی عارضی غیر حاضری بھی یہاں کے کام کے لئے مضر اور مخل نہ ہوگی اسکا ضرور انتظار ہے کیونکہ ایک جگہ کا ہوتا ہوا کام خراب کرکے دوسری جگہ کا کام بنانا کیا مفید ہوگا لطف تو جب ہے کہ یہاں بھی کام ہو اور وہاں بھی۔

جس دن آپ حضرات کے خطوط آئے مجھے اتفاق سے مولوی وصی الدین

صاحب ایسے وقت جا رہے تھے کہ موقع تحریری جواب کا نہ تھا چنانچہ میں نے
ان سے کہدیا تھا کہ آپ ہی کو جواب بنا کر بھیجتا ہوں مگر دل اس زبانی جواب پر نہ مانا
اسلئے آج یہ تحریر لکھے رہا ہوں اسکو سب حضرات کو سنا دیجئے اور یہ آپ کے مولوی
عبدالحنان صاحب اور حکیم وصی احمد صاحب کے خطوط کا مشترکہ جواب ہے۔

حضرت مصلح الامہؒ کے حالات گورکھپور کے سلسلہ میں راقم نے وہاں کے چند
خاص خاص لوگوں کے حالات بیان کئے ہیں چنانچہ آخر میں محترمی مولوی شکیل احمد
صاحب عباسی مدظلہ کی مکاتبت سے ناظرین کو اندازہ بھی ہوا ہوگا کہ حضرتؒ کا فیض
گورکھپور میں کیسا کیسا پہونچا اور چند ماہ کے قیام سے وہاں بھی کیسے کیسے مخلص
پیدا کئے چنانچہ ایک کثیر مخلوق کو حضرت والا کا فیض پہونچا جی چاہتا ہے کہ چند حضرات
کے خطوط اور نقل کردوں جن سے حضرت والا کا افادہ اور حضرت کے الہ آباد
چلے آنے پر وہاں کے لوگوں کے قلبی تاثرات کا اندازہ ہوتا ہے

(مکتوب بنام حضرت مصلح الامہؒ)

حال :- نہایت ادب سے عرض ہے کہ جس وقت سے حضور والا کی تشریف آوری گورکھپور
میں ہوئی اسی وقت سے یہ گنہگار خدمت والا میں حاضری کا شرف حاصل
کر رہا ہے اور جو بیش بہا موتی آنحضرت اپنے وعظوں میں بکھیرتے ہیں چن چن کر
لاتا ہوں اور حتی الوسع اس سے مستفید ہونے میں مشغول رہتا ہوں۔ احقر
ان احکامات کی بجا آوری میں تسکین اور خوشی محسوس کرتا ہے اور خدا سے دعا
کرتا ہے کہ اسی حالت کو تا زیست حضور کے طفیل سے قائم و برقرار رکھے۔
مجھے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضری سے دو فوائد روز حاصل ہوتے
ہیں اول یہ کہ جتنی دیر نشست ہوتی ہے اتنی دیر عبادت میں گذرتا ہے۔ دوم
یہ کہ نئی بات دین کی معلوم کر کے عمل کرنے کی گدگدی دل میں پیدا ہوتی ہے

بسا اوقات اللہ تعالیٰ سے دست بہ دعا ہوتا ہوں کہ حضور والا کو مدت دراز تک ہم لوگوں میں قائم رکھے ۔ تحقیق : آمین ۔ میں اس دعا کا ممنون ہوں۔

حال :۔ اکثر اس خیال سے بھی کانپ اٹھتا ہوں کہ حضرت ہم لوگوں کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ کو نہ تجویز فرمائیں۔

تحقیق :۔ یہ آپ کی محبت ہے، محبت میں جدائی گوارا نہیں ہوتی

حال :۔ اور یہ دین کا چشمہ جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے گورکھپور میں جاری کر رکھا ہے کسی دوسری جگہ رجوع نہ ہو جائے ۔ میرا یہ خدشہ صحیح بھی ثابت ہوا لیکن خدا کا شکر ہے کہ اللہ رب العزت نے اس چشمۂ فیض کی روانی کو دوسرے شہر کی جانب رُخ کرنے سے روک دیا اور جناب ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب کو (اللہ تعالیٰ انکو اجر عظیم عطا فرمائے) تیار کر دیا کہ وہ گورکھپور کو اسی چشمۂ دین سے سیراب ہونے میں مدد دیں۔ یہ گورکھپور اور اہل گورکھپور کی خوش قسمتی ہے کہ ایسی ہستی جو ہندوستان میں نایاب ہے یہاں قیام پذیر ہے۔

تحقیق :۔ میں آپ کی عقیدت و محبت سے بہت خوش ہوں اور دل سے دعا گو ہوں

حال :۔ میں حضور والا کی شفقت و محبت و عنایت کا تہ دل سے شکر گذار ہوں، مجھکو حضرت نے کہاں سے کہاں پہونچا دیا جس کا احساس مجھی کو ہو سکتا ہے ۔

تحقیق : اور بھی نفع ہوگا

حال :۔ خداوند عالم کی یاد و اتباع سنت و احکامات شرعیہ کا ذوق و شوق ہر وقت دامنگیر رہتا ہے یہ سب حضور کی توجہ کا نتیجہ ہے ۔ تحقیق : اللہ تعالیٰ کا فضل ہے ۔

حال : امید ہے کہ حضرت ایسے ہی خیال فرماتے رہیں گے اور اس گنہگار کو نجات کا راستہ دکھلاتے رہیں گے ۔ تحقیق : ضرور بالضرور

ایک اور طالب کا خط حضرت مصلح الامۃ کے نام

حال : حضرت والا کا قیام گورکھپور بیشک ایک نعمت عظمیٰ تھا جس کا احساس

اب ہو رہا ہے ۔
تحقیق: بیشک اب احساس آپ کو ہوا۔ قدر نعمت بعد زوال ۔
حال: حضرت والا کے جانے کے بعد سے عمل میں کوتاہیاں ہو جایا کرتی ہیں جیسے مشعل راہ ہٹنے کے بعد سے راہ رو کو بھٹک پیدا ہو جاتی ہے ۔ اگر حضرت والا کی دعائیں شامل حال رہیں تو اس ناتواں بازوؤں میں قوت خداداد پیدا ہو سکتی ہے
تحقیق: ۔ دعا کرتا ہوں
حال: ۔ گذرے ہوئے حالات اور کیفیات اور شفقت جب یاد آتی ہے تو اضطرابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے حالانکہ یہ نعمت خلاف امید ملی تھی افسوس کہ ہم لوگوں نے قدر نہ کی، اب اللہ تعالیٰ ارشادعالیہ پر توفیق عمل کی عطا کرے ۔
حال: ۔ ڈیڑھ سال کے قیام گورکھپور میں حضرت والا نے شب و روز احکام خدا و رسول ہم لوگوں تک اتنا پہونچایا کہ اگر عمل کیا جائے تو کافی و وافی ہے تحقیق بیشک
حال: ۔ حضرت والا دعا فرمائیں کہ جن باتوں کو سنا ہے اس پر عمل کی توفیق دیدیں دین کا کام کرتا ہوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں ۔
تحقیق: اللہ تعالیٰ کامیاب فرمائے ۔
حال: ع شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را ۔
ہ ۔ تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را
تحقیق: بھائی یہ کیوں لکھ رہے ہو ۔ سود تو ہوا ہر شخص کو گو کامل نہ ہوا ہو ۔ تو کامل جلدی ہو جاتا ہے ؟

(راقم عرض کرتا ہے کہ حضرت والا کو خط میں بہت سے لوگ یہ شعر لکھتے تھے جس سے مایوسی جھلکتی تھی اور پست ہمتی ٹپکتی تھی حضرت کو یہ مضمون لوگوں کا کبھی بھی پسند نہیں ہوا چنانچہ ان صاحب کو بھی ٹوکا کہ ۔ " بھائی یہ کیوں لکھتے ہو " ۔ مطلب یہ کہ جب سمجھتے ہو کہ کوئی رہبر کامل مل گیا ہے تو اب کس بات کا انتظار ہے اس سے نفع اٹھاؤ ۔ باقی یہ جو اس قسم کی بات لکھتے ہو یہ نفس کا کید اور شیطان کی رہزنی ہے کہ وہ ہمت پست کر کے عمل سے باز رکھنا چاہتا ہے)

اسکے بعد ایک خط حاجی ولی محمد صاحب کا ملاحظہ فرمایئے ۔ حاجی صاحب موصوف مولوی حکیم وصی احمد صاحب کے بڑے بھائی تھے اور حضرت اقدسؒ کے مخلص خدام میں سے تھے ۔ حکیم وصی احمد صاحب کے مکان میں منتقل ہونے میں دخل حاجی صاحب کے تعلق خاص اور انکے اخلاص کو بھی تھا ۔ یہ کئی بھائی تھے اور ان کا بڑا خاندان تھا سب ہی حضرات کم وبیش حضرتؒ کے عقیدت مندوں میں سے تھے ۔ حاجی صاحب موصوف بڑے سیدھے سادے اور بھولے بھالے انسان تھے گورکھپور میں اردو بازار میں عطار کی دوکان تھی اور اس میں شک نہیں کہ حضرت اقدسؒ سے اس ذکی کو دلی محبت تھی ۔ خط ملاحظہ فرمایئے کہ کس طرح چند سادے لفظوں میں اپنے قلبی درد کا اظہار کیا ہے

(خط جناب حاجی ولی محمد صاحب بنام حضرت مصلح الامۃؒ)

حال :۔ مخدومی محترمی جناب حضرت والا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ۔
الحمد للہ کہ خادم خیریت سے ہے حضرت والا کی دعا چاہیئے ۔ حضرت والا کی صحت کے لئے ہملوگ دعا کرتے ہیں ۔ اور خدا تعالےٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت والا کا قدم اور آجائے خدا کے حکم سے ۔ خادم ولی محمد

تحقیق :۔ مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ۔
بھائی صاحب اتنی جلدی گھبرا گئے ، ابھی تو کچھ ٹھیک ہو رہا ہوں ۔ دیکھو بھائی دین کی خدمت کے لئے صحت بہت ضروری ہے اور یہ بغیر اسکی حفاظت کئے نہیں ہو سکتی میں آپ لوگوں کیطرف دل سے متوجہ ہوں برابر خیال لگا رہتا ہے اور میں نے آنے جانے سے کب انکار کیا ہے ۔

آپ میری طرف سے حکیم وصی احمد صاحب سلمہٗ کی اہلیہ سے کہدیجئے کہ تم کیوں رنج میں اپنی صحت خراب کر رہی ہو، کیا اب ملاقات ہو ہی نہیں سکتی ؟ دیکھو تو میں کس طرح آیا مجھے کسقدر تکلیف تھی یہاں آکر اچھا ہو گیا اس سے آپکو اور سب کو خوش ہونا چاہیئے صحت بہت ضروری چیز ہے مجھکو اتنا غم پسند نہیں میرا یہ خط وہ بار بار پڑھیں انکا غم

اسی سے جاتا رہیگا بلکہ یہ خط میرے سب متوسلین کو پڑھکر سنا دیجئے۔ میں سب کے لئے دعا کر رہا ہوں اطمینان رکھیں۔ والسلام۔

وصی اللہ عفی عنہ

ذیل کا ایک اور خط جناب حکیم وجیہ اللہ صاحب کا ہے۔ آپ بھی غالباً اعظم گڈھ کے باشندے تھے گورکھپور میں مطب فرماتے تھے وہاں کے مشہور اطبا میں سے تھے حضرت اقدسؒ سے ملتے تھے لیکن بہت کم۔ دیندار آدمی تھے اور اپنے ہی مسلک کے لوگوں میں سے تھے لیکن رجحان کچھ مودودی خیالات کی جانب بھی تھا اسی لئے ان کا خط پاکر حضرت کو تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی جیسا کہ جواب والا سے ظاہر ہے۔

خط جناب حکیم وجیہ اللہ صاحب بنام مصلح الامۃؒ

حال: — محترم و مولانا السلام مسنون۔ آپ کے بلا علم و اطلاع تشریف لیجانے پر اسلئے اور بھی افسوس رہا کہ نیاز نہیں حاصل کرسکا اور ایک افسوس و مایوسی کا باعث یہ ہوا کہ بعد میں آپ نے گورکھپور چھوڑ دینے اور الہ آباد میں مستقل رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ مولوی غیاث الدین صاحب اور حاجی ولی محمد صاحب سے واپسی پر خیریت مزاج معلوم کرتا رہا۔ بہرحال یہ توقع اور امید ضرور قائم ہے کہ خصوصی اوقات میں اس ناچیز کے لئے بھی عاقبت بخیر ہونے کی دعا فرماتے رہیں گے۔

بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے میں جو فائدہ ہے اس پر پورا پورا یقین رکھنے کے باوجود اپنی بعض معذوریوں کے باعث اسکا حق نہیں ادا کرسکا کاش یہ پہلے سے معلوم ہوتا کہ یہ مواقع تھوڑے سے ہی دنوں کے لئے میسر ہوئے ہیں تو شاید یہ تساہل نہ ہوتا۔ فقط۔

والسلام۔ نیاز کیش حکیم وجیہ اللہ

تحقیق: — محبی و مکرمی زاد اللہ تعالیٰ اخلاصکم و اعزکم اللہ و اکرمکم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہٗ

آپ کا محبت نامہ ملا آپ کے اس تعلق اور محبت کا میرے قلب پر خاص اثر ہوا۔ اس سے پہلے آپ کے تعلق کا اندازہ نہ تھا لیکن آپ کے اس خط سے بیحد متاثر ہوا اور

معلوم ہوا کہ آپ کو مجھ سے اتنا زیادہ تعلق ہے واقعی آپ حضرات کو میری جدائی کا صدمہ اور قلق ہے ۔ لیکن حکیم صاحب میں کرتا کیا دیکھئے میں کس حال میں یہاں آیا ہوں، انتہائی کرب اور تکلیف تھی جس کی وجہ سے سفر پر مجبور ہوا اگر ویسے آجاتا تو آپ حضرات کے لئے بیشک رنج اور افسوس کا موقع تھا مگر میں تو کسی اور ہی حال میں آیا ۔ بہرحال آ ضرور گیا ہوں لیکن آئندہ کے لئے کچھ کہہ نہیں سکتا ۔

رشتہ، در گردنم افگندہ دوست ۔۔۔ می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

(میرے دوست نے تو میرے گلے میں پھندا ڈال رکھا ہے اسی رسی کو کھینچتے ہوئے مجھے جہاں چاہتا ہے لیجاتا ہے)

اہل گورکھپور کی محبت کا مجھ پر اثر ہے ۔ رہا ملاقات کا معاملہ تو یہ کیا مشکل امر ہے ؟ ۔۔۔۔ جب باہم محبت ہے تو محبت ہر چیز کو آسان کر دیتی ہے ۔ والسلام ۔

وصی اللہ عفی عنہ،

(خط جناب ماسٹر واجد علی صاحب بستوی بنام مصلح الامۃ رح)

حال :۔۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ یہاں پہونچنے پر پہلا کام یہی کیا کہ اپنے جملہ دینی بھائیوں کو منشاء گرامی سے مطلع کیا تاکہ رضائے حق کا مورد بنوں ۔ جن جن حضرات سے انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ملاقات ہوتی گئی تشریح و وضاحت کے ساتھ منشاء گرامی کو پیش کرتا رہا ہوں اور انشاء اللہ تعالیٰ عند الملاقات پیش کرتا رہوں گا ۔ **تحقیق :** اللہ تعالیٰ توفیق دے

حال :۔۔ احقر نے بھائیوں کی خدمت میں جو کچھ پیش کیا اسکا خلاصہ حضرت اقدس کیخدمت میں بغرض اصلاح پیش ہے :۔

عرض کیا کہ ہم باشندگانِ گورکھپور پر حق تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ حضرت والا مدظلہ، العالی ہم میں سے ہر ایک سے خوش ہیں اور کسی سے ناراض نہیں ہیں یہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے اسکی ہمکو بجان و دل قدر کرنی چاہیئے ۔ **تحقیق :** بیشک

ہماری بے حسی اور غفلت کا مقتضا تو یہ تھا کہ انجام اسکے برعکس ظہور پذیر ہوتا لیکن قربان جائیے حق تعالیٰ کی اس رأفت اور انعام کے کہ بجائے ناراضگی ہم کو اپنی رحمت کاملہ

سے نوازا ہے ہمارا یہ فرض عین ہے کہ اب سے ہم میں سے ہر ایک اس نعمت عظمٰی کی قدر و شکر اعمال خالص پیش کر کے اور حضرت والا کی مزید خصوصی شفقتوں کو اپنے شامل حال کر کے رحمت الٰہی کا مورد بنے ۔ **تحقیق** :۔ بیشک

حال :۔ یہ بھی عرض کیا کہ حضرت والا مدظلہ العالی کے یکایک الٰہ آباد تشریف لیجانے کا واحد سبب حصول صحت ہے ۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ روز افزوں ترقی کے ساتھ صحت نصیب ہو رہی ہے ۔ ہم طالبان و محبان صادق میں سے ہر ایک کے لئے نہایت مسرت و سجدۂ شکر کا مقام ہے کہ حضرت والا دامت برکاتہم نہایت عافیت و راحت سے ہیں اور لوگ فیضیاب ہو رہے ہیں ہماری مخلصانہ محبت کا مقتضاء یہی ہے کہ حضرت والا مدظلہ العالی کو حق تعالیٰ صحت کاملہ عطا فرمائیں اور اپنا یہ ظل ہم پر قائم و دائم رکھیں

اب ہم میں سے ہر ایک کو چاہیئے کہ انعام خصوصی کی دل سے قدر کریں اور حضرت والا مدظلہ اپنی طویل مدت کے قیام میں شب و روز جو تعلیم اور تربیت دی ہے اس پر اپنے کو مامور کرلیں اور اپنے اعمال پیش کر کے اپنی اپنی اصلاح کریں اور محبوب کی فرقت میں جو تکلیف ہو اس پر صبر کریں اور اپنے اس انعام خصوصی میں اس طرح عمل کر کے اضافہ و ترقی کے طالب صادق بنکر حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کریں ۔ **تحقیق** :۔ بیشک

حال :۔ اگر ہم لوگ اس طرح کام پر لگ جائیں گے تو حضرت اقدس نے فرمایا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر ایک کو رستہ کھلتا نظر آئیگا اور فلاح دارین نصیب ہوگی ۔ حضرت والا بجان و دل دعاء فرمائیں کہ حق تعالیٰ ہم جملہ وابستگان و منتسبین کو منشاء گرامی کے بموجب صدق و اخلاص کے ساتھ کام پر مامور فرمادیں ۔

تحقیق :۔ دل سے دعاء کرتا ہوں یہ مضمون بہت ضروری ادا ہوا ۔

حال :۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ حضور والا کی دلی دعاؤں کی برکت سے اس ناکارہ کو جملہ حرکات و سکنات میں اپنے باطن کی اصلاح کر کے اللہ و رسول اور حضور والا سے تعلق صحیحہ میں رسوخ پیدا کرنے کی فکر و دھن قلب میں جاگزیں ہو رہی ہے ۔ حضرت والا دل سے یہ دعاء فرمادیں کہ اللہ تعالےٰ اپنے خاص فضل و کرم سے اس ناکارہ کے قلب سے مکمل طریقہ سے

غفلت کا ازالہ فرماکر مقصود کی تحصیل میں بامراد فرمادیں۔

مزید خیر و برکات، کام کا مسلمان بننے، جملہ خواطر کو قلب سے نکالنے، ازالۂ غفلت میں بامراد ہونے اور حُسنِ خُلق سے متصف ہونے کی دل سے دعا فرمادیں۔

تحقیق:۔ دعا کرتا ہوں

(راقم عرض کرتا ہے کہ صاحب مکتوب بالا جناب مکرمی ماسٹر واجد علی صاحب بستوی بھی میاں صاحب جارج اسلامیہ کالج گورکھپور میں پڑھاتے تھے وطن تو آپ کا بستی ضلع کا ایک دیہات تھا لیکن عرصہ سے گورکھپور ہی میں قیام رہا۔ پرانے اور معمر لوگوں میں سے تھے اور گورکھپور کے تو سابقین اولین میں سے تھے حضرت والا کے مخصوص لوگوں میں آپکا شمار تھا۔ فتحپور تال نرجا کے اپنے ابتدائی قیام ہی میں دیکھا تھا کہ حضرت والا کے یہاں جب ماسٹر صاحب تشریف لاتے تو خاصا مجمع اہل بستی اور گورکھپور کا آپ کے ہمراہ ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ بستی، دیوریا اور گورکھپور کے بہت سے لوگوں بالخصوص نوجوانوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے دین پر لگنے اور حضرت اقدسؒ سے اصلاحی تعلق کرنے کا ذریعہ ماسٹر صاحب مرحوم ہی ہوئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت نصیب فرمائے اور جزائے خیر عطا فرمائے۔ حضرت والا بھی اپنے زمانۂ قیام گورکھپور میں اہل گورکھپور سے گفتگو کرنے میں واسطہ مولوی امجداللہ صاحب کو بناتے یا پھر ماسٹر صاحب موصوف ہی کو بناتے تھے پنشن ہو جانے کے بعد اپنے وطن بستی ہی میں مستقل طور سے رہنے لگے اور حضرت اقدس کے وصال کے کچھ دنوں بعد حضرت ماسٹر صاحب بھی اپنے شیخ سے جاملے۔ بہت ہی خوب آدمی تھے نہایت فہیم متواضع اور نرم خو انسان تھے اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمادے۔ آمین۔)

(خط جناب حکیم مولوی عبدالحق صاحب بنام مصلح الامۃؒ)

حال:۔ گذارش ہے کہ حضرت والا کے تشریف لیجانے کے بعد گورکھپور میں جیسے خیر و برکت ہی ختم ہوگئی امید ہے کہ حضرت کی تندرستی بہ نسبت گورکھپور کے قیام کے الٰہ آباد میں بہتر ہوگی خاکسار حسنِ عمل وحسنِ خاتمہ کے لئے دعا کا خواہاں ہے۔

تحقیق :۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ تمھارے جانے کے بعد گورکھپور کی خیر و برکت ہی ختم ہوگئی، یہ آپ کا ایمانی احساس ہے۔ اہل ایمان اور اہلِ ادراک کو یہ احساس ہوتا ہے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ خیر و برکت میں برابر ترقی عطا فرمائے اور کبھی ختم نہ ہو۔ آپ حضرات کی محبت وجدائی کا مجھے بھی خیال ہے۔

(دوسرا خط جناب مولوی صاحب موصوف کا بنام حضرت مصلح الامۃ رح)

حال :۔ گذارش ہے کہ عرصہ سے خیال ہو رہا تھا کہ ایک عریضہ خدمت اقدس میں ارسال کروں مگر اپنی تساہلی کی وجہ سے نہ لکھ سکا غالباً جناب عالی کی طبیعت ٹھیک ہوگی۔ ایک شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت نے فرمایا کہ یہاں صحت بھی ٹھیک ہے اور کام بھی خوب ہو رہا ہے۔ تحقیق۔ الحمد للہ ہو رہا ہے۔

حال :۔ حضرت یہ تو گورکھپور والوں کی بدقسمتی ہے کہ مکان کے اندر پاور ہاؤس آجانے کے باوجود اپنے قلوب کو تاریک ہی رکھا اور اس بدقسمتی کی کوئی حد ہے کہ آج بھی مطمئن ہیں۔

تحقیق :۔ جن لوگوں نے روشنی حاصل کی ہے انکا اطمینان دوسرے قسم کا ہے اَلَا بِذِکرِ اللہِ تَطمَئِنُّ القُلوبُ۔ سن لو کہ اللہ تعالیٰ کی یاد ہی سے قلوب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے

حال :۔ اس اطمینان نے مسلمانوں کو تباہ کر ڈالا کہ دینی امور میں ترقی کی کوئی حرص ہی نہیں اور دنیاوی امور میں اسی نسبت سے غیر مطمئن ہیں۔

تحقیق :۔ اطمینان بالدنیا نے بیشک تباہ کر ڈالا مگر سب ایسے نہیں۔

حال :۔ احقر نے ارادہ کیا تھا کہ شوال کی کسی تاریخ میں خدمت اقدس میں حاضری کے لئے سفر کروں گا مگر میری بدقسمتی کہ امام صاحب ایک ماہ کے لئے وطن تشریف لے گئے اور مجھے انکی جگہ پر امامت کا فرض انجام دینا پڑتا ہے۔

مولانا مدنی رح کا وصال ہوا ہے ابتک چین نصیب نہ ہوا، اور یہی حال دنیا کا بھی ہوگیا ہے کہ مطب کا حال بہت خراب ہے مالی حالت بہت سقیم ہوگئی ہے خرچ کا چلانا مشکل ہوگیا ہے

عید کے بعد فوراً حاضر ہو سکتا تھا مگر یہ وجہ بھی مانع ہوئی۔ **تحقیق:** معقول عذر ہے۔

حال:۔ حضرت سے استدعا ہے کہ دعا فرمائیں کہ دینی و دنیاوی دونوں قسم کی راحت نصیب ہو۔ **تحقیق:۔** دل سے دعا کرتا ہوں۔

راقم عرض کرتا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں خطوط جناب مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کے ہیں۔ آپ طبیب بھی تھے اور گورکھپور کی جامع مسجد کے نائب امام بھی تھے حضرت والا کی خدمت میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ جامع مسجد کے امام صاحب بھی حضرت اقدس سے واقف تھے لیکن چونکہ وہ خود بھی مقامی طبیب تھے اسلئے مجلس وغیرہ کے موقع پر تو انھیں کبھی تشریف لاتے دیکھا نہیں۔ یوں وہ بدن کے بھی بھاری تھے اس لئے چلنا پھرنا مشکل ہوتا تھا البتہ حضرت اقدس سے محبت بہت فرماتے تھے۔ حضرت بھی جمعہ کی نماز زیادہ تر جامع مسجد ہی میں پڑھتے تھے، گورکھپور کی جامع مسجد بڑی مسجد ہے جمعہ کے دن بالکل بھر جاتی ہے۔ حضرت والا کے لئے یہ دشواری تھی کہ اگر اندر جگہ لینے کے خیال سے پہلے تشریف لیجاتے تھے تو اپنے مرض اور ضعف کی وجہ سے اتنی دیر تک انتظار کا تحمل مشکل ہوتا اور وقت پر روانہ ہونے پر جگہ ملنی مشکل ہو جاتی اس مجبوری اور معذوری کو معلوم کر کے امام صاحب نے جامع مسجد کے اندر مسجد سے متصل ہی اپنا ایک کمرہ حضرت والا کے لئے خالی فرما دیا تھا حضرت نماز سے ایک دو گھنٹہ قبل تشریف لیجاتے اور اسی میں آرام فرماتے پھر اذان کے بعد وہیں ضروریات سے فراغت فرما کر وضو فرماتے اور جماعت کیوقت بس کمرہ کا دروازہ کھول کر مسجد میں آجاتے اس انتظام کی وجہ سے بڑی ہی سہولت ہو گئی تھی اور حضرت والا کو نہایت ہی آرام ملا۔ نماز کے بعد امام صاحب بھی تشریف لاتے اور حضرت سے ملاقات فرماتے یہی معمول عرصہ تک رہا۔ یہاں کے امام صاحب مولوی فضل اللہ صاحب حضرت مولانا نور محمد صاحبؒ پنجابی کے صاحبزادے تھے جو کہ فتحپور ہسوہ کے مدرسۂ اسلامیہ میں کبھی صدر مدرس رہ چکے تھے اور حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحبؒ گنج مرادآبادی نور اللہ مرقدہٗ کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ اور انھیں مولانا نور محمد صاحبؒ سے ہمارے الہ آباد کے حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ خلیفہ حضرت مولانا تھانویؒ نے اپنے

زمانۂ قیام فتحپور میں مشکوٰۃ شریف سبقاً سبقاً پڑھی تھی۔ غرض امام صاحب جامع مسجد ایک بزرگ کی اولاد تھے اسلئے بھی حضرت والا انکا بہت احترام فرماتے تھے انکھیں امام صاحب کے نائب یہ مولوی حکیم عبدالحق صاحب تھے جنکے خطوط اوپر نقل کئے گئے۔

یہاں جن حضرات کا بھی تذکرہ مستقلاً یا ضمناً ہوا ہے ان کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات تھے جن کو حضرت والا سے خصوصی تعلق بھی تھا یہاں سب کا بیان مقصود نہیں ہے اسلئے صرف چند پر اکتفا کیا گیا کیونکہ بتلانا صرف یہ ہے کہ حضرت والا کے گورکھپور پہونچ جانے پر وہاں کی بھی دینی کھیتی لہلہا اٹھی اور چمن معرفت میں بہار آگئی اطراف و جوانب کے لوگ بھی خوب خوب رجوع ہوئے اور دوسرے مقامات کے حضرات کے لئے بھی حضرت تک رسائی آسان ہوگئی۔ لکھنؤ سے سیدھی ریلوے لائن آنے کی وجہ سے گونڈہ۔ بہرائچ۔ سیتا پور اور خود لکھنؤ سے بھی لوگ زیارت و ملاقات کے لئے آنے لگے۔ ایک دفعہ مولوی محمد منظور صاحب نعمانی تشریف لائے۔ ایک دفعہ مولوی محفوظ الرحمان صاحب نامی بہرائچ سے تشریف لائے۔ ایک دفعہ صدیق حسن صاحب جو غالباً لکھنؤ میں پبلک سروس کمیشن کے ممتاز لوگوں میں سے تھے وہ بھی آئے۔ صدیق حسن صاحب نے واپس جاکر لکھنؤ سے مولوی ثناء اللہ صاحب مرحوم کو اپنے اس سفر کے تاثر کا خط لکھا اس میں یہ بھی لکھا کہ:—

مجھے سب سے زیادہ خصوصی اور نمایاں چیز جو حضرت کے یہاں نظر آئی وہ یہ تھی کہ میں نے وہاں سب ہی حضرات کے چہروں پر ایک سکون اور اطمینان سا دیکھا جو کہ آج کی دنیا میں ہر جگہ مفقود ہے۔

یہ الفاظ راقم کے ہیں مگر مفہوم ان کے کہنے کا یہی تھا۔ حضرت والاؒ نے انکی یہ بات مجلس میں سنائی اور فرمایا کہ انھوں نے جس سکون و طمانینت کو لکھا ہے جانتے ہیں وہ کیا چیز ہے؟ وہ ہے اللہ تعالیٰ سے تعلق کا اثر جو خدا کی جانب سے مومن کو اس دنیا میں عطا ہوتا ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے دل کو سکون حاصل ہوتا ہی پھر جب قلب میں سکون آگیا تو دیگر جوارح تو قلب کے تابع ہی ہوتے ہیں اذا صلحت صلح الجسد کلہ جب قلب درست ہوجاتا ہے تو تمام جسم درست ہوجاتا ہے۔

پس یہاں جو آپ لوگ تھوڑا بہت ذکر وغیرہ کر لیتے ہیں یہ اسی کا اثر ہے جسکو یہ صاحب لکھ رہے ہیں یہ سنا کر فرمایا کہ اس قسم کی بات صرف انھوں نے لکھی ہے یوں آنے کو یہاں بہت لوگ آتے ہیں مگر ایسی بات کسی نے نہیں کہی بات یہ ہے کہ عاقل شخص ہیں کم از کم دنیا کی تو عقل رکھتے ہی ہیں اسلئے اُنکی عقل نے رہنمائی کی اور انکو متوجہ کیا کہ آخر کیا بات ہے کہ آج جبکہ دنیا والے پریشان ہیں یہ لوگ کس دنیا کے لوگ ہیں کہ ان میں سے ہر ایک ہشاش بشاش اور گویا دنیوی افکار سے بیفکر نظر آتا ہے۔

راقم عرض کرتا ہے کہ حضرت اقدس نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ بالکل بجا اور عین صواب ہے لیکن کیا ہم لوگ اور کیا ہمارا ذکر و شغل، بات یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے خود حضرت والاؒ کے قلب مبارک میں تعلق مع اللہ کی وجہ سے جو طمانینت اور سکینہ عطا فرما رکھی تھی پاس والوں پر بھی اسی کا پرتو پڑتا تھا دیکھنے والے سمجھتے تھے کہ یہ سکون انکا ذاتی ہے حالانکہ وہ کسی اور کا مرہون منت ہوتا تھا۔ دھوپ میں پڑے ہوئے آئینہ کو دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ یہ آئینہ خود چمک رہا ہے لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ یہ فیض حضرت شمس کا ہے ؎

مری طلب بھی کسی کے کرم کا صدقہ ہے　　　قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامیؔ سے ناظرین واقف ہی ہوں گے بہرائچ کے مدرسہ نور العلوم سے تعلق تھا کچھ دنوں کے لئے چھوٹی اسمبلی کے پرائیویٹ سکریٹری بھی رہ چکے تھے اسلامی اور قومی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے قرآن کے ترجمہ کیجانب قوم کو متوجہ کیا اس سلسلہ میں ترجمہ قرآن پر آسانی سے واقف ہو جانے کے لئے اور عربی قواعد پر وقوف کے سلسلہ میں کچھ کتابیں بھی تصنیف فرمائی تھیں۔ چنانچہ جس زمانہ میں حضرت اقدسؒ کا قیام وطن ہی میں تھا مولانا نے حضرت والا کو ایک خط بھی لکھا تھا اور اپنے رسائل بھی ارسال فرمائے تھے اس طور پر حضرت والاؒ سے

غائبانہ تعلق مولانا کو پہلے سے تھا' وہ خط اور اسکا جواب ہدیۂ ناظرین ہے۔

مولانا محفوظ الرحمان صاحب نامیؔ کا مکتوب گرامی حضرت مصلح الامۃ رح کے نام

گرامی نامہ کے صدور نے عزت بخشی اور جناب کے مبارک کلمات سے بڑی ہمت افزائی ہوئی مجھے یقین ہوکہ اگر ہمیں آپ جیسے بزرگوں کی رہبری حاصل ہوجائے جو کام کی کوتاہیوں پر تنبہ فرمائیں اور کام کو صحیح معنیٰ میں مفید بنانے کیلئے مشورے عنایت فرمائیں تو بڑے سے بڑا کام ہوسکتا ہے۔ جو نصاب تعلیم اس ناچیز نے تیار کیا ہے اس کا مکمل سٹ خدمت مبارک میں روانہ کررہا ہے انہیں جتنی کوتاہیاں اور فروگذاشتیں ہوں انکا اس ناچیز کو اعتراف ہے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے اس فضل وکرم پر سراپا تشکر ہے کہ اس نصاب کے ذریعہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں ہزاروں مسلمان بچے بچیاں، مرد وعورتیں عربی زبان اور ترجمۂ قرآن سے مناسبت پیدا کررہے ہیں اگر ہر ہر ضلع کے لوگ پوری قوت سے اسکی طرف متوجہ ہوجائیں تو انشاء اللہ چند ہی سال میں اردو ہی کو نہیں بلکہ عربی زبان کو مسلمانوں میں فروغ ہوجائے گا اور اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وحی الٰہی اور تعلیمات نبوی سے استفادہ آسان ہوجائے گا۔ بہرحال دعا اور سرپرستی کا طالب ہوں۔ والسلام

احقر محفوظ الرحمان نامیؔ ۔ ۲۲ ذیقعدہ ۱۳۷۰ھ

حضرت مصلح الامۃ رحمۃ اللہ علیہ کا جواب باصواب

کارڈ پہونچا اور اس کے قبل چھ کتابوں کا مکمل سیٹ۔ کتابیں ماشاء اللہ اپنی افادیت۔ کتابت۔ طباعت اور نفاست میں میرے نزدیک بہت عمدہ اور مرغوب ومطلوب معلوم ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ انکو مفید اور نافع بنائیں۔ اشتہار سے آپ کے عزائم بھی معلوم ہوئے آپ کی حوصلہ مندی سے جی بہت خوش ہوا دل سے

دعا کرتا ہوں کہ آپکا حقیقی مقصد (یعنی قرآن سے مسلمانوں میں مناسبت پیدا کرنا) حاصل ہوجائے اور یہ بات حق تعالیٰ کو کچھ دشوار نہیں وہ تو صرف نیتوں کا خلوص، اپنی کوشش سے صرف نظر اور اسکے بعد صبر و استقلال، بس انھیں چیزوں کو دیکھتے ہیں اسکے بعد انکے یہاں نہ اپنوں کے لئے کوئی تنگی ہے نہ دوسروں کے لئے کُلًّا نُّمِدُّ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (ہم انکی بھی مدد کرتے ہیں اور انکی بھی آپ کے رب کے عطایا کے ساتھ اور آپ کے رب کا عطیہ کسی سے رکا ہوا نہیں ہے) کام کرتے جائیے کام ہوتے اور اسکے نتائج نکلتے دیکھکر خود ہی سب کے دل سے دعائیں نکلیں گی۔ میں نے آپ کی کتاب تو فی الحال اپنی لڑکیوں کو پڑھانا تجویز کیا ہے۔ عملی تجربہ کے بعد کوئی بات قابل ذکر سمجھ میں آئیگی تو انشاء اللہ لکھوں گا۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہ۔ یکم ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ

مولانا نامی رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت والا کی یہ مکاتبت بہ زمانۂ قیام وطن ہوئی تھی اس غائبانہ تعارف کے بعد گورکھپور کے زمانۂ قیام میں مولانا نامی حضرت کے یہاں تشریف لائے اور ملاقات کا بھی موقع ملا اور مجلس میں بھی شرکت کی اور حضرت اقدس سے ملکر بہت محظوظ ہوئے۔

وطن میں پیش آنے والے حالات کی مصلحت اب سمجھ میں آئی کہ اللہ تعالیٰ کو اس طرح سے حضرت کے فیض کو عام کرنا تھا چنانچہ عسیٰ ان تکرھوا شیئًا و ھو خیر لکم (یعنی ہو سکتا ہے کہ تم کسی کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے حق میں بہتر ہو) کی تفسیر سمجھ میں آگئی چنانچہ آپ نے بھی گذشتہ سطور کے خطوط سے اندازہ فرمالیا ہوگا کہ اہل گورکھپور نے بھی حضرت والا سے کیسا کیسا فیض اٹھایا اور کس درجہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی محبت لوگوں کے قلوب میں پیوست ہوگئی تھی جس کا ظہور حضرت کی جدائی کے بعد ہوا نیز پہلے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ وطن ہی میں حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ نے اصالۃً اپنے

ہر دو عزیز جناب قاری محمد مبین صاحب مدظلہ اور مولوی قمرالزماں سلمہٗ کو خود ہی پڑھانا شروع کر دیا تھا چنانچہ اس سلسلہ میں خود حضرت اقدسؒ سے سنا یہ فرماتے تھے کہ سہارن پور اور دیو بند سے فارغ ہو کر جو مولوی صاحبان میرے پاس آئے تو کبھی کسی موقع پر کتاب سے کوئی مضمون نکلوانے یا کبھی کچھ عبارت پڑھوانے کی ضرورت پیش آئی تو انکو نہایت ہی کم استعداد بلکہ بد استعداد تک پایا اس سے میں نے سمجھا کہ اب ان مدارس میں بھی تعلیم اطمینان بخش نہیں ہو رہی ہے کہیں سیاست کے شمول نے طلبہ کو علم دین سے ہٹا دیا کہیں تعداد طلبہ بڑھ جانے کے سبب طلبہ کی نگرانی جیسی ہونی چاہیئے ہو نہیں پا رہی ہے اسلئے انکی علمی استعداد کمزور ہوتی جارہی ہے یہ منظر دیکھکر میں نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ اپنے ان بچوں کو کہیں باہر تعلیم کے لئے نہیں بھیجوں گا بلکہ خود ہی انکو تعلیم بھی دوں گا اور انکی تربیت بھی کرونگا اور کبھی اسی سلسلہ میں بطور تحسر یہ بھی فرماتے کہ مجھے ان مدارس سے بھی اس قدر علم کے ضیاع کا اندیشہ نہیں تھا ورنہ شاید میں اب سے بہت پہلے اپنے یہاں تعلیم و تعلم کا کچھ سلسلہ جاری کئے ہوتا اور اگر بڑے پیمانہ پر نہ سہی تو دو چار دس کو تو پڑھا ہی دیتا۔ اس خیال کے تحت حضرتؒ نے اپنے دونوں بچوں یعنی داماودں کو کہیں باہر جانے نہیں دیا بلکہ خود ہی پڑھایا۔ پھر جب اسباق ہونے لگے تو قرب وجوار کے کچھ طلبہ اور بھی آکر شریک ہو گئے۔ حتیٰ کہ فارغ التحصیل جو مولوی صاحبان حضرت سے متعلق ہوتے وہ بھی اپنے زمانۂ قیام میں اجازت لیکر درس میں بھی شریک ہو جاتے اور جو اہل علم خانقاہ میں مستقلاً مقیم تھے ان کے لئے تو شرکت درس لازم ہی تھی۔ چنانچہ کوپا گنج کے حکیم مولوی بشیرالدین صاحب۔ مولوی نثار احمد صاحب۔ مولوی عبدالرؤف صاحب۔ مولوی محمد صاحب۔ مولوی ابوالحسنات صاحب۔ گھوسی کے مولوی وقار احمد صاحب مرحوم اور ان کے برادرِ خورد مولوی عمار احمد سلمہٗ۔ جون پور کے مولانا عبدالحلیم صاحب مدظلہ اور مولوی محمد حنیف صاحب۔ اسی طرح سے یہ ناکارہ عبدالرحمٰن جامی اور اس کے برادرِ خورد مولوی عبدالعلیم عیسیٰ سلمہٗ۔ نیز مئو سے آکر مولانا ریاست علی صاحب مدظلہ

مفتی نظام الدین صاحب مدظلہ۔ مولانا محمد امین صاحب مرحوم اور انکے علاوہ اور دوسرے بہت سے حضرات وقتاً فوقتاً شریک درس ہوتے رہے اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق سب ہی حضرات نے حضرت والا سے علاوہ مدرسہ کے علم کے مزید علمی اخذ فیض کیا۔ چنانچہ بلا کسی تصنع اور مبالغہ کے عرض کرتا ہوں کہ اس ہیچمداں کو جو کچھ آیا وہ سب حضرت اقدس ہی کے فیض کا صدقہ ہے۔ جسطرح سے کہ علم طب کے طلبہ طبیہ کالج میں طب پڑھتے ہیں لیکن ان کے اس علم کا اجراء کسی حاذق طبیب کے مطب میں شرکت کے بعد ہی ہوتا ہے اسی طرح مذکورہ بالا تمام علماء کیجانب سے کہتا ہوں کہ سب نے مختلف مدرسوں میں پڑھا پڑھایا ضرور تھا لیکن حضرت اقدسؒ نے ہم سب کو تحقیقی علم سے روشناس کرایا۔ اور کسی مسئلہ کی تحقیق اور کسی تحقیق کا ریسرچ علمی کیونکر کیا جاتا ہے یہ حضرت ہی نے سب کو سکھلایا اس میں دو رائے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کیجانب سے حضرت اقدسؒ کو جزائے خیر عطا فرمائے اور حضرت والا کی آرام گاہ کو نور سے بھردے۔ ہم نالائقوں کو کسی لائق بنانے کے لئے بلاشبہ حضرت والا نے بڑا تعب اور بہت ہی مشقت اٹھائی۔ حضرت اقدس کا یہ احسان فراموش نہیں کیا جا سکتا اور حضرت والا کے اس احسان سے ہم لوگ تا زندگی عہدہ برآ نہیں ہوسکتے، اسکا منکر ہوجانا تو بجائے خود رہا اسکو بھلا دینا بھی ظلم عظیم ہی ہے۔ بہرحال تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ حضرتؒ کے وطن سے گورکھپور منتقل ہوجانے کے بعد گورکھپور میں بھی بدستور قائم رہا۔

یہاں ناظرین پر یہ امر بھی مخفی نہ رہے کہ حضرت اقدس کا یہ مدرسہ جو بہت ہی مختصر اور نہایت ہی محدود اور گویا خانقاہ کے زیر سایہ ہی قائم تھا اس کے وجود میں آنے کا اولین سبب حضرت اقدس کی اولاد یعنی حضرت کے داماد ہی بنے جن میں سب سے پہلا نمبر حضرت مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب دام مجدہٗ ہی کا تھا۔ چنانچہ حضرت اقدس کے تعلیمی اور اس سلسلہ کے سب سے پہلے سبق اور سب سے آخری سبق ہر ایک میں محب مکرم جناب قاری محمد مبین صاحب دام مجدہم شریک رہے اور دوسرے حضرات تو

بعد میں آتے گئے اور بہرہ یاب ہوتے گئے۔ پس کس قدر ظلم کیا ہے اس سوانح نگار نے جس نے حضرت اقدس کے شاگردوں کی گنتی میں حضرت قاری صاحب جیسے اولین و آخرین شاگرد کو شمار ہی نہیں کیا۔ رہی یہ بات کہ تحصیل علم کے بعد انکا کسی مدرسہ سے تعلیم و تعلم کا تعلق نہیں دیکھا گیا تو یہ تو کوئی وجہ عدم شمار کی ہو نہیں سکتی تھی بہت سے حضرات دیوبند سے فارغ ہوئے اور علاوہ تعلیم و تعلم کے دیگر مشاغل میں لگے اور مشہور ہوئے آج دیوبند کے فارغین میں انکا نام بھی موجود ہے چنانچہ حضرت قاری محمد مبین صاحب مدظلہ کا اگر علمی اور تعلیمی کام کسی پر مخفی بھی رہا ہو تو حضرت نور اللہ مرقدہ کا جانشین ہونا۔ حضرتؒ کی خانقاہ کا متولی ہونا اور حضرتؒ کے مدرسہ کا مہتمم ہونا تو کوئی پوشیدہ بات نہ تھی پھر جہاں حضرت والا کا ذکر آئے وہاں اس جیسے متعلق کو کیونکر بھلایا جا سکتا ہے۔ اب اگر اس عدم ذکر کا منشار لاعلمی اور عدم واقفیت ہوئی ہو تو اللہ تعالےٰ معاف فرمائے اور اگر کوئی غلط جذبہ اسکا باعث بنا ہو تو حضرت اقدس کے متبعین تو اس حق تلفی کو معاف نہیں کر سکتے۔ اتنی بڑی غلطی اور ایسی زبردست بھول کا پیش آجانا محض تعجب ہی کی بات ہے بقول قائل ؎

فان کنت لاتدری فتلک مصیبۃ   وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

(تم اگر حقیقت حال سے ہی ناواقف تھے تو خیر یہ بھی ایک مصیبت ہی تھی اور اگر واقف تھے تب تو وہ مصیبت دوچند ہو گئی)۔ اور میں اس موقع پر حضرت قاری صاحب مدظلہ کی جانب سے یہ کہتا ہوں وافوض امری الی اللہ واللہ بصیر بالعباد اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں سے (اور ان کے احوال سے) باخبر ہیں۔ خیر یہ گفتگو تو حضرت والا کے تعلیم و تدریس کے سلسلہ میں آگئی عرض یہ کر رہا تھا کہ گورکھپور میں بھی یہ سلسلہ باقی رہا۔

اللہ تعالیٰ نے اس عالم میں چونکہ خیر و شر دونوں کو توأم بنایا ہے چنانچہ جہاں پھول ہوتے ہیں وہیں کانٹے بھی ہوتے ہیں جہاں خزانہ ہوتا ہے وہیں سانپ بھی ہوتا ہے۔ جہاں حق ہوتا ہے وہاں باطل بھی ہوتا ہے۔ جہاں کوئی بڑا ولی ہوتا ہے

وہیں بڑا شیطان بھی ہوتا ہے اسلئے یہاں گورکھپور میں بھی اسکا ہونا ناگزیر تھا ابھی وطن میں اسکا نمونہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ دین کا کام کیسے سکون و اطمینان کے ساتھ ہو رہا تھا اور آن کی آن میں معاملہ کیا سے کیا ہوگیا ۔ تقریباً اسی نوع کا ایک واقعہ یہاں بھی پیش آیا ۔

تفصیل اسکی یہ ہے کہ جب حضرت والاؒ کا فیض عام ہوا اور شہر کے ہر ہر گوشہ سے لوگ مجلس والا میں آنے لگے اور یہ کوئی سالانہ یا ماہانہ جلسہ نہ تھا بلکہ روزانہ کا ایک معمول تھا تو اسکی اطلاع اہل بدعت میں بھی پہونچی اب آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ ان مبتدعین پر کیا گذر گئی ہوگئی ؟ پوری جماعت میں اس نور حق کو بجھانے کے سلسلے میں مشورے ہونے لگے اور تدبیر سوچی جانے لگی یہ سمجھتے تھے کہ نہ حضرت والا کیطرح مجلس کیجا سکتی ہے اور نہ ویسا باا ثر وعظ کہنا کسی کے بس کی بات ہے، نہ حضرتؒ کا مزاج مناظرہ کا تھا کہ اسی کو میدان جنگ بنایا جاتا اس لئے دماغ عاجز تھے کہ پھر انکے ساتھ کس طرح سے مقابلہ کیا جائے ؟ بالآخر شیطان نے جو سب اہل اہوار کا گرو گھنٹال ہے ایک تدبیر یہ سمجھائی کہ انکو معاذ اللہ دنیا دار اور امراء پرست پیر مشہور کرو وہ اپنے سے اس الزام و بہتان کو دفع کرنے کے لئے یہ کوٹھی ترک کر دیں گے اور ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ جسقدر لاؤ لشکر جمع ہے ان سب کے قیام کے لئے کوئی دوسری جگہ ملے گی نہیں اسلئے یہ کہیں اور جا کر بسیں گے اور ہم لوگ ان سے نجات پا جائیں گے

یہ اسکیم بنا کر ان رقیبوں نے مکرمی مولوی ثناء اللہ صاحب مرحوم اور عم محترم جناب مولوی امجد اللہ صاحب مرحوم کے "اقارب" میں نظر دوڑائی کہ کون ان میں سے ان کے لئے "عقارب" کا کام کر سکتا ہے چنانچہ تلاش کر ہی لیا اور پھر اس کے بعد جب رقیب اور اقارب کا گٹھ جوڑ ہوگیا تو وہی کھیل کھیلا گیا جو اہل باطل بالعموم اہل حق کے مقابلہ میں کھیلا کرتے ہیں یعنی گمنام خطا اور گمنام پوسٹر کا سلسلہ شروع کیا گیا جس میں یہ ظاہر کیا گیا کہ حضرتؒ کا قیام یہاں گورکھپور میں صرف مولوی ثناء اللہ صاحب اور مولوی امجد اللہ صاحب کے رحم و کرم پر ہے یہی لوگ انکا سہارا ہیں اور انھیں کا

مکان انکا آشیانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سب حرکات سے ان دونوں حضرات یعنی مولوی نثار اللہ صاحب اور مولوی امجد اللہ صاحب) کا دور کا بھی تعلق نہیں تھا یہ دونوں حضرات اور ان کے قریبی اعزہ بالکل بے قصور اور اہل شہر اور اہل شہر کی ان اسکیموں سے قطعی ناواقف تھے۔ بہر حال اسی سلسلہ کی ایک تحریر حضرت والا کی نظر سے گذری کھلی ہوئی بات ہے کہ اب ایسے موقع پر حضرت والا جیسے حساس اور غیرت مند کیلئے اسکے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہ تھا کہ وہ اپنا ظاہری تعلق اس گھر اور اس گھرانہ سے منقطع کرلیں تاکہ معاندین اور تمام اہل شہر یہ سمجھ لیں کہ ان حضرات (یعنی گورکھپور کے رؤسا) پر حضرت کے قیام کا دار و مدار نہیں ہے ان سے اور ان کے مکان سے بے تعلق ہوکر بھی حضرت گورکھپور میں قیام فرما سکتے ہیں اس طور پر مخالفین کا خیال یکسر غلط ہو جائیگا اور وہ لوگ اپنے خیال کی تردید کیوجہ سے نہایت درجہ ذلیل و خوار ہوں گے۔ پس تبدل مکان سے حضرت والا کا مقصد ان رقیب و قریب کو انکی اسکیم میں رسوا و ذلیل کرنا تھا نہ کہ معاذ اللہ اپنے ان دونوں محسنوں (مولوی نثار اللہ صاحب اور مولوی امجد اللہ صاحب) کو رسوا کرنا۔

وہی فہم کا پھیر اور تعبیر کی غلطی یہاں بھی بعض حضرات سے واقع ہوگئی کہ انھوں نے اس واقعہ کو اس طرح سے بیان کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا ان دونوں رؤسا گورکھپور (مولوی نثار اللہ و مولوی امجد اللہ صاحب) ہی سے ناراض ہوگئے اور گویا اس سلسلہ میں جو تکلیف حضرت کو پہونچی اسکا سبب ہی یہی لوگ تھے۔ حاشا وکلا ایسا نہیں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنا بچہ باہر جاکر محلہ کے لڑکوں سے پٹ کر آتا ہے تو شریف باپ اسی کو دو طمانچہ اور رسید کرتا ہے حالانکہ وہ مظلوم اور بقصور ہوتا ہے یہ محض اس کی اصلاح و تربیت کے طور پر ہوتا ہے نہ کہ مجرمانہ سزا کے طور پر۔ یہی یہاں ہوا یعنی حضرت والا اس واقعہ کے پیش آنے پر اپنے ان ہر دو مخلص خدام پر بھی خفا ہوئے یہ صحیح ہے لیکن وہ خفگی بطور تنبیہ کے تھی کہ تم لوگ یہاں اتنے دنوں سے رہتے ہو اپنے اور پرائے سب کے مزاج سے واقف ہو تم نے حالات کا جائزہ کیوں نہیں لیا اور کیوں ایسے مغفل رہے۔

بہرحال اس تحریر کو ملاحظہ فرمانے کے بعد حضرت والا سنے طے تو یہی فرمالیا کہ
کہ مجھے اب اس گھر میں رہنا نہیں ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اتنے سارے لوگوں کو
لیکر کہاں تشریف لیجاتے اسلئے احباب سے صلاح ومشورہ کرنے میں چند دن
اور گذر گئے مشورہ میں مولوی نثاراللہ صاحب بھی ہوتے مولوی امجداللہ صاحب بھی
ہوتے ان کے علاوہ ماسٹر واجدعلی صاحب، مولوی تشکیل صاحب عباسی، مولوی
عبدالحنان صاحب مولوی افتخارالحق صاحب مولوی وصی الدین صاحب، اور
ذکی اللہ بھائی جوان دنوں وہاں موجود تھے اور ان کے علاوہ چند مخصوص حضرات
سے مشورہ فرمایا۔ یہ بھی طے تھا کہ جلد سے جلد اس جگہ کو چھوڑنا ہے اور یہ بھی ذہن
میں تھا کہ ایسی کوئی بھدی شکل نہ ہونا چاہیئے جس سے ان شرفاء گورکھپور کی اپنے
عزیزوں یا دوسرے لوگوں میں کچھ رسوائی یا خفت ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑا مسئلہ
تھا چنانچہ حضرت کی خدمت میں آنے جانے والوں میں سے حکیم مولوی وصی احمد صاحب
بھی تھے اور ان کے برادر بزرگ حاجی ولی محمد صاحب تو آپ کے مرید ہی تھے
ان حضرات کا مکان اسی محلہ میں تھا اور بہت قریب تھا ان سے بھی صورت حال کا
ذکر آیا لیکن ایک محتاج، عاجز، بے بس اور غریب الوطن ہونے کی حیثیت سے نہیں
بلکہ ایک مخلص دوست اور ایک مرید سعید ہونے کی حیثیت سے۔ یوں ہونے کو
تو گورکھپور میں حضرتؒ کے جاں نثار خدام بہت موجود تھے لیکن حضرت والاؒ نے حکیم وصی احمد
صاحب کے مکان کو اپنی منتقلی کے لئے اسلئے بھی تجویز کیا کہ وہ یہیں چند مکانوں کے
بعد ہی تھا لوگ نہایت خاموشی کے ساتھ وہاں جا سکتے تھے نہ شہر میں کہیں شور
ہوتا نہ تذکرہ اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ حکیم صاحب موصوف گو اپنے گھر کے کھاتے
پیتے آدمی تھے لیکن ظاہر حال یہی تھا کہ ان رؤسا گورکھپور کے مقابلہ میں ایسے ہی
تھے جیسے ہاتھی کے مقابلہ میں چیونٹی (غالب گمان یہی ہے کہ حکیم صاحب کو بھی
اسکا اعتراف ہوگا اور وہ اس تمثیل کو ناگوار نہ جانیں گے) تو حضرت اقدس اہل گورکھپور
کو یہ بھی دکھلا دینا چاہتے تھے کہ ہم جیسے فقیروں کی نظر میں شاہ وگدا سب یکساں ہیں

تم لوگ جو یہ سمجھ رہے ہو کہ ہماری پیری ان افراد کی ممنون کرم ہے اور ہم بھی گویا ایک دنیادار پیر ہیں تو تمھارا یہ خیال صحیح نہیں دنیاداری کی یہ عینک خود تمھاری آنکھوں پر لگی ہوئی ہے جس سے تم بھی ہمیں ایسا ہی دیکھ رہے ہو، ہمارے قیام کے لئے مولوی نثار اللہ صاحب کی کوٹھی اور حکیم وصی احمد کی جھونپڑی دونوں برابر ہیں پس تمھارا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا۔ حضرت اقدس کے ہر ہر قول اور ہر ہر فعل میں کیا کیا حکمتیں ہوتی تھیں اسکو تو حضرت ہی سمجھتے تھے یا پاس رہا ہوا کوئی خادم سمجھ سکتا تھا دوسروں کے لئے انکا سمجھنا واقعی دشوار ہوتا تھا

ذکی اللہ بھائی نے مجھ سے بیان کیا کہ میں تو اسوقت گورکھپور ہی میں تھا جب حضرت والاؒ حکیم وصی احمد صاحب کے مکان میں منتقل ہوئے ہیں اور اس گفتگو میں واسطہ رہا ہوں جو حضرتؒ نے حکیم وصی احمد صاحب سے فرمائی، حکیم وصی احمد صاحب نے چونکہ ابتدا میں حضرت سے کچھ پڑھا بھی تھا اور بچپنے میں جبکہ چھوٹے بچے تھے حضرتؒ کے گھر میں بھی جایا کرتے تھے اس لئے ان سے قدیمی اور بے تکلفی کے تعلقات بھی تھے صاحبزادیاں بھی ان سے واقف تھیں اور انکا مکان مولوی نثار اللہ صاحب کے مکان سے بہت قریب بھی تھا اسلئے حضرت نے مجھے حکیم وصی احمد صاحب کے پاس بھیجا اور یہ فرمایا کہ ان سے جاکر کہو کہ اگر میں تمھارے مکان میں آجاؤں تو کیسا ہے؟ حکیم صاحب نے اس کے جواب میں کہلا بھیجا کہ حضرت اس سے بڑھکر ہمارے لئے کیا سعادت ہوسکتی ہے کہ حضرت کے قدم میرے غریب خانہ پر پہونچ جائیں پھر حضرت خود بھی ان کے یہاں کسی وقت تشریف لے گئے اور فرمایا کہ مجھے کہاں ٹھہراؤ گے انھوں نے اپنا مکان دکھلاتے ہوئے عرض کیا کہ یہاں اس کمرہ میں حضرت کا قیام رہے گا اور وہ کمرہ ہے اس میں مہمان حضرات ٹھہریں گے اور اندر کا حصہ خالی کردونگا اس میں بہنیں آجائیں گی میں اپنے بھائی صاحب کے مکان میں منتقل ہو جاؤنگا۔ حضرت والا نے اندازہ فرمالیا کہ یہ جگہ کافی ہو جائیگی تو پھر میرے واسطہ سے حکیم صاحب کے پاس کہلا بھیجا کہ مجھے بلا تو رہے ہو لیکن اگر ان لوگوں نے (یعنی مولوی نثار اللہ صاحب اور مولوی

امجد اللہ صاحب نے اس سلسلہ میں کچھ کہا سنا تو ان سے ڈر تو نہ جاؤ گے (یہ بات حضرت اقدس نے حکیم صاحب کے عزم کی پختگی اور بعض حالات کے پیش نظر فرمائی) کیونکہ یہ دونوں حضرات بڑے لوگ تھے حضرت کو خیال ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دونوں حضرات حکیم صاحب سے کچھ کہیں اور ان پر زور ڈالیں تو کہیں ایسا تو نہیں کہ حکیم صاحب ان سے مرعوب ہو جائیں اور ہم لوگوں کو ٹھہرا لینے پر افسوس کریں اسلئے حضرتؒ نے انکی پختگی معلوم کرنے کیلئے یہ سوال فرمایا۔ اس پر حکیم صاحب نے اپنی پختگی ظاہر کی اور کہا کہ حضرت کی خوشی کے مقابلہ میں کسی کی بھی پروانہ کروں گا اور ادھر کی دنیا چاہے ادھر ہو جائے اس سے ہٹنے والا نہیں۔ حضرت والا نے فرمایا بس میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا اسکے بعد حضرتؒ ایک دن شام کو خاموشی سے منتقل ہو گئے۔ یہ صورت ہوئی یہاں منتقلی کی اور خدا تعالیٰ کی جانب سے یہ شرف مقدر تھا حکیم صاحب موصوف کے لئے انکو ملا ورنہ حضرت کچھ بے بسی اور لاچاری کے طور پر یہاں نہیں تشریف لائے اگر کسی کا ایسا خیال ہے تو غلط ہے۔ باقی اس میں شک نہیں کہ مولوی نثار اللہ و مولوی امجد اللہ صاحب کی طرح حکیم وصی احمد صاحب کا بھی ہم سب خدام پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے حضرت والاؒ کے علاوہ ہم سب کیلئے بھی اپنے یہاں قیام کی جگہ نکالی خود تکلیف اٹھائی اور مہمانوں کو آرام سے رکھا لیکن حضرت اقدس کے متعلق تو یہی سمجھنا چاہیئے کہ ؎

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی — منت شناس ازو کہ بخدمت گذاشتت

شاہ کی کوئی خدمت کر کے اس پر احسان نہ رکھو بلکہ خود اس کے احسان مند رہو کہ اس نے تم سے یہ کام لے لیا۔ اور حضرت والاؒ کے مزاج میں چونکہ تواضع حد درجہ کی تھی اسلئے وہ اپنوں سے بھی اسی انداز کی گفتگو کرتے تھے چہ جائیکہ دوسروں کیسا تھ۔ حضرت نے متعدد موقعوں پر اپنے کسی خادم سے فرمایا کہ میں یہاں تمھاری ہی وجہ سے آیا ہوں اب کام کرنا ہوگا ظاہر ہے کہ فی الواقع وہی صاحب سبب سفر نہ ہوتے لیکن محبت اور شفقت کا اظہار کبھی کسی سے یوں بھی فرماتے تو یہ اسکے لئے سبب انکسار و

ممنونیت ہونا چاہیئے نہ کہ سبب فخر و مباہات لیکن دنیا میں چونکہ ہر قسم کے لوگ رہتے اس لئے کسی کسی نے اس قسم کے عنوان سے ناجائز فائدہ بھی اُٹھایا اور یہ اعلان کردیا کہ میں حضرت کا مجاز ہوں حضرت نے میرے متعلق فلاں موقع پر ایسا ایسا فرمایا تھا اگرچہ ان صاحب کا یہ اعلان لوگوں کی نظروں میں کچھ زیادہ وقیع ہوا نہیں تاہم انکا نفس تو خوش ہو ہی گیا۔

بہرنوع حکیم وصی احمد صاحب نے بھی حضرت والا کو آرام پہونچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور ان کے برادر معظم حاجی ولی محمد صاحب تو ہر وقت حضرت والا کے اشارۂ چشم کے گویا منتظر ہی رہتے تھے ان کے علاوہ حکیم صاحب کے اور دوسرے عزیزان گرامی نے بھی سب کے ساتھ قلبی تعاون کیا ——— اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو انکی کوششوں اور کاوشوں کا صلہ مرحمت فرمائے۔

(حضرت مصلح الامۃؒ کی علالت اور سفر الہ آباد)

حضرت اقدس کو تحریک نزلہ کی شکایت تو وطن میں بھی اکثر رہا کرتی تھی ایک بالشت لانبی اور ایک ہی بالشت چوڑی مختلف رنگوں کی گورکھپوری تولیوں کو تو کبھی کبھی درجنوں الگنی پر لٹکا ہوا دیکھا ذرا ٹھنڈی ہوا سر میں لگی یا ناک کے راستہ دماغ میں پہونچی کہ مسلسل چھینکیں آنی شروع ہوجاتیں پھر دو چار نہیں بلکہ دس بیس تک کی نوبت آجاتی اور ناک سے ریزش شروع ہوجاتی پھر کیا یکے بعد دیگرے چار چھ کپڑے تر ہوجاتے ناک کا کنارہ چھل نہ جائے اس خیال سے کبھی کبھی حضرت والا اپنے بڑے رومال کے ایک گوشہ میں جسکو کاندھے پر رکھنے کا معمول تھا ململ کا چھوٹا سا ٹکڑا باندھ لیتے تھے تاکہ بوقت ریزش اسی سے کام لے لیا جائے اور بڑا رومال ملوث نہ ہو ایک ٹکڑا گندہ ہوجاتا تو اسکو بدلکر دوسرا باندھ دیا جاتا اسی کو دیکھکر غالباً کسی نے گورکھپور سے چھوٹی چھوٹی تولیہ درجنوں بھیجدی تھیں۔ اس نزلہ کا سبب کیا تھا؟ عام طور سے اطباء وطن ظاہری اور عام نزلہ و زکام کے سبب کی جانب جاتے تھے اور اسی کے مطابق دوا تجویز کرتے تھے

راقم نے خود دیکھا کہ واقعی جیسا کہ حکیم صاحبان کا قدح مشہور ہے حضرت والا مسلسل بنفشہ اور اطبار حاضرالوقت کا تجویز کردہ جوشاندہ برابر پیتے رہتے تھے لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ کچھ فائدہ نہ ہوتا۔ اسی زمانہ میں ٹھنڈک کے اثر سے بچانے کے لئے حضرت کے بالکل خلاف مزاج مصلحین نے ٹھنڈا کیا ہوا تازہ پانی بھی روک دیا گنگنا پانی پلایا چنانچہ حضرت والا نے مہینوں ٹھنڈا پانی پیا ہی نہیں۔ حضرت اقدس خود فرمایا کرتے تھے کہ میں بھی برابر سوچتا رہتا تھا کہ آخر اس نزلہ کا سبب کیا ہے کیونکہ ٹھنڈک ہی سے ایسا نہ ہوتا تھا بلکہ کبھی گرمی۔ سے بھی تحریک شروع ہو جاتی تھی خود فرماتے تھے کہ دیکھئے ذرا سا رومال کان اور سر سے اُتارا تھا تو چھینک آنے لگی پھر گرم رومال سر پر لپیٹ لیا تو بند ہوگئی لیکن ایسا ہمیشہ نہ ہوتا تھا بلکہ ایسا بھی ہوتا کہ رومال گرم چادر سب لپیٹے ہوئے ہیں اور چھینکیں آنی شروع ہوگئیں ناک سے ریزش اور آنکھ سے پانی جاری ہوگیا حتیٰ کہ آنکھ بالکل سرخ ہو جاتی اس حالت میں حضرت والا گھبرا کر چادر بھی جسم پر سے ہٹا دیتے اور رومال کو بھی سر پر سے کھول دیتے حتیٰ کہ کبھی کبھی گرم ٹوپی بھی اتار دیتے بس ایسا کرتے ہی چھینک آنی بند ہو جاتی تو فرماتے تھے کہ متضاد قسم کے اسباب ہوتے ہیں کبھی سردی سبب بن جاتی ہے تحریک کا اور کبھی گرمی بھی محرک نزلہ بن جاتی ہے اب ایسے مریض کا علاج ہو تو کیونکر ہو۔ چنانچہ وطن میں حکیم بشیرالدین صاحب، حکیم نثار احمد صاحب اور ان کے والد جناب حکیم محمد شفیع صاحب، حکیم رمضان صاحب حکیم حفیظ اللہ صاحب حکیم بدیع الزماں عطائی طبیب مئو کے حکیم حبیب اللہ صاحب اور حکیم سعد اللہ صاحب اور باہر کے آنیوالے حضرات میں سے ڈاکٹر محمد غفران صاحب حکیم ظہیر الدین صاحب وغیرہ کس کس کا علاج حضرت نے نہیں کیا لیکن اس مرض سے کلی افاقہ نہیں ہونا تھا نہ ہوا بالآخر الہ آباد کے لوگوں کی جب آمد و رفت شروع ہوئی تو کسی نے یہاں کے حاذق طبیب جناب حکیم مولانا شاہ فخرالدین صاحب جعفری کا تذکرہ کیا حضرت والا نے بطور تجربہ کے الہ آباد تشریف لانا اور ان سے علاج کرانا منظور فرمایا چنانچہ پہلا سفر الہ آباد کا حضرت والا نے اپنے وقت میں بسلسلہ علاج یہی فرمایا۔ یوں فرماتے

تھے کہ جب یہاں حضرت خواجہ عزیزالحسن صاحب انسپکٹر آف اسکول کی جگہ پر تھے اور ان وقت
میں الہ آباد ایکبار اور آچکا ہوں مگر وہ دوسرا دور تھا ۔ غرض الہ آباد تشریف لائے
اور حاجی عبدالوحید صاحب کے مدرسہ قرآنیہ حسن منزل میں قیام فرمایا جسکی مفصل
روداد تو حالات الہ آباد میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے ۔ مختصر یہ کہ حکیم فخر صاحبؒ کو نبض
دکھلائی حکیم صاحب موصوف نے اس زمانہ کے لحاظ سے غالباً سو روپیہ کا ایک نسخہ
تجویز فرمایا جو حجریات پر مشتمل تھا اور مشک و زعفران وغیرہ کا بھی جزو اسمیں
شامل تھا دوا مختصر سی تھی لیکن نہایت خوشگوار لطیف خوشبودار اور مزیدار ہوتی
تھی ۔ چمچہ میں لیکر اسکی پہلی خوراک جب حضرت کو کھلائی گئی اسی وقت حضرت اقدس
نے فرمایا کہ بین طور پر محسوس کر رہا ہوں کہ اس دوا سے نفع ہوگا انشاء اللہ تعالےٰ سے لے
زبان پر رکھتے ہی جیسے دماغ کی گرہ سی کھل گئی ۔ اسکے بعد غالباً حکیم بشیرالدین صاحب
سے فرمایا کہ مولوی بشیر کہو تو کہدوں مکرر فرمایا کہ نہیں واقعی اگر تم برا نہ مانو تو تمکو
طب کا ایک علم دیدوں وہ یہ کہ تم لوگوں کے پاس دیہاتی قسم کے لوگ آتے رہے
اور تم انھیں پر اپنی طب کو مشق کرتے رہے چنانچہ وہی نسخہ تم نے میرے لئے بھی تجویز
کیا اور یہ حکیم صاحب بڑے لوگوں کا علاج کرتے ہیں راجہ اور نواب قسم کے لوگ
انکو اپنے یہاں بلاتے ہیں انھوں نے میرا اصل مرض ضعف دماغ پکڑ لیا اور دماغ کو
قوت پہونچانے والے اجزاء پر مشتمل نسخہ لکھدیا جو گراں تو ضرور ہے لیکن مرض کے
عین مطابق ہے اسلئے اسکے کھاتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ جیسے تیر نشانہ پر لگ گیا ہو
میں اگر خود ہی گھبرا کر یہاں بھاگ نہ آتا اور اللہ تعالیٰ ان حکیم صاحب سے علاج
کرانا میرے قلب میں نہ ڈالدیتے تو تم لوگ تو مجھے جوشاندہ پلا پلا کر مار ہی ڈالتے ۔
اور میرا کیا مرض تھا اور اسکا کیا علاج ہونا چاہیئے یہ تمھاری سمجھ ہی میں نہ آتا تم تو
جوشاندہ پلاتے اور جب تحریک میں اضافہ دیکھتے تو کہتے کہ دن میں ایک دفعہ اور
اسکا استعمال بڑھا دیا جائے پھر اور تحریک بڑھتی تو ایک بار اور بڑھا دیتے تمھاری پرواز فکر
ہی وہاں تک نہ جاتی جہاں اس شخص کی پہونچی ۔ بڑے آدمی کی بڑی ہی بات ہوتی ہے

اور سنو میرا اصل مرض ضعفِ دماغ ہی تھا اس میں حس کی زیادتی ہوجانے کے سبب سے ذراسی گرمی موثر ہوجاتی اور ذراسی سردی موثر ہوجاتی تھی جو تمھارے جوشاندہ سے جانے والا مرض نہیں تھا اسکے لئے تو اسی قسم کے قیمتی اجزا اور ادویہ کے استعمال کی ضرورت تھی اور یہ بھی جانتے ہو کہ مجھے یہ ضعف دماغ ہوا کہاں سے؟ طالب علمی میں نے کی۔ خانقاہ میں رہ کر ذکر و شغل میں نے کیا۔ اسوقت تو کچھ نہ ہوا اب گھر آگیا ہوں اور بظاہر کوئی دماغ اور محنت کا کام بھی نہیں ہے پھر یہ ضعف دماغ کیسا؟ کہو تو اسکی وجہ بھی بتادوں؟ حکیم بشیرالدین صاحب نے عرض کیا کہ حضرت فرمادیں۔ فرمایا یہی جو آپ لوگوں پر خفا ہوتا ہوں اور آپ لوگوں کے کام پر نہ لگنے کی وجہ سے مجھے ایک ضیق سی جو ہوتی ہے۔ لوگوں کی بداخلاقیوں سے نالاں رہتا ہوں اسی غم نے بڑھتے بڑھتے بالآخر ضعف دماغ کی صورت اختیار کرلی۔ بس یہی وجہ ہے اسکے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے صحیح اور صحتمند دیکھنا چاہتے ہو تو لوگوں سے کہو کہ اپنی بداخلاقیاں چھوڑیں۔ نفاق ترک کریں۔ اخلاص سیکھیں اور کام پر لگیں بس میں اچھا ہی ہوں۔

ترتیب واقعہ اور تاریخ وقوع کی رو سے تو حضرت اقدس کا یہ الٰہ آباد کا پہلا سفر قیام وطن ہی کے حالات میں بیان ہوجانا چاہیئے تھا لیکن اسوقت ذہن سے بالکل نکل گیا اب ذکر علالت گورکھپور کے موقع پر وطن کی علالت یاد آئی اور اسی کی وجہ سے الٰہ آباد کا سفر یاد آگیا۔ لیکن خیر اسوقت یہاں اسکا ذکر آجانے سے یہ بات صاف ہوگئی کہ حضرت والا نے علاج کے لئے الٰہ آباد ہی کو کیوں تجویز فرمایا اس بیان سے معلوم ہوگیا کہ الٰہ آباد کے لوگوں کا حضرتؒ سے تعلق اور خود حضرت کا الٰہ آباد سے تعلق ہوچکا تھا وہی قلیل مُنجر بہ کثیر ہوا۔ چنانچہ حکیم مولوی فخرالدین صاحب جعفری کی حذاقت کا تجربہ ہوجانے پر حضرت والا نے اپنے خویش ثانی مولوی قمرالزماں سلمہٗ کو بھی علاج کے لئے الٰہ آباد ہی بھیجا۔ اور خود حضرت والا کا قیام تو اس پہلی بار الٰہ آباد میں تھوڑا ہی رہا لیکن اہل الٰہ آباد کا تانتا لگ رہا چونکہ مسلسل آنا جانا رہتا تھا اس لئے

مستقل طور پر حکیم صاحب موصوف ہی کے پاس حضرت والا کا حال اور یہاں سے
فتحپور (تال نرجا) اور دیہ جاتی رہیں اس واسطہ سے باہم سلام و پیام کا بھی سلسلہ قائم
ہوگیا۔ حضرت والا ہی نے غالباً حاجی عبدالوحید یا حاجی شفیع اللہ صاحب سے فرمایا کہ
حکیم صاحب اگر یہاں تشریف لا سکیں تو ایک مرتبہ لے آؤ۔ حکیم صاحب موصوف کو بھی
حضرت والا سے ایک خاص تعلق ہوگیا تھا آنا منظور فرمالیا چنانچہ حاجی صاحبان کے
ہمراہ الہ آباد سے مئو تک ریل سے اور وہاں سے کوپا گنج تک کار سے اور کوپا گنج سے
فتحپور تک خام راستہ پالکی سے طے فرمایا اس طرح سے جگہ بجگہ قیام کا موقع ملجانے
اور حضرت والا کے متعلقین نیز حکیم صاحب موصوف کے تلمیذ وغیرہ کے ملجانے کیوجہ
سے یہ سفر نہایت راحت اور آرام سے گذرا اور حکیم صاحب کے لئے سبب تفریح
ہی رہا۔ حضرت نے گاؤں والوں کو گاؤں سے باہر استقبال کیلئے بھیجا اور خود بھی
اپنے مکان سے کچھ آگے بڑھکر حکیم صاحب کا استقبال کیا اور بوقت ملاقات غایت
خوشی اور مسرت کا اظہار فرمایا حکیم صاحب بھی بہت خوش ہوئے۔ یہاں قیام شاید ایک ہی دن رہا
دوسرے دن علی الصباح حضرت کی نبض دیکھی قارورہ دیکھا اور صحت پر خوشی کا
اظہار فرمایا۔ ناشتہ اور کھانے پر حضرت اقدسؒ نے حکیم صاحب کے مزاج کی رعایت
فرماتے ہوئے معقول انتظام فرمایا حکیم صاحب کے ہمراہ ان کے تلمیذ خاص جناب
مولوی سلیمان صاحب فخری بھی تھے ان سب امور میں ان سے بہت مدد ملی پھر کیا تھا
دن بھر حکیم صاحب کے پاس بستی اور اطراف کے لوگوں کا تانتا بندھا رہا بہت سے
لوگوں نے اپنے مرض کی تشخیص کرائی اور نسخہ تجویز کرایا۔ دوسرے ہی دن غالباً
حکیم صاحب الہ آباد واپس ہوگئے چنانچہ جس طرح سے آرام و راحت کے ساتھ
تشریف لائے تھے اسی طرح سے الہ آباد بھی تشریف لے گئے اور اب دل ہی دل
میں گویا ان ہر دو طبیب جسمانی اور طبیب روحانی میں معاہدہ سا ہوگیا تھا کہ کبھی کبھی ملاقات
کا یہ سلسلہ باقی رکھا جائیگا کبھی حکیم صاحب پھر آجائیں اور کبھی حضرت الہ آباد تشریف
لیجائیں لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ آخری ملاقات تھی اسلئے اسکے بعد باہم ملاقات نہ ہوسکی۔

چنانچہ واپسی کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حکیم فخر الدین صاحب جعفری نے سفر آخرت فرمالیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔ حضرت والاؒ کو انکی فرقت اور جدائی کا بڑا قلق ہوا فرماتے تھے کہ افسوس اتنے زمانے کے بعد ایک ہی تو طبیب ایسا ملا تھا جسکی تشخیص اور تجویز پر اطمینان کیا جا سکتا تھا اللہ کو ان سے بس اسی قدر استفادہ منظور تھا۔ تاہم حکیم صاحب کے علاج سے ایک کلی نفع حضرت اقدس کو یہ ہوا کہ پھر اور دوسرے اطباء کے لئے علاج کی راہ کھل گئی یعنی پھر اور حضرات نے بھی مقوی دماغ اور مقوی قلب دوائیں حضرت کو استعمال کرائیں۔ چنانچہ مانیکلاں کے حافظ حامد صاحب جو حضرتؒ سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے غالباً حکیم بہار الدین صاحب ٹونکی کا ایک معجون مقوی دماغ جو اس وقت تقریباً ساڑھے تین سو میں تیار ہوتا تھا اہتمام کے ساتھ تیار کرا کے خود حضرت کی خدمت میں پیش کیا حضرت نے حکیم بہار الدین صاحب کا نام سنکر کہ وہ بھی ایک حاذق اور مشہور طبیب تھے اسے استعمال فرمایا چنانچہ اپنے لئے اسکو نہایت مفید پایا اسلئے ان حافظ صاحب سے اسکا نسخہ ہی طلب فرمایا اور جب وہ معجون ختم ہو گیا تو خود حکیم بشیر الدین صاحب یا کبھی حکیم نثار احمد صاحب کے زیر اہتمام اسے تیار کرا کے بہت دنوں تک استعمال فرماتے رہے (یہ نسخہ حضرت اقدس کی بیاض میں بھی درج ہے) اسی طرح سے جناب حکیم فخر الدین صاحب کے بھی متعدد نسخے درج بیاض ہیں) اسطرح سے اللہ تعالیٰ نے حکیم صاحب کی جدائی کے بعد بھی انکے فیض کو جاری رکھا مگر یہ بھی صحیح ہے کہ والفضل للمتقدم۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ درحقیقت حکیم صاحبؒ کا یہاں الہ آباد کے لوگوں پر احسان عظیم ہوا کہ اس طبیب جسمانی نے اپنے علاج کے واسطہ سے اہل الہ آباد کو ایک طبیب روحانی سے روشناس کرادیا۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء فی الدنیا والآخرہ۔

الغرض الہ آباد کے حکیم صاحب جناب مولانا شاہ حکیم سید فخر الدین صاحب جعفریؒ کے علاج سے حضرت والا کا ایک قدیمی مرض نزلہ کا ازالہ ہی ہو گیا۔ جناب حکیم صاحب موصوف عالم بھی تھے اور شیخ بھی اور سادات میں سے تھے، ایک واسطہ کے بعد انکا سلسلہ ہمارے حضرت حاجی صاحب مہاجر مکیؒ قدس اللہ سرہٗ سے ملتا تھا یعنی حضرت حاجی صاحبؒ

سکے کوئی خلیفہ تھے مولانا بخاریؒ حکیم صاحب موصوف انھیں کے خلیفہ اور مجاز تھے
ہمارے ایک دوست بھائی انیس احمد پرتاپگڑھی کہتے تھے کہ حکیم صاحب موصوف پہلے
حضرت مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ خلیفہ حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے
متعلق تھے ان کے وصال کے بعد حضرت بخاریؒ سے بعد میں بیعت فرمائی اور ان کے
مجاز ہوئے۔ الہ آباد تو دوائر کا مجموعہ ہی ہے یہاں کے بارہ دائرے مشہور ہی تھے چنانچہ
آپ کا دائرہ بحمد اللہ نہایت معتدل اور حق پرست اور حق پسند دائرہ تھا اسی لئے بہت
سے مسائل میں خصوصًا رمضان اور عید کے چاند کے مسئلہ میں حضرت حکیم صاحب موصوف
کی بھی تقریبًا وہی پوزیشن تھی جو آج ہماری خانقاہ شاہ وصی اللّٰہی کی ہے۔ اسی لئے
حضرت والاؒ کو حکیم صاحبؒ سے بہت محبت تھی اور حکیم صاحب کو حضرت اقدسؒ سے
بیحد عقیدت تھی۔ رسوم و بدعات کی تاریکی میں نہایت خاموشی اور گمنام مسلک کیساتھ
حکیم صاحب الہ آباد میں اپنا کام کر رہے تھے حضرت اقدس کی ملاقات کے بعد ہم اہل الآباد
کو معلوم ہوا کہ حکیم صاحب تو پورے طور سے ہمارے ہم مسلک ہی نہیں بلکہ ہمارے ہم سلسلہ
بھی ہیں اس سے بہت مسرت ہوئی اور حکیم صاحب کے بہت سے لوگوں نے حکیم صاحب کی
وفات کے بعد حضرت اقدس سے عقیدت مندانہ تعلق باقی رکھا۔

صحت کے بعد حضرت والاؒ وطن میں بدستور کام کرتے رہے یہاں تک کہ ہجرت کا واقعہ
پیش آگیا چنانچہ وطن سے ہجرت فرما کر گورکھپور میں مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم کی کوٹھی میں
قیام فرمایا تو وہاں بھی صحت ہی رہی اور دینی اصلاح کا کام خوب شباب پر رہا۔
لیکن تاکے اللہ تعالیٰ ہی کو منظور ہوا کہ خود حضرتؒ ہی کا شباب شیبۃ سے بدل جائے
تو حضرت والاؒ ایک بار پھر بیمار ہوئے اور ایسے بیمار ہوئے کہ میں نے تو حضرت اقدس
کا ویسا بیمار ہونا نہ اس سے قبل کبھی دیکھا تھا نہ اسکے بعد کبھی ویسے بیمار ہوئے۔ زکام
بخار تو عام مرض ہی ہے ابتداءً اسی کا حملہ ہوا پھر بخار کا سلسلہ طویل ہوا اور غالبًا کچھ
اسہال کی بھی تکلیف رہی، غذا بھی تقریبًا بند سی ہو گئی۔ ادھر غذا بند اُدھر اسہال
اسکی وجہ سے کمزوری بڑھ گئی اور طبیعت نڈھال سی رہنے لگی۔ اسباق و مجلس بند ہو گئی

اوقات مجلس میں تو لوگ اسی طرح سے آتے اور کبھی طبیعت بشاش ہوتی تو مصافحہ کرکے ورنہ باہر ہی سے خیریت مزاج دریافت کرکے چلے جاتے۔ ادھر یہ ضعف بڑھتا ہی گیا اور نقاہت تک کی نوبت آپہونچی۔ اسباق کے لئے حضرتؒ والا نے مکرمی مولانا عبدالوحید صاحب فتحپوری کو (جو مدرسہ اسلامیہ فتحپور (ہسوہ) کے صدر مدرس اور حضرتؒ کے خادم تھے) بلوایا ان سے فرمایا کہ بچوں کے سبق کا میری علالت کی وجہ سے حرج ہو رہا ہے اسباق کا نظام آپ کے متعلق کرتا ہوں اور اثنار قیام میں کبھی کبھی راقم الحروف کے واسطہ سے (کہ میری مولانا موصوف سے سابق بے تکلفی بھی تھی کیونکہ فتحپور تال نرجا کی حاضری سے قبل میں بھی فتحپور (ہسوہ) ہی کے مدرسۂ اسلامیہ میں مدرس تھا اور حضرت مولانا شاہ ابرار الحق مدظلہ کے مدرسہ اسلامیہ فتحپور سے تعلیمی تعلق منقطع فرمالینے پر والد صاحب مرحوم سے دیرینہ تعلقات کی بنا پر مولانا عبدالوحید صاحب فتحپوری ہی نے مجھے سہارنپور سے یہاں مدرسی کیلئے بلایا تھا اس لئے مولانا سے راقم کے بھی نیازمندانہ اور خادمانہ تعلقات پہلے سے تھے جسکی بنا پر باہم بے تکلفی تھی چنانچہ میرے واسطہ سے) مولانا موصوف کے پاس کہلا بھیجا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کچھ دنوں مستقل طور سے میرے پاس رہیں اس میں یہاں بچوں کا بھی نفع ہوگا کہ انکی تعلیم کے جاری رہنے کی ایک سبیل نکل آئیگی اور انشاءاللہ طویل قیام وصحبت کیوجہ سے آپکو بھی نفع ہوگا۔ رہا معاش کا مسئلہ تو جو خدمت آپکی مدرسہ کر رہا ہے وہ میں کردیا کروں گا اگر آپ اپنی جگہ وہاں کیسکو تجویز فرما سکتے ہوں تو انتظام کر دیجئے اور یہاں آجائیے۔ لیکن مولوی صاحب موصوف اپنے بعض اعذار واقعیہ کی بنا پر فتحپور کے قیام کو ترک کرنے پر تیار نہ ہوئے اس سے قبل وطن میں بھی حضرت نے اسی نوع کا خیال ظاہر فرمایا تھا تو مولوی صاحب موصوف نے اپنی والدہ کی تنہائی اور انکے ضعف کا عذر فرمادیا تھا۔

سچ عرض کرتا ہوں مولانا موصوف کی اس قسمت پر رشک آتا تھا کہ یہاں طالب ہی مطلوب نظر آتا تھا لیکن کسی وجہ سے بھی سہی اسکا موقع نہ ہوسکنے پر افسوس بھی ہوا اور افسوس بھی اس پر کم ہوا کہ مولوی صاحب کچھ ہوجاتے بلکہ اس سے زیادہ اسکا ہوا کہ حضرت اقدسؒ نے جو جواہر پارے بکھیرے تھے جسکا کچھ نمونہ آپ کے رسالہ کی اٹھارہ سالہ خدمات

خدمات میں ملاحظہ فرمایا ہے ان جواہرات کا شناسا اور قدر داں صحیح معنی میں مولانا موصوف ہی ہو سکتے تھے ان کو جمع بھی فرما سکتے تھے اور تقسیم بھی فرما سکتے تھے، آخر علوم ظاہری میں حضرت مولانا علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی "تقریر بخاری شریف" آپ نے لکھی ہی اور وہ ہندو پاک ہر دو جگہ طبع ہوئی اور مقبول ہوئی۔ اسی طرح سے اگر حضرت مصلح الامتؒ جیسے شیخ کامل کو بھی ایسا ہی کوئی شاگرد رشید مل جاتا تو شاید آپ حضرات اب سے زیادہ لطف اندوز ہوتے، پس اس افسوس میں ان کے نفع سے زیادہ اپنی خود غرضی شامل تھی۔ بہر حال خدا کو جو منظور تھا وہ ہوا اب تو اسی پر راضی رہنا ہے اور قدر مقدور ہی پر قناعت کرنا ہے

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کاہل اور جاہل اور ظلوم و جہول کے لئے جس سے عمل اور مجاہدہ تو کچھ ہونے والا نہ تھا اللہ تعالیٰ نے یہ سبیل نکالدی کہ تو ہماری دعوت میں ہمارے مہمانوں کو کھانا کھلا اور سن! کھانا یہیں کھا کر جانا (یعنی حضرت اقدسؒ کے علوم ومکلفن کے ضبط کرنے اور لوگوں کے لئے ان سے مستفید ہونیکا واسطہ بنایا اور انشاء اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں راقم کو بھی اسکی وجہ سے سرخرو ہی فرمادیں گے) بہر حال یہ بھی تھا انکا کرم میں تو اس قابل نہ تھا۔

الغرض مولانا موصوف نے کچھ دنوں کے لئے اسباق جاری کر دئیے جہانتک یاد پڑتا ہے کہ اسکے مستقل شرکاء حضرت قاری محمد مبین صاحب مدظلہ۔ مولوی قمر الزمان صاحب سلمہ، مولانا محمد حنیف صاحب۔ مولوی محمد یونس صاحب۔ مولوی منظور الوحید صاحب۔ مولوی انوار الغنی صاحب تھے — اور کبھی مولوی بشیر الدین صاحب یا مولانا عبد الحلیم صاحب وغیرہ بھی شریک ہو جاتے تھے۔ یہ تو زمانہ علالت کے اسباق کا حال تھا اور مجلس کا سلسلہ بھی اس طرح چلتا رہا کہ زمانۂ علالت میں بھی لوگ تو برابر آتے رہے اور کبھی کبھی یہ ہوتا کہ حضرتؒ کی طبیعت کچھ شگفتہ ہوتی تو دریافت فرماتے کہ باہر مجلس میں لوگ آتے ہیں؟ عرض کیا جاتا جی ہاں لوگ برابر آرہے ہیں اور خیریت مزاج والا دریافت کر کے چلے جاتے ہیں یہ سنکر کبھی تو یہ فرمادیتے کہ ہاں لوگوں سے کہو کہ میری صحت کیلئے دعا کریں — اور کبھی یہ فرماتے کہ جاکر لوگوں سے کہو کہ — تمھارا پیر بیمار ہو اور تم ہی لوگوں کی وجہ سے بیمار ہو جائے یہ کیسا ہے؟ مطلب یہ ہوتا تھا کہ میری اس علالت و ضعف ونقاہت کا اصل سبب

آپ ہی لوگ ہیں۔ آپ کی بد حالی کا مسلسل تجربہ کرتے کرتے اور مشاہدہ کرتے کرتے دل و دماغ معطل ہو گیا ہے جسکی وجہ سے بیمار پڑ گیا ہوں کچھ آپ لوگوں کو بھی اسکی غیرت ہے یا نہیں؟ غرض اسی قسم کی باتیں فرماتے کہ جسکا ایک جملہ ایک مجلس کا کام کر جاتا اور حساس طبیعتوں پر ایک تازیانہ ہی تو لگ جاتا تھا۔

لیکن اسباق کا یہ نظم زیادہ دنوں نہ چل سکا مولوی صاحب موصوف چند ہفتے بمشکل قیام کر سکے اور پھر اپنے مدرسہ نیز خانگی ضروریات سے مجبور ہو کر فتحپور (ہسوہ) واپس ہو گئے اسکے بعد غالباً کچھ دنوں کے لئے یہ سعادت مولانا عبدالحلیم صاحب مدظلہٗ کے حصہ میں آئی مگر انکا رشتہ بھی ایک دوسرے مدرسے سے جڑا ہوا تھا بالآخر وہ بھی تشریف لے گئے ادھر حضرت اقدس کی حالت روز بروز بگڑتی ہی گئی یہاں تک کہ کبھی کبھی دیر دیر تک غشی اور ظاہری غفلت سی طاری رہنے لگی ایسی حالت میں اگر سبق ہوتا بھی تو لوگ اسکے لئے ذہناً مستعد نہ تھے۔ حضرت والا کے گھر کے لوگ پریشان، مولوی ثناء اللہ صاحب اور مولوی امجد اللہ صاحب پریشان، اہل مجلس پریشان، طبیب ڈاکٹر سب حیران کہ کوئی دوا کام نہیں کر رہی ہے یہاں تک کہ ایک شب تو ایسا محسوس ہوا کہ شاید یہ حضرت کی زندگی کی اب آخری شب ہے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ بدن میں پانی کا حصہ بالکل خشک اور ختم ہو چکا ہے اسلئے فوراً گلوکوز کے بوتل چڑھانے کی ضرورت ہے اسکے انتظام میں اندر باہر کچھ اسطرح سے بھاگ دوڑ ہوئی کہ عورتوں نے محسوس کیا کہ شاید حضرت والا کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی ہے یا خدانخواستہ حضرت پر نزع کا عالم طاری ہے کہ قاری صاحب وغیرہ اس قدر پریشان نظر آ رہے ہیں۔ یہ خیال کر کے انھوں نے تو رونا دھونا شروع کر دیا رونا سنکر رونا آتا ہی ہے انکو روتا دیکھکر مولوی امجد اللہ صاحب کے گھرانے کے لوگ بھی شریک رنج ہو گئے غرض اندر ایک کہرام سا مچ گیا یہاں باہر کے لوگوں کو فرصت ہی نہیں تھی کہ اندر جا کر صحیح حال سے باخبر کریں اور کوئی جاکر کرتا بھی تو کیا کرتا۔ حضرت کے پاس ڈاکٹر گلوکوز چڑھانے کے لئے آیا اور سوئی چبھوئی تو رگ ہی نہ ملی ایک ہاتھ کو چھوڑ دوسرے میں چبھویا وہاں بھی نہ مل سکی۔ اسی طرح سے دونوں پیروں میں چبھویا وہاں بھی نہ مل سکی تو اس سے نروس (پریشان

اور ناامید سا) ہو کر اپنے ہاتھ کو اپنی پیشانی پر مار لیا جسکی وجہ سے دیکھنے والا ہر فرد بشر رو دیا لیکن شیخ سامنے تھا، بیہوش تھا تو کیا اسکا ادب اسکے سامنے سسک سسک کے رونے سے بھی مانع تھا۔ سب کے ہاتھ میں رومال اور آنکھ میں آنسو تھے۔ دل حق تعالےٰ کی جانب راجع اور زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ یا اللہ! رحم فرما۔ اے کریم! کرم فرما۔ یا اللہ! ہمارے شیخ کو صحت عطا فر۔ یا اللہ ہمیں اتنی جلدی روحانی یتیم نہ بنا۔ یا اللہ ہمارے حال پر رحم فرما۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ادعونی استجب لکم اور فمن یجیب المضطرّ اذا دعاہ کے فرمانے والے نے لوگوں کی اسوقت کی دعاء کو کیسا کچھ سنا ہوگا۔ دعاء قبول ہوگئی اور ڈاکٹر کا ہاتھ ایک رگ پر پڑگیا، اس میں سوئی لگائی ٹیوب سے کنکشن قائم کرکے اسٹینڈ پر بوتل لٹکائی اور رات بھر کے لئے ایک کمپاؤنڈر کو مقرر کرکے وہ تو چلاگیا۔ خدام والا نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ رات بھر چار چار آدمیوں کی جماعت کی جاگنے کی باری مقرر کی گئی اور صرف چار آدمیوں کی پہلی جماعت کمرہ میں باقی رہی اور بقیہ سب لوگ باہر جاکر دعاء و تلاوت وغیرہ میں مشغول ہوگئے۔ اور چار کیا اندر باہر ملاکر تقریبًا چالیس آدمی ساری رات جاگتے ہی رہے اور جہاں ایک بوتل ختم ہوگئی تو دوسری بوتل بدل دی گئی پھر دوسری کے بعد تیسری بدلی گئی، اور اب کسی کسی وقت حضرت والا سوتے سوتے ذرا زور کی سانس لے لیتے یا کبھی جس ہاتھ یا پیر میں سوئی لگی تھی اسکو حرکت دینے کی کوشش فرماتے لیکن مستعد خدام متعین تھے کام بگڑنے نہیں دیا یہاں تک کہ فجر کیوقت خود حضرت والا نے بھی آنکھ کھولدی اور یہ سارا منظر ملاحظہ فرماکر پھر آنکھ بند کرکے خاموش لیٹے رہے اس طور پر گویا خود ہی احتیاط کرنے میں شریک ہوگئے

الحمدللہ حاضرین کا اطمینان اور زیادہ ہوگیا۔ فجر کی نماز میں بھی بڑے ہی عاجزانہ طور سے حضرت کی صحت کے لئے اہتمام کیسا تھ دعاء ہوئی۔ اندر صاحبزادیوں کے پاس کہلا دیا گیا کہ الحمدللہ حضرت والا کی طبیعت اچھی ہے۔ ان سب نے بھی جس طرح آنسوؤں سے دعاء کی تھی اسی طرح سے آنسوؤں ہی سے اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا شکر ادا کیا فرق یہ تھا کہ پہلا آنسو گرم تھا اور یہ ٹھنڈا کہ وہ غم کے آنسو تھے اور یہ مسرت کے قطرات تھے جو آنکھوں سے نکل رہے تھے۔

حضرت مصلح الامۃ کی ایک عظیم الشان کرامت اور استقامۃ علی الدین کی حیرت انگیز مثال

دوسرے دن صبح کو جب ڈاکٹر صاحب تشریف لائے (غالباً یہ ڈاکٹر لہری تھے جو گورکھپور کے ایک مشہور اور مولوی امجد اللہ صاحب کے فیملی ڈاکٹر تھے) اور انھوں نے رات کی حالت کے برخلاف حضرت والا کو آنکھ کھولے ہوئے اور آہستہ آہستہ بات بھی کرتے ہوئے دیکھا تو مارے خوشی کے پھولے نہ سمائے اور اسی ترنگ میں آکر یہ جملہ کہا کہ کہئے مولانا صاحب کیسی طبیعت ہے؟ حضرت نے لطیف مسکراہٹ کے ساتھ آنکھوں اور اور ہاتھوں کے اشارہ سے فرمایا کہ الحمد للہ اچھی ہے اس پر بھلے مانس نے یہ کہدیا کہ — مولانا صاحب! آپ تو رات چلدیئے ہوتے میں نے آپ کو بچالیا — اب جا ہے اس نے ازراہِ عجب یہ کہا ہو یا اپنی بدعقیدگی کے ماتحت ایسا کہدیا ہو یا یہ سمجھکر کہا ہو کہ یہ اس سے بہت خوش ہوں گے اور شاید مجھے انعام ہی مل جائے۔ بہرحال جیسے ہی اسکے منھ سے یہ الفاظ سنے حضرتؒ پر تو جو گذرنی تھی گذر گئی، چہرہ کا رنگ فوراً بدل گیا اسکی جانب سے منھ دوسری جانب پھیرلیا۔ اسکے بعد ڈاکٹر تو ادھر نسخہ لکھکر اور دوا کے استعمال کا طریقہ بتلاکر رخصت ہوا ادھر حضرت والا نے فوراً مولوی امجد اللہ صاحب کو بلایا اور ان سے فرمایا کہ مولوی امجد اللہ! میں تمھارے اس ڈاکٹر کا علاج اب نہیں کرونگا سن لیا!۔ انھوں نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا بس اب جاؤ کوئی اور انتظام علاج کا کرو ہم لوگوں نے ڈاکٹر کی وہ بات بھی سنی تھی اسلئے اس منع فرمانے کا منشاء تو سمجھ میں آ ہی گیا تھا لیکن دشواری یہ تھی کہ اب کیا کیا جائے؟ اگر ممانعت کے بعد اسکا علاج جاری رکھا جاتا ہے تو علم ہونے پر ہم لوگوں کا حشر کیا ہوگا اور علم کا ہو جانا بعید نہ تھا بوقت استعمال دریافت ہی فرمالیتے کہ یہ کسکی دوا ہے؟ پھر کیا جواب ہوتا اگر کذب بیانی کیجاتی تو شیخ کے ساتھ معاملہ اور شیخ کی تعلیم نے اسکی اجازت نہیں دی، پھر دوسرے کسی طبیب

کا علاج ہو تو کس کا ہو بہرحال یہ وہ دشواریاں تھیں جو منتظمین علاج کو اسوقت پیش آرہی تھیں اور اسی نسخہ کو دوسرے ڈاکٹر کے ہاتھ سے لکھوا کر دوا لاکر پلانے میں علاوہ کذب کے خداع کی صورت بھی تھی اسلئے حضرت کے معاملہ میں کسی کی ہمت نہ پڑی۔ اگر کسی نے ان میں سے کسی بات کا مشورہ بھی دیا تو اور لوگ تیار نہ ہوئے۔ بہرحال اس مدعی ڈاکٹر کا علاج تو ترک ہی کر دیا گیا اور پھر کسی دوسرے کا علاج کیا گیا اور شاید التباس سے بچنے کے لئے حضرت والا نے نوعیت علاج ہی بدل دی یعنی بجائے ایلوپیتھک کے یونانی یا ہومیوپیتھک علاج ہونے لگا اور اللہ تعالیٰ نے شفا دی اور واذا مرضت فھو یشفین کا عقیدہ عین الیقین بنکر ہم سبکے سامنے آگیا کہ بیمار کرنا اور شفا دینا شافی مطلق ہی کے ہاتھ میں ہے دوا علاج تو واسطہ محض ہیں۔ حضرت اقدسؒ نے طے فرما لیا تھا کہ ایسے مدعی مشرک کا علاج کرنے سے مرجانا بہتر ہے تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کا صلہ بصورت صحت عطا فرمایا۔ سچ ہے ؎

توچنیں خواہی خدا خواہد چنیں　　　می دہد یزداں مراد متقیں

(راقم عرض کرتا ہے کہ حضرت اقدس نے اس موقع پر جس توکل اور تفویض اخلاص اور اپنی دینی غیرت کا ثبوت دیا وہ تو حضرت ہی کا حصہ تھا اللہ تعالیٰ حضرت کی برکت سے ہم خدام کے قلب کو بھی اپنی محبت سے بھر دے اور ہمکو صدق توکل کی دولت سے نوازے اور دینی و ایمانی غیرت سے ہمارے قلوب کو بھر دے بلاشبہ کسی بزرگ کے کمالات باطنی کے ظہور کے یہی مواقع ہوتے ہیں اور کسی اللہ والے کے دینی استقامت کے یہی نمونہ ہوا کرتے ہیں۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ جسے مشہور فرماتے ہیں اور جسکو اپنا مقرب خاص بناتے ہیں وہ یونہی نہیں بناتے بلکہ اسکی جانب سے بھی کوئی معاملہ دیکھتے ہیں تب اسے مقبول فرماتے ہیں)

حضرتؒ والا نے ہر طرح قولاً فعلاً اور حالاً اپنے لوگوں کو نفاق سے بچا کر اخلاص تک پہونچانا چاہا اور رسم سے نکالکر حقیقت تک لیجانا چاہا۔ شہرت سے نکالکر کام پر لگانا چاہا لیکن جنھیں سیکھنا تھا انھوں نے سیکھا اور جنھیں نہ سیکھنا تھا نہ سیکھا۔

حضرتؒ خود فرماتے تھے کہ صرف کسی کا مرید ہو جانا کافی نہیں ہوتا اور محض "پدرم سلطان بود" کا زبانی نعرہ معتبر نہیں ہے۔ آدمی کو کام کرنا چاہیئے نہ تو کاہلی سے کام لے اور نہ تمام کے پیچھے پڑے۔

اس سلسلہ کے چند واقعات خود میرے علم میں بھی ہیں ایک صاحب جو حضرتؒ کے مخصوص احباب میں سے تھے جب وہ حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو دو چار حضرات کے ساتھ آتے اور اپنے وطن میں ان سب کو دین اور طریق کی باتیں بتاتے اور سکھاتے تھے ایک مرتبہ ایسی ہی ایک جماعت کے ہمراہ وہ صاحب آئے۔ چند یوم قیام کیا اور واپسی سے ایک دو دن قبل سب لوگوں نے حضرت اقدسؒ کو اپنے اپنے حالات کا خط لکھا اور دعا، وغیرہ کی درخواست کی ان میں سے ایک صاحب نے حضرت اقدسؒ کو یہ لکھا کہ "اپنے وطن میں بھی حضرت کی مجلس میں بیٹھتا ہوں اور حضرت نے فلاں فلاں چیزیں پڑھنے کے لئے بتلائی ہیں۔ جب دو چار دفعہ انھوں نے حضرت حضرت لکھا تو ہمارے حضرتؒ نے ایک جگہ خط کھینچکر سوال فرمایا کہ "یہ حضرت کون ؟" خطوط کی واپسی پر ان صاحب نے خود بھی جواب کے اس سوال کو پڑھا اور جن بزرگ کے ہمراہ آیا کرتے انکو بھی دکھلایا۔ خود وہ کاتب صاحب تو کچھ سمجھے نہیں لیکن یہ صاحب سمجھ گئے اور گھبرا گئے۔ اور انکی گھبراہٹ بھی بجا تھی کیونکہ اس تحریر سے حضرت اقدسؒ نے دراصل انھیں صاحب کو تنبیہ فرمانا چاہا تھا کہ اتنے دنوں سے آتے جاتے ہو اور ابھی تک یہاں کا مزاج نہیں بنا اپنے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں کو اتنا بھی نہیں سمجھا سکے ہو کہ وہ مجھ ہی کو مخاطب کر کے تمھیں حضرت سے تعبیر کرتے ہیں آخر طریق میں بھی کچھ ادب وغیرہ کی رعایت ہے یا نہیں ؟ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی کو خود کو حضرت کہلوانے کا شوق ہے یہ بات وہ سمجھے اور اس مواخذہ کا رخ اپنی جانب سمجھکر گھبرا گئے۔ یہ تھا حضرت مصلح الامۃ کا قال جس سے طالبین میں اخلاص پیدا فرماتے تھے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ایک صاحب کا یاد آیا ان کے پاس بھی لوگ آتے جاتے تھے حضرت والا کیجانب سے اجازت رہی ہو گی۔ ایک مرتبہ ان آنے جانیوالوں

میں سے ایک شخص نے ہمارے حضرت اقدس کو لکھا کہ کبھی کبھی تعطیل میں فلاں جگہ چلا جاتا ہوں خانقاہ میں قیام رہتا ہے الحمدللہ بہت نفع ہوتا ہے۔ حضرت مصلح الامۃؒ نے خط میں لفظ خانقاہ پر خط کھینچکر حاشیہ میں تحریر فرمایا کہ خانقاہ کیسی؟ اور راقم سے ان بڑے صاحب کے پاس خط لکھوایا کہ فلاں صاحب کو لکھو کہ — کسی کا پیر زندہ ہو اور وہ اسکی زندگی ہی میں خانقاہ بنوالے یہ کیسا ہے؟ اس خط کے پہنچتے ہی ان صاحب کے پیر تلے کی تو زمین نکل گئی، بہت کچھ عذر معذرت کی اور صفائی دی کہ حضرت میں نے کوئی خانقاہ نہیں بنوائی ہے لیکن حضرت اقدس کو اطمینان نہیں ہوا۔ فرماتے تھے کہ یہ ناممکن ہے کہ لوگ پہلے سے اس جگہ کو خانقاہ نہ کہتے ہوں اور بس اسی ایک شخص نے سب سے پہلی بار مجھے ایسا لکھدیا ہو ایسا سمجھ میں نہیں آتا یہ مانا خود انھوں نے اسکی ترغیب نہ دی ہوگی لیکن لوگوں سے سنکر اسکو ناپسند بھی نہ کیا ہوگا بلکہ خوش ہوئے ہوں گے کہ ہم صاحب خانقاہ ہوگئے۔ تم لوگوں سے پوچھتا ہوں بتلاؤ یہ کیسا ہے؟ کیا یہ پیر بننے کا شوق نہیں ہے؟ حضرت مولانا تھانویؒ کے سامنے تو کوئی ہم لوگوں کو کسی خصوصی القاب سے پکار لیتا تھا تو پانی پانی ہوجاتے تھے۔ یہ بھی اس زمانہ کا مرض ہے کہ پیر ہونے سے پہلے لوگ پیر بن جانا چاہتے ہیں۔ بس اب یہی حال ہوگیا ہے۔

اسی کو میں نے عرض کیا کہ سبحان اللہ حضرت اقدسؒ کا کیا کہنا روز و شب اسی دھن میں گذرتے کہ لوگوں میں کس طرح سے اخلاص پیدا کیا جائے اور کیونکر انھیں اخلاص کا مطلب سمجھایا جائے۔ غرض کسی اللہ والے کے حالات میں اسکے اسی نوع کے احوال اور اقوال و افعال اور تعلیمات قابل دید اور لائق داد ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اخلاص، توکل اور تفویض کا ایک نمونہ آپ نے علالت کے اس واقعہ میں ملاحظہ فرمایا اللہ تعالیٰ ہمکو بھی اس دولت کا ایک شمہ عطا فرمادے

جب اس طویل علالت سے اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدس کو شفا عطا فرمائی تو اس کے بعد بھی کچھ مدت تک حضرت والا مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم کے مکان

ہی پر قیام فرما رہے اور اسکے بعد وہ ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا جس کی وجہ سے حضرت والا حکیم وصی احمد صاحب کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس سلسلہ میں راقم یہ عرض کر چکا ہے کہ مولوی ثناء اللہ صاحب اور مولوی امجد اللہ صاحب جو حضرت والا کے اصل میزبان تھے وہ اس واقعہ میں بالکل بے قصور تھے لیکن تھوڑی سی غفلت ہو جانے کی وجہ سے مورد عتاب بھی تھے۔ جب حضرت والا حکیم صاحب کے یہاں تشریف لے گئے اور سب طلبہ اور طالبین بھی یہاں سے روانہ ہو گئے اور اب مدرسہ و خانقاہ ہر دو حکیم صاحب موصوف کے مکان پر قائم ہو گیا تو ان مولوی صاحبان کو بھی اپنا مکان کاٹنے لگا۔ جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی کہ ایک طرف اگر قال اللہ و قال الرسول کی آواز سنائی پڑتی تھی تو دوسری جانب اللہ ہو اللہ ہو کی صدا سے ہال گونجتا رہتا تھا وہاں اب ہو کا عالم ہو گیا تھا اسلئے یہ دونوں حضرات بھی اپنا اپنا بستر لیکر حکیم صاحب کے مکان پر پہونچ گئے کہ جب شیخ ہی نے ناراض ہو کر ایک جگہ کو چھوڑ دیا ہے تو پھر اب ہم وہاں کیسے رہ سکتے ہیں لیکن جب حضرت والا کو اسکی اطلاع ہوئی تو مولوی ثناء اللہ صاحب کو بلوایا کہ میں تو آپ کے یہاں سے چلا آیا جو ان حالات میں میرے لئے ضروری تھا لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ شہر میں آپ لوگوں کی رسوائی اور بدنامی ہو آپ لوگ یہاں کیوں چلے آئے آپ کے گھر کے لوگ پریشان ہوں گے ایسا نہ کیجئے بلکہ آپ لوگ اپنے اپنے مکان جائیے اور وہاں ہی رہیئے اس پر مولوی ثناء اللہ صاحب آبدیدہ ہو گئے اور تاثر کے ساتھ حضرت سے معافی مانگی کہ حضرت اقدس کے قلب مبارک میں ہم لوگوں کی طرف سے ادنیٰ تکدر بھی ہماری دینی تباہی کے مرادف ہے۔ حضرت نے انکی تسلی فرمائی اور اُن کے اِن جذبات کی قدر فرمائی اسکے بعد وہ حضرات اپنے اپنے گھر واپس ہو گئے۔

راقم عرض کرتا ہے کہ اس دنیا میں واقعات تو پیش آتے ہی رہتے ہیں حوادثات کا وقوع بھی ناگزیر ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ لوگوں کے معاملات ایسے مواقع پر کیا ہوتے ہیں اور کون اپنا کیسا کردار پیش کرتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ بڑا صبر آزما واقعہ تھا۔ اس موقع پر ان ہر دو صاحبان نے اپنے انتہائی اخلاص۔ انقیاد۔ محبت و تعلق شیخ اور کامل

دینداری کا ثبوت پیش کیا۔ ایسے مواقع پر کسی کو اپنے انتقامی جذبات کی تسلی دینی مقصود ہو یا اسکے رزیلہ، حسد کو اپنے ابھار کا ایک اچھا موقع ہاتھ آجائے تو اسکے متعلق کچھ کہنا نہیں ہے ورنہ انسان اگر اپنے قلب پر ہاتھ رکھکر اس واقعہ کو سوچے تو اسکی سمجھ میں حقیقت آجائے کہ شہر کے ایک باعزت گھرانے کے لوگ جو ثروت میں شہرت میں جاہ و منصب میں ایک عالی مقام رکھتے ہوں ان کے ساتھ ایسے زبردست معاملہ کا پیش آجانا جو ایک ضعیف القلب کے لئے اسکے ہارٹ تک کے فیل ہوجانے کا سبب بن سکتا ہو اسکو اس خندہ پیشانی سے گوارا کرلینا اور خود ہی کو باوجود بیقصور ہونے کے مجرم کے خانہ میں رکھکر شیخ سے معذرت طلب کرنا اس میں شک کہ فنا فی الشیخ کا انتہائی ثبوت تھا۔ یوں کہنے کو آپ جو چاہیئے کہہ لیجئے اور قائم کرنے کو جو رائے چاہیئے قائم کرلیجئے مگر بہ نظر انصاف اگر دیکھئے گا تو اس میں ان دونوں مریدین کو آداب طریق اور تادب شیخ میں اگر نقید المثال نہیں تو قلیل النظیر ہی پائیے گا کیونکہ آج کی دنیا میں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر مرید کی منشار کے خلاف شیخ کا کوئی ادنیٰ معاملہ بھی ہوتا ہے تو مرید ہی اس شیخ کو طلاق دیکر اور بزبان حال یہ کہکر چلدیتا ہے کہ "پائے مرا لنگ نیست ملک خدا تنگ نیست" یعنی دنیا میں بہت سے پیر ہیں آپ نہ سہی کوئی دوسرا سہی۔ اب اہل زمانہ کا یہ انداز ملاحظہ ہو اور ان دو حضرات کا ایسا نیاز و انقیاد ان دونوں کا موازنہ کیجئے اور دیکھئے کہ ان حضرات نے واقعی اپنے تعلق بالشیخ کا ثبوت دیا تھا یا نہیں؟

پھر جب چند دن کے بعد معاملہ ہلکا ہوا اور ان حضرات سے جو چوک یا غفلت ہوگئی تھی اس پر تنبیہ ہوچکی تو حضرتؒ کو خود یہ خیال ہوا کہ یہ لوگ امیر۔ رئیس۔ شریف زادے ہیں اور گورکھپور میں ممتاز ترین شخصیت کے مالک ہیں ان کی انکے شہر میں رسوائی بھی ٹھیک نہیں تو حضرت والا نے اپنی فراست و حکمت اور خداداد سلیقہ اصلاح سے اسکی تلافی کی یہ صورت تجویز فرمائی کہ ایک دن مجلس میں آنے والے سب لوگوں سے مواخذہ اور اخلاص کا مطالبہ فرمالیا (سب ناظرین کو شاید نہ معلوم ہو کہ حضرت والاؒ مجلس فرماتے تھے اور اس میں امور اصلاحی امراض نفسانیہ اور ان کے معالجات ذکر فرماتے تھے اس کے

ساتھ ساتھ یہ بھی کرتے تھے کہ مہینہ دو مہینہ (یا کم و بیش) کے بعد کبھی کبھی سب لوگوں سے یہ سوال ہوتا تھا کہ آپ لوگ اتنے دنوں سے آرہے ہیں مجھ سے آپ نے کیا سیکھا آنا جانا اخلاص سے ہے یا محض رسمی؟ ہر شخص الگ الگ ایک ایک کر کے آوے اور مجھے مطمئن کرے۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جب شیخ ایسا امتحان لے لے تو طالبین کیلئے یہ کسقدر دشوار گذار گھاٹی ہوتی تھی ہر شخص اپنی جگہ کانپ اٹھتا تھا لیکن حضرت کا حکم ہوتا تھا اسلئے سب لوگ باری باری پیش ہوتے اور حضرت ہرایک سے اسکے احوال کے مناسب معاملہ فرماتے تھے کسی سے یہ فرماتے کہ آپ کو تو میں جانتا ہوں کام پر لگے ہیں جائیے کام کیجئے، کسی سے اسکے عرض معروض کے بعد فرماتے کہ ہاں بھائی کام کرو۔ یونہی بلا فائدہ آنا جانا نہ رکھو۔ کسی کے عرض مدعا پر فرماتے کہ اب آپ یہ فرما رہے ہیں آجتک آپ نے اپنا کچھ حال لکھکر نہیں دیا کبھی کبھی از خود اپنے حالات سے مطلع کیجئے۔ جائیے۔ کسی سے فرماتے سچ کہہ رہے ہو نا بات تو نہیں بنا رہے ہو کہ سڑاک سے پیر کے سامنے بولکر نکل جاؤ یہ کیسا ہے؟ کسی سے فرماتے کہ آئیے اور ہم ہی لوگوں سے نفاق برتیئے اچھی بات ہے میں بھی اب تیار ہوں فرمائیے کیا فرماتے ہیں لیکن جو کچھ کہیئے گا سمجھکر کہیئے گا اور یہ سمجھ لیجئے گا کہ اپنا جو حال جس طرح اب بیان کیجئے گا ویسا ہی آپ کے لئے لازم حال ہو جائے گا یعنی اگر جھوٹ اور غلط بیانی سے کام لیجئے گا تو جھوٹ اور نفاق ہی آپ کو یہاں سے مل بھی جائے گا ع۔ ان تمارضتم لدنیا تمرضوا۔ (اگر تم ہمارے سامنے اپنا (جھوٹا) بیمار ہونا ظاہر کروگے تو واقعی میں بیمار ہو جاؤ گے) کوئی صاحب حال اور محب تنہائی پاکر رو دیتا حضرت والا اسکے صدق حال کی تصدیق فرماتے۔ غرضیکہ اسی طرح سے ہر شخص کا حال فی الجملہ شیخ کے سامنے سے گذر جاتا اور باہر مجمع کا یہ حال ہوتا کہ طریق کے متعلق ع "اندریں رہ می تراش و می خراش" کا منظر سامنے آجاتا تھا۔ یہ اس سوال و جواب کی عکاسی تھی جو حضرتؒ کبھی کبھی اہل مجلس سے فرمالیا کرتے تھے۔

چنانچہ اسی طرح سے حکیم صاحب کے یہاں بھی لوگوں سے یہ سوال ہو گیا اور حضرت کا مواخذہ اور عتاب اس امر پر ختم ہوا کہ فرمایا کہ یہ میری مجلس خصوصی مجلس ہے اسمیں

ہر شخص شریک نہیں ہو سکتا بلکہ جو مخلص ہو اور جسکو اپنی اصلاح منظور ہو جو کچھ کام کرنا چاہے وہی آئے اور غیر طالبین اور غیر مخلص دوسرے اوقات میں مجھ سے ملیں مجلس میں نہ بیٹھیں ۔ اسکے بعد فرمایا کہ اب کون شخص طالب ہے اور کون نہیں اسکے لئے مولوی نثار اللہ صاحب کو مقرر کرتا ہوں ۔ آپ سب لوگ ان سے ملیئے وہ جس کے متعلق اطمینان دلا دیں گے اور سفارش کر دیں گے وہ شخص مجلس میں آسکتا ہے ۔ اس اعلان کے سننے کے بعد ہر شخص کو یہ فکر ہوگئی کہ وہ کس طرح سے مولوی صاحب موصوف کو مطمئن کرے تاکہ مولوی صاحب حضرت والا سے اسکے لیے مجلس میں شرکت کی اجازت دلوا دیں ۔ اس معاملہ سے ایک طرف تو یہ نفع ہوا کہ تمام آنے جانے والوں کی نظر میں مولوی نثار اللہ صاحب کی ایک عظمت قائم ہوگئی کہ یہ حضرت والا کے ایسے معتمد علیہ ہیں ، اور سابقہ مواخذہ کی وجہ سے کسی بدفہم کو خود انھیں حضرات سے اگر کسی قسم کی سوءظنی ہوگئی ہو تو وہ ختم ہو جائے اور دوسری طرف آنے جانے والوں میں یہ احساس پیدا ہوگیا کہ یہ کام کی جگہ ہے یہاں آتے ہیں تو کچھ کام کرنا چاہیئے ورنہ کسی وقت بھی ہماری گرفت اور پکڑ ہو سکتی ہے سبحان اللہ یہ بھی حضرت مصلح الامۃ کی اصلاح کہ کیسے کیسے اور کتنے نازک موقعوں پر بھی آپ کا ذہن رسا کیسا طریقہ کار سوچ لیتا تھا کہ جس میں سب ہی کے نفع کا سامان ہوتا اور کسی کو ضرر نہ پہونچتا ۔

بہرحال چند ہی دنوں کے بعد حضرت والا ان حضرات سے منشرح ہو گئے اور انکا سارا غم غلط ہوگیا لوگ بھی سب بھول گئے کہ کیا ہوا تھا اور کیا نہیں ہوا تھا ۔ اب حضرت اقدس کی مجلس حکیم صاحب کے ہال میں ہونے لگی ۔ چونکہ مولوی نثار اللہ صاحب کے ہال سے بہت چھوٹا کمرہ تھا اس لئے حاضرین سے کھچا کھچ بھر جاتا بلکہ کچھ بعد میں آنے والوں کو ولان ہی میں بیٹھنا پڑتا ۔ یہیں حضرت والا کا قیام تھا کہ ایک بار حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہٗ حضرتؒ کی عیادت کے لئے حاضر ہوئے تھے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں ۔ طلبہ اور طالبین کے لئے بھی جگہ بن گئی حکیم صاحب نے اور ان کے برادر معظم قبلہ جناب حاجی ولی محمد صاحب نے پاس پڑوس کے دو ایک مکانات بھی خالی کرا دیئے ، حکیم صاحب خود جس گھر

میں رہتے تھے اس میں حضرت والا کے متعلقین قیام پذیر ہوئے۔ حضرت والا کی قیام گاہ کا ایک دروازہ اندر کی جانب بھی کھلتا تھا اسلئے صاحبزادیوں کیلئے بھی ملاقات کرنے اور آنے جانے میں آسانی تھی۔

وطن میں حضرت والا نے مسجد کی توسیع فرمائی تھی لیکن خدا کو یہی منظور تھا کہ حضرت گورکھپور جائیں چنانچہ تشریف لے گئے اسی طرح سے یہاں حکیم وصی صاحب کی مسجد بھی مختصر سی تھی حضرت اقدس کے پہونچنے کے بعد اسکی توسیع بھی وجود میں آئی اور پھر وہ نہایت عمدہ اور شاندار مسجد بن گئی۔

حضرت والا نے اب یہاں کچھ طلبہ اور طالبین کے انتشار قیام کے باعث اور کچھ سابقہ واقعہ سے عبرت فرماکر یہ چاہا کہ جب رہنا ہے تو پھر خود اپنا کوئی مکان ذاتی اور مستقل طور پر یہاں ہو جائے تو بہتر ہے اسکا تذکرہ بھی احباب سے فرمایا چنانچہ ہم لوگ دیکھتے تھے کہ کبھی مولوی امجد اللہ صاحب مرحوم کے ساتھ کبھی حکیم ابوالکلام صاحب کے ہمراہ اور کبھی حکیم وصی احمد صاحب کی معیت میں رکشے پر کہیں تشریف لیجاتے تھے واپسی پر معلوم ہوتا تھا کہ فلاں محلہ میں ایک مکان فروخت ہونے والا ہے اسی کو دیکھنے تشریف لے گئے تھے اور کبھی یہ معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ ایک زمین تھی اسکو ملاحظہ فرمانے تشریف لے گئے تھے ایسا متعدد بار پیش آیا لیکن خدا تعالیٰ کے علم میں تو الہ آباد کو آپکا مستقل وطن ہونا مقدر ہو چکا تھا اسلئے خدا کا کچھ کرنا ایسا ہوا کہ نہ تو کوئی مکان ہی پسند آیا نہ کوئی زمین ہی طے ہوسکی۔

گورکھپور کے زمانہ قیام میں جسکی مدت کم و بیش ڈیڑھ سال رہی تقریباً ایک سال مولوی نثار اللہ صاحب کے یہاں اور ۶ ماہ کے قریب حکیم صاحب کے یہاں۔ اس مدت میں حسب ذیل حضرات ہمارے حضرت اقدسؒ سے زیادہ قریب ہوئے یعنی ان حضرات نے وقتاً فوقتاً آمد و رفت رکھی اور ان میں سے بعضوں کو تو حضرتؒ سے خاص تعلق ہوا وہ حضرات یہ ہیں :۔۔۔۔۔۔ مولوی نثار[1] اللہ صاحب مرحوم ۔ مولوی امجد[2] اللہ صاحب مرحوم مولوی محمد شکیل[3] صاحب عباسی مرحوم ۔ ماسٹر واجد[4] علی صاحب مرحوم ۔ مولوی عبد[5] الحنان صاحب ۔ مولوی حکیم عبد[6] الحیٔ صاحب ۔ مولوی وصی[7] الدین صاحب مرحوم ۔ مولانا افتخار[8] الحق صاحب مدظلہ

حکیم مولوی وصی[9] احمد صاحب ۔ حاجی[10] ولی محمد صاحب ۔ حاجی مطیع اللہ[11] صاحب مرحوم
حاجی محمد عمر[12] صاحب ۔ قاضی عظیم الحق[13] صاحب اور ان کے صاحبزادے[14] قاضی علیم الحق صاحب
عبدالغفار[15] خاں صاحب ۔ مولوی غیاث الدین[16] صاحب ۔ بھائی لیاقت حسین[17] صاحب اور
ان کے بھائی صاحبان[18، 19] ۔ حکیم ابوالکلام[20] صاحب ۔ مولوی امجد اللہ صاحب کے صاحبزادگان[21، 22]
مولوی نثار اللہ صاحب کے بڑے داماد بھائی مسعود[23] علی صاحب مرحوم ۔ عزیزم حافظ[24] عبدالعزیز سعدی
قاضی وہاب[25] اشرف صاحب ۔ داروغہ امداد[26] حسین صاحب مرحوم ۔ حافظ[27] ثناء اللہ صاحب
کاری ساتھوی ۔ مولوی جنید[28] صاحب ۔ مولوی ابراہیم[29] صاحب کوریا پاری ۔ بھائی محمد[30]
معروف صاحب ۔ محمد ادریس[31] صاحب سارٹر ۔ تحصیلدار[32] محمد حنیف صاحب ۔ پروفیسر عبدالحمید[33]
صاحب ۔ تحصیلدار[34] عاشق احمد صاحب ۔

مذکورہ بالا حضرات تو مقامی تھے ان کے علاوہ باہر سے بھی لوگ برابر آتے رہتے اور جو بہار اور چہل پہل اب سے پہلے مولوی نثار اللہ صاحب کی کوٹھی کو نصیب تھی وہ اب اس غریب کی جھونپڑی کے حصہ میں آگئی، بہرحال کوئی محل ہو یا جھونپڑی اہل اللہ کی نظر میں دونوں یکساں ہیں۔ جس طرح سے دین کا کام وہاں سے ہو رہا تھا اسی طرح سے معرفت کی نہر اب یہاں سے بہنے لگی اور الحمدللہ اہل گورکھپور اس سے سیراب اور فیض یاب ہونے لگے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ لوگ اس فکر میں بھی رہنے لگے کہ حضرت والا کے لئے کوئی مستقل مکان کہیں مل جاتا تو حضرت کا قیام یہیں گورکھپور میں مستقل ہو جاتا اس لئے ہر شخص اس کوشش میں رہنے لگا کہ کہیں کوئی مکان مل جائے لیکن خدا کے علم میں تو اور ہی کچھ تھا اسلئے خاطر خواہ اور مناسب حال کوئی مکان نہ ملنا تھا نہ ملا۔ چنانچہ چند ہی (یعنی ۶، ۷) ماہ یہاں قیام کے گذرے تھے کہ سفر الہ آباد کے اسباب پیدا ہونے شروع ہو گئے یعنی حضرت والا ایک بار پھر سخت بیمار پڑے علاج کس کس کا نہیں ہوا گورکھپور کے سب ہی حکیم ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا لیکن ہوا یہ کہ ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

بالآخر مرض میں اضافہ اور شدت اس امر نے بھی پیدا کر دی کہ حضرت والا کو ہچکیاں آنی شروع ہو گئیں۔ ہر ہر منٹ پر دو چار بار مسلسل ہچکی آنے لگی جس کو دن میں تو لوگوں سے بات وغیرہ کر کے کسی طرح گذارا گیا مگر رات میں بھی وہ بند نہ ہوئی جسکی وجہ سے حضرت کو نیند آنی مشکل ہو گئی معلوم ہوتا کہ شاید اب نیند آجائیگی کہ اتنے میں دوسری بار ہچکی آکر جگا دیتی۔ ادہر علاج معالجہ میں مزید اہتمام کیا گیا، بار بار دوا تبدیل کیجانے لگی اور داخلی، خارجی جو جو تدابیر سمجھ میں آئیں کی گئیں اور تجربہ میں جو چیز اسکے روکنے کی آچکی تھی ایک ایک کر کے سب کو آزمایا گیا مگر کوئی نفع نہ ہوا۔ جب وہاں کے سب حکیم ڈاکٹروں کا نمبر ختم ہو گیا اور اگلا دن آیا اور ہچکی پھر بھی نہ بند ہوئی تو خدام بھی پریشان ہو گئے اور حضرت والا پر تو جو تکلیف مسلسل ہچکی کے سبب سے نیز ۴۸ گھنٹے سے نہ سونے کی وجہ سے گذر رہی تھی وہ حضرت ہی جانتے تھے۔

خدام کی دوڑ دھوپ کو بے اثر دیکھکر نیز معالجین کی مایوسی ملاحظہ فرما کر اور ان سب سے زیادہ خود اپنی تکلیف اور ضیق کو محسوس فرما کر حضرت والا نے دوسرے یا تیسرے دن مولوی امجد اللہ سے فرمایا کہ مولوی امجد اللہ کچھ تدبیر کروگے یا اسی طرح میرے تڑپنے کا تماشہ دیکھو گے۔ جاؤ مشورہ کرو لوگوں سے کہ کیا ہونا چاہیئے؟ حضرت والا کا اس سے نشاء یہ تھا کہ قاری مبین صاحب اور دوسرے خاص لوگوں سے مشورہ کر کے مجھے بتاؤ کہ کیا اب ہونا چاہیئے۔ مولوی صاحب موصوف نے چند حضرات کو لیکر مشورہ کیا اور حاضر ہو کر حضرت سے عرض کیا کہ حضرت سب لوگوں کا مشورہ یہ ہے کہ علاج کے لئے کسی اور جگہ چلنا چاہیئے۔ حضرت بھی چاہتے یہی تھے لیکن خود اپنی زبان سے فرمانا نہیں چاہتے تھے اس لئے جیسے ہی انھوں نے یہ کہا حضرت نے فرمایا ہاں ٹھیک رائے تو ہے۔ پھر کہاں چلوگے مولوی صاحب نے فرمایا حضرت اس مسئلہ پر بھی گفتگو ہو چکی ہے وہ یہ کہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ لکھنؤ چلا جائے وہاں متعدد اطبا رموجود ہیں اور کچھ لوگ الہ آباد کے متعلق رائے دے رہے ہیں حضرت والا نے فرمایا کہ سب کو بلا لیجئے اور میرے سامنے گفتگو کیجئے اور بتایئے کہ لکھنؤ کو کس بنا پر ترجیح ہے اور الہ آباد جانے میں کیا نفع ہے

تاکہ میں بھی سنوں اور پھر کوئی فیصلہ کرسکوں۔ سب لوگ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ الہ آباد میں قیام کی سہولت تھی کہ خدام خاص موجود تھے اور لکھنؤ میں اطبار کی کثرت تھی۔ حضرت والا نے فرمایا کہ الہ آباد میں بھی تو آخر طبیب ہوں گے لوگوں نے عرض کیا جی ہاں ہیں، حکیم احمد عثمانی صاحب ایک اچھے اور حاذق طبیبوں میں سے ہیں فرمایا کہ مولوی حکیم فخر صاحب مرحوم گو اب نہیں ہیں مگر ان کے کوئی شاگرد تو آخر ہوں گے ہی؟ بس اس سے حاضرین نے سمجھا کہ حضرت کا منشار بھی الہ آباد ہی تشریف لیجانے کا ہو رہا ہے اس لئے کسی نے اسکے خلاف پر کچھ اصرار نہیں کیا اور سب نے الہ آباد ہی تشریف لیچلنے کی رائے دی۔

الغرض جب یہ طے ہوگیا کہ علاج یونانی ہوگا اور الہ آباد چلنا ہے تو حضرت والا نے مولوی امجد اللہ صاحب ہی سے فرمایا کہ جائیے آپ موٹر کا انتظام کیجئے۔ کچھ دیر کے بعد مولوی صاحب نے واپس آکر عرض کیا کہ حضرت ایک نہایت ہی بڑی اور آرام دہ گاڑی کا انتظام ہوگیا ہے وہ کل صبح نو بجے یہاں آجائیگی۔ حضرت والا اس پر بآسانی لیٹ کر سفر فرماسکیں گے حضرت نے فرمایا جزاک اللہ۔ اور فرمایا کہ میرے ہمراہ آپ چلئے گا اور یہ مولوی حکیم بشیرالدین بھی چلیں گے۔ مولوی جامی کو لے لیجئے گا اور اپنے ملازم مشرف کو۔ بس اتنے ہی آدمی ہمراہ چلیں گے۔ اور الہ آباد کے کوئی صاحب ہوں تو انکو بھیجکر یا ٹیلیفون سے حاجی عبدالوحید اور حاجی شفیع اللہ صاحب کو اطلاع کردیجئے کہ میں الہ آباد کل موٹر سے آرہا ہوں وہاں خاص خاص احباب کو بھی مطلع کردیں چنانچہ الہ آباد فون کردیا گیا۔ حاجی عبدالوحید صاحب نے حاجی عبدالحکیم صاحب اور ان کے برادرِ خورد مولوی عبدالمجید صاحب کو بھی حضرت والا کی تشریف آوری کی اطلاع کردی۔

اب اہل الہ آباد کی مسرت کا اندازہ کرنا مشکل تھا کہ انھیں حضرتؒ کے تشریف لانے کی خبر سے کس درجہ خوشی تھی۔ مولوی عبدالمجید صاحب وغیرہ کے

پاس اندنوں کا رموجود تھی اسلئے ان حضرات نے باہم یہ مشورہ کیا کہ ہم دونوں بھائی اور وہ دونوں حاجی یہ چاروں آدمی گورکھپور سے آنے والی سڑک پر دس بیس میل آگے پہونچکر حضرت والا کا استقبال کریں گے۔

یہاں گورکھپور کے لوگوں میں اس خبر سے صف ماتم بچھ گئی تھی اور یہ خبر سارے شہر میں گونج اٹھی کہ حضرت والا توبسلسلہ علاج الہ آباد تشریف لیجا رہے ہیں یہ سنکر لوگ جوق در جوق آنا شروع ہوئے حضرت والا نے بھی اپنے اخلاق کریمانہ سے سب کو نوازا یعنی سب سے ملاقات فرمائی اور سب سے اپنے لئے دعا کی درخواست فرمائی اور لڑکیوں اور گھر کے لوگوں کی تسلی فرمائی اور تقریباً ۱۰ بجے دن کو گورکھپور سے الہ آباد کے لئے روانہ ہو گئے احباب کا خاصا مجمع موٹر کے پاس کھڑا تھا ادہر موٹر چل پڑی ادہر سب لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے کہ دیکھئے اب حضرت تشریف لاتے بھی ہیں یا نہیں ؟

موٹر اس قسم کا تھا کہ جس میں وزرار وغیرہ بالعموم چلا کرتے ہیں نہایت ہی کشادہ اور آرام دہ سیٹ کہ جس میں حضرت والا باسانی لیٹ سکتے تھے۔ حضرت اقدس کے پائنتی ایک گوشہ میں یہ راقم (جامی) بیٹھا، ڈرائیور کے پاس آگے مولوی احمد اللہ صاحب حکیم بشیر الدین صاحب بیٹھے اور پیچھے سامان رکھنے کا جو حصہ ہوتا ہے وہ کھول دیا گیا تو اچھا خاصا ایک مختصر سا حجرہ نکل آیا اسمیں میاں مشرف صاحب مع سامان بٹھلائے گئے گاڑی پر بیٹھکر باوجود اسکی تیز رفتاری کے ہچکولے بھی بہت معمولی لگتے تھے۔ ابھی شہر سے باہر ہوئی ہی تھی کہ حضرت نے کہا مجھے اٹھا کر بٹھا دو باہر کا سبزہ زار اچھا معلوم ہوتا ہے طبیعت کو اسے دیکھکر فرحت حاصل ہوتی ہے۔ ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ یا تو حضرت پر ایسی نقاہت تھی کہ لیٹنا بھی دوبھر تھا یا اب ماشاء اللہ تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھکر باہر کی سیر فرمانے لگے اور بار بار سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرماتے کہ الحمد للہ خوب فرحت حاصل ہو رہی ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ حکیم صاحب کا کمرہ جس میں حضرت والا کا قیام تھا ذرا بند بند سا تھا اور حضرت اقدس ہمیشہ کھلی جگہ اور کھلی ہی فضا کے

رہنے کے عادی تھے طبع والا پر ایسی بند اور تنگ جگہ کا قیام بھی اب تک سبب
ضیق ہی بنا ہوا تھا۔ چنانچہ حضرت والا کا معمول تھا کہ صبح و شام کو باہر تفریح کے لئے
تشریف لے جاتے تھے ادہر چند دنوں علالت کے سبب باہر جانا ہی نہیں ہو رہا تھا
اس لئے اندر کمرے میں بند بند طبیعت گھبرا بھی گئی تھی چنانچہ آج سفر کے سلسلہ میں
کھلی فضا جو ملی تو اسکی وجہ سے بڑا انشاط محسوس ہوا اور کہنا چاہیئے کہ گویا آدھا مرض ہی
جاتا رہا لیکن ہچکی برابر چلی آرہی تھی اس تفریح اور سفر نے گو اسکی جانب سے توجہ کم ضرور
کردی تھی مگر وہ ختم نہ ہوسکی۔ یہ سفر گورکھپور سے چلکر بڑھل گنج پھر وہاں سے گھا گھرا
دریا پار کرکے دوہری گھاٹ وہاں سے اعظم گڈھ جونپور۔ مچھلی شہر۔ بادشاہ پور
پھولپور ہوتے ہوئے الہ آباد آنے کا تھا۔ چنانچہ بڑھل گنج ہی میں ہچکی کی تکلیف
پھر ذرا شدت پکڑ گئی ایسی کہ حضرت والا کو الجھن ہونے لگی جو کچھ دوائیں ہمراہ تھیں
استعمال کرائی جارہی تھیں لیکن ان سے نفع نہیں ہو رہا تھا بالآخر خود حضرت والا ہی نے
فرمایا کہ شاید تھانہ بھون میں ایک بار کسی کو اسی نوع کی تکلیف ہوگئی تھی تو کسی
حکیم صاحب نے گرم گرم دودھ پلایا تھا جس سے افاقہ ہوگیا تھا فوراً اسکا بھی انتظام
کیا گیا لیکن اس سے بھی کوئی خاص افاقہ نہ ہوا۔ پھر دوہری گھاٹ میں پہونچکر خود
حضرت ہی نے فرمایا کسی موقع پر ہچکی کے مرض میں کسی طبیب نے املی کے بیج (چیاں)
کو پیسکر تالو پر رکھوایا تھا اگر اسکا انتظام ہوسکے تو کرو۔ اب سفر میں چیاں دستیاب ہونے
سے زیادہ دشوار اسکا کوٹنا اور پیسنا تھا اس موقعہ پر اس شعر کی بالکل تصدیق ہوگئی کہ

دردِ سر کے واسطے صندل بتاتے ہیں طبیب اسکا گھسنا اور لگانا دردِ سر یہ بھی تو ہے

بہرحال دوہری گھاٹ کی آبادی بڑی تھی پنساریوں کے یہاں چیاں تلاش کیا گیا تو
مل گیا پھر کسی مسلمان کا گھر تلاش کیا گیا جہاں اسکے کوٹنے پیسنے کا بھی انتظام ہوگیا
چنانچہ تیار کر کے حضرت والا کے تالو پر اسکو رکھدیا گیا مشہور ہی ہے کہ حرکت میں خدا نے
برکت رکھی ہے اس اتنی دوا دوش کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی منٹ کے بعد حضرت والا کی
تین دن سے مسلسل آنے والی ہچکی بند ہوگئی اور موٹر کی معتدل حرکت اور ٹھنڈی

ہوا کے برابر لگنے رہنے کیوجہ سے حضرت والا کو نیند آگئی چنانچہ اعظم گڈھ گذرا اسکے بعد جون پور گذرا مگر حضرت والا چونکہ کئی شب کے جاگے ہوئے تھے سوتے ہی رہے بالآخر مچھلی شہر کے قریب آنکھ کھلی۔ نماز ظہر کا وقت تو ہوچکا تھا لیکن اس خیال سے کہ کہیں حرکت وغیرہ کیوجہ سے ہچکی کا دورہ دوبارہ نہ پڑجائے یہی مناسب سمجھا گیا کہ جس قدر زیادہ راستہ طے ہوجائے اچھا ہے حضرت سے بھی عرض کردیا گیا کہ نماز آگے چل کر پڑھی جائے گی۔ ماشاء اللہ موٹر بھی تیز رفتار تھی بات کی بات میں مچھلی شہر سے بادشاہ پور آیا اور ذرا ہی دیر کے بعد پھولپور گذرا۔ راستہ کے لوگ موٹر کو تعجب کی نگاہوں سے دیکھتے تھے دور سے اسکو آتا ہوا دیکھکر خیال کرتے تھے کہ شاید کوئی وزیر صاحب کہیں تشریف لے جارہے ہیں لیکن مسافرین کی ریش دیکھکر متحیر ہوتے تھے کہ ان لوگوں کو ایسی کار میں سوار ہونے کا حق کیسے ملا' یہ کون لوگ ہیں ؟ انھیں کیا خبر تھی کہ اس میں وزیر ہی نہیں سلطنت دین محمدی کا ایک شاہ سفر فرمارہا ہے۔ بہرحال ادہر کا یہ سفر بہت جلد طے ہوا اور تقریبًا دو ڈھائی بجے الہ آباد سے بارہ پندرہ کیلومیٹر قبل ایک میدان میں جہاں سڑک کے کنارے ایک پختہ کنواں تھا موٹر روکی گئی تاکہ نماز ظہر سے فراغت حاصل کرلی جائے۔ حضرت والا کو موٹر کے اندر ہی ایک سلیپچی میں وضو کرادیا گیا۔ حضرت نے تنہا موٹر ہی میں بیٹھے بیٹھے نماز ادا فرمائی اور ہم لوگ استنجے اور وضو سے فارغ ہوکر سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ الہ اباد کا وہ استقبالیہ قافلہ موٹر پہ حضرت والا کی آمد آمد کا انتظار کرتے کرتے یہاں تک آپہونچا۔ ہم لوگوں کو دور سے دیکھکر پہچان لیا اور سب لوگ اتر کر حضرت والا سے ملے۔ ان آنے والوں میں حسن منزل کے حاجی عبدالوحید صاحب اور حاجی شفیع اللہ صاحب۔ اور حاجی عبدالحکیم صاحب مالک اسرار کریمی پریس اور ان کے برادران خورد مولوی عبدالمجید صاحب اور عبدالحمید صاحب بھی تھے۔ مولوی عبدالمجید صاحب سے تو آپ حضرات رسالہ کے واسطہ سے بخوبی واقف ہوں گے۔ ان لوگوں سے ملکر حضرت والا کو بھی بہت ہی

مسرت ہوئی۔ ان میں سے پہلے کے دو حضرات ہی دراصل اسوقت حضرت والا کے میزبان تھے۔

نماز سے فراغت کے بعد پھر بقیہ سفر شروع ہوا ان حضرات نے حضرت والا سے عرض کیا کہ اجازت ہو تو ہم لوگ آگے چلے جائیں اور وہاں کا انتظام کریں لوگوں کو اطمینان بھی دلا دیں کہ حضرت تشریف لا رہے ہیں۔ حسن منزل میں بہت سے لوگ دیر سے جمع ہیں۔ وہ لوگ تو اجازت لیکر آگے چل دیئے اور اب تک راستہ کی رہبری مولوی امجد اللہ صاحب کر رہے تھے نیز یہ کہ ہر موڑ اور چوراہوں پر بورڈ بھی لگے ہوتے ہیں اس سے ڈرائیور خود بھی سمجھ لیتا ہے کہ الہ آباد جانے کے لئے کس طرف چلنا ہے لیکن اب یہاں سے کچھ ہی دور چلکر گنگا کا پل (پھا پھامئو) پار کر کے شہر آرہا تھا اسلئے یہاں سے حسن منزل تک پہونچنے کے لئے کونسا راستہ اختیار کیا جائے اسکی رہبری کے لئے ع قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند۔ چنانچہ واقعی اس شہر کی تمام سڑکوں اور گلیوں میں بارہا آنے جانے کے باوجود تیز رفتار موٹر پر راستہ طے کرتے وقت میں سیج مچ بالکل بھوچکا ہی ہو رہا تھا۔ خیر پھاپھامئو سے کٹرہ آیا وہاں سے ٹرافک کی کثرت کی زحمت سے بچنے کے لئے میں نے بجائے چوک آنے کے بڑی سڑک سے آنند بھون کی طرف سے عیدگاہ ہوتے ہوئے منٹھی گنج کی جانب سے شہر کے جنوبی جانب کی بڑی سڑک پکڑلی اور گول پارک ہوتے ہوئے اسلامیہ کالج کے پاس پہونچا یہیں سے داہنی جانب حسن منزل کو ایک گلی گئی تھی جس میں سے کہ موٹر بدقت ہی گذر سکتی تھی مگر موٹر کی تیز رفتاری اور پیچھے وہ بھی دوسری جانب بیٹھے ہونے کی وجہ سے گلی گذر گئی اور میں ڈرائیور سے موڑنے کے لئے کہہ نہ سکا۔ مجھے خود بھی الجھن تھی مگر دو منٹ میں موٹر بڈھے تعزیے کے چوارہے پر تھی، تب میں بولا کہ ہم لوگ آگے آگئے ہیں موٹر پیچھے لوٹائیے۔ یہ سننا تھا کہ حضرت کو تغیر ہوا اور میری تو گویا جان ہی نکل گئی واقعی اسقدر دور دراز کے سفر کا تکان پھر ایسی علالت میں بجائے جلدی کے اگر دیر ہو جائے تو کسقدر تکلیف

کی بات ہے۔ بہرحال موٹر بدقت تمام اس سڑک پر موڑا گیا اور حضرت نے خفا ہوکر مولوی امجد اللہ صاحب سے فرمایا کہ تم پوچھو جی لوگوں سے کہ حسن منزل کا راستہ کون سا ہے۔ انھوں نے دو کانداروں سے دریافت کیا لوگ پہلے سے موٹر اور موٹر والوں کی جانب متوجہ تھے، میں اسی شہر بلکہ اسی محلہ کا باشندہ ہی تھا لوگ مجھے بھی پہچانتے ہی تھے غضب یہ ہوا کہ مولوی صاحب کے راستہ دریافت کرنے پر ایک صاحب کہتے ہیں کہ وہ کیا موٹر میں حسن منزل والے بیٹھے ہیں، ظالم نے یہ کہکر حضرت والا کی ناراضگی میں مزید اضافہ کر دیا جو بالکل بجا بھی تھا کہ وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ کو حق تعالےٰ نے موقع عتاب میں ذکر فرمایا ہے عالم سے جہالت کا صدور بلاشبہ شدید جرم ہے۔ بہرحال گلی سے مڑکر حسن منزل پہونچے یہاں لوگ بیچینی کے ساتھ حضرت والا کا انتظار کر رہے تھے کیونکہ ہمارے پہونچنے میں کچھ دیر ہوگئی تھی کچھ تو طویل راستہ اختیار کرنے کے سبب اور کچھ راستہ بھٹک جانے کی وجہ سے۔ بہرحال یہ آخری تھوڑی سی تکلیف تو حضرت والا کو ضرور ہوگئی باقی اسکے علاوہ یوں سفر نہایت آرام سے طے ہوا، حضرت اقدس کے نشاط میں بھی اضافہ تھا اور ہچکی بھی الحمدللہ بند ہی ہوچکی تھی۔

اس دفعہ حضرت اقدس کا قیام حسن منزل ہی میں حاجی شفیع اللہ صاحب (ایڈ، مرچنٹ) کے مکان پر ہوا اور چند ہی دنوں کے بعد حضرت نے گورکھپور سے سب متعلقین کو بھی بلوالیا یہاں کے علاج سے نفع ہوا اور قلیل ہی عرصہ میں حضرت بالکل صحتمند ہو گئے۔ متعلقین کا قیام حاجی شفیع اللہ صاحب کے مکان کے متصل ہی حاجی عبدالوحید صاحب (ڈیری والے) کے مکان کے اوپری حصہ میں ہوا۔ طالبین کے لئے دو ایک کمرے قریب ہی خالی کرا دیئے گئے۔ اور طلبہ کے قیام کا انتظام ذرا فاصلہ پر ایک دوسرے مکان میں کر دیا گیا۔ اس طور پر خانقاہ اور مدرسہ بھی حضرت والا کے ساتھ ہی ساتھ اب الہ آباد ہی منتقل ہوگیا تھا۔

اس بار کے قیام میں چونکہ حضرت والا اپنے سارے ہی متعلقین کے

ہمراہ تشریف لائے تھے اس لئے تمام مصارف کا تعلق خود حضرت والا ہی کا رہا تاہم اس میں شک نہیں کہ ان دونوں حاجی صاحبان نے حضرت والا کو آرام پہونچانے میں بڑے ایثار سے کام لیا ہر وقت خدمت میں حاضر رہتے اور ہر ضرورت کے پورا کرنے میں ہر ایک دوسرے سے سبقت کرتا۔ حسن منزل میں چونکہ حضرت والا کے خدام بھی بکثرت تھے اسلئے حضرت اقدس کو یہاں بہت آرام ملا۔ راقم کے والد ماجد مولانا سراج الحق صاحب رحؒ۔ استاذی حافظ محمد یٰسین صاحب مدظلہ۔ ڈاکٹر محمد ادریس صاحب۔ برادرم عبداللطیف صاحب اور خود دونوں حاجی صاحبان اور انکے خاندان والے سب خدمت کے لئے حاضر ہی رہتے۔ علاوہ اسکے مولوی عبدالمجید صاحب ڈاکٹر صلاح الدین صاحب۔ ماسٹر محمد ابراہیم صاحب اور دور ونزدیک کے سبھی حضرات برابر حضرت والا کی راحت رسانی کی فکر رکھتے تھے۔

مولوی عبدالمجید صاحب منیجر اسرار کریمی پریس کے پاس ان دنوں کار تھی روزانہ وہ صبح و شام تشریف لاتے اور حضرت کو حسب معمول تفریح کے لئے شہر سے باہر کھلی جگہ کسی طرف لے جاتے۔ ڈاکٹر صلاح الدین صاحب کے والد داروغہ نجم الدین احمد صاحب حضرت مولانا تھانوی رحؒ سے بیعت تھے اور حضرت تھانوی کے بعد ان کا ہمارے حضرت سے تعلق تھا انکے ہمراہ ڈاکٹر صلاح الدین صاحب گورکھپور ہی میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے اسلئے حضرت والا ان سے متعارف تھے اور حضرت والا کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا کیا کہ اپنے ساتھ کسی طبیب کو ضرور رکھتے تھے، وطن میں حکیم مولوی بشیرالدین صاحب تھے، گورکھپور میں پہلے حکیم ابوالکلام صاحب اور بعد میں حکیم وصی احمد صاحب رہے الہ آباد میں یہ منصب ڈاکٹر صلاح الدین صاحب کو حاصل ہوا جو کہ طبیہ کالج الہ آباد سے فارغ ہونے کیوجہ سے یونانی طب سے بھی واقف تھے اور چونکہ طبی علاج ہی حضرت کے مزاج کے موافق پڑتا تھا اس لئے حضرت کو وہی پسند تھا چنانچہ تفریح میں جاتے وقت مولوی عبدالمجید صاحب بھی ہوتے اور ڈاکٹر صلاح الدین رہتے، عبدالمجید صاحب کے بھتیجے موٹر چلاتے تھے

جب طبیعت میں مزید قوت آگئی تو مجلس بھی شروع ہوگئی اور اسباق بھی جاری ہوگئے۔ گرمی کے زمانے میں ۹، ۱۰ بجے کے بعد کم از کم الہ آباد میں تو باہر چلنا پھرنا ہی مشکل ہوجاتا ہے چنانچہ اکبر الہ آبادی نے یہاں کی گرمی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

پڑ جائیں گے اکبر کے بدن میں ابھی چھالے پڑھ کر جو کوئی پھونک دے اپریل، مئی، جون

تو ایسے وقت میں بھلا درس و تدریس بھی کیسے کیجا سکتی ہے اسلئے حضرت یہ کرتے کہ فجر کی نماز کے بعد ہی کبھی دریائے گنگ کی جانب اور کبھی دریائے جمن کی طرف اور کبھی دونوں کے سنگم اور قلعہ اکبری کی جانب میدان میں مکان سے سیر و تفریح کے لئے تشریف لیجاتے۔ چنانچہ قلعہ کے نزدیک جمنا کے کنارے ایک خوشنما پارک تھا جو جو منٹو پارک کے نام سے موسوم تھا اس میں پھولوں کی روشوں اور سبزہ زار لان کے وسط میں ایک سنگ مرمر کا چبوترہ بنا ہوا تھا حضرت والا موٹر سے اتر کر کچھ اسی باغ میں مشی فرماتے اور پھر اسی چبوترہ پر آکر بیٹھ جاتے گرمی کی صبح میں سنگ مرمر کا ٹھنڈا چبوترہ بھی ایک پرلطف جائے نشست ہوتا ہے وہیں مولوی عبدالمجید صاحب حضرت کو ایک بسکٹ کے ہمراہ ایک فنجان چائے کا ناشتہ کراتے اور طلبہ کو حکم تھا کہ یہ لوگ اسی جگہ پر پہونچ جائیں اور یہیں آکر سبق پڑھیں۔ چنانچہ ہم لوگ بھی نماز فجر کے بعد ہی فتح الباری وغیرہ بغل میں دبائے ہوئے تیز قدم سے وہاں جاتے جب بھی تقریباً آدھ گھنٹہ میں وہاں پہونچتے تھے۔ اسی چبوترہ پر بیٹھکر مفتوں حدیث کا سبق ہوا ہے جس میں مخدوم محترم قاری محمد مبین صاحب ہوتے۔ مولوی قمرالزماں صاحب سلمہٗ ہوتے۔ مولانا محمد حنیف صاحب جونپوری رہتے۔ راقم الحروف ہوتا ــــ اور یاد پڑتا ہے کہ کویا گنج کے مولوی منظور الوحید صاحب اور مولوی انوار غنی صاحب بھی شریک درس تھے۔ سبق کے بعد بچی ہوئی آدھی فنجان چائے کبھی کبھی ہم سب کو بھی ملجاتی جو الحمدللہ ہم سب کے لئے اسکا مصداق بنتی کہ ؎

مستی کے لئے بوئے مئے تند ہے کافی میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

آہ آج یاد آرہا ہے کہ اس مشقت میں بھی کیسا لطف تھا اور دیکھا جارہا ہے کہ جو جو طلبہ

حضرتؒ کے اس درس میں شریک تھے سب ہی نے ایک سے ایک بڑھکر راحت اور عزت کی زندگی پائی اور ہر ایک کو اپنے اپنے حلقہ میں خاص مرتبہ ملا اور بقدر نصیب شہرت حاصل ہوئی فللہ الحمد علیٰ ذٰلک ۔

تفریح سے واپسی کے بعد مجلس کا وقت ہو جاتا بلکہ حضرت والا کی واپسی سے پہلے ہی سے لوگ آنا شروع ہو جاتے اور حاجی شفیع اللہ صاحب ہی کے مکان کی دوسری منزل کے وسیع صحن میں مجلس ہوتی ۔ یوں تو مجلس میں کافی لوگ شرکت کرتے تھے لیکن الٰہ آباد کے خاص خاص حضرات حسب ذیل تھے جو برابر ہی شریک ہوتے تھے :۔

[1] مولانا محمد میاں صاحب فاروقی الٰہ آبادی ۔ [2] قاری حبیب احمد صاحب مظاہری کٹرہ ۔ [3] جناب سید حسین صاحب کمشنر (جب الٰہ آباد میں موجود ہوتے) ۔ [4] جناب شاکر حسین خاں صاحب مرحوم ۔ [5] جناب حافظ محمد یٰسین صاحب مدظلہٗ ۔ [6] والدی جناب مولانا سراج الحق صاحبؒ ۔ [7] حاجی شفیع اللہ صاحب ۔ [8] حاجی عبد الوحید صاحب ۔ ڈاکٹر [9] محمد ادریس صاحب ۔ [10] محمد طاہر صاحب مرحوم ۔ [11] مولوی سید محمد ابراہیم صاحب ابن حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ ۔ [12] پروفیسر محمد احمد صاحب صدیقی مرحوم [13] پروفیسر طفیل احمد صاحب ۔ [14] محمد احمد صاحب ٹیلر ماسٹر مرحوم ۔ [15] مولانا عبد القدوس رومی صاحب [16] شاہ عبد الباقی صاحب ۔ [17] ڈاکٹر صلاح الدین صاحب صدیقی ۔ [18] مولوی عبد المجید صاحب مدیر رسالہ ۔ [19] حاجی عبد الحکیم صاحب مرحوم ۔ [20] حاجی عبد الحمید صاحب برادر معظم مولوی عبد المجید صاحب ۔ [21] مولانا عبید الرحمٰن صاحب مرحوم الٰہ آبادی ۔ [22] پروفیسر غلام مرتضیٰ صاحب ۔ [23] فخر الاسلام صاحب وکیل ۔ [24] انعام الحق صاحب ایڈوکیٹ ۔ [25] محمد الیاس صاحب وکیل ۔ [26] محمد قمر صاحب انصاری ۔ [27] نثار احمد صاحب ۔ [28] ڈاکٹر صابر حسین صاحب [29] حاجی عبد الصمد صاحبؒ ۔ [30] حاجی ستار صاحبؒ ۔ [31] حافظ شمس الحق صاحب ۔ [32] بھائی احمد سعید صاحب ۔ [33] منیر احمد صاحب صدیقی ۔ [34] بھائی اشرف علی صاحب ۔ [35] حاجی عبد الاحد صاحب رنگ والے ۔ [36] بھائی عبد اللطیف صاحب حسن منزل ۔ [37] حاجی فاروق صاحب

قاری عبداللطیف[۳۸] صاحب مرحوم۔ ڈاکٹر محمد فاروق[۳۹] صاحب۔ حکیم سعید[۴۰] صاحب۔ بھائی محمد خلیل[۴۱] صاحب انبالہ۔ قاری کبیر[۴۲] صاحب۔ حاجی وکیل[۴۳] احمد صاحب (حضرتؒ کے آخری مرید)۔ مولوی محمد رفیع[۴۴] صاحب بن حاجی محمد شفیع صاحب۔ ذکی اللہ[۴۵] خاں صاحب۔ داروغہ نجم الدین[۴۶] صاحب والد ماجد ڈاکٹر صلاح الدین صاحب۔ داروغہ نظامت اللہ[۴۷] صاحب۔ داروغہ مشتاق[۴۸] احمد صاحب اعظمی۔ شاہ عبید اللہ[۴۹] صاحب۔ شاہ عبدالمعبود[۵۰] صاحبؒ۔

اور اطراف الٰہ آباد سے کبھی کبھی یہ حضرات تشریف لاتے:۔

مولانا محمد فاروق[۵۱] صاحب اتراؤں۔ حکیم محمد شفیع اللہ[۵۲] صاحب محی الدین پور۔ بھائی حاجی محمد شفیع[۵۳] صاحب چائل۔ چودھری حبیب[۵۴] الرحمٰن صاحب بمرولی۔ مولوی مقبول[۵۵] احمد صاحب اسرولی۔ حکیم حبیب[۵۶] اللہ صاحب اتراؤں۔ عبدالقدوس[۵۷] صاحب ہنڈیہ۔ بھائی مشرور اللہ[۵۸] صاحب۔ حکیم عبدالشکور[۵۹] صاحب۔ ڈاکٹر نواب[۶۰] صاحب ہنڈیہ۔

پھر جب حضرت والا اپنے ذاتی مکان بخشی بازار میں آ گئے تو حسب ذیل حضرات بھی حضرت والا سے قریب ہوئے:۔

بھائی مسعود[۶۱] احمد صاحب۔ بھائی شعیب[۶۲] احمد صاحب۔ بھائی عبدالشکور[۶۳] صاحب جاوید۔ حافظ عبدالمجیب[۶۴] صاحب۔ بھائی عبدالرزاق[۶۵] صاحب۔ بھائی شریف[۶۶] حسن صاحب۔ بابا منصور[۶۷] صاحب وغیرہ۔

الٰہ آباد تشریف لانے کے بعد تھوڑے ہی دنوں میں حضرت والا کی آمد کا ہر طرف شور ہو گیا اور طالبین کی کافی تعداد مجلس میں ہونے لگی۔ یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ حضرت والا نے لکھنؤ یا الٰہ آباد تشریف لانے کے لئے بوقت مشورہ الٰہ آباد کو جو ترجیح دی تھی تو خود اسکی وجہ بھی حضرت ہی نے کسی موقع پر یہ بیان فرمائی کہ لکھنؤ میں علماء کرام موجود ہیں اور ماشاء اللہ سب کام پر لگے ہوئے ہیں انکی جانب عوام کا مرجوعہ بھی ہے اور لوگوں کو دینی نفع بھی ہو رہا ہے ایسی صورت میں میں بھی اگر وہاں پہونچ جاؤں گا پیر بنکر تو بیٹھوں گا نہیں کچھ بولوں گا ضرور اور لوگ بھی میرے پاس آویں گے اور میرا کام عام علماء کے کام سے ذرا مختلف سا بھی ہے تو میں اسکو

پسند نہیں کرتا کہ کسی جگہ کے سکون کے ساتھ ہوتے ہوئے کام میں میری وجہ سے کوئی رخنہ پڑے اور انتشار پیدا ہو جائے یہ میرے مذاق کے خلاف ہے۔ چنانچہ اس مذاق کا ذکر کرتے ہوئے حضرت والاؒ نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کو صاف صاف تحریر فرمایا کہ ——— "وہاں یعنی لکھنؤ آنیکو جو فرمایا ہے تو وہاں تو آپ حضرات موجود ہی ہیں اور بھی بہت سے اہل کمال حضرات موجود ہیں، کام کر سکتے ہیں ایسی جگہ جانے سے اور وہ بھی کام کرنے سے میرا ذوق ابار کرتا ہے" — پھر ایسی صورت میں ممکن ہے کسی کو یہ خیال پیدا ہو جائے کہ یہ اقلیم تو پُر تھی یہاں یہ کیوں آگئے یہاں انکی گنجائش نہیں ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو لیکن میں مسلمانوں کے باہم اختلاف کے شائبہ سے بھی دور رہنا چاہتا ہوں چنانچہ یہی وجہ ہوئی کہ میں حضرت تھانویؒ کے بعد تھانہ بھون اور اسکے اطراف میں بھی کہیں سفر کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا کہ بلا ضرورت تھا وہاں حضرت (تھانویؒ) کے بہت سے خلفا موجود ہیں اور کام کر رہے ہیں لوگ ان سے نفع اٹھائیں میری وہاں کیا ضرورت ہے؟ باقی یہ خیال کرنا کہ اہل حق میں بھلا یہ سب باتیں کہاں ہوتی ہیں، حالات سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ میں نے تھانہ بھون میں رہکر دیکھا ہے اور حضرتؒ کے پاس رہکر سیکھا ہے اسلئے اہل زمانہ کے حالات سے کچھ کچھ واقفیت ہوگئی ہے ورنہ میں بھی یہی سمجھتا اور مغالطہ میں پڑا رہتا اور نقصان اٹھاتا۔ تاریخ کے واقعات دیکھنے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ایسا پہلے بھی ہوا ہے۔ حضرت زکریاؒ ملتانی جب شروع شروع ملتان تشریف لائے تو کتابوں میں لکھا ہے کہ ملتان کے تمام علماء و مشائخ نے متفقہ طور پر باہم مشورہ کر کے حضرت کی خدمت میں دودھ سے لبریز ایک پیالہ بھیجا حضرت زکریا ملتانی نے اس پر ایک پھول رکھدیا اور لانے والے خادم کے ہاتھ ہی اسے واپس فرما دیا اور حاضرین سے فرمایا کہ یہاں کے مشائخ نے لسان اشارت میں مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ یہ اقلیم مشائخ سے اسی طرح پُر ہے جیسے یہ پیالہ دودھ سے پُر ہے اسلئے یہاں آپکی گنجائش نہیں ہے کہیں اور تشریف لیجائیے

تو میں نے اس پر پھول رکھکر جو واپس کر دیا تو اسکا مطلب یہ تھا کہ ابھی اس پیالہ میں باوجود بھرے ہونے کے بھی پھول کی گنجائش ہے، بس میں بھی انشاء اللہ تعالیٰ آپ حضرات کے درمیان اس اقلیم میں مانند پھول ہی کے رہوں گا یعنی آپکے لئے یار شاطر ہی رہوں گا بار خاطر نہ بنوں گا۔ حضرتؒ کے اس جواب کو مشائخ نے بہت پسند کیا اور حضرت کے قیام فرمانے پر راضی ہو گئے۔

اب نہ تو ہر شخص زکریا ملتانیؒ ہے کہ سب کو مطمئن کر سکے اور نہ اُس زمانہ کے وہ علماء و مشائخ سب کے سب علماء سوء اور مشائخ زُور ہی رہے ہونگے مگر بات یہ ہے کہ نفس سب ہی کے اندر ہوتا ہے اور کبھی اختلاف مزاج اور کبھی کبھی مذاق بھی کسی کی تائید سے باز رکھتا ہے۔ اس لئے میں شبہ کا کام بھی کیوں کروں؟ رہا الہ آباد تو اول تو یہاں اپنے لوگوں میں سے ایسا کوئی عالم ہی نہیں ہے جس کا کوئی نمایاں کام ہو اسلئے یہاں کام کی بھی ضرورت ہے اور بوجہ یکسوئی کے نفع کی بھی امید ہے۔

یوں الہ آباد میں مشائخ کے دوائر بہت تھے چنانچہ بارہ دائروں کا یہ شہر کہلاتا تھا لیکن حقیقی اصلاح اور سنت کے مطابق دین کی تعلیم شاید ہی کہیں جاری رہی ہو تمام جگہیں رسوم کا گڑھ اور بدعات کا گہوارہ بنکر رہ گئی تھیں الا ما شاء اللہ۔ اسلئے حضرت اقدس کو یہ احساس تھا کہ گو یہاں اپنے لوگوں کی جانب سے اختلاف کئے جانیکا تو کوئی اندیشہ نہیں ہے لیکن یہ سمجھتے تھے کہ ہمارا کام بھی چونکہ پیری مریدی کی لائن کا ہے (گو الحمد للہ سنت اور شریعت کے مطابق ہے اور اپنے پیش نظر ایک مقصد رکھتا ہے یعنی لوگوں کی اصلاح کرنا، رذائل سے انھیں نکالنا اور فضائل کے ساتھ انھیں متصف کرنا) اسلئے اہل خوانق پر شاید میرا قیام شاق گذرے۔ اسی لئے

نخس منزل میں جب مجلس شروع فرمائی تو مسلسل کئی ماہ تک روزانہ کسی نہ کسی موقع سے حضرت زکریا ملتانیؒ کا یہی واقعہ ضرور بیان فرماتے اور مقتضائے حال کے مطابق ہونے کی وجہ سے اور کچھ حضرت اقدس کا انداز بیان ایسا شیریں ہوتا کہ یہ تکرار طبیعتوں

پرشاق نہ گذرتی بلکہ ہر روز ایک نیا لطف آتا بس یہ معلوم ہوتا کہ سورہ رحمٰن کی تلاوت ہے اور فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن کی حلاوت ہے۔

باقی ہر کام کرنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے جس جگہ کام کرنا ہے پہلے وہاں کی زمین ہموار کرے اور فضا کو سازگار بنائے مخالفین کو دوست بنائے بغیر اس طریقہ کے کہیں کام کرنا دشوار ہوا کرتا ہے حضرت والا کے اس کام میں یہی تعلیم پوشیدہ تھی بلکہ اہل نظر کے لئے بالکل عیاں تھی اور اس میں شک نہیں کہ یہی مسنون طریقہ بھی ہے کہ تبلیغ دین کا جن لوگوں میں کام کرنا ہے ان میں اولاً قبول دعوت کی صلاحیت پیدا کرے۔ چنانچہ حضرت والا نے یہاں ایک کام تو یہ کیا اپنی تقریر میں روزانہ حضرت زکریا ملتانیؒ کا واقعہ بیان فرمایا جس کا اثر یہ ہوا کہ حاضرین بھی اس سے متاثر ہوئے اور ان حاضرین نے غائبین سے جاکر اسکو بیان کیا تو شدہ شدہ جملہ ارباب خوانق تک یہ بات پہونچی کہ حضرت مولانا نے آج یہ بیان فرمایا ہے اور دوسرا کام یہ کیا کہ سب آنے والوں کے ساتھ نہایت ہی خوش اخلاقی سے پیش آئے اور ہر شخص کے ساتھ اسکی حیثیت کے مطابق معاملہ فرمایا یعنی کسی دائرہ سے اگر کوئی صاحب سجادہ تشریف لے آئے تو خاطر مدارات کے علاوہ تسبیح، رومال اور نقد وغیرہ کا کچھ نہ کچھ ہدیہ انکی خدمت میں ضرور پیش فرمایا۔ حضرت والا کے اس خلق کا چرچا بہت جلد پورے شہر میں ہوگیا اور لوگوں نے جو اجنبیت محسوس کی تھی وہ بہت جلد مبدل بہ انس و محبت ہوگئی۔ ہر شخص نے سمجھ لیا کہ نہایت خلیق انسان ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ موافقین نے تو یہ کہنا شروع کیا کہ بہت بزرگ شخص ہیں اور مخالفین بھی اتنا کہنے پر تو مجبور ہو گئے کہ یہ ویسے وہابی نہیں ہیں جیسے اور دیوبندی ہوا کرتے ہیں۔ حضرت والا یہ سنکر ہنستے تھے اور فرماتے تھے کہ بھائی میرا عقیدہ اور مسلک وہی ہے جو حضرت مولانا تھانویؒ کا تھا اور میں اپنے طریقہ میں کچا نہیں ہوں بہت مضبوط ہوں ہاں چونکہ اخلاق کی تعلیم ہی کرتا ہوں۔ حسن خلق کو پسند کرتا ہوں اسلئے خود بھی کوشش کرتا ہوں کہ کسی کو میری ذات سے کسی قسم

کی تکلیف نہ پہونچے اور سناتے تھے کہ بزرگوں نے کہا ہے کہ کوئی کام ایسا نہیں ہے جو درشتی اور سختی سے نکلتا ہو مگر یہ کہ اسکے لئے کوئی ایسا طریقہ بھی ضرور موجود ہوتا ہے جو نرم اور سہل ہو تو انسان کو چاہیئے کہ نرم ہی طریقہ کیوں نہ اختیار کرے۔ اور فرماتے تھے کہ تبلیغ و تعلیم کے لئے نرمی ہی کو متعین سمجھتا ہوں۔ بڑے ہی نفسانیت کا زمانہ ہے انانیت اور تکبر اپنے شباب پر ہے لہٰذا اس دور میں اگر مفید ہو سکتی ہے تو نرمی ہی۔ نرم اخلاق سے پتھر جیسے قلب بھی موم ہو جاتے ہیں اسلئے میں بھی باب اصلاح میں اپنے لوگوں کے ساتھ کچھ سختی کا معاملہ کیوں نہ کرلوں لیکن دوسرے لوگوں کے ساتھ تو بہت نرمی ہی برتتا ہوں۔ چنانچہ یہاں الہ آباد میں بھی اس طرز کا کھلا ہوا فائدہ نظر آیا کہ سوا چند غالی اور متشدد اہل بدعت کے اور سب ہی حضرات ہمارے حضرت سے ملے اور ملکر خوش ہوئے۔ حضرت یہ بھی فرماتے تھے کہ دیکھو میری اس نرمی کا اثر یہ بھی ہوا کہ ہر شیخ اور ہر مقتدا جسکا یہاں ایک مخصوص حلقہ تھا وہ بھی اپنے لوگوں میں میری برائی نہیں کرتا ورنہ اگر ان سب لوگوں کو میں اپنا مخالف بنالیتا تو یہی سب اور دوسرے لوگوں کو میرے خلاف بہکاتے اور پھر میرے لئے کام کرنا دشوار ہو جاتا۔

غرض ان دونوں طریقوں سے حضرت اقدس نے یہاں کی عام فضا میں بہت کچھ سکون کا سامان پیدا فرما دیا اور نہایت اطمینان کے ساتھ دین کا سب کام ہونے لگا مجلسیں بھی ہونے لگیں اور مدرسہ کا بھی کام شروع ہو گیا جب اہل علم کا مجمع ہو گیا تو لوگ فتوے اور مسائل بھی دریافت کرنے لگے باہر سے بھی جو علما کرام اور واعظین عظام الہ آباد آتے وہ حضرت کے در دولت پر ملاقات کے لئے اور کبھی قیام کے لئے تشریف لانے لگے۔ ان تمام چیزوں کے علاوہ اب باہر سے لوگوں کی آمد و رفت بکثرت ہونے لگی الہ آباد کا جائے وقوع ہر لحاظ سے بہت مناسب تھا سب طرف سے گاڑیاں براہ راست آتی ہیں اسلئے آنے والوں کو سفر میں جو سہولت ملی وہ اس سے قبل حضرت کے وطن یا گورکھپور میں حاصل نہ تھی۔ چنانچہ مولانا ابوالحسن[1] صاحب ندوی مدظلہ اور مولانا محمد منظور[2] صاحب نعمانی مدظلہ تو متعدد بار تشریف لائے کبھی کسی دینی جلسہ یا اجتماع میں شرکت

سے کے لئے الہ آباد آنا ہوا تب بھی حضرت والا سے ضرور ملاقات فرمائی۔ حضرت العلامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی بھی یہیں تشریف لائے اور حضرت مولانا ارشاد احمد صاحب مبلغ دارالعلوم دیوبند کا تعلق بھی حضرت والا سے یہیں سے شروع ہوا۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی کا بھی آنا یہیں ہوا۔ اور مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کو تو اپنے بار بار کے آنے میں بہت ہی سہولت ہوگئی۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی بھی یہیں حضرت والا سے ایک عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی جسے حضرت مہتمم صاحب نے اپنے مخصوص انداز بیان میں یوں فرمایا کہ بچپن کے بعد اب بچپن میں حضرت سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ سفر میں آتے جاتے یہاں ہی امیر شریعت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی پھلواری شریف والے بھی تشریف لائے۔ ایک ایک بار مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی اور مولانا اسعد مدنی صاحب کو بھی الہ آباد میں حضرت والا سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ حضرت والا کا یہ طریقہ بطور ایک عادت مستمرہ کے تھا کہ ذی الشرف والمنزلت حضرات کا بہت احترام فرماتے تھے خواہ حضرات علماء ہوں یا مشائخ یا کسی بزرگ کی اولاد ہوں حضرت والا کچھ نہ کچھ ہدیہ ان حضرات کی خدمت میں ضرور پیش فرماتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا حفظ الرحمان صاحب بھی جب رخصت ہونے لگے تو حضرتؒ نے انھیں بھی کچھ ہدیہ پیش فرمایا اور معانقہ فرمایا حالات ہند کے اس زمانہ میں کچھ تشویشناک تھے مسلمانوں پر مظالم ہو رہے تھے ضمناً اسکا ذکر آگیا تو مولانا سیوہاروی نے رخصت ہوتے وقت دعاء کی درخواست کی اور یہ عرض کیا کہ حضرت ان حالات کا ہمیں شدت سے احساس ہے بس حضرت دعاء فرمادیں اور ہمارے حال پر توجہ ضرور فرمائیں انشاء اللہ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم لوگ آپ کے سپاہی ثابت ہوں گے۔

مولانا سیوہاروی کے اس جملہ میں جیسا کچھ تادب۔ انقیاد۔ تسلی اور اور منصب کی شناخت اور تواضع کا اظہار ہے یہی سب امور ایک عالم کی حقیقی صفات تھیں مگر افسوس اب یہ سب باتیں کہاں ؟

اسیطرح سے مولانا حبیب الرحمٰن[11] صاحب اعظمی اور مولانا معراج الحق[12] صاحب دیوبندی کا بھی آنا ہوا۔ ایک دفعہ مولانا شاہ عبدالغنی[13] صاحب پھولپوریؒ اور ایک بار مولانا ظریف احمد[14] صاحب سہارن پوری بھی تشریف لاسے اور جماعت اسلامی کے صدر مولانا ابواللیث[15] صاحب نے یہاں بھی حضرت سے ملاقات کی۔ حضرت مولانا محمد احمد[16] صاحب پرتاپگڈھی بھی اب کبھی کبھی یہاں مجلس میں تشریف لانے لگے اور اور بابا نجم احسن صاحب پرتاپگڈھی نے بھی یہیں حضرتؒ کو مسند ارشاد پر بیٹھا ہوا پہلی بار دیکھا تو فرط مسرت سے یہ اشعار موزوں فرمائے ؎

دیکھ دیوانے دیکھ اسے احسنؔ ۔۔۔ یہ بھی گلشن ہے اشرفی گلشن

مجلس حضرت وصی اللہ ۔۔۔ ہے نمود بہار تھانہ بھون

بابا نجم احسن صاحب کے اس فرمانے پر کہ ؎

مجلس حضرت وصی اللہ ۔۔۔ ہے نمود بہار تھانہ بھون

راقم کو بے ساختہ ایک بات یاد آگئی کہ وہ یہ کہ ہمارے حضرتؒ یہ فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح سے یو۔پی میں اللہ تعالیٰ نے مولانا تھانویؒ کو پیدا فرما کر ان سے دین و اصلاح کا اتنا بڑا کام لیا اسیطرح سے بہار میں حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ کا یہی مقام تھا اور یہ فرماتے کہ اگر اسی طرح کے دو چار بزرگ اور ہندوستان میں پیدا ہو جاتے تو سارا ہندوستان ہی دین کے رنگ میں رنگ جاتا اسی طرح کی ایک بات ایک اور بزرگ فرماتے تھے کہتے تھے کہ حضرت تھانویؒ کے خلفا تو بہت ہوئے ہیں اور سب ہی سے اللہ تعالےٰ نے دین کا کام لیا لیکن ان میں سے دو حضرات ایک مولانا محمد حسن صاحب امرتسریؒ اور دوسرے ہمارے حضرت مصلح الامۃ نور اللہ مرقدہٗ ان میں سے ایک نے پاکستان کو رنگ دیا دوسرے کا فیض ہند میں عام ہوا۔ چنانچہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ بابا نجم احسن صاحب حضرت والا کی مجلس کو "نمود بہار تھانہ بھون" فرمارہے ہیں۔ آخر کچھ تو دیکھا ہوگا؟ بات یہ ہے کہ حضرت تھانوی کے مجاز تھے، بہار تھانہ بھون دیکھ چکے تھے۔ ہمارے حضرت کی مجلس کو

اسکا آئینہ دیکھکر اصل کی یاد تازہ ہوگئی جو قلب سے زبان پر آگیا۔ ایک پیر بھائی کا اپنے پیر بھائی کی اسطرح سے تعریف کرنا یا تو پہلے زمانہ کے ساتھ مخصوص تھا یا اہل اخلاص ہی کا شیوہ ہوا کرتا ہے جو اس زمانہ میں اگر نایاب نہیں تو نادر اور کمیاب تو ضرور ہی ہوگیا ہے۔ یہ تو آپ نے چمن تھانہ بھون کے ایک گل کی تعریف سنی اب ذرا دوسرے گل کی تعریف بھی سنیئے۔ مفتی مولانا محمد شفیع صاحب کتنے بڑے شخص ہوئے ہیں، حضرت تھانویؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے ایک مرتبہ انکو حضرت مولانا محمد حسن صاحب امرتسری کی مجلس امرتسر میں شرکت کا اتفاق ہوا اس کا تأثر خود انکی زبان سے سنیئے اور لطف حاصل کیجئے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

یہ اعجوبہ بفیض و فضل مولانا حسن دیکھا ۔۔۔ کہ امرتسر میں ہم نے آج اک تھانہ بھون دیکھا
سنا وہ درس قرآن دل کی آنکھیں کھل گئیں جسنے ۔۔۔ معارف ہائے قرآنی کا دریا موجزن دیکھا
شریعت میں طریقت کو طریقت میں حقیقت کو ۔۔۔ کھلی آنکھوں سے ہر حاضر نے گویا ہمقرن دیکھا

ہمارے مفید مطلب تو بس یہی اشعار تھے لیکن ناظرین کی تنشیط طبع کے لئے بقیہ تین اشعار جو مجھے مل سکے وہ بھی درج کرتا ہوں ؎

منادیٔ حرم کی پھر سنی آواز مستانہ ۔۔۔ پھر ان آنکھوں نے گویا وہ مدینہ کا چمن دیکھا
جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی یاد حق دادی ۔۔۔ مسلماں را بطرز نو تو دیرینہ سبق دادی

الٰہی پھر مسلمانوں میں پیدا ذوق قرآں ہو
اسی میں انکا جینا ہو اسی میں اُن کا مرنا ہو

سبحان اللہ! کیا خوب ہے یہ کلام حضرت مفتی صاحبؒ کا صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی تال سے دونوں سُر نکلے ہوئے ہیں جس حال سے متأثر ہوکر بابا نجم احسن صاحبؒ کو الہ آباد میں تھانہ بھون یاد آیا تھا اسی نوع کے مناظر پیش نظر ہوکر حضرت مفتی صاحبؒ کو بھی امرتسر میں اپنے محبوب شیخ کا مسکن یعنی تھانہ بھون یاد آگیا۔ ماشاء اللہ کیسے پیر تھے اور کیسے مرید تھے۔ کیسی سب کی محبت تھی اور کیسی انکی مناسبت تھی۔ اور اس نوع کا کلام وہ بھی ایسے باکمال حضرات کی زبان سے نکلنے نے ان بزرگ کے ارشاد کی تائید

کردی کہ حضرت تھانویؒ کے یہ دونوں خدام واقعی یک جان دو قالب ہی تھے ۔

اسی طرح یہیں الہ آباد میں مولانا زین العابدین[۱۸] سجاد میرٹھی بھی اپنے پٹنہ کے سفر سے واپسی میں ملے اور بیعت بھی ہو گئے ۔ یہیں مولوی محمد رفیع[۱۹] صاحب بن حاجی محمد رفیع صاحب حضرت والاؒ سے ملے اکثر مجلس میں حاضر[۲۰] ہوتے رہے ۔ نیز الہ آباد کے رؤسا میں سے شیخ ذوالفقار[۲۱] اللہ صاحب ۔ مصطفٰی رشید شیروانی[۲۲] صاحب نے بھی حضرت والا سے بار ہا ملاقات کی ۔ اسی طرح سے بشیر احمد صاحب ایڈوکیٹ جو ایک زمانہ میں اسمبلی کے ممبر بھی رہے وہ نیز نفیس[۲۳] احمد کاظمی صاحب ایڈوکیٹ بھی اکثر حضرت والا سے ملتے رہے ۔ اسی طرح سے الہ آباد ہی کے قیام کے زمانہ میں سید[۲۴] محمود صاحب مرحوم کو بھی حاضری کا موقع ملا چنانچہ وہ بھی چند بار تشریف لائے اور حضرت اقدسؒ سے بیعت بھی ہوئے ۔ انکا ایک ابتدائی خط ملاحظہ فرمائیے ۔ حضرت والا کو لکھا

۱۱ دسمبر ۶۱ء ۔ ۲ تغلق کریسنٹ ۔ نئی دہلی ممبر آف لوک سبھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضور والا ۔ السلام علیکم ۔ حالانکہ جناب والا کا وطن مالوف اعظم گڈھ ہے لیکن اس ناچیز کو اب تک جناب سے واقفیت نہ تھی کل لکھنؤ میں عزیزی سید حسن صاحب سے ملاقات ہوئی اور کچھ دیر تک بزرگوں کا ذکر رہا اسی دوران میں انھوں نے جناب والا کا ذکر کیا سید حسین صاحب میرے محترم دیرینہ دوست سید سلیمان ندوی صاحب کے داماد ہیں اسلئے مجھ کو ان سے ربط ہے انکی گفتگو نے اس حقیر کے دل میں جناب عالی سے ملنے کا شوق پیدا کر دیا اور میں نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ جلد از جلد جناب کی زیارت سے مشرف ہوں ۔ چنانچہ ۲۵ یا ۲۶ دسمبر کو یہ ناچیز الہ آباد جناب کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہوگا ۔ مصطفٰی رشید شروانی کے یہاں قیام کروں گا اور ۱۱ بجے تک انشاء اللہ آستانہ بوسی کروں گا ۔

سید حسین صاحب نے آپ کا ایک مختصر سا رسالہ جو قرآن کی تلاوت کی

اہمیت کے متعلق ہے دیا تھا جسے میں نے پڑھ لیا طبیعت کو بیحد لذت حاصل ہوئی۔ مجھے یہی عرصہ سے علماء کرام سے شکایت رہی ہے کہ قرآن پر زور نہیں دیا جاتا اور نہ مسلمانوں میں قرآن کی تعلیم عام کیجاتی اور نہ قرآن سے وعظ و نصیحت حاصل کیجاتی ہے۔ میں عربی نہیں جانتا اور نہ قرآن سمجھتا ہوں لیکن ترجمہ کی اعانت سے جہاں اسکے معنی و مطالب سمجھ میں آجاتے ہیں بدن میں کپکپی پیدا کر دیتے ہیں آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔

مولانا کے ترجمان القرآن کا انگریزی میں ترجمہ کر رہا ہوں کچھ عرصہ ہوا میں نے مولانا مرحوم کو خواب میں زور زور سے قرآن کھڑے ہوکر پڑھتے ہوئے دیکھا انکی ڈاڑھی کچھ بڑھی ہوئی تھی ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور وہ پھر مشغول ہو گئے۔ اسکی تعبیر میں نے یہ نکالی کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ بس اب قرآن ہی کی تعلیم و تلقین مسلمانوں کا بڑا کام ہے۔ اس رسالہ میں جناب کی یہی تعلیم و تلقین دیکھکر طبیعت بہت حیرت یاب ہوئی۔ جی تو چاہتا تھا کہ چند دن جناب کی صحبت بابرکت میں گذاروں مگر سردست بہت سی پریشانیوں میں مبتلا ہوں اسلئے صرف ایکدن ٹھہر سکوں گا۔ حضرت مولانا رائپوری اور مولانا . . . سے بھی شرف نیاز حاصل کر چکا ہوں۔ اگر جواب کی عزت بخشی جائے تو خوشی کا باعث ہوگا۔

تحقیق :— مکرمی بندہ زیدت مکارمکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ باوجودیکہ یہ آپکا پہلا خط ہے تاہم آپ سے اجنبیت بالکل نہیں محسوس ہوئی غالباً اسکی وجہ وہی ہے جو آپ نے تحریر فرمائی ہے کہ "سید حسین صاحب میرے محترم دیرینہ دوست سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم کے داماد ہیں اس لئے مجھ سے ان سے ربط ہے" —— یعنی آپ کو سید سلیمان صاحب سے ربط ہے اور انکو مجھ سے ربط ہے اس طرح آپ گویا میرے دوست کے دوست ہوئے پس بظاہر آپ کو مجھ سے واقفیت نہ تھی لیکن باطناً ایک دیرینہ ربط باہم تھا گویا بالواسطہ تھا اور طریق میں باطن ہی کا اعتبار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہی وجہ ہوا جنبیت نہ محسوس ہونے کی

تشریف آوری کی خبر نے مجھے بھی جناب کی ملاقات کا مشتاق بنا دیا اللہ تعالے
باحسن وجوہ موقع نصیب فرمادیں۔ اجازت ہے۔ شوق سے تشریف لائیے۔
انشاء اللہ تعالیٰ ان تاریخوں میں الہ آباد ہی میں رہوں گا۔ آپ کو وقت کم تھا اسلئے
جی تو یہی چاہتا تھا کہ خانقاہ ہی میں جناب کا قیام ہوتا تاکہ اس کم وقت میں زیادہ سے
زیادہ صحبت کا موقع مل جاتا مگر شاید آپ کو وہاں جیسا آرام یہاں نہ مل سکے یا آپکی
دوسری مصالح بھی ہوں اسلئے آپ ہی کو اختیار دیتا ہوں جہاں سہولت ہو قیام
فرمایا جائے۔ قرآن شریف کے متعلق اپنے سے آپ کے مذاق کو متحد پاکر ایک خاص قسم
کی مسرت ہوئی اور اس سلسلہ میں مزید کچھ کام کرنے کا شوق تازہ ہوگیا۔ اس
قحط الرجال کے دور میں جب کسی اہل فہم سے کام کی کچھ تائید مل جاتی ہے تو
بڑی ہمت بڑھ جاتی ہے۔ میری مراد اس سے آپ کے خط کا یہ مضمون ہے
کہ مجھے بھی عرصہ سے یہ شکایت رہی ہے کہ قرآن پر زور نہیں دیا جاتا ہے اور نہ
مسلمانوں میں قرآن کی تعلیم عام کیجاتی ہے اور نہ قرآن سے وعظ و نصیحت کیجاتی
ہے میرا بھی یہی خیال ہے۔ باقی میں علاوہ اسکے اتنی بات اور کہتا ہوں کہ آج
ہم لوگوں نے قرآن سے بھی غفلت برتی اور ساتھ ہی ساتھ سنت سے بھی بے اعتنائی
برتتے ہوئے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ یہ بھی قرآن ہی سے غفلت کا نتیجہ اور اسی کی
فرع ہے کیونکہ کتاب و سنت دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں اسلئے کہ جس شخص کے
پیش نظر کتاب اللہ کی یہ نصوص ہونگی (۱) مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ
فَانْتَهُوْا (جو کچھ تمکو رسول دیں اسکو لے لو اور جس بات سے منع کریں اس سے بچو)
(۲) مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (۳) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں ۔ تمھارے لئے رسول اللہ کے اندر ایک اچھا اسوہ ہے)
آخر اسکو اوامر و منا ہی رسول ۔ رسالات نبی اور اسوۂ پیغمبر کے علم سے کس طرح صبر ہوگا
اور ظاہر ہے کہ ان امور کی تفصیل سنت ہی سے دستیاب ہوسکتی ہے۔ اسی طرح
کتاب اللہ کے احکام معلوم کئے بغیر وہ شخص بھی نہیں رہ سکتا جس کے قلب میں اسکی

قدر و عظمت کو ان احادیث نے راسخ کر دیا ہو۔ سنیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ :۔

(۱) اما بعد فان خیر الحدیث کتاب اللہ و خیر الھدی ھدی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) و شر الامور محدثاتھا و کل بدعۃ ضلالۃ۔ (الابداع شیخ علی محفوظ[۹۴])

(اما بعد پس بہترین قول اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ اور بدترین شئے دین میں بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

(۲) ابن مسعودؓ سے موقوفاً و مرفوعاً دو طرح مروی ہے قال انما ھما اثنتان الکلام والھدی فاحسن الکلام کلام اللہ واحسن الھدی ھدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم الا وایاکم و محدثات الامور فان شر الامور محدثاتھا ان کل محدثۃ بدعۃ (حوالہ بالا)

(وہ دو ہیں ایک کلام اور ایک طریقہ پس بہترین کلام، کلام اللہ ہے اور بہترین طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اور سنو! اپنے کو نئی نئی چیزوں سے بچاؤ اسلئے کہ نئی باتیں ہی سب سے بُری چیز ہیں اور بلاشبہ (دین میں) نئی چیز جو ہو وہ بدعت ہے۔

(۳) نیز حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قال ان احببت ان لا توقف علی صراط طرفۃ عین حتی تدخل الجنۃ فلا تحدث فی دین اللہ حدثا برایک۔

(اگر تم چاہتے ہو کہ دخول جنت کے راستہ میں دم بھر کے لئے بھی روکا وٹ نہو اللہ تعالےٰ کے دین میں کوئی نئی بات نہ نکالو)

اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ کے دین میں احداث سے بچنا کتاب وسنت دونوں کے کامل علم کے بعد ہی ہو سکتا ہے اور لوگ آج ان دونوں ہی سے غافل ہیں چنانچہ اسی غفلت کا یہ نتیجہ ہے جو موجودہ بدحالی کی صورت میں ہمارے اور آپ کے سامنے ہے کہ آج معاصی کی کثرت کا یہ حال ہو رہا ہے کہ دور جہالت کا نقشہ ہمارے سامنے

پیش کردیا ہے اور معصیت کی شدت نے کفر کی سرحد تک عوام کو گویا پہونچا دیا ہے حضرت امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کی کتاب الایمان میں یکے بعد دیگرے دو ابواب قائم فرمائے ہیں۔ چنانچہ ایک میں تو یہ فرمایا ہے کہ باب کفران العشیر وکفر دون کفر۔ اسکی شرح فرماتے ہوئے صاحب فتح الباری نے قاضی ابوبکر ابن العربیؒ کا قول نقل فرمایا ہے کہ مراد اس سے بخاریؒ کی یہ ہے کہ یہ بتائیں کہ جس طرح سے طاعات کو ایمان کہا جاتا ہے اسی طرح سے معاصی پر بھی کفر کا اطلاق کبھی کردیا جاتا ہے اس کفر سے مراد وہ کفر نہیں جسکی وجہ سے آدمی ملت ہی سے خارج ہو جاتا ہے۔ العیاذ باللہ۔ (پس کفر کے بھی درجے ہوئے بعض کفر بعض سے اشد ہوتا ہے) اور دوسرے باب میں فرماتے ہیں کہ "باب المعاصی من امر الجاہلیۃ" یعنی جس قدر بھی معاصی ہیں وہ سب جاہلیۃ کے زمانہ کی چیزیں ہیں۔ اسلام سے انکا کچھ جوڑ نہیں ہے۔ یہ ایک بات درمیان میں آگئی تھی اس خیال سے ذرا تفصیل سے عرض کردیا کہ بہت ممکن ہے کہ آپ بھی اس سے محظوظ ہوں۔

خط میں آپ نے کلام اللہ کے معانی کے خطور سے جس کیفیت کا طاری ہونا لکھا ہے یہ تو عین تقاضائے ایمان وایقان ہے اللّٰہم زد فزد اور خواب کی جو تعبیر تحریر فرمائی ہے صحیح ہے اللہ تعالیٰ اس کام سے ہمکو بھی اور آپ کو بھی حصہ وافر نصیب فرمائیں۔ آمین۔

میرے مکان کا پتہ تو وہی ہے جو آپ نے لفافہ پر تحریر فرمایا ہے یعنی ۲۲۳ بخشی بازار۔ الہ آباد۔ یہ جگہ الہ آباد اسٹیشن سے بالکل قریب بھی ہے تقریباً ۲½ یا ۳ فرلانگ کا فاصلہ ہوگا بخشی بازار کے ڈھال والے چوراہے کے متصل ہی غریب خانہ ہے ہمارے کرم فرما ڈاکٹر صلاح الدین صاحب آپکو لینے کیلئے اسٹیشن جائیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے۔ باقی عندالتلاقی۔

والسلام۔ وصی اللہ عفی عنہ

اسی طرح سے یہاں الہ آباد میں حضرت اقدسؒ کی خدمت میں

حضرت مولانا ابرارالحق صاحب مدظلہ بھی متعدد بار تشریف لائے یوں آپ حضرت والا کے یہاں حضرت کے فتحپور کے زمانۂ قیام میں بھی تشریف لیجا چکے تھے اور یاد آتا ہے کہ گورکھپور بھی تشریف لے گئے تھے۔ لیکن الٰہ آباد میں آ جانے کے بعد حضرت اقدس سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا تھانہ بھون کے بعض حالات کے سلسلے میں حضرت مولانا پھولپوریؒ نے ہمارے حضرت سے جو کچھ فرمانا چاہا تو اس میں حضرت مولانا ہردوئی مدظلہ واسطہ بنتے رہے۔

" حضرت مولانا ابرارالحق صاحب مدظلہ بھی حضرت اقدس مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہ کے خلفاء میں سے ہیں اور مجاز بیعت ہیں اسکے باوجود مولانا مدظلہ نے اپنا یہ طریقہ رکھا کہ حضرت تھانویؒ کے بعد حضرت اقدس کے کسی نہ کسی خلیفہ سے اپنا خصوصی تعلق برابر قائم رکھا چنانچہ حضرت تھانویؒ کے بعد حضرت کے جلیل القدر خلیفہ حضرت مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری سے مولانا موصوف کا خاص تعلق رہا۔ یعنی آمد و رفت بھی وہاں رہتی اور اپنے خصوصی معاملات میں استفسار بھی حضرت ہی سے فرماتے۔ ادھر اپنے حضرت اقدس کی خدمت میں چند بار جو آنا جانا ہوا تو تعلق اور محبت میں اضافہ ناگزیر تھا۔ حضرت اقدس بھی مولانا ہردوئی کی تشریف آوری پر خوش ہوتے اور کبھی کبھی فرماتے کہ آج مجلس میں کچھ آپ بیان کر دیجئے چنانچہ مولانا الامر فوق الادب پر عمل فرماتے ہوتے کچھ بیان فرما دیتے اس قرب و مناسبت کا اثر یہ ہوا کہ حضرت مولانا پھولپوریؒ کے وصال کے بعد پھر مولانا ہردوئی نے حضرت اقدس کا انتخاب فرمایا یعنی آمد و رفت میں ایک تسلسل قائم ہوگیا۔ چنانچہ الٰہ آباد کے علاوہ بمبئی بھی تشریف لے گئے اور ہمارے حضرتؒ کو مولانا کی جانب توجہ بیش از بیش ہوگئی یہاں تک کہ بمبئی کے زمانۂ قیام میں مولانا ابرارالحق صاحب مدظلہ کا خط آیا کہ کوئی آپریشن ہونا ہے حضرت اقدس اس خبر کو سنکر بے چین ہوگئے اور یہ فرمایا کہ اپنی جماعت میں اب یہی ایک نوجوان شخص تھے امید تھی کہ کچھ کام کریں گے یہ بھی بیمار ہو گئے، تم سب لوگ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مولوی صاحب کو صحت کامل عطا فرمائے۔"

چنانچہ اکثر و بیشتر علماء کرام کے اسماء آپ نے ملاحظہ فرمائے اب ان اطباء عظام کے نام بھی سنیئے جو بسلسلہ معالجہ یا صرف برائے ملاقات حضرت اقدسؒ سے الہ آباد میں ملے۔

حکیم سید فخر الدین صاحب[1] جعفریؒ پہلے سفر علاج میں حضرت سے ملے اس کے بعد تو انکا انتقال ہی ہو چکا تھا۔ ان کے خلف رشید جناب حکیم محمد سلیمان[2] صاحب برابر مجلس میں آتے رہے۔ شفاء الملک جناب حکیم شمس الدین[3] صاحب لکھنوی حضرتؒ کے خاص معالج ہی تھے لکھنؤ سے برابر تشریف لاتے رہے۔ حکیم نثار احمد صاحب[4] کلکتہ والے بھی تشریف لائے۔ الہ آباد کے حکیم محمد سعید[5] صاحب بھی برابر آتے رہے اور حکیم مولانا محمد میاں[6] صاحب فاروقی کا تو حضرت والا سے تعلق ہی تھا اکثر مجلس میں اور علاوہ مجلس کے اکثر دوسرے اوقات میں تشریف لاتے تھے۔ علی گڈھ سے جناب حکیم افہام[7] اللہ صاحب متعدد بار تشریف لائے۔ اسی طرح سے لکھنؤ کے حکیم افتخار[8] احمد صاحب بھی کئی مرتبہ آئے۔ اتراؤں کے حکیم حبیب[9] اللہ صاحب بھی حاضر خدمت ہوتے رہے۔ میرٹھ کے حکیم نیاز[10] علی صاحب (داماد حکیم محمد مصطفےٰ میرٹھی) بھی الہ آباد میں آئے۔ جون پور کے حکیم منظور[11] احمد صاحب اور مختار[12] احمد صاحب بھی آئے۔ حکیم ظہیر الدین[13] صاحب بھی برابر تشریف لاتے رہے اور کبھی کبھی بہت بہت دنوں تک قیام فرماتے۔ بمبئی کے حکیم مسعود صاحب[14] معروف بہ حکیم اجمیری صاحب تشریف لائے۔ حکیم احمد[15] عثمانی صاحب الہ آبادیؒ اکثر و بیشتر تشریف لاتے۔ حکیم محمد شفیع[16] اللہ صاحب جو حضرتؒ سے بیعت تھے برابر آتے تھے۔ دیوبند سے حکیم محمد عمر[17] صاحب اور حکیم عزیز[18] الرحمان صاحب اس سے قبل وطن میں حضرت سے ملاقات یا علاج بھی ان حضرات اطباء نے فرمایا تھا:۔

حکیم الٰہی[19] بخش صاحب اعظم گڈھ والے۔ حکیم محمد حسن[20] صاحب پودہ معروف والے۔ حکیم محمد شفیع[21] صاحب۔ حکیم حفیظ[22] اللہ صاحب۔ حکیم بشیر الدین[23] صاحب

حکیم بشیر الدین[۲۲] صاحب ۔ حکیم نثار احمد[۲۳] صاحب ۔ محمدی کے حکیم رمضان الحق[۲۴] صاحب ۔ مئو کے حکیم سعد اللہ[۲۵] صاحب و حکیم حبیب اللہ[۲۶] صاحب و حکیم محمد منظور احمد[۲۷] صاحب ۔ گورکھپور کے حکیم ابو الکلام[۲۸] و حکیم وصی احمد[۲۹] صاحب ۔ حکیم فضل اللہ[۳۰] صاحب ۔ حکیم عبد الحق[۳۱] صاحب ۔ حکیم وجیہ اللہ[۳۲] صاحب اور بعد میں لکھنؤ میں حکیم عبد اللطیف[۳۳] صاحب معروف بہ حکیم فلسفی ۔ حکیم عبد الحمید[۳۴] صاحب وغیرہ سے ملاقات کے علاوہ اکثر حضرات مختلف اوقات میں حضرت کے معالج رہے ۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلہ میں ان اطبا انگریزی یعنی ڈاکٹر صاحبان کو بھی شمار کر دیا جائے جو بصورت تجویز نسخہ یا مشورہ خصوصی حضرت اقدس کے علاج معالجہ میں شریک رہے اور بطور خود بھی حضرت کے فیض سے مستفیض ہوتے رہے ۔ یہاں الہ آباد کے علاوہ دوسرے مقامات کے بھی حضرات کا نام اس فہرست میں شامل ہے ۔

۱۔ جناب ڈاکٹر غفران صاحب مانی کلاں جون پور ۔ ۲۔ جناب ڈاکٹر محمد شمیم صاحب جون پور ۔ ۳۔ ڈاکٹر محمد ظفر صاحب (ہومیو) کوریا پاری مقیم حال بنارس ۔ حضرت والا کے خاص معالج رہے ۔ ۴۔ ڈاکٹر صلاح الدین صاحب صدیقی الہ آباد ۔ ۵۔ ڈاکٹر صابر حسین صاحب (ہومیو) الہ آباد ۔ ۶۔ ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب الہ آباد ۔ ۷۔ ڈاکٹر محمد ابرار صاحب الہ آباد ۔ ۸۔ ڈاکٹر حماد صاحب ابن حکیم عثمانی صاحب ۔ ۹۔ ڈاکٹر ایف خان صاحب (ہومیو) الہ آباد ۔ ۱۰۔ ڈاکٹر حفیظ اللہ خاں صاحب گورکھپور ۔ ۱۱۔ ڈاکٹر عبد الجلیل صاحب فریدی لکھنؤ ۔ ۱۲۔ ڈاکٹر انصاری صاحب علی گڈھ ۔ ۱۳۔ ڈاکٹر اسحاق صاحب بمبئی ۔ اسکے علاوہ بمبئی میں چند اور مسلم ڈاکٹروں سے بھی ربط ہو گیا تھا ۔

راقم نے یہاں ناظرین کے سامنے اطبا کرام اور ڈاکٹر صاحبان کی یہ طویل فہرست جو بیان کر دی ہے وہ یونہی بلا وجہ نہیں کی ہے بلکہ اس سے آپ حضرات

سے سامنے حق تعالیٰ کے ایک عجیب و غریب معاملہ کا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت والاؒ
کے ساتھ مقدر فرمایا تھا اسکا اظہار مقصود تھا وہ یہ ہے کہ

حضرت اقدس نے ماہ اپریل ۱۹۵۶ء کی کسی تاریخ میں وطن کو خیرباد فرمایا
تھا پھر گورکھپور سے ۲۲ نومبر ۱۹۵۶ء کو الہ آباد تشریف لائے اور پھر یہاں سے علی گڈھ
لکھنؤ اور جون پور اور بمبئی وغیرہ تشریف لے گئے تو ان مقامات پر تشریف لیجانے
کی وجہ سے جہاں عوام کو اہل علم کو نفع ہوا وہ تو ہوا ہی ان کے منجملہ ایک خاص طبقہ
یعنی اطباء و ڈاکٹر صاحبان کی بھی ایک خاص جماعت حضرت والا کے فیض سے
مستفیض ہوئی اور اکثر جگہوں پر اس فیض کا سبب خود حضرت اقدسؒ کا علیل
ہوجانا بنا ۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی قدرت کی نرالی ہی شان دکھلائی کہ ان حضرات
کو روحانی صحت عطا فرمانے کے لئے اپنے ولی ہی کو بیمار فرما دیا تاکہ ان کے لئے
اپنے مشاغل کثیرہ کا عذر باقی نہ رہے اور علاج و معالجہ ہی کو ان کے لئے
سبب فلاح و اصلاح بنا دیا ۔ عجب نہیں کہ ان حضرات کی بے لوث خدمت خلق کو
دیکھکر خالق کائنات نے باطن کے اس چشمۂ شیریں کو خود انھیں کے پاس پہونچا دیا ہو
بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کا انتہائی فضل و کرم ہے جس بندہ پر ہوجائے ۔

جہاں تک مجھے علم ہے ان سب ہی حضرات کو حضرت مصلح الامۃؒ سے
بقدر نصیب فیض ہوا ــــــ البتہ حکیم مولانا سید فخر الدین صاحب جعفریؒ کا
تعلق حضرت اقدس سے مساویانہ رہا اسلئے کہ حکیم صاحب موصوف زیادہ عمر کے بھی
تھے اور خود ایک مستقل صاحب اجازت شیخ بھی تھے اور الحمد للہ خاص اپنے ہی
سلسلہ کے لوگوں میں سے تھے چنانچہ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ :ــ

" فراغت تعلیم کے بعد پہلی بیعت حضرت مولانا مولوی حکیم حافظ صوفی
محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ سے کی جنکا وصال اجمیر شریف میں حضرت قطب العالم شیخ
عبدالقدوس گنگوہیؒ کے اس شعر ؎

گفت قدوسے فقیری در فنا و در بقا ۔۔۔ خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی

پر ہوا۔ مولانا الہ آبادی قطب عالم آیۃ من آیات اللہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے اجل خلفاء میں تھے حضرت مولانا الہ آبادیؒ کے وصال کے بعد ہمارے حضرت (حکیم مولوی سید فخر الدین صاحب جعفری زینبی الہ آبادی) نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو خط لکھا کہ ہماری تعلیم باقی رہ گئی ہے تکمیل کے لئے آپ کی خدمت میں آنا چاہتا ہوں مولانا گنگوہی نے تحریر فرمایا کہ چونکہ بھائی مولانا الہ آبادی اور مجھ میں کچھ اختلافات ہیں اسکی وجہ سے تم کو کچھ تکلیف ہو۔ ہمارے حضرت (حکیم موصوفؒ) نے لکھا کہ جن باتوں میں آپ کا اور انکا اختلاف ہے وہ فقہی مسائل ہیں اسکو میں مکمل حاصل کر چکا ہوں اور مطمئن ہوں اسکے لئے نہیں آنا چاہتا۔ جن مسائل میں آپ دونوں ایک ہیں اور آپ کا اتفاق ہے یعنی تعلیم تصوف علمی و عملی اسکو سیکھنا اور حاصل کرنا ہے۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ نے دعائیں لکھیں اور لکھا کہ تم نے صحیح لکھا ہم دونوں میں فقہی مسائل میں تھوڑا اختلاف تھا ورنہ ہم دونوں ایک ہی ہیں۔ تم جب چاہو آجاؤ۔

ہمارے حضرت (حکیم صاحب موصوفؒ) مولانا گنگوہیؒ کے یہاں جانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ حضرت گنگوہیؒ کا وصال ہو گیا حضرت (حکیم صاحب) کو اسکا بیحد رنج اور صدمہ تھا اور بہت ہی متفکر تھے کہ مولانا الہ آبادی کو خواب میں دیکھا کہ فرمارہے ہیں کہ بخاری صاحب سے بیعت کرو تعلیم مکمل ہو جائیگی۔ حضرت مولانا الہ آبادی کی ہدایت کے مطابق حضرت مولانا حکیم فخر الدین صاحبؒ نے حضرت بخاریؒ صاحب سے بیعت کی اور مکمل تعلیم حاصل کی۔

حضرت بخاری صاحبؒ کا اسم گرامی سید محمد افضل ہے آپ

بخارا کے رہنے والے تھے عنفوان شباب میں وارد ہندوستان ہوئے اور یہیں سے حج کے لئے تشریف لے گئے۔ حج وزیارت سے فراغت کے بعد اعلیٰ حضرت قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی اور حضرت کی خدمت میں عرصۂ دراز تک رہ کر تکمیل تعلیم کی اور خلافت سے بہرہ ور ہو کر بحکم اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ آگرہ میں مقیم ہو گئے آپ کا مزار پُر انوار چھم چھم گلی آگرہ میں (ایک مکان کے اندر واقع) ہے

(مصباح السالکین طبع چہارم)

راقم عرض کرتا ہے کہ حکیم فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حضرت اقدس مصلح الامۃ رحمۃ اللہ علیہ سے اسقدر الفت اور محبت کا تعلق اس امر کا تو پتہ دیتا تھا کہ حکیم صاحب موصوف اپنے سلسلہ سے بہت قریب کا تعلق رکھتے ہیں لیکن مذکورہ بالا تفصیل کا علم ہم لوگوں کو آج تک نہ ہوا تھا۔ ہمارے ایک محترم دوست بھائی انیس احمد صاحب پرخاصوی نے چند دن ہوئے کتاب مصباح السالکین مطبوعہ پاکستان دکھلائی اس میں مذکورہ بالا تفصیل دیکھکر بہت مسرت بھی ہوئی اور اسلاف کے نزدیک فرعی اختلافات کی حیثیت بھی معلوم ہوئی کہ سبحان اللہ کیسے بے نفس لوگ تھے اور حضرت گنگوہی کی صفائی معاملات اور طالب خدا کی قدر افزائی کا جو علم ہوا وہ تو واقعی حضرت ہی کا حصہ تھا۔ اس تمام تفصیل کے جاننے سے معلوم ہوا کہ مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی۔ حضرت گنگوہی۔ حکیم الامۃ مولانا تھانوی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حکیم سید فخر الدین صاحب جعفری ایک ہی سلسلہ کے حضرات تھے اور الحمد للہ باہم خوب شیر و شکر تھے۔

پہلے زمانہ کے لوگ اسی طرح سے بے نفس ہوتے تھے ان میں جزئی اختلافات بھی ہوتے تھے تو اسکو اپنی حد پر رکھتے تھے چنانچہ جسکا طریقہ سنت اور شریعت سے قریب تر ہوتا تھا تو دوسرا اسکا لحاظ کرتا تھا میں نے بعض معتبر حضرات

سے سنا کہ حضرت تھانوی جب الہ آباد تشریف لاتے تھے تو مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ کبھی کبھی
حضرتؒ کی دعوت فرماتے، اور مولانا الہ آبادی کو قوالی کا ذوق تھا چنانچہ کھانے سے
فارغ ہوتے ہی متعینہ قوال آجاتے تھے اور قوالی شروع کر دیتے ایک مرتبہ حضرت
تھانویؒ بھی مولانا کے ساتھ دسترخوان پر موجود تھے کھانے سے فراغت کے بعد
حسب معمول قوال آئے اور انھوں نے چاہا کہ اپنا کام شروع کریں مگر حضرت
الہ آبادی نے انکو اشارہ سے منع کردیا اور یہ فرمایا کہ بھائی آج یہ مولوی صاحب
تشریف لائے ہوئے ہیں جو اس سے پرہیز کرتے ہیں اسلئے آج حذف۔

سبحان اللہ! اختلاف مشرب کے باوجود کیسی رعایت صاحب شریعت عالم
کی تھی، آج کا زمانہ ہوتا تو کوشش کیجاتی کہ انکو کسی نہ کسی طرح قوالی ضرور سنا کر
چھوڑو۔

حاصل یہ کہ جس مسلک کو دیوبندیت کہا جاتا ہے وہ اسوقت بھی موجود تھا
اہل زمانہ کی رسوم و بدعات بھی موجود تھیں لیکن دونوں جماعتوں میں عناد اور
مخالفت کا یہ حال نہ تھا جو آج مشاہدہ میں آرہا ہے۔ ہاں جب سے بریلویت
کا فتنہ شروع ہوا تو اسوقت سے یہ لوگ علمار حقانی وربانی کے درپئے آزار ہوگئے
خلوص کی جگہ نفسانیت آگئی اسلئے مودت و محبت کی جگہ عناد و فساد نے لے لی
انا للہ وانا الیہ راجعون۔ گذشتہ زمانہ میں ہمیشہ ہی علمار ظاہر اور ارباب خوانق کے
طریقۂ کار اور مشرب میں کچھ اختلاف ہی رہا ہے لیکن یہ باہم کفر اکفری کا جو
انداز ہماری بدقسمتی سے آج نظر آرہا ہے یہ کبھی نہیں رہا مشائخ برابر یہ کہتے رہے
کہ ان علمار کے پاس علم دین و شریعت ہے یہ لوگ امانت سنت کے حامل ہیں
لہٰذا ہمارے ذمہ انکا احترام ضروری ہے اور علمار یہ کہتے تھے کہ ان صلحار کی بعض
رسوم اگرچہ شریعت سے مؤید نہیں ہے تاہم انکو حق تعالیٰ سے جو نسبت اور تعلق
حاصل ہے وہ کم دولت نہیں ہے اور ہمارے پاس گو علم ظاہر ہے لیکن علم باطن اور
احوال باطنہ میں ان سے ہم کہیں کم ہیں لہٰذا ہمیں ان سے ملنا چاہیئے اور اپنے لئے

ان سے دعا کرانی چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل خوالق نے علماء دیوبند سے برابر ربط رکھا اور ان سے بعض امور میں اختلاف کے باوجود انکو بنظر تحقیر کبھی نہیں دیکھا خود حضرت مولانا تھانوی نے اپنا واقعہ بیان فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ ہمارے والد صاحب الہ آباد کسی مقدمہ میں آئے میں بھی ساتھ تھا طالبعلم تھا اور عمر بھی کم تھی۔ چنانچہ والد صاحب نے ملا محمدی شاہ صاحب سے ملاقات فرمائی اور اپنے مقدمہ کیلئے ان سے دعا کی درخواست کی ہمراہ ہونے کی وجہ سے میرا بھی تعارف ہوا کہ یہ میرا بچہ ہے مدرسہ دیوبند میں پڑھتا ہے۔ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ اس کے بعد ملا صاحب نے مجھ سے دریافت فرمایا کہو مولوی کون سی کتابیں پڑھتے ہو؟ میں نے جلالین شریف وغیرہ کا نام لیا اس پر فرمایا ووجدک ضالاً فھدیٰ کا ترجمہ کرو میں نے فوراً عرض کیا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ ـــــ اللہ نے آپ کو (اے نبی) ناواقف پایا پس واقف کر دیا ـــــ ترجمہ سنکر شاہ صاحب بہت خوش ہوئے اور بہت دعائیں دیں یہ موقع یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ضالاً کا ترجمہ منشاء امتحان تھا حضرت اقدس نے کامل ادب کی رعایت فرمائی کہ ضالاً کا ترجمہ "گمراہ" نہ کر کے "ناواقف" کیا اس پر شاہ صاحب بہت خوش ہوئے۔

حضرت مولانا تھانوی کے بزرگوں سے ملنے کا واقعہ تو آپ نے دیکھا اسی طرح سے حضرت مولانا گنگوہی کی صفائی معاملہ اور صاف گوئی بھی آپ نے ملاحظہ فرمائی کہ حکیم صاحب کے شیخ اول سے جزئی اختلاف کی بناء پر اپنے ساتھ وابستگی سے انکار فرمایا لیکن پھر انکو فہیم و طالب صادق پا کر اپنے ساتھ متعلق فرمانا منظور بھی کر لیا اور فرمایا ہاں سچ کہتے ہو ہم میں اور ان میں چند مسائل میں جزئی اختلاف تھا ورنہ تو وہ اور ہم ایک ہی ہیں۔

اسی طرح سے بانی مدرسہ دیوبند حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب کی بے نفسی کا ایک واقعہ سنیئے حضرت کی بستی میں کوئی صاحب مولوی فضل رسول نامی رہتے تھے جو مسلکاً حضرت کے خلاف تھے حضرت کے کسی شاگرد نے ایکبار

حضرت کے سامنے انکو اس طرح سے یاد کیا کہ وہ مولوی فصلِ رسول (یعنی فضیل کی جگہ انھوں نے فصل کہدیا اور اپنے طور پر اپنی اس بلاغت پر خوش تھے یہ سمجھتے تھے کہ حضرت سے اسکی داد ملیگی لیکن) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے جب ان کے منھ سے یہ الفاظ سنے تو ان پر بہت ناراض ہوئے اور یہی بار بار فرماتے رہے کہ ان کا یہی نام ہے جو تم نے لیا ہے؟ ان کا یہی نام ہے جو تم نے کہا ہے؟ پھر تم نے انکے نام کو کیوں بگاڑا؟ اور کیا یہ ولا تنابزوا بالالقاب (کسی کا نام بگاڑ کر اور بدل کر اسکو نہ پکارو) کی وعید میں داخل نہیں ہے۔ بالآخر جب تک انھوں نے معافی نہ مانگ لی حضرت مولانا ان سے ناراض ہی رہے۔

اہل حق کے انصاف اور اخلاق کا یہ حال ہوتا ہے۔ آج لوگ اپنے کسی مخالف کا نام کس کس طرح بگاڑ کر اور اس سلسلہ میں کیسی کیسی طبع آزمائی فرماتے ہیں! اور پھر اس پر خوش ہوتے ہیں ہمارے لئے اپنے اسلاف کے ان واقعات میں عبرت ہے اور دوسروں سے ہم اسکے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ ؎

اولئک آبائی فجئنی بمثلھم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

یہ ہیں ہمارے اسلاف ان کے جیسے اے جریر تم بھی لے آؤ جبکہ ہمکو اور تمکو کوئی مجمع جمع کرے۔

حاصل کلام یہ کہ علماء ظاہر ہیں اور اہل خوانق متقدمین میں راہ ورسم اور میل و ملاقات برابر جاری تھی یہ آج کا جو انداز آپ کے سامنے ہے یہ بعد کی نحوست ہے من سن سنۃ سیئۃ فلہ وزرھا و وزر من عمل بھا یعنی جس شخص نے کوئی برا طریقہ ایجاد کیا تو اسپر اسکا بھی وبال اور جس جس شخص نے بعد میں اسکے طریقہ پر عمل کیا ان سب کا وبال ہوگا۔ اللھم احفظنا منہ۔

سابق بیان سے معلوم ہوگیا کہ حضرت مصلح الامۃؒ کا ورود با مسعود الہ آباد میں ہوچکا ہے اور جائے وقوع کے مناسب ہونے اور سفر کی سہولتوں کی بناء پر ہر جگہ سے اور ہر طبقہ کے لوگوں کا آنا جانا آسان ہوگیا ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے اکابر تک کی آمد و رفت جاری ہے۔

تصنیفی مشق اور تالیفی سلیقہ نہ ہونے نیز کسی بھی جگہ کے تمام ہی واقعات مسلسل اور مرتب طور پر ذہن میں نہ ہونے کیوجہ سے قدم قدم پر رکاوٹ پیش آجاتی ہے کہ اب آگے کیا لکھوں چنانچہ اسی دشواری سے بچنے کے لئے راقم نے گورکھپور کے حالات کے بیان کرنے کے سلسلے میں یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہاں کے جو معزز حضرات تھے حضرت مصلح الامۃؒ کے ساتھ انکی وابستگی کا ذکر کرکے بہت کچھ واقعات پیش نظر کرلئے تھے اسلئے یہاں الہ آباد کے حالات بیان کرنے میں بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے چند مخصوص لوگوں کے حالات جو حضرت اقدسؒ سے متعلق رہے بیان کروں تاکہ الفول بالقول یذکر کے طور پر بات سے بات یاد آتی چلی جائے۔

۱ ـ فخر الاطباء جناب مولانا حکیم شاہ سید فخر الدین جعفری صاحبؒ کے حالات عرض کرنے کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ الہ آباد کے ایک اور عظیم المرتبۃ طبیب حاذق کا ذکر کروں یعنی

۲ ـ رئیس الحکماء جناب حکیم احمد صاحب عثمانیؒ الہ آباد کے مشہور طبیب جناب حکیم احمد حسین صاحب عثمانیؒ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ آپ کے دوسرے چھوٹے بھائی محمد حسین صاحب بھی طبیب تھے یعنی والد طبیب اور ان کے یہ دونوں صاحبزادے بھی طبیب تھے گویا ایں خانہ ہمہ آفتاب است کا مصداق تھے۔ چنانچہ حکیم عثمانی صاحب نے طبیب کے گھر آنکھ کھولی تو بچپن ہی سے طب کا ذوق پیدا ہوگیا اسلئے اپنے وقت پر خود بھی زبردست طبیب ہوئے۔ وضع قطع عالمانہ تھی ہمیشہ سر پر عمامہ بندھا رہتا تھا نہایت ہی وجیہ اور بارعب شخص تھے۔

حکیم فخر صاحب مرحوم کے موجود ہونے کے سبب سے ابتداً ہم لوگوں کا انکی جانب کچھ زیادہ مرجوعہ نہ تھا لیکن حکیم جعفری صاحبؒ کے وصال کے بعد جب حضرت والاؒ دوبارہ الہ آباد تشریف لائے تو ایک موقعہ پر کسی کے توسط سے حکیم عثمانی صاحب بھی حضرت اقدس کے معالجہ کے لئے بلائے گئے۔ حکیم صاحب تشریف لائے نسخہ لکھا، حضرتؒ سے ملاقات فرمائی آدمی دیندار تھے دیندار گھرانے کے تھے اسلئے جتنا نفع حضرت والا کو ان سے پہونچا اس سے کہیں زیادہ فائدہ حکیم عثمانی صاحب کو حضرت اقدسؒ سے ہوا۔ حضرت والا سے ملتے ہی حکیم صاحب کا حال بس اس کا مصداق ہوگیا تھا کہ ؎

آہن کہ بپارس آشنا شد فی الحال بصورت طلار شد

حکیم صاحب چونکہ خود بھی اپنے فن کے کامل اور ماہر تھے اسلئے ان کے اندر ایک شان استغنار بھی پائی جاتی تھی لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ کیسے کیسے بڑے علمار اور مشائخ آئے لیکن حکیم صاحب نے کسی کی جانب رخ تک نہیں کیا چنانچہ مقامی علمار و مشائخ کو تو خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن آخر میں آکر قائل ہوئے تو حضرتؒ کے اور جھکے تو حضرت کے آگے جھکے۔ چنانچہ کھلی آنکھوں دیکھا گیا کہ حضرت اقدسؒ کی ملاقات کا انکے قلب پر گہرا اثر ہوا اول ہی دن سے بڑی محبت بڑی عقیدت، بڑے ہی ادب کے ساتھ حضرت سے ملے اور ان کا ادب روز افزوں ہی ہوتا گیا یہاں تک کہ حضرت والاؒ کبھی کبھی خود بھی ان کے مکان پر صرف ملاقات کے لئے تشریف لیجاتے اور حکیم صاحب بڑی ہی نیازمندی کے ساتھ ملتے چنانچہ حکیم صاحب موصوف جب حج بیت اللہ کو جانے لگے تو تاریخ روانگی کے دن حضرت والاؒ نے اس خادم ہی کو رکشہ پر اپنے ہمراہ لیا اور فجر کے بعد ہی حکیم صاحب کے مکان پر تشریف لے گئے حکیم صاحب اندر سے تشریف لائے اور درخواست کی حضرت کمرہ میں تشریف لے چلیں حضرت نے فرمایا کہ نہیں آج آپ کے سفر کا دن ہے سفر کی ضروریات اور مشغولیات زیادہ ہوتی ہیں میں بیٹھوں گا نہیں بس صرف آپ سے ملنے ہی آیا تھا اسلئے کہ اسٹیشن پر

کثرت ہجوم کے باعث ٹھیک سے ملاقات بھی مشکل ہو جاتی ہے بس آیئے معانقہ کیجئے اور میرے واسطے دعا فرمایئے گا۔ حکیم صاحب نے بھی بڑی ہی لجاجت کیساتھ مصافحہ کیا اور دعا کی درخواست کی حضرت کا ہاتھ چوما۔ اور حضرت والا فی امان اللہ کہکر وہاں سے مکان واپس ہو گئے۔ میں تو اس موقع پر موجود تھا ہی حکیم صاحب کے والد مولوی حکیم احمد حسین صاحب کے بارے میں ایسا ہی کچھ مشہور تھا اسی لئے حکیم صاحب کو ہم بھی ابتک خشک ہی سمجھتے تھے لیکن حضرت کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت اور بزرگوں جیسی محبت دیکھکر معلوم ہوا کہ اجی کچھ نہیں بزرگوں کا تعلق چونکہ اللہ تعالیٰ سے صحیح ہوتا ہے اس لئے ساری ہی مخلوق کو ان سے انس ہو جاتا ہے اس میں مقلد، غیر مقلد، بدعتی حتی کہ غیر مسلم کی بھی تخصیص نہیں اور اپنے حضرت اقدس کے ساتھ تو ہم نے یہی معاملہ مخلوق کا دیکھا کہ ایسی شان محبوبیت تھی کہ جو شخص بھی ایک بار زیارت کر لیتا تھا وہ دیکھتا ہی رہ جاتا تھا اسفار کے موقعوں پر اسٹیشن پر دیکھا جاتا تھا کہ ہر شخص خواہ وہ اپنا ہو یا پرایا ہو، مسلم ہو یا غیر مسلم ہو پبلک کا عامی آدمی ہو یا ریلوے کا کوئی ملازم سب کے سب جب حضرت کو دیکھ لیتے تھے تو دیر دیر تک دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔

حکیم صاحب موصوف کا معاملہ بھی ایسا ہی ہوا کہ یا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انکو کسی عالم اور بزرگ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یا تعلق ہوا تو ایسا کہ حکیم صاحب بالکل بدل ہی گئے۔ سچ ہے اللہ والوں کی نظر فیض اثر میں ایسی ہی تاثیر ہوتی ہے اور انکی صحبت میں ایسا ہی اثر ہوتا ہے بقول حضرت خواجہ صاحبؒ ؎

دلے کو از دل او بستہ گردد　　اگر خارے بود گلدستہ گردد

(جو دل کہ اس دل کے ساتھ بندھ جائے اگر گھاس و کانٹا بھی ہو تو ملکہ گلدستہ ہو جائے گا)

چنانچہ الحمد للہ حکیم صاحب بھی اس باب میں بہت ہی خوش نصیب ثابت ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ کا کچھ کرنا ایسا ہوا کہ حکیم صاحب کا یہ سفر حج سفر آخرت بھی ثابت ہوا دیار محبوب میں جاکر وہاں سے واپس نہ آسکے وہیں انتقال فرما گئے اور وہیں دفن ہوئے

اللہ تعالیٰ نے خاتمہ ایسا حسین فرما دیا جس کی تمنا ہر مسلمان کے دل میں ہوا کرتی ہے ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر　　که مبادا بار دیگر نه رسی بدیں تمنا

یعنی جب محبوب کی گلی میں تم پہونچ جاؤ تو اپنی اس بیقرار جان کو وہیں سپرد کر دو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ شاید اب دوبارہ تم کو ایسا زریں موقع نہ میسر آ سکے۔ سنا گیا ہے کہ حکیم صاحب مرحوم اپنے اس سفر میں جانے سے پہلے یہ دعا فرمایا کرتے تھے کہ "یا اللہ اب آپ نے اپنے در پر حاضری کی توفیق دی ہے تو ہند میں واپس نہ لانا اور اس ستھرے ماحول سے اس دنیوی ماحول میں ملوث نہ فرمانا"۔ اللہ تعالیٰ نے حکیم صاحب کی یہ دعا سن لی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جا کر پھر واپس نہ آ سکے۔ حج سے فراغت کے بعد غالباً رمی جمار کے موقع پر گر پڑے چوٹ آ گئی اور وہی بہانہ بن گئی دنیا سے روانگی کا۔ ؏۔ خدا یہ موت دے سب کو ہم اس مرنے پہ مرتے ہیں۔

حکیم عثمانی صاحب باوجود متعدد بار آنے جانے کے بھی حضرت اقدسؒ کے سامنے بالکل خاموش ہی رہتے تھے طبی ضروریات سے کوئی بات دریافت کرنی ہوئی تو کر لیا بس اسکے بعد کچھ نہیں جیسا کہ اس زمانہ کا دستور ہو گیا ہے کہ بزرگوں کے پاس لوگ جائیں گے تو مقصد یہ ہو گا کہ ان سے ذرا تبادلۂ خیالات کیا جائے گا۔ یہی بے ادبی لوگوں میں آ گئی ہے جس کی وجہ سے بزرگوں کے فیض سے محروم رہتے ہیں ورنہ ؎

اسکے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر　　تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

لیکن حکیم صاحب نے اپنی خاموشی میں پالا مار لیا۔ اپنے اس معمول کے خلاف البتہ ایک بار حکیم صاحب موصوف حضرت والاؒ سے بولے اور دو بدو گفتگو فرمائی وہ بھی سنئے، ہوا یہ کہ حضرت کو رعاف کا دورہ پڑا۔ بڑا خون نکلا اور برابر نکلتا ہی رہا ایک دن میں متعدد بار دورہ پڑنے لگا جسکی وجہ سے متعلقین گھبرا گئے حتیٰ کہ خود حضرت والا بھی تردد میں پڑ گئے کہ خون اتنا اتنا نکل رہا ہے انجام کیا ہو گا۔ اسلئے نزدیک و دور ہر جگہ کے مخصوص اطباء جمع ہو گئے چنانچہ ایک موقع پر بمبئی سے حکیم اجمیری صاحب

لکھنؤ سے حکیم خواجہ شمس الدین صاحب ۔ جون پور سے حکیم منظور احمد صاحب ۔ دیوبند سے حکیم محمد عمر صاحب ۔ علی گڑھ سے حکیم افہام اللہ صاحب اور ان کے علاوہ اور بہت سے حکماء جمع ہو گئے ۔ سارے اطباء تشخیص مرض اور تجویز نسخہ میں ہمہ تن مصروف تھے باہم مشورہ بھی ہو رہا تھا اور حضرت والا کے حکم سے طب کی کتابیں بھی دیکھی جا رہی تھیں کیونکہ حضرت کا علاج عام طبیب کے بس کی بات نہ تھی ۔ دریافت فرماتے تھے کہ ایسا کیوں ہوا ؟ اسکو کسی طب کی کتاب سے مبرہن بیان کرو اور مجھے بھی وہ موقع دکھلاؤ ۔

اب جن حضرات نے وہ منظر دیکھا ہے وہی جان سکتے ہیں کہ کیسا منظر ہوتا تھا ۔ حضرت کی علالت بھی بڑے بڑے اطباء کے لئے مستقل ایک طبی امتحان ثابت ہو جاتا تھا ۔ اسباب و علل کی تقریر اور اس کے علاج کو مدلل طریقہ پر حضرت کو سمجھانا اور مطمئن کرنا پڑتا تھا ۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ کتب طب کا مطالعہ جاری تھا کہ اسی اثناء میں کسی مسلم طبیب کی یہ عبارت ملی کہ "مرض رعاف کے سلسلے میں کبھی مریض کی ناک سے خون کا فوارہ نکلتا ہے اور اتنا زیادہ اور اس قدر نکلتا ہے جیسے کوئی بکرا ذبح کر دیا گیا چنانچہ اسکی وجہ سے مریض بھی گھبرا جاتا ہے اور لوگ بھی ہراساں ہو جاتے ہیں" لوگوں نے حضرتؒ کو عبارت دکھلائی تو مرض کی جانب سے اطمینان ہوا ۔ اسکے بعد علاج کے لئے اطباء کیا کہتے ہیں تلاش کرو اسکا مطالبہ شروع ہوا ۔

بہر حال رعاف سے الحمد للہ سکون ہوا تو ہچکی کے مرض نے اسکی جگہ لے لی ۔ اب اطباء کے لئے تحقیق کا یہ موضوع بن گیا ۔ الحمد للہ اسکی طرف سے بھی اطمینان ہوا تو باہر کے اطباء اجازت لیکر اپنے اپنے وطن تشریف لے گئے اور یہاں یہ طے ہوا کہ حضرت اقدس کو ضعف بہت ہے اور اندیشہ ہے کہ رعاف یا ہچکی کا مرض عود کر آئے اسلئے حضرت والا بغرض علاج کچھ دنوں کے لئے لکھنؤ تشریف لیجائیں اور وہاں شمس الاطباء جناب شمس الدین صاحب کے نگرانی

آپ کا علاج ہو۔ اطباء کی بھی رائے ہوئی اور گھر کے لوگ بھی اس پر تیار ہو گئے اور حضرت والا سے رضامندی بھی حاصل کر لی گئی مگر اس تجویز کی اطلاع حکیم عثمانی کو نہیں ہوئی حکیم صاحب کو اُس دن معلوم ہوا جس دن کہ حضرت والا کی لکھنؤ کو روانگی تھی۔ چنانچہ اس دن صبح حکیم صاحب تشریف لائے حضرت سے ملے اور حضرت کی شدید علالت اور قصد سفر پر رنج و افسوس ظاہر کرتے ہوئے حضرت والا سے اتنا کہا کہ ـــ حضرت سنا ہے کہ لکھنؤ جانے کا قصد فرمالیا ہے مجھے پہلے سے اطلاع ہوتی تو اصرار کر کے روکتا۔ اب تو آپ بالکل پا بہ رکاب ہیں کیا عرض کر سکتا ہوں ہاں مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ آپ نے جب ارادہ ہی فرمالیا ہے تو جائیے خدا حافظ لیکن حضرت لکھنؤ میں کوئی دوسرا خدا نہیں ہے اور اطباء میں احمد عثمانی سے زیادہ لائق کوئی طبیب بھی نہیں ہے۔ طبیب کی خدمت درکار ہو تو خادم حاضر ہی ہے اور جو خدا وہاں ہے وہی یہاں بھی ہے اسلئے ضرورت سفر فرمانے کی تو نہ تھی آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ اسقدر توحید میں ڈوبا ہوا جملہ شیخ وقت نے جب سنا ہوگا تو قلب پر کیا گذر گئی ہوگی ؟ حضرت بالکل خاموش تھے اور حکیم صاحب بھی اتنا کہکر قطعی خاموش ہو گئے۔

باقی اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ کی آب و ہوا میں بھی کچھ خاصیت رکھی ہے اتنے دنوں الٰہ آباد کا تجربہ کرنے کے بعد خیال گذرا ہوگا کہ شاید وہیں سے صحت مقدر ہو اس لئے حضرت اقدس نے لکھنؤ کا سفر فرمایا اور الحمد للہ کہ صحت یاب ہو کر تشریف لائے۔

۳ ـــ اوپر کہیں ذکر حکیم اجمیری صاحب کا آیا ہے آپ بھی پہلی بار حضرت سے ملنے الٰہ آباد ہی تشریف لائے تھے۔ خود فرماتے تھے کہ میں حضرت تھانوی ؒ کا معتقد کیا بلکہ عاشق تو تھا ہی مگر حضرت کے خلفاء میں سے حضرت شاہ وصی اللہ صاحب سے واقف نہ تھا بمبئی میں میرے پاس بھائی ظہیر احمد صاحب کاتب اعظمی تشریف لایا کرتے تھے ایک دن انھوں نے چند کتابچے مجھے دیئے کہ ہمارے حضرت کے یہ رسالے ہیں انھیں ملاحظہ فرمائیے میں نے اخلاقاً اُنسے

لے تو لئے لیکن دل میں یہی کہا کہ ایسے ایسے بہت سے رسالے دیکھ چکا ہوں اور اخلاق و تصوف پر اب ہمارے حضرت تھانوی کے بعد کیا کوئی لکھے گا۔ پھر ان کے جانے کے بعد سوتے وقت میں نے کہا کہ لاؤ دیکھوں تو سہی شاہ صاحب نے ان میں کیا لکھا ہے اور انکو دیکھنے لگا سب سے پہلے جو رسالہ اٹھایا تو اسمیں یہ مضمون ملا کہ انسان جب عاجز ہو کر کسی انسان ہی سے کچھ طلب کرنا چاہے تو کیوں نہ اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرے ایسا کر کے تو دیکھے کہ اللہ تعالیٰ اسکی دعا ر قبول فرماتے ہیں یا نہیں۔ میں ان دنوں اپنی ایک پریشانی میں مبتلا تھا وہ یہ کہ جس مکان میں اب ہوں وہ مکان فروخت ہو رہا تھا اسکے خریدنے کیلئے پاس پیسہ نہیں تھا اس لئے سوچ رہا تھا کہ آخر کس طرح کامیابی ہو اور کس سے مانگوں اور کس سے نہ مانگوں۔ اس حیرانی و پریشانی کے وقت شاہ صاحب کے ان الفاظ نے کیا کام کیا اسکو میں ہی جانتا ہوں میں نے ارادہ کر لیا کہ بس اب کسی مخلوق سے عرض مدعا نہیں کروں گا اور جو کچھ مجھے کہنا ہے اپنے اللہ تعالیٰ ہی سے کہوں گا۔ چنانچہ دعار کرنی شروع کر دی سچ جانیئے کہ بس چند ہی یوم میں اللہ تعالیٰ نے روپیہ کا بندوبست فرما دیا اور مجھے کسی سے ایک لفظ نہیں کہنا پڑا اس سے مجھے حضرت شاہ صاحب کی قدر ہوئی اور میں نے سمجھا کہ ہاں یہ واقعی بزرگ شخص ہیں اور انھوں نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ سیکھا ہے اس طرح سے حضرت سے تعلق غائبانہ ہوا اور پھر میں نے حضرت کو خط لکھا۔

اسی طرح سے ایک دفعہ یہ ہوا کہ یہی بھائی ظہیر احمد صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ ہم چند لوگ کل الہ آباد جا رہے ہیں کہیئے تو آپ کے لئے بھی ٹکٹ لے لوں۔ میں نے کہا کہ جی تو میرا بھی حضرت سے ملنے کو چاہتا ہے مگر اتنی جلد کیسے تیاری ہو سکتی ہے؟ انھوں نے کہا ٹکٹ لئے لیتا ہوں نہ تیار ہو سکئے گا تو واپس ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے تیاری کر لی اور الہ آباد حاضر ہو گیا۔ حضرت مجھ سے واقف تھے اسلئے الگ کمرہ میں ٹھیرنے کا بندوبست فرما دیا اور اپنے ایک داماد کو میرے اوپر

مستقلاً مقرر فرما دیا کہ دیکھو حکیم صاحب کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اوقاتِ مجلس میں یا جب حضرت طلب فرماتے حضرت کے پاس حاضر ہوجاتا اور بقیہ اوقات اسی کمرہ میں رہتا جس میں ہر قسم کی راحت کا سامان حضرت نے مہیّا فرما دیا تھا۔

پھر اسکے بعد تو حضرت سے خاصا تعلق ہوگیا جس کے سبب الہ آباد کئی بار حاضری ہوئی اور آخر میں تو حضرت بمبئی بھی تشریف لے گئے ۔ اور اس میں شک نہیں کہ یا تو حکیم صاحب ایسے مستغنی واقع ہوئے تھے کہ انکا کسی کی جانب رجوع ہونا مشکل معلوم ہوتا تھا اور یا جب سے تعلق ہوا تو اپنے کو اس طرح پیش کر دیا کہ تمام اہل بمبئی انگشت بدنداں تھے کہ یہ حکیم صاحب اسقدر کیسے بدل گئے حضرت والا بھی اپنے زمانہ قیام بمبئی میں تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن ان سے ملنے ان کے مکان تشریف لے جاتے ایک مرتبہ حضرت والا کو اچانک کچھ تکلیف ہوگئی وہ یہ کہ جب ذرا نیند آتی تو بڑے زور سے چونک جاتے تھے حکیم صاحب کو طلب فرمایا حکیم صاحب تشریف لائے دوائیں استعمال کرائیں اور امتحان کی غرض سے رات بھر جاگتے رہے کہ دورہ پھر تو نہیں پڑتا حالانکہ اپنا گھر چھوڑ کر کسی کے یہاں شب کو رہنے کی اس سے قبل کوئی مثال نہیں تھی، دوسرے دن بھی غالباً قیام فرمایا جب اطمینان ہوگیا کہ دورہ نہیں پڑیگا تب مکان تشریف لے گئے۔

حکیم صاحب سے اور جناب قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند سے کچھ قریبی رشتہ بھی تھا اسلئے جناب قاری صاحب اکثر حکیم صاحب موصوف کے یہاں تشریف لاتے تھے، چنانچہ ایک بار جب دیوبند کے مدرسہ کے حالات کچھ دگرگوں ہوئے تو بیمار ہو کر حضرت مہتمم صاحب بمبئی تشریف لائے تو حضرت والا کو جناب مہتمم صاحب کی علالت کی سخت فکر ہوگئی فرمایا کہ آپ یہیں بمبئی میں رہیئے میں آپکا علاج کراؤں گا اور حکیم صاحب موصوف اور ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب کو متعین فرمایا کہ آپ دونوں حضرات کی نگرانی اور مشورہ سے قاری صاحب کا علاج ہوگا۔

چنانچہ اس خبر پر دیوبند سے نائب مہتمم صاحب علامہ ابراہیم بلیاویؒ کے اور بعض حضرات کے خطوط حضرتؒ کے پاس بطور ہدیۂ تشکر کے آئے حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس سے حقیقی خوشی تو مجھے اسوقت ہوتی جب آپ حضرات کے بجائے طلبہ کی جانب سے میرے پاس کوئی تحریر طلب خیریت کی آتی کیونکہ کسی مدرسہ کے مہتمم کی کوئی خدمت در اصل ان طلبہ کی بھی خدمت ہے جوان کے زیر اہتمام تعلیم پا رہے ہوں۔ اس سے اندازہ فرمائیے کہ حضرت مصلح الامۃ حضرت مہتمم صاحبؒ کی ذات والاصفات کو کس درجہ قابل احترام اور لائق تعظیم سمجھتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ایسا انکی اسی نسبت کی وجہ سے تھا جو بزرگوں سے انکو حاصل تھی۔
بہرحال بزرگوں نے اپنے عمل سے اسکا ثبوت دیا کہ کسی نسبت کا کوئی شخص حامل ہو کر خود بھی کسقدر لائق تعظیم ہوا کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت اقدسؒ اس مزاج کے بھی نہ تھے کہ کسی انسان کو معصوم سمجھتے ہوں مدرسہ کے اندرونی معاملات میں دخیل بھی نہ تھے تاہم ان سب باتوں کے باوجود اتنا ضرور سمجھتے تھے کہ حضرت قاری صاحب اپنی ذات سے بھی اور اپنی نسبت کی رو سے بھی بڑے شخص ہیں اور مغتنمات زمانہ سے ہیں اب ان کے بعد لوگ ان کے جیسا بھی نہ پاسکیں گے۔

راقم عرض کرتا ہے کہ "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید" حضرت حکیم الامۃؒ نے مدرسہ کو جس حال میں دیکھنا چاہا تھا ابنار زمانہ کو وہ پسند نہ ہوا پھر اب حضرت مصلح الامۃؒ نے بھی جو چاہا اسکے خلاف ہی میں لوگوں کی مصلحت معلوم ہوئی چنانچہ حضرت قاری صاحب کو ہٹا دینے کے بعد بھی سنا ہے کہ وہاں کا عملہ چین سے نہیں ہے اور ایک ایک کرکے تمامی باہمی اختلافات رونما ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ ہی دارالعلوم کی حفاظت فرمائے۔

میرا مقصد یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ جس طرح سے حکیم صاحب موصوف کو حضرت اقدس کی صحت کا لحاظ تھا تو حضرت والا نے بھی عجب نہیں کہ اسی کا صلہ ادا فرماتے ہوئے حکیم صاحب کے عزیز خاص یعنی سمدھی حضرت مہتمم صاحب کے ساتھ یہ معاملہ

فرمایا ہو چنانچہ حضرت قاری صاحب کے معالجہ پر اسقدر توجہ فرمائی کہ اساطین دیوبند کو بھی اسکا اندازہ ہو کر تشکر نامہ ارسال کرنا پڑا مثلاً اسی موقع پر جناب سید مبارک علی صاحب نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے حضرت والا کو یہ عریضہ تشکر ارسال فرمایا کہ

" حضرت مولانا محمد طیب صاحب زید مجدہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند کا گرامی نامہ ۱۱ ربیع الاول ۱۳۸۵ھ کو موصول ہوا اس سے معلوم ہوا کہ الحمدللہ حضرت مہتمم صاحب کی طبیعت نسبتاً اچھی ہے دوا اور پرہیز کا سلسلہ جاری ہے نیز یہ معلوم ہوا کہ حضرت مہتمم صاحب کے علاج کے سلسلہ میں آنجناب کو بہت زیادہ اہتمام ہے اور نہایت محبت سے حضرت مہتمم صاحب کی طرف متوجہ ہیں۔ غایت درجہ مسرت اور طمانینت حاصل ہوئی اور اس عریضہ تشکر کے ارسال خدمت کرنے کا داعیہ قلب میں پیدا ہوا۔ ہم سب خدام دارالعلوم اسکے لئے ممنون اور شکر گزار ہیں امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ آنجناب کی روحانی توجہات سے جلد مرض کا ازالہ ہو جائے گا اور حضرت مہتمم صاحب عنقریب مراجعت فرمائے دیوبند ہو جائیں گے۔

یہ حقیقت ہے کہ اپنی جماعت میں جناب والا کی ذات گرامی مغتنمات میں سے ہے اللہ تعالیٰ تا دیر اس ظل عاطفت کو قائم رکھے۔ گو جناب والا بندہ سے واقف نہیں لیکن احقر عرصہ سے جناب کے عقیدت کیشوں میں شامل ہے۔ دعا کے لئے مستدعی ہے۔ خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔ والسلام

نیازکیش۔ بندہ سید مبارک علی

(نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ ۲۳ ۳/۸۵ ھ)

اسی موقع پر ایک دوسرے حضرت علامہ بلیاوی رحمہ اللہ کا خط بھی آیا ملاحظہ فرمائیے

" پرسوں یا ترسوں ایک ملفوف عریضہ ارسال خدمت کر چکا ہوں۔

آج یہ عریضہ خاص مقصد کے لئے لکھ رہا ہوں۔ مخدوما! یہ معلوم کر کے
از حد مسرت ہوئی کہ آنجناب نے حضرت مہتمم صاحب دار العلوم
کے حصول صحت و بقائے ذات میں کمال توجہ اور التفات تامہ سے کام لیا مثلاً
علاج اور وہ بھی پر از کمال طبیب سے کرایا ہے۔ اگرچہ جناب نے اخوت روحانی
اور حفاظت دار العلوم کا حق ادا کیا ہے مگر آنجناب کا یہ عمل
جماعت دار العلوم پر جس میں جناب بھی داخل ہیں بڑا احسان ہے۔ اسلئے
احقر اور پوری جماعت ہدیہ تشکر خدمت اقدس میں پیش کر کے مزید توجہ
کے متمنی ہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ ہاتھ میں طاقت نہیں۔ والسلام۔
محمد ابراہیم ۲۸/۳/ ۷۳ھ

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ حضرت مہتمم صاحب کی ذات گرامی حضرت اقدسؒ کے نزدیک۔
اور ان دونوں بزرگوں کے نزدیک (جن میں سے ایک نائب مہتمم اور دوسرا
صدر المدرسین دیوبند ہے) کتنی عزیز اور کس قدر گرامی شخصیت تھی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ
کہ حضرت قاری محمد طیب صاحب مدظلہ ان حضرات کے نزدیک مہتمم دار العلوم کے واحد فرد
تھے۔

حضرت اقدسؒ نے ان دونوں خطوط کا یہ جواب مرحمت فرمایا:۔
"کل کی ڈاک سے جناب سید مبارک علی صاحب نائب مہتمم مدرسہ
دار العلوم کا اور آج کی ڈاک سے جناب والا کا مکتوب گرامی حضرت
مہتمم صاحب کے علاج کے سلسلہ میں بطور تشکر کے آئے۔ علاج تو
حضرت مہتمم صاحب کا جناب حکیم اجمیری صاحب اور ڈاکٹر اسحاق صاحب
کر رہے ہیں جنکا شکریہ تمام جماعت کی جانب سے ادا کرنے کے سلئے
میں خود کافی تھا چنانچہ میں تو ان حضرات کا شکریہ تقریباً روزانہ ہی
ادا کر رہا ہوں۔ آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا اس سے کہیں زیادہ خوشی مجھے
اسوقت ہوتی جب آپ کے بجائے ان طلبہ کے خطوط جناب مہتمم صاحب

کی دریافت خیریت و دعا گوئی کے لئے آتے جو کم از کم مجھ سے تعلق و محبت رکھتے ہیں، اس لئے کہ حضرت مہتمم صاحب کی بیماری کا سبب طلبہ ہی بنے ہیں تو جن لوگوں سے بیماری آئی ہے انھیں لوگوں کی جانب سے حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں تو اظہار نیازمندی اور وسائط صحت کے لئے تشکر زیادہ زیب دیتا۔ اس سے زیادہ کیا عرض کروں۔ والسلام خیر ختام خویدکم۔

وصی اللہ عفی عنہ ربیع الاول ۸۰ھ

حضرت قاری صاحبؒ کے معالجہ کا ذکر حکیم صاحب موصوف کے ذکر میں ضمناً آگیا ورنہ تو اصل ذکر حکیم صاحب کا ہو رہا تھا۔ آپ گنگوہ کے رہنے والے تھے اور آپ کے والد حکیم سعید صاحبؒ یا دادا جناب حکیم محمد اسماعیل صاحب مرحوم و مغفور کچھ دنوں اجمیر رہے پھر وہاں سے بمبئی تشریف لے گئے اور وہیں رہنے ہی لگے چونکہ اجمیر سے بمبئی تشریف لے گئے اسلئے وہاں بمبئی میں حکیم اجمیری کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے بعد پھر ان کے صاحبزادے جناب حکیم مسعود صاحب کو بھی لوگ اجمیری کہنے لگے اور ان کے بھی بعد ان کے دو صاحبزادگان حکیم مولوی سعد رشید صاحب اور حکیم مولوی سعود صاحب کو بھی لوگ حکیم اجمیری کے لقب سے پکارتے ہیں۔ بہرحال جس طرح سے سعد کا مادہ اس خاندان کے مرد و عورت کے اسمار کا جزو لازم سا ہو گیا اسی طرح سے اجمیر کی جانب نسبت بھی لازم سی ہو گئی اگرچہ وطن آپکا گنگوہ تھا۔

چونکہ بڑے حکیم صاحب حکیم سعید صاحبؒ کا تعلق حضرت حکیم الامتؒ سے تھا اسلئے حکیم مسعود صاحب کو بھی گویا حضرت تھانویؒ سے پیدائشی عقیدت تھی۔ حضرت اقدس مولانا تھانویؒ بھی بڑے حکیم صاحب کا بیحد ادب فرماتے تھے اور ان حکیم صاحب کو تو مانند اپنی اولاد کے مانتے تھے اسلئے بھی کہ آپ کا خاندانی سلسلہ حضرت اقدس قطب عالم مولانا عبد القدوس صاحب گنگوہیؒ سے ملتا تھا۔ اس نسبت پر حکیم مسعود صاحب معروف بہ حکیم اجمیری صاحب کا ایک واقعہ

جو یہاں کے لوگوں سے سنا ہے یاد آیا عجیب واقعہ ہے :

جن دنوں حضرت والا پر رُعاف کا دورہ پڑا تھا اور علاج کے سلسلے میں حکیم اجمیری صاحب بھی بمبئی سے طلب کئے گئے تھے تو ایک مرتبہ حکیم صاحب کے سامنے ہی حضرت کو بہت خون آیا ایسا کہ حکیم صاحب بھی پریشان ہوگئے طبی اصول کے تحت جو پرہیز ہونا چاہیئے تھا اس میں حکیم صاحب نے کچھ کمی پائی مثلاً یہ کہ ایسی حالت میں مریض کو بالکلیہ آرام درکار ہے ۔ تنہائی میں آئے ہوئے لوگوں سے گفتگو کرنا تو الگ رہا ان سے ملاقات کرنے میں بھی کمی رکھی جائے ۔ یہ سب ہونا چاہیئے تھا یہاں حال یہ تھا کہ حضرت والا غیر اوقات دورہ میں لوگوں سے اسی طرح سے ملتے جیسے عام قاعدہ تھا ۔ گفتگو فرماتے اس میں تیزی بھی ہو جاتی مواخذہ اور عتاب بھی فرماتے ۔ یوں منع کرنے کو سب ہی اطبار اور ڈاکٹر نے حضرت کو اس سے منع کیا لیکن حضرت یہ فرماتے تھے کہ "میرے پاس لوگ آویں گے تو مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا کہ میں چپ پیرین کر بیٹھ جاؤں میں ضرور بولوں گا اور انکی اصلاح کروں گا ۔ لوگ میرے پاس آویں اور میں یونہی ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کا مصداق بنا رہوں اس سے مرجانا بہتر سمجھتا ہوں" ۔ بولنے سے زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ خون آجائے گا آئے ۔ مرجاؤں گا مرجاؤں آخر مرنا تو ایک دن ہے ہی ۔ اور لوگ تو اس تقریر کے بعد خاموش ہو جاتے تھے لیکن حکیم صاحب چونکہ بڑے طبیب تھے اسلئے انھوں نے بھی محسوس کیا کہ حضرت کو مکمل آرام فرمانے کی ضرورت ہے اس لئے اس دن ذرا پریشان ہوکر یہ فرمادیا کہ اگر حضرت کا یہی حال رہے گا تو صحت مشکل ہے حضرت نے بھی سنا کہ حکیم صاحب کچھ فرما رہے ہیں ۔ فرمایا کہ حکیم صاحب کیا فرما رہے ہیں ؟ یہ سنکر حکیم صاحب ہی خود بولے کہ حضرت اگر آپ اسی طرح سے کام جاری رکھیں گے بولیں گے خفا ہوں گے تو خون پھر آجائے گا تھوڑی مدت اس گفتگو کو بند رکھا جائے ۔ چونکہ حکیم صاحب کا یہ لہجہ حکیمانہ کے بجائے ذرا حاکمانہ انداز اختیار کر گیا تھا اس لئے حضرت نے فرمایا کہ میں تو بولوں گا دیکھیں تو خون کیسے آتا ہے ؟

اسپر حکیم صاحب تو یہ کہکر اپنے قیام گاہ پر چلے گئے اور حضرت والا خاموش ہو گئے، خدام ششدر کہ یا اللہ یہ گفتگو تو آج گڑبڑ ہوئی۔ چنانچہ آدھ گھنٹہ گذرنے پر حضرت والا نے کسی خادم کو حکیم صاحب کے پاس بھیجا اور فرمایا حکیم صاحب خون دوبارہ تو نہیں آیا۔ پھر آدھ گھنٹہ گذرنے پر دوسرے کو بھیجا کہ حکیم صاحب سے جاکر کہو کہ خون تو نہیں آیا۔ تیسری بار پھر کہلوایا۔ حکیم صاحب یہ سنکر حضرت والا کی خدمت میں خود حاضر ہوئے اور منکسار کو سمجھکر دور کھڑے ہوکر ہاتھ جوڑکر عرض کیا کہ حضرت! میں نے جو کچھ عرض کیا تھا وہ قانونِ طب کے اصول اور قاعدہ کے ماتحت عرض کیا تھا باقی میں الحمدللہ اولیاء اللہ کی کرامات کا منکر نہیں ہوں (مطلب یہ کہ اب کسی کو اگر ان حالات میں خون نہ آئے تو یہ اسکی کرامت ہے۔ میں اسکا منکر نہیں ہوں۔) اس طرح سے گویا اپنی اس فی الجملہ تیز کلامی کی معافی طلب فرمائی۔ حضرت والا کو یہ جملہ سنکر ہنسی آگئی۔ پاس بلایا اور فرمایا کہ حکیم صاحب آج خیر ہوگئی اسوقت آپ کی اس بات پر میں نے تو آپ کو کچھ کہہ دیا ہوتا لیکن قطب عالم حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کی روحانیت آڑے آگئی اسلئے زبان سے کچھ نکل نہ سکا۔ اس سے حکیم صاحب کی بھی اصلاح ہوگئی اور ہم لوگوں کے لئے اہل اللہ کا ایک ادب معلوم ہوا کہ وہاں تو انسان کو بقول۔ "مجھے تو خو ہے کہ ہر بات پر بجا کہیئے" کا مصداق ہونا چاہیئے اور یہ سمجھنا چاہیئے کہ ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن   کہ جاہا سپر باید انداختن

یعنی" ہر جگہ گھوڑے دوڑانے سے کام نہیں چلا کرتا کوئی کوئی جگہ ایسی بھی ہوتی ہے جہاں سپر ڈال دینی چاہیئے"

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ حضرت مصلح الامتہؒ کی علالت کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے اطباء کے لئے انکی باطنی صحت کا ذریعہ بنا دیا تھا، ہمارے حکیم احمد بیریؒ صاحب نے بلاشبہ حضرت والا کا معالجہ نہایت ہی خلوص کے ساتھ فرمایا چنانچہ اسی کے بقدر اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدسؒ کے فیض سے بھی حکیم صاحب مرحوم کو حصہ وافر عطا

فرمایا اس سلسلہ میں حکیم صاحبؒ کے دو خط پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیے۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

حال: "کمینہ خدام کفش بردار مسعود عفی عنہ بادب و نیاز عرض گذار ہے کہ رسالہ میں ملفوظات عالیہ ہمیشہ ہی بے بہا جواہر ہوتے ہیں مگر تصوف کے عنوان سے ملفوظ عالی ایسا عجیب و غریب ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا عمر اسی ماحول میں گذری مگر اس عنوان پر ایسا جامع اور شافی و افی مضمون نظر سے نہیں گذرا۔ نہایت ہی عجیب و غریب استدلالات ہیں (مثلاً) "اسم محدث ہے تو مسمیٰ تو محدث نہیں"۔ اور "غل و غش کی وجہ سے تصوف کا رد و انکار ہے تو اصل صورت میں اسلام ہی کب باقی رہ گیا ہے" بہت ہی عمدہ اور مسکت دلیلیں ہیں اس پر مستزاد حوالے اور امام مالکؒ کا قول تصوف کے متعلق ذکر فرمانا یہ امور سونے پر سہاگہ ہیں۔ آنے جانے والوں کو سناتا ہوں۔ محظوظ ہوتا ہوں محظوظ کرتا ہوں۔

یہ مضمون پورا آجائے تو دل چاہتا ہے کہ ایک جلد خادم زادے سعود سلمہ کو مدینہ طیبہ بھیجوں حق کے جویاں وہاں بہت ہیں"۔ خیال تھا کہ علامہ مودودی کو بھی بھیجدوں مگر وہ شخص حق کے جویا معلوم نہیں ہوتے"

والا نامہ ملفوفہ صادر ہو گیا۔ شوال میں حاضری کی آرزو اور ارادہ ہے"

تحقیق: " ملفوظات پر جو آپ نے اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے بہت مسرت کا موجب بنا آپ کی قدر دانی سے بڑا لطف آیا نقل کرا رہا ہوں تاکہ دوسروں کے لئے بھی مفید ہو" ۔ والسلام وصی اللہ عفی عنہٗ (از رجسٹر ۱۷)

(حکیم اجمیری صاحبؒ کا دوسرا خط بنام مصلح الامۃؒ)

حال: افاضات عالیہ میں ہر فیض اور ہر ملفوظ لاجواب اور بے مثال ہوتا ہے

مگر نسبت صوفیہ یہ ملفوظ عالی تو معلوم ہوتا ہے کہ اسی خادم کو سامنے بٹھلا کر بیان فرمایا جایا ہے نہایت پرمغز اور بہت عظیم الشان اور انتہائی جلیل القدر علم ہے اور بڑے انوکھے اور دلنشین انداز میں اسے تعلیم فرمایا گیا ہے۔ ہفتہ وار مجالس میں اسے ہی بیان کر رہا ہوں اور اس دل کی لگن کو بڑی لگن کے ساتھ لوگ سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بات کبھی ذہن میں بھی نہیں آئی تھی اور اب معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ سے جانتے ہیں قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ کا کتنا صحیح اور انوکھا مصداق ہے۔ عبد ادیب"

تحقیق: آج ارادہ کر ہی رہا تھا کہ آپ کو خط لکھوں کہ آئیے تشریف لائیے ملاقات کو طبیعت چاہتی ہے کہ اتنے میں آپکا محبت نامہ ملا۔ مضمون کے متعلق آپنے جو لکھا تو میں تو آپ ہی کے خاندان کا خوشہ چین ہوں میری کیا حیثیت ہے باقی یہ مضمون نسبت صوفیہ جو آپکو پسند ہوا تو اس نسبت کی برکت سے جو اپنے اسلاف سے آپکو حاصل ہے والسلام۔ وصی اللہ

ملاحظہ فرمایا آپنے حضرت حکیم صاحب موصوف کی مکاتبت۔ اتنا بڑا شخص اور خود کو حضرت اقدسؒ کے سامنے کسقدر فنا کئے ہوئے ہے۔ ایسا وسیع النظر انسان جو بزرگوں کی صحبت بھی اٹھا چکا ہو وہ حضرت کے مضامین کی تعریف ان لفظوں میں فرمائے کہ "ایسا شافی وافی مضمون نظر سے نہیں گذرا" اسی سے اندازہ فرمائیے کہ کس درجہ حضرتؒ کے فیض سے حصہ پایا تھا کہ علامہ مودودی تک ان مضامین کے پہونچانے کا داعیہ پیدا ہو گیا تھا اور اسمیں شک نہیں کہ حضرت اقدس کی یہ تصنیف یعنی "رسالہ تصوف اور نسبت صوفیہ" ہے ہی اسی شان کی چنانچہ جسوقت ہمارے حضرتؒ نے اسکا کچھ حصہ حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کو جبکہ وہ حضرت والا کے یہاں تشریف لائے ہوئے تھے راقم کے واسطہ سے سنوایا تھا تو انھوں نے بھی برجستہ یہی فرمایا کہ ارے ابھی ابھی مجھ سے ملنے کیلئے یہاں مولوی ابو اللیث آئے تھے یہ انکے بڑے کام کی چیز تھی ہو سکتا تھا کہ انکو اس سے نفع ہوتا۔ اسی نوع کا تاثر ہمارے حکیم اجمیری صاحبؒ کو ہوا کہ "جی چاہتا ہے ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کے پاس بھی اسکو بھیجدوں کہ لو اب تصوف کا انکار کرو"

الغرض ان اطبائے کرام کی بھی ملاقات حضرت اقدس سے چونکہ الہ آباد ہی میں ہوئی اسلئے حالات الہ آباد کے ذیل میں کچھ ذکر ان حضرات کا بھی آگیا۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ حضرت اقدس کا ورود با مسعود الہ آباد میں نومبر ۵۷ء کو "حسن منزل" میں ہوا تھا وہیں حاجی شفیع اللہ صاحب لیڈر مرچنیٹ کے مکان میں حضرت والاؒ کا قیام رہا اور اسکے متصل حاجی عبدالوحید صاحب ڈیری والے کے مکان میں حضرت کے متعلقین کا قیام تھا۔ اسی محلہ میں مجلس بھی ہوتی تھی طلبہ اور طالبین کا بھی قیام یہیں تھا۔ آناً فاناً حضرتؒ کا شہرہ شہر اور اطراف شہر میں عام ہوگیا ہر طرف سے لوگ آآکر مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ مجلس کے لئے تو ماشاء اللہ حاجی شفیع اللہ صاحب کے بالاخانے کا صحن خاصا وسیع تھا لیکن جس مکان میں صاحبزادیاں مقیم تھیں وہ انکے لئے چنداں آرامدہ نہ تھا تاہم کسی نہ کسی طرح گذر ہوتا رہا کہ اسی عرصہ میں گرمی کا زمانہ آیا اور الہ آباد میں تاریخی قسم کی گرمی پڑی یوں تو الہ آباد ویسے بھی گرم جگہ ہے سنگم پر اور دو دریاؤں گنگا، جمنا کے تین طرف سے شہر کو گھیرے ہونے کے باوجود گرمی یہاں کافی پڑتی ہے لیکن امسال تو حد سے زائد گرمی پڑی جس کا اثر حضرت اقدس پر یہ ہوا کہ حضرت کے بھی تمام بدن پر گرمی دانے نکل آئے اور پھر دانوں نے ترقی کر کے چھالوں کی شکل اختیار کر لی جس میں بڑی جلن اور سوزش ہوتی تھی۔ تکلیف تو ایسی تھی لیکن سبحان اللہ حضرت بھی کوہ استقامت اور پیکر صبر و ضبط تھے کہ نہ تو کبھی مجلس ناغہ فرمائی اور نہ لوگوں کو اپنی اس تکلیف کا احساس ہونے دیا۔ ہوتا یہ تھا کہ مجلس کے ختم ہونے پر جب لوگ رخصت ہوجاتے تو حضرت والا کرتا اور بنیائن اتار کر صرف تہبند باندھکر کمرہ میں ہوجاتے اور خدام دوا یا پوڈر جو بھی ہوتا تمام بدن پر مل دیتے تھے۔ اس سے حضرتؒ کو کچھ سکون ہوجاتا تھا۔ چونکہ صبح بعد الفجر کی تفریح میں ڈاکٹر صلاح الدین صاحب بھی ہمراہ ہوتے تھے ادھر حضرت والا کو ٹھنڈی جگہ کی تلاش تھی اسلئے ایک دن غالباً خود حضرت ہی نے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب آج تمھارے گھر چلیں چنانچہ مجلس کے بعد فوراً مچھلی کوٹھی ڈاکٹر صاحب کے مکان پر حضرت والا تشریف لے گئے طلبہ کو اطلاع ہوئی کہ وہیں جاکر سبق پڑھیئے چنانچہ

حدیث کا سبق وہیں ہوا ڈاکٹر صاحب کا یہ مکان کرایہ پر تھا لیکن متعدد کمرے تھے
اور سہ منزلہ بلکہ چہار منزلہ تھا اسلئے نیچے کے کمرے میں سے بالخصوص وہ کمرے
جو دھوپ کے رُخ پر نہ تھے کافی ٹھنڈے تھے چنانچہ انھوں نے مکان کی پشت
کی جانب گلی کا ایک کمرہ حضرت کے قیام کے لئے تجویز کیا اور اس میں حضرت اقدس
کا پلنگ بچھا دیا اور مزید اہتمام یہ کیا کہ کمرہ کی نالی بند کر کے اس میں پانی بھر دیا
چارپائی کے پائے کے نیچے اینٹ لگا دی اور خدام اور ملنے والوں کے لئے کرسیاں
رکھدیں۔ حضرت والا کو اس نظم سے بہت آرام ملا۔ چنانچہ اب یہی معمول ہوگیا
کہ مجلس سے فارغ ہوکر یہیں چلے آتے شام تک یہیں رہتے اور حضرتؒ کے مکان سے
کھانا یہیں آجاتا، طلبہ بھی یہیں آکر سبق پڑھتے اور حضرت والا مغرب کے وقت
یہاں سے مکان واپس تشریف لیجاتے۔ شب کو حسن منزل ہی میں آرام فرماتے
ڈاکٹر صاحب کا یہ مکان ڈھال والی مسجد محلہ بخشی بازار سے قریب ہی تھا اسلئے
کبھی کبھی حضرت عصر یا مغرب کی نماز پڑھنے اس مسجد میں بھی تشریف لاتے
تھے اس کے متولی حاجی عبدالصمد صاحب مرحوم تھے ان کے چھوٹے بھائی
حاجی عبدالستار صاحب حضرتؒ کے مرید اور "صحیح معنوں میں خادم خاص" تھے۔ یہ
میں نے صحیح معنوں میں اسلئے بڑھا دیا ہے کہ آجکل یہ لفظ بھی ایک خاص اصطلاح
بن گیا ہے کہ خادم بمعنی مرید اور خاص بمعنی خلیفہ یعنی اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہو
کہ کسی بزرگ کا خود کو خلیفہ ظاہر کرے تو وہ اس دعوے کو اس پردے میں چھپا کر
یہ کہہ سکتا ہے کہ "فلاں خادم خاص حضرت مولانا فلاں" اس میں نفس کی ایک چال یہ
معلوم ہوتی ہے کہ ادعائے خلافت سے بھی محفوظ رہے اور مقصد بھی حاصل ہوگیا
کیونکہ کسی بزرگ کا کوئی اپنے کو خادم خاص کہے تو اس میں کیا قباحت ہے؟
اسی قبیل سے یہ بھی ہے کہ اگر کوئی بزرگ کسی کو صحبت کا مجاز بنائے
اور اسکی مصلحت ہوتی ہے کہ کاش لوگ مجھے "مجاز بیعت" سمجھتے تو بوقت اظہار نسبت
لفظ صحبت کو حذف کر کے فلاں مجاز حضرت مولانا فلاں کہدیتا ہے۔ اب اس زمانہ

میں کتنے لوگ ہیں جو مجاز صحبت اور مجاز بیعت کے فرق کو سمجھتے ہوں اور قاعدہ یہی ہے کہ المطلق اذا اطلق یُرادُ بہ الفرد الکامل پس صرف مجاز سے بھی لوگ مجاز کامل یعنی مجاز بیعت سمجھ لیں گے مقصد حاصل ہو جائیگا اگر کوئی واقف اعتراض کریگا تو جواب ظاہر ہے کہ ہم نے کب مجاز بیعت کہا ہے ہمنے تو صرف مجاز کہا ہے جو دونوں کو شامل ہے اب فرمائیے کیا اشکال ہے)۔ چنانچہ حاجی عبدالستار صاحب مرحوم اس اصطلاحی معنی میں خادم خاص نہ تھے بلکہ واقعی نہایت مخلص خادم، بہت ہی مسکین صورت اور خوش مزاج اور نرم طبیعت انسان واقع ہوئے تھے اور دل سے ہر وقت یہ چاہتے تھے کہ حضرت پر کس طرح سے خود کو فدا کر دیں۔ جوتے کی دوکان تھی روزانہ کی بکری میں سے کوئی شرح مقرر کر رکھی تھی جو حضرت والا کو دین کے لئے صرف فرمانے کے لئے الگ دیتے تھے اور ذاتی ہدیہ الگ دیتے تھے۔ چونکہ روزانہ کا یہ معمول تھا اسلئے اسکی جھلک ہم لوگوں کو بھی لگ جاتی تھی ورنہ ہمکو کیا معلوم کہ کون کیا دیتا ہے اور کیا لیتا ہے۔

اور ایک یہی خدمت کیا دیکھا جاتا تھا کہ حضرت والا نے گھر کی تمام ضروریات کی فراہمی کے لئے گویا انھیں کو منتخب فرما لیا تھا اور حاجی صاحب نہایت خوشی اور انشراح کے ساتھ ہر کام کے لئے مستعد رہتے تھے۔ انھیں کے گھرانے میں مسجد کی تولیت تھی اسلئے مسجد کا انتظام بھی انھیں سے متعلق تھا اور یہاں کے دوسرے نمازیوں میں سے بھی بہت سے لوگ حضرت کے مرید اور معتقد تھے۔ امام مسجد ایک باہر کے رہنے والے بالکل سیدھے سادے نوجوان شخص تھے جو مدرسۂ سبحانیہ میں جناب قاری محب الدین صاحب سے تجوید پڑھنے آئے تھے اور اس مسجد میں رہتے تھے نماز بھی پڑھاتے تھے اور چھوٹے بچوں کو کچھ تعلیم بھی دیتے تھے بعد میں حضرت والا سے بیعت بھی ہو گئے تھے۔ بہرحال حضرت اقدس جب اس مسجد میں پہلی بار تشریف لائے تب ہی سے یہ جگہ یہ محلہ یہ لوگ حضرتؒ کو بہت پسند آ گئے شاید اسی کا یہ اثر ہوا ہو کہ بعد میں چلکر حق تعالیٰ کیجانب سے یہی محلہ

حضرت والا کے قیام کیلئے تجویز کردیا گیا اور مسجد بھی بعد میں اب حضرت مولانا کی مسجد
عام طور سے کہی جانے لگی۔

حاجی عبدالستار صاحب اور دیگر اہل محلہ کے ساتھ انس و محبت نیز
امام صاحب کی حسن قرأت کیوجہ سے حضرت والا بھی اب عصر و مغرب کی نماز
اکثر یہیں ادا فرمانے لگے یہاں تک کہ ان حضرات کی خدمات سے متاثر ہوکر
حضرت نے شب کا قیام کبھی کبھی مسجد کی باہری دوکانوں کی کھلی چھت پر فرمانا
شروع کردیا۔ امام صاحب کے زیر اہتمام عصر سے پہلے ہی خوب چھت ٹھنڈی
کیجاتی تھی اسی پر چارپائی ڈالدی جاتی اور حضرت والا یہیں قیام فرماتے مجلس
اب بھی حسن منزل ہی میں ہوتی تھی۔

اس درمیان میں حضرت کو یہ خیال ہوا کہ گرمی ایسی شدید پڑ رہی ہے
لوگوں نے میری راحت کا تو انتظام کردیا ہے لیکن میری بچیاں اور دوسرے
لوگ تکلیف میں ہیں چنانچہ حضرت جب مکان تشریف لیجاتے تو بر سبیل تذکرہ
ذکر بھی آیا کہ یہ مکان دن میں تو تکلیف دہ ہونا ہی ہے رات کو بھی نیند نہیں آتی
کمروں کے آگے سائبان اور بارجہ پر ٹین کی چادر پڑی ہے جو دن رات تپتی ہے
اسوقت حضرت والا کا احساس اور شدید ہوگیا اور اب حضرت نے پاس کے
لوگوں سے کہنا شروع فرمایا کہ اب تو میں نے الہ آباد کو وطن بنا ہی لیا ہے لہٰذا
یہاں اپنا کوئی مکان ہونا ضروری ہے اور اگر مکان ملجائے تو بہتر ورنہ کوئی پلاٹ
ہی ملجائے تو لیکر اس پر مکان تعمیر کرلیا جائے

حضرت والاؒ کی اس خواہش پر ہر خادم مکان یا پلاٹ کی جستجو میں لگ گیا
حسن منزل کے لوگوں نے یہ چاہا کہ حضرت یہاں سے کسی اور محلہ میں نہ جائیں اسلئے
حاجی صاحبان نے اپنے اپنے مکان کی پیشکش کی لیکن حضرتؒ نے فرمایا
کہ بھائی اس مکان میں تو ہم مقیم ہی ہیں اور پھر بھی تکلیف کی وجہ سے مکان کی
تلاش ہے اب اگر آپ لوگ یہ مکان مجھے دے بھی دیں گے تو اس سے اصل تکلیف

سے کیسے رفع ہو جائیگی مکان تو وہی رہے گا صرف فرق یہ ہوگا کہ عاریت سے نکلکر
ملکیت میں آجائے گا تو اسکا اثر رفع کلفت پر کیا ہوگا۔
حضرت والا کے سامنے جو کام ضروری آجاتا تھا دن رات اسکی ایک
دھن سی ہو جاتی تھی اسلئے اب مکان کی ایک دھن تھی جو لگی ہوئی تھی اسی سلسلہ
میں خدام سے فرمایا کہ بھائی جلدی کرو اگر زمین میں وقت ہوا اور واقعی اس پر
مکان وغیرہ بنوانا وقت طلب ہوگا تو کوئی بنا بنایا مکان ہی تلاش کرلو چنانچہ ایکدن
ہم لوگ حدیث کی کتاب لیکر سبق پڑھنے کے لئے حسب معمول مچھلی کوٹھی گئے
ابھی سبق شروع نہ ہوا تھا کہ ڈاکٹر صلاح الدین صاحب نے آکر عرض کیا کہ حضرت
یہاں قریب ہی محلہ ہی میں ہمارے ایک عزیز جو مچھلی شہر کے رہنے والے ہیں
انکا مکان خالی ہے اور غالباً وہ اسکو فروخت بھی کرنا چاہتے ہیں مکان بہت
بڑا ہے میرا دیکھا بلکہ رہا ہوا ہے وکیل صاحب گھر پر ہیں اگر مناسب سمجھیں تو چلکر
ملاحظہ فرمالیں۔ یہ سنکر حضرت فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم لوگوں سے فرمایا
کہ چلو مکان دیکھتے آویں اسکے بعد سبق ہوگا۔
یہ مکان جناب وکیل ابوالحسن صاحب جعفری کا تھا جو راقم کے بھی عزیز
ہوتے تھے اور ہم لوگوں کے گھرانہ سے قدیمی رسم وراہ تھی آمد و رفت بھی رہا کرتی تھی
اسلئے مکان میرا بھی دیکھا ہوا تھا۔ بڑا گھرانہ تھا مگر اب سب لوگ دوسری جگہ
چلے گئے تھے صرف وکیل صاحب اور انکی اہلیہ یہاں رہ گئیں تھیں، ڈاکٹر صاحب
کے مکان سے شاید اسکا فاصلہ تین ساڑھے تین سو قدم سے زیادہ نہ ہوگا اسلئے
حضرت پیدل ہی چل دیئے پیچھے پیچھے ہم سب طلبہ کی جماعت تھی ہمراہ ڈاکٹر صاحب
تھے مکان پر پہونچکر دستک دی گئی صاحب خانہ نکلے حضرت اقدس سے ملے
اندر پردہ کرایا اور فرمایا کہ حضرت تشریف لائیے۔ حضرت اندر تشریف لے گئے
اور جتنا حصہ اس مکان کا خالی تھا اور فی الحال قبضہ میں آجاتا اسے ملاحظہ فرمایا
آئیے آپ بھی اجمالاً اسکی سیر فرمالیجئے۔ مکان کا صدر دروازہ جنوب میں واقع

تھا شمال و جنوب اسکی لمبان تھی اور شرقاً غرباً اسکی چوڑان تھی۔ سڑک پر سے تین چار سیڑھیوں کے بعد باہر ہی لوہے کا چھڑدار پھاٹک تھا اسمیں داخل ہوکر تقریباً سات آٹھ فیٹ مربع ایک دہلیز تھی اسکے دائیں اور بائیں دونوں جانب کمرے تھے، دہلیز کے بعد بقدر ایک سیڑھی کے بلند ایک ٹین کا مضبوط دوسرا پھاٹک تھا جو کہ مکان کا اصل دروازہ تھا اس میں جاکر ۱۲ فیٹ لمبی دوسری اندرونی دہلیز تھی جس میں داہنے بائیں بڑے بڑے ہال تھے جس کے دو دو دروازے اس دہلیز میں بھی کھلتے تھے اس دہلیز کے بعد در میں بڑا پردہ پڑا تھا اسکے اندر داخل ہونے پر سارا مکان سامنے تھا پردہ عبور کرکے ہم لوگ دونوں ہالوں اور دہلیز کے سامنے ایک وسیع وعریض سات دروں کے دالان میں تھے فرش پر پتھر کا چوکا بچھا ہوا تھا۔ یوں سمجھئے کہ یہ دالان مکان کے چاروں طرف تھا فرق صرف یہ تھا کہ مشرق و مغرب کی جانب آدھے آدھے حصہ میں سردی و گرمی کیلئے باورچی خانہ تھا اور بقیہ آدھے حصہ میں مشرق کی جانب چند کوٹھریاں اور مغرب کی جانب غسل خانہ اور پاخانہ وغیرہ بنا تھا۔ جب وکیل صاحب نے پردہ اٹھا کر حضرت کو مکان کے اندر بلایا تو ساتھ ساتھ داہنی جانب سے مکان دکھلانا شروع کیا عرض کیا کہ حضرت یہ ایک ہال کمرہ ہے (یہ وہی مشرقی ہال ہے جس کے دو دروازے لانبی اندرونی دہلیز میں بھی کھلتے تھے اور دو دروازے دالان میں بھی کھلتے تھے) حضرت نے فرمایا اچھا' وکیل صاحب نے کہا اندر تشریف لے چلیں یہ اسکے مغرب میں وہی دہلیز ہے اور جنوب میں باہر کا کمرہ ہے جس میں کا ایک دروازہ پہلی دہلیز میں کھلتا تھا۔ اور یہ مشرق کی جانب اندرونی لانبی کوٹھری ہے۔ پھر جانب شرق چلے کہا کہ یہ غلہ کی کوٹھری ہے اور اسکے بعد یہ وسیع مشرقی باورچی خانہ ہے اور آگے یہ دو تین کوٹھریاں ہیں مختلف ضروریات کے لئے۔ اب شمال والی دلان میں آکر کہا کہ یہ سامنے ایک بڑا کمرہ ہے حضرتؒ نے باہر ہی سے اسے بھی دیکھا۔

ایک گیلری تھی حضرت نے فرمایا یہ کیا ہے؟ وکیل صاحب نے عرض کیا کہ حضرت
یہ راستہ ہے دوسرے قطعہ مکان میں جانے کا جو اسی کا ایک حصہ ہے کرایہ پہ
ہے ایک داروغہ جی رہتے ہیں اسکے بعد ایک کمرے کے تین دروازے بند
ملے فرمایا یہ کیا ہے؟ عرض کیا کہ حضرت جنوبی ہال کے مقابلہ میں یہ بھی ایک ہال کمرہ
ہے لیکن اسکو بھی میں نے یونانی دواخانہ کو کرایہ پر دیدیا ہے یہ اندر سے بند ہے
اسکے بعد دالان کے ختم پر ایک جانب اوپر جانے کا زینہ تھا۔ وکیل صاحب نے
عرض کیا کہ حضرت اوپر تشریف لے چلیں گے تکلیف تو نہ ہوگی فرمایا نہیں نہیں
چل سکتا ہوں۔ چنانچہ حضرت اوپر تشریف لے گئے ختم پر داہنی جانب بھی راستہ
تھا اور بائیں جانب بھی فرمایا کدھر چلوں؟ وکیل صاحب نے عرض کیا کہ حضرت
داہنی جانب تشریف لے چلیں اب حضرت دالان کی اوپر والی کھلی چھت پہ
تھلے جس کے وسط میں چند زینوں کے اوپر حضرت تشریف لے گئے تو نہایت
عریض و وسیع کھلی چھت ملی جس میں مغرب کی جانب شمالاً و جنوباً ایک لانبا سا کھپریل
پڑا ہوا تھا یہ صحن در اصل نیچے کے دونوں ہالوں کا مجموعہ تھا اور کچھ حصہ داروغہ جی
کے مکان کا بھی اس میں پڑتا تھا حضرت اقدس کو کھلے مکان اور مقام سے ہمیشہ
اُنس رہا ہے اسکو دیکھکر بہت مسرور ہوئے چونے کی پختہ چھت تھی اور بہت ہی
بڑی تھی ایسی کہ شہروں میں ایسی چھت تقریبًا نایاب ہوتی ہے پھر اس سے
واپس ہوکر بائیں جانب تشریف لے چلے تو پہلے ایک کمرہ ملا جو تقریبًا ۱۶ فٹ لمبا
اور ۸ فٹ چوڑا تھا اسکے بعد تقریبًا ۱۸ فٹ لمبا ایک صحن تھا اسکے بعد ۵، ۶
فٹ چوڑا ایک دالان اسکے دروازے سے باہر ہوئے تو دوسری جنوبی دالان
میں اترنے والا ایک تقابلی زینہ تھا اس سے حضرت والا نیچے اترے تو پہلے
ہال کا بغلی لانبا کمرہ ملا اسکے بعد بڑا ہال جس سے ملا ہوا پہلی دہلیز کا مغربی کمرہ
تھا لیکن چونکہ درمیان سے یہ بند تھا اسلئے دونوں کمروں میں راستہ نہ تھا۔ پھر
پردہ اٹھا دیا گیا اور حضرت والا دہلیز میں آگئے۔ وکیل صاحب حضرت سے

نہایت ادب سے ملے۔ حضرت نے فرمایا کہ اسکے متعلق اپنا خیال پھر مشورہ کر کے ڈاکٹر صلاح الدین صاحب کے واسطہ سے آپ کے پاس کہلا بھیجوں گا اسکے بعد ہم سب لوگ واپس چلے آئے واپس آکر پہلے درس حدیث ہوا پھر حضرت نے اولاً ہم ہی لوگوں سے پوچھا کہ مکان کیسا ہے؟ ہم سب نے کہا کہ حضرت بہت عمدہ مکان ہے۔

اسکے بعد حضرت نے مجلس میں آنے والے مخصوص احباب سے فرمایا کہ آپ لوگ بھی جاکر مکان دیکھئے اور پھر اسکے متعلق اپنا اپنا مشورہ دیجئے۔ چنانچہ حاجی شفیع اللہ صاحب۔ حاجی عبدالوحید صاحب۔ حاجی عبداللطیف صاحب۔ شاکر حسین صاحب ڈپٹی اقبال صاحب۔ ماسٹر محمد ابراہیم صاحب۔ قاری حبیب احمد صاحب والد ماجد مولوی سراج الحق صاحب۔ ڈاکٹر صلاح الدین صاحب۔ حافظ یٰسین صاحب۔ سب سے اسکا مشورہ اور خیال معلوم کیا سب نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا صرف ایک صاحب نے کہا کہ بہت پرانا مکان ہے حضرت کو ہمیشہ اسکو بنوانا ہی پڑے گا، آج یہ چھت ٹپک رہی ہے کل کو وہ ٹپک رہی ہے، آج یہاں مرمت کی ضرورت ہے کل وہاں کچھ کام کرانا ہوگا بس اسی طرح سے ہمیشہ لگا رہیگا ایک صاحب نے یہ کہا کہ اس مکان کے خریدنے میں دو قباحتیں ہوں گی ایک تو یہ کہ یہ گرودوارے کے قریب ہے اور الہ آباد میں فسادات بھی ہوتے ہیں اس لئے جگہ مخدوش ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں پانچ پانچ کرایہ دار ہیں ان سب سے اسکو خالی کرانا پوری مصیبت ہے اس پر غور فرما لیا جائے۔ چنانچہ حضرت والا نے جب گھر کے لوگوں سے مشورہ لیا تو حضرت قاری محمد مبین صاحب مدظلہٗ نے بھی یہی خرابیاں بتلائیں کہ مکان بہت پرانا ہے دوسرے یہ کہ اسکا زیادہ حصہ تو کرایہ داروں کے قبضہ میں ہے کون تخلیہ کے لئے بستہ باندھکر کچہری دوڑتا پھریگا۔

اور پھر یہ کہ محلہ بھی کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہے اسلئے طبیعت میں رکاوٹ ہوتی ہے ورنہ ویسے مکان تو بہت اچھا ہے ۔

احباب کے اختلاف رائے کا تو حضرت اقدسؒ پر کچھ اثر نہیں ہوا لیکن حضرت قاری صاحب کی زبان سے بھی وہی باتیں سنیں تو حضرت کو فکر ہوئی کہ ان کے اشکالات کو رفع کر کے انھیں مطمئن کرنا ضروری ہے اس لئے کہ مکان تو ہم انھیں لوگوں کے لئے لے رہے ہیں اگر انھیں کو پسند نہ ہوا تو پھر فائدہ کیا ؟ باقی حضرت اقدس کے انشراح سے اندازہ ہوتا تھا کہ خود حضرتؒ کو بھی یہ مکان پسند تھا ۔ اسلئے جناب قاری صاحب کو حضرت نے یوں مطمئن فرمایا کہ ایک دن کسی سے فرمایا کہ ذرا کسی دن مجھے گردوارہ دکھلاؤ تو سہی ۔ چنانچہ ایک دن تفریح کو جاتے وقت کسی نے حضرت سے کہدیا کہ حضرت یہ ہے گردوارہ یہ جی ۔ ٹی روڈ پر مکان سے اسٹیشن جاتے میں ایک فرلانگ کی دوری پر دوسری پٹری پر پڑتا تھا ۔ اسکے ملاحظہ کے بعد حضرت نے فرمایا کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ مکان کو اس سے کیا تعلق ہے کہاں مکان اور کہاں یہ ؟ بہت فاصلہ ہے یہ تو کوئی عذر نہیں ہے ۔ اور پھر قاری صاحب سے فرمایا کہ میں نے گردوارہ کو جاکر دیکھا ہے وہ تو گھر سے بہت دور ہے ، رہا کرایہ داروں کے تخلیہ کا مسئلہ تو بیشک اس زمانہ میں ہے یہ ایک مشکل مرحلہ لیکن بتاؤ کہ اگر جتنا مکان خالی ہے اور جس پر ہمارا قبضہ ہو جائے گا اتنا حصہ بھی تمھارے فتحپور والے مکان سے زیادہ ہے یا نہیں جس کو تم چھوڑ کر آئے ہو ۔ قاری صاحب نے عرض کیا جی ہاں اس سے تو یہ کہیں زیادہ ہے ۔ فرمایا کرایہ دار خالی کریں یا نہ کریں کرایہ تو دیں گے چلو خیر یہی سہی ۔ اول تو تخلیہ کی کوشش کیجائے گی اور نہ خالی ہوگا نہ سہی ہمارا کیا نقصان ہے ۔ باقی یہ کہ مکان پرانا ہے اور خستہ ہے تو یہ سوچو کہ اگر اسوقت اسکو گرا کر اسکے دروازے ۔ اینٹیں ۔ پتھر اور کڑیاں فروخت کی جائیں تو ۲۵ ہزار میں بک جائیں گی یا نہیں ؟ قاری صاحب نے

عرض کیا ہاں ضرور بک جائیں گی۔ فرمایا پھر زمین تو تمکو مفت کی مل گئی۔ جبتک چلے گا چلے گا نہیں تو از سر نو لیا جائے گا۔ ان جوابات کو سنکر قاری صاحب کی تسلی ہوگئی اور مکان کے متعلق شرح صدر ہوگیا۔ عرض کیا کہ جی ہاں بہتر ہے لے لیا جائے۔

چنانچہ اس کے بعد ڈاکٹر صلاح الدین صاحب کے توسط سے الحمدللہ بہت کفایت پر معاملہ طے ہوگیا یعنی پچیس ہزار میں رجسٹری کر دینے کا وکیل صاحب نے وعدہ فرمالیا اور حضرت بھی راضی ہوگئے۔ اور اب خریداری کے لئے رقم کی فراہمی کا سوال پیش آیا جو الحمدللہ حضرت والا جیسی شخصیت کے لئے کچھ دشوار نہ تھا لیکن حضرت اقدس چونکہ اپنے ہر معاملہ کے ذریعے اپنے پاس آنے جانے والوں کو سبق دینا اور تعلیم فرمانا چاہتے تھے اسلئے یہاں بھی یہی انداز اختیار فرمایا اور ایکدن چند خواص کو جمع کر کے فرمایا کہ بھائی وکیل صاحب تو تیار ہوگئے ہیں رجسٹری کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی اب مکان کی خریداری کی کیا صورت ہو میرے پاس اسوقت نقد تو پچیس ہزار موجود نہیں ہے ہاں میں اتنی رقم آہستہ آہستہ فراہم کرسکتا ہوں اور ادا کرسکتا ہوں مگر مجھے بھی مکان کی جلد ہی ضرورت ہے اور وکیل صاحب کو بھی رقم کی فوری حاجت ہے تو اب کیا صورت اختیار کیجائے؟ جائیے آپ لوگ باہم مشورہ کر کے کوئی صورت طے کیجئے۔ ان حضرات نے تخلیہ میں بیٹھکر باہم مشورہ کیا کسی نے کسی سے قرض لینے کی رائے دی اور کسی نے کسی اور شخص کا نام پیش کیا۔ ایک صاحب نے اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ حضرت کے مقامی وغیر مقامی خداموں میں سے پچیس اہل ثروت کا انتخاب کرلیا جائے اور ہر ایک کے ذمہ ایک ایک ہزار کی فراہمی لازم کردی جائے۔ چنانچہ اس طرح سے پچیس ہزار کی رقم حضرت کی خدمت میں پیش کردی جائے اور ہم لوگ حضرت کو اتنی سہولت اور پہونچا دیں کہ جب اور جتنی گنجائش ہو حضرت آہستہ آہستہ ہی ادا فرماتے رہیں، اور ہم لوگ ایک فہرست اپنے طور پر مرتب کرلیں کہ کس شخص

کو فوری ضرورت ہے یا جلدی ضرورت ہے ۔ اور ایک شخص کو نامزد کر دیں کہ حضرت اسے قسط عطا فرما دیا کریں اور وہ حسب ترتیب فہرست لوگوں کو ادا کرتا رہے۔ اس طرح سے کسی ایک شخص پر زائد بار بھی نہ پڑے گا اور اتنا بڑا کام نہایت آسانی کے ساتھ انجام پا جائے گا ۔ یہ تجویز اور مشورہ حضرت اقدس کے سامنے پیش کیا گیا جسے حضرت نے بھی بہت پسند فرمایا۔

یہاں ایک بات یہ ذہن نشین رہے کہ حضرتؒ کے خدام میں سے بہت سے ایسے لوگ تھے کہ ایک معمولی سے اشارہ میں ایسی بڑی رقم ان میں سے ایک ہی شخص پیش کر سکتا تھا لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ حضرت والا کا مزاج ہی کچھ اس نوع کا تھا کہ وہ اپنے ہر قول اور ہر فعل سے امت کے سامنے ایک آسان حل اور اپنے متعلقین کے اندر جذبۂ ایثار و ہمدردی اور وقت پڑ جانے پر کسی کی ضرورت کے احساس کے جذبات کو ابھارنا چاہتے تھے اسی لئے یہ تمام شوریٰ و مشورہ تھا ورنہ نہ یہ ایسا کوئی بڑا کام تھا اور نہ حضرت اس میں کچھ مجبور ہی تھے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حضرتؒ کے مزاج میں شروع ہی سے امراء سے استغنا اور مخلوق کو چھوڑ کر خالق کی انابت کا داعیہ پیدا کر رکھا تھا۔ اسلئے بھی حضرتؒ کو اپنے لئے مخلوق سے کچھ کہنا طبعاً گراں تھا۔ پھر ہو سکتا ہے کہ امراء و رؤسا کی اصلاح بھی اسمیں مضمر ہو کہ جب یہ دیکھیں گے اتنا بڑا دنیوی کام پڑا اور حضرت نے ہماری کچھ بھی ضرورت نہ محسوس کی تو اسکی وجہ سے انکے قلوب میں شیخ کی عظمت اور وقعت اور اور بڑھیگی جو کہ اصلاح کی روح ہے۔ چنانچہ عقلاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی بزرگ کو یہ مطلوب ہو کہ لوگ اس سے نہ ملیں اور انکی تنہائی کا سکون مشوش نہ ہو تو وہ یہ کرے کہ اپنے پاس آنے والے غریب کو تو کچھ قرض دیدے اور امیر کی جانب کوئی حاجت پیش کر دے بس دونوں سے نجات مل جائے گی ۔ غریب عدم ادائیگی کی شرمساری سے محجوب رہے گا اور امیر

اور مال معاملہ ایسا نازک ہے کہ
سنئے مطالبہ کے اندیشہ سے خوف زدہ ہوجائے گا۔
اہل دنیا اسکو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں چنانچہ مقولہ مشہور ہی ہے کہ

گرجاں طلبی مضائقہ نیست — ور زر طلبی سخن دریں است

بہرحال اس مشورہ کے بعد کیا ہوا اور رقم کیونکر فراہم کی گئی اسکی تفصیل مجھکو نہیں معلوم
اور نہ ہم لوگوں نے اسکے معلوم کرنے کی کبھی ضرورت سمجھی۔ تاہم ایک محترم نے اس سلسلہ
میں راقم کو واسطہ بنایا اور حاضر ہوکر کچھ رقم حضرت کیخدمت میں یہ کہکر پیش کی کہ حضرت
یہ اسی مشورہ کے ماتحت میری جانب سے قبول ہو اور ایک گذارش یہ بھی ہے کہ مجھے
سردست روپیہ کی حاجت ہی نہیں ہے سب حضرات کو دیئے جانے کے بعد آخر میں
میرا نمبر رکھا جائے۔ حضرت نے وہ رقم قبول کرلی اور بعد میں مجھ سے فرماتے تھے تمھارے
یہ عزیز حسن منزل والے بڑے مخلص شخص ہیں اپنی طرف سے مجھے ہر طرح کی سہولت
دیدی۔ بس میں یہی چاہتا ہوں کہ اسی طرح سے مل جل کر لوگ ایک دوسرے کی ضروریات
کو پوری کردیا کریں۔ بڑی پریشانی کا وقت ہے آدمی پر کبھی نہ کبھی کوئی وقت آہی جاتا ہے
اب اگر احباب کے اندر اتنی بھی حمیت اور حمایت نہ موجود ہو تو پھر کیا لطف زندگی ہے۔
یہ ضرور ہے کہ جب لوگ کسی کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ کریں تو اسکو اپنے وعدہ
کی پابندی لازم ہے۔ آج لوگ یہی نہیں کرتے اسلئے لوگوں نے بھی کسی کی حمایت
کرنی چھوڑ دی ہے۔

بہرحال تاریخ مقررہ پر مکان کی رجسٹری ہوگئی اور شام کو کچہری سے واپس
آنے کے بعد ہم سب نے مژدہ سنایا کہ حضرت الحمدللہ مکان کی خریداری کی تکمیل ہوگئی۔
دوسرے دن وکیل صاحب نے حضرت اقدس کو مکان کی کنجی حوالہ کردی اور عرض کیا
کہ حضرت آج کا دن میرے لئے بڑی مسرت کا دن ہے یہ کہکر حضرتؒ کا ہاتھ چوما اور
رونے لگے۔ حضرت نے خیال فرمایا کہ وطن سے اور مکان سے لوگوں کو رغبت ہوتی ہی
ہے یہ خیال آگیا ہوگا کہ آج سے یہ میرا آبائی مکان اب میرا مکان نہیں رہا لیکن انھوں نے
اسکی صفائی دی کہ حضرت مسرت اس بات پر ہے کہ میں نے اپنے باپ دادا کی بنوائی

ہوئی عمارت اور ان سے پائی ہوئی اس امانت کو ایک اہل کی جانب منتقل کیا ہے
جس کی بنا پر امید کرتا ہوں کہ حشر میں والد مرحوم کے سامنے مجھے کوئی ندامت
نہ ہوگی اور ان سے یہ عرض کرسکوں گا کہ میں نے آپ کی امانت ایک اللہ کے
ولی کے حوالے کردی۔ حضرت والاؒ ان کے ان الفاظ سے بہت متاثر ہوئے انکے
سر پر ہاتھ پھیرا اور انکو گلے سے لگایا اور تسلی کے طور پر یوں فرمایا کہ نہیں
ندامت کیوں ہوگی انشاءاللہ وہ بہت خوش ہونگے۔ آپ نے بہت خلوص اور
ایثار سے کام لیا ہے جزاکم اللہ تعالیٰ۔

اور واقعہ بھی یہی تھا کہ بہت دنوں سے کچھ لوگ اس مکان کی خریداری
کی فکر میں تھے چنانچہ ایک سندھی نے سنا ہے ساٹھ ستر ہزار تک دام لگا دیا تھا لیکن
ایک شرط کے ساتھ وہ یہ کہ صحن خانہ کے وسط میں جو عورتوں کے نماز پڑھنے کے لئے
ایک پختہ چبوترہ ہے جسکے غربی جانب محراب بنی ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ مسجد کے
مشابہ ہوگیا ہے اسکو وکیل صاحب خود اپنے ہاتھ سے منہدم کردیں تاکہ میری خریداری
کے بعد بوقت انہدام محلہ کے مسلمانوں کی طرف سے کچھ سوال نہ اٹھے۔ وکیل صاحب
نے ہر چند کہا کہ ہم لوگ اس پر نماز ضرور پڑھتے ہیں لیکن وہ مسجد نہیں ہے ہمارے
ہاتھوں اسکو منہدم نہ کراؤ ہم تمھارے ہاتھ فروخت کردیں پھر تم جو چاہنا بنانا بگاڑنا
تمکو اختیار ہے لیکن سندھی ایک تو پردیسی دوسرے مسجد کے نام سے مرعوب
بغیر اسکے لینے کی ہمت نہیں کرسکا ظاہری وجہ رکاوٹ تو ایک غیر مسلم کے لئے اس
مکان کی خریداری کیلئے یہی بنی لیکن حق تعالیٰ کو تو یہ منظور تھا کہ جس مکان کو ایک دیندار
نے بنوایا ہے اور جس میں دیندار خواتین نے نمازیں بھی پڑھی ہوں اور جس مکان
کے صحن کے مختصر سے چبوترے پر چند دینداروں نے رمضان کی ساری رات تلاوت
کلام اللہ کرکے اور سنکر کے گذاری ہو تو جس طرح قرآن کریم کے بارے میں فرمایا ہے
کہ لایمسہ الا المطہرون اسی طرح اسکے تلاوت کے مکان کو بھی کسی غیر مسلم
کے قبضہ میں نہ دیا جائے گا اور یہ انتظام کیا جارہا تھا کہ الہ آباد میں جب میرا یہ ولی آوے

تو اسکو اسی میں ٹھیرایا جائے اور اس جگہ کو علم و معرفت کا سرچشمہ بنایا جائے چنانچہ
ایسا ہی ہوا کہ مکان کے بکنے کی تو عرصہ سے خبر تھی دام چڑھتا تھا اترتا تھا مگر کوئی
گاہک طے نہیں ہو پاتا تھا اور آخر میں ایک شخص نے لینا بھی چاہا تو شرط پوری
نہ ہو سکنے کی وجہ سے وہ بھی نہ لے سکا۔ اور حضرتؒ کے یہاں کوئی چیز رکاوٹ ہی
کی نہ تھی اسلئے وکیل صاحب نے بڑے انشراح اور خوشی کے ساتھ حضرت
کے ہاتھوں اسکا فروخت کرنا منظور فرمالیا۔ اور ابھی جو میں نے یہ عرض کیا کہ
چند دینداروں نے ساری ساری رات اس میں تلاوت کیا اور سنا ہے تو اسکی
تفصیل یہ ہے کہ مالک مکان جناب ابوالحسن صاحب جعفری (وکیل) کے والد کا نام
مولوی غلام مجتبیٰ صاحب جو پرانے وقت کے ایک فاضل دیندار وکیل تھے اور
یہاں الٰہ آباد کے مشہور طبیب جو حضرت کے معالج بھی رہ چکے تھے جناب حکیم
سید فخر الدین احمد صاحب جعفری کے والد بزرگوار کا اسم شریف مولوی محی الدین
جعفری تھا جو کہ الٰہ آباد کے ایک ذی علم معزز شخص تھے، ان دنوں الٰہ آباد کے
مدرسہ احیاء العلوم واقع مسجد عبداللہ میں قرارت کے ایک مشہور استاذ جو اپنے
زمانہ میں اس اطراف کے استاذ الکل قرار دیئے جاتے تھے یعنی قاری عبدالرحمٰن
صاحب مکی ثم الٰہ آبادی تجوید کے مدرس تھے، چنانچہ یہ دونوں حضرات یعنی
مولوی محی الدین صاحب اور مولوی غلام مجتبیٰ صاحب میں باہم بہت گہری
دوستی تھی اور دینداری کے سبب ان دونوں حضرات کو حضرت قاری صاحب
کی قرأت سننے کا بہت شوق تھا چنانچہ غلام مجتبیٰ صاحب مرحوم کے اسی مکان
میں کبھی کبھی یہ تینوں حضرات یا کبھی اور دوسرے بعض حضرات بھی جمع ہوتے
اور اسی صحن کے چبوترہ پر شبینہ ہوتا تھا۔ یہ لوگ بھی سنتے گھر کی مستورات بھی
فیضیاب ہوتیں اور سارا گھر نور قرآن سے منور ہو جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ
اللہ تعالےٰ کے یہاں حضرت قاری صاحب کا یہ قرآن پڑھنا مقبول ہو گیا تھا
اسلئے اللہ تعالیٰ نے بھی اس مکان کا مکین ہونا ایسی ذات کے لئے مقدر

فرما دیا تھا جنکو قرآن سے عشق تھا اور جس نے یہاں تشریف لاتے ہی
تلاوتِ قرآن پر ایسا دلنشین وعظ فرمایا کہ علماء اور مشائخ تک کو گویا انکا بھولا ہوا
سبق یاد کرا دیا۔ چنانچہ خود میرے سامنے یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت نے مجھے اپنے
کمرہ میں طلب فرمایا وہاں پہلے سے ایک بزرگ تشریف فرما تھے، حضرتؒ نے
فرمایا سنو! دیکھو یہ مولانا کیا فرما رہے ہیں۔ اتنے میں ان مولانا صاحب نے کہنا
شروع کیا کہ میں نے حضرت سے ابھی ابھی یہ عرض کیا ہے کہ حضرت نے تلاوت
کا مضمون بیان فرما کر امت پر بڑا احسان فرمایا ہے۔ حضرت کی زبان سے
تلاوت کے فضائل اور آثار و برکات کو سنکر اپنی طبیعت اب کچھ ایسی ہو گئی ہے
کہ اب کوئی دوسرا مضمون وعظ میں بیان کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا جب بیان
کرتا ہوں بس تلاوت کے فضائل بیان کرتا ہوں یا تلاوت قرآن سے کچھ باتیں
سنا دیتا ہوں بس یہی میرا بیان ہوتا ہے۔

اسی طرح سے اس سلسلہ میں ایک عالم کا تاثر سنیئے انھوں نے اپنی الٰہ آباد
تشریف آوری کے موقع پر حضرتؒ کی صبح کی مجلس کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان فرمایا
اور کسی کو لکھا کہ :۔

"صبح کی جو مجلس ایک خاصے بڑے مجمع کے سامنے ہوئی اس میں
زور شروع سے آخر تک بس تلاوت قرآن پر اور مروجہ اذکار و
اشغال سے زائد قرآن مجید سے رابطہ قائم کرنے پر تھا"

اور بعد ظہر کی "خصوصی مجلس" کے تاثر کو ان لفظوں میں بیان فرمایا :۔

"مولانا وصی اللہ صاحب حفظہ اللہ کے افراط کرم سے شرمسار
و محجوب ہو کر واپس آیا" بعد ظہر کی مجلس میں انھوں نے ایک بات
ایسی فرما دی جو دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گئی فرمایا کہ ایسے
علماء بھی ہیں جو مسائل تفسیر پر تو خوب گفتگو کر لیتے ہیں لیکن تلاوت قرآن
سے ان کے دل کو لگاؤ نہیں اسلئے اسکے انوار و برکات سے محروم

ہی رہتے ہیں۔

یہ تو گویا اپنے کشف سے یا فراست سے میرے ہی دل کا چور پکڑ لیا اب اگر آنعزیز میرے اس خط کے حوالہ سے موصوف سے کچھ آداب تلاوت دریافت کر کے مجھے لکھ بھیجیں تو یہ آنعزیز کا بڑا کرم ہوگا۔"

(اسی کو راقم نے عرض کیا تھا کہ بہت سے علماء و مشائخ کو حضرتؒ نے انکا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا)

اسلئے اسی کا انتظام ہوتا رہا دوسرے کسی کو یہ مکان مل بھی کیسے سکتا تھا؟ جو اسکا صحیح معنوں میں اہل اور مستحق تھا اسکو پہونچا دیا گیا۔ چنانچہ وکیل صاحب نے بھی یہی جملہ فرمایا کہ اب میں امید کرتا ہوں کہ انشاء اللہ قیامت میں والد صاحب کے سامنے سرخرو ہونگا اور ان سے کہہ سکوں گا کہ "حق بحقدار رسید"۔

بہرحال حضرت والا نے مکان خرید لیا اور یہ کوئی ایسی نئی بات بھی نہ تھی دنیا میں مکان بکتے بھی ہیں اور خریدے بھی جاتے ہیں لیکن خدا معلوم کیا اثرات تھے کہ بڑی شہرت اور سرعت کے ساتھ آناً فاناً یہ خبر تمام شہر میں مشہور ہوگئی۔ ہمارے محمد میاں صاحب فاروقی الہ آبادی ان دنوں دہلی میں تھے وہاں سے واپس آکر جب حضرتؒ سے ملے تو فرمایا کہ مجھکو مکان کی خریداری کی خبر مولانا شاہد فاخری صاحب نے دہلی میں دی۔ کہنے لگے کہ محمد میاں! سنا نہیں آپ کے پیر نے ابوالحسن جعفری کا مکان خرید لیا ہے۔ مولانا نے کہا کہ میں نے جواب میں کہا کہ الحمد للہ۔ خدا معلوم مولانا شاہد فاخری صاحب نے کس خیال سے یہ جملہ فرمایا تھا خبر محض تھی یا استعجاب تھا کہ پیر ہو کر اتنے مالدار ہیں! یا کیا غرض تھی؟

باقی یہ تو بہرحال دیکھا گیا کہ مخالفین کی نظروں میں حضرت اقدس کا مکان خریدنا بہت کھلا برخلاف اسکے حلقۂ احباب میں یہ خبر بہت ہی مسرت انگیز بنی۔ اور باہر کے بعض حضرات نے بھی اطلاع پانے پر حضرت والا کو خطوط لکھے۔

چنانچہ صوفی عبدالرب صاحب نے اناؤ سے حضرت اقدسؒ کو لکھا کہ

"معلوم ہوا ہے کہ حضرت اقدس کا اب الہ آباد میں ذاتی مکان بھی ہو گیا ہے اور حضرت اقدس اب اپنے ہی مکان میں تشریف فرما ہیں اس مژدۂ روح افزا سے ایسی مسرت ہوئی ہے کہ جیسے ابتک پابند و گرفتار تھا کہ یکبا گی میرے ہاتھ پیر کھل گئے"

حضرت اقدس نے انھیں لکھا کہ "چونکہ آپ کو مجھ سے محبت ہے اس لئے یہ خوشی ہے اور میری بھی یہی حالت ہے" ___ اسی طرح سے ایک اور مولوی صاحب نے گورکھپور سے لکھا کہ مولوی سراج الحق صاحب الہ آباد سے تشریف لائے ان ___ سے یہ

"معلوم ہوا ہے کہ آپ نے ایک مکان خرید لیا ہے جو کافی طویل و عریض اور آرام دہ ہے اور ایسا ہے کہ طالبین و ذاکرین و واردین و صادرین سب کے لئے گنجائش نکل سکتی ہے۔ اور سب سے زیادہ قلبی خوشی کی چیز یہ ہے کہ زمخشریؒ کو مجاورت کعبہ کے باعث جاراللہ کے معزز لقب سے ملقب کیا گیا اور حضرت کو ایک عالیشان مکان مسجد کے جوار میں رکھکر علم و معرفت اور شریعت و طریقت کے عظیم الشان اور عالمتاب قندیلوں کے روشن کرانے کا سامان بہم پہونچایا جا رہا ہے"

حضرت نے انھیں جواب دیا کہ "آپ نے صحیح سنا ہے۔ جی ہاں مکان وسیع ہے خدا کرے آپ کا ظن صحیح نکلے"۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ احباب کو حضرت اقدس کے مکان خرید لینے کی کس قدر مسرت ہوئی اور نہ صرف اہل الہ آباد ہی خوش ہوئے بلکہ جس نے جہاں بھی سنا اپنی خوشی کا اظہار کیا لیکن اغیار پر اسکا اثر یہ ہوا کہ خدا معلوم کیوں انکی پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا شاید وجہ یہ ہو کہ ابتک تو وہ یہ سمجھتے رہے کہ ایک وہابی قسم کے پیر یہاں آ گئے ہیں لوگ انکے یہاں بہت آتے جاتے ہیں انکی باتوں سے ایک اچھا خاصا پڑھا لکھا طبقہ متاثر بھی ہے لیکن خیر یہ یہاں کتنے دنوں رہیں گے اپنے وطن کے

لوگوں سے ناراض ہوکر آگئے ہیں چند دن کے بعد معاملہ رفع دفع ہو ہی جائے گا اور یہ پھر واپس ہو جائیں گے کیونکہ اپنا مکان اور پھر ایسی عالیشان مسجد اور خانقاہ چھوڑنے کے لئے تھوڑا ہی بنوائی گئی تھی۔ مگر جب حضرت والا نے اپنے لئے مستقل مکان خرید لیا تو اب وہ یہ سمجھے کہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید شاہ صاحب یہیں رہ جائیں گے اور انکا یہاں قیام کرلینا ہمارے قصر بدعات کے لئے مہلک ثابت ہو جائیگا' اسلئے پریشان تھے۔

ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی لوگوں کے اس مزاج سے خوب واقف تھے اسلئے 'حسن منزل' کی ابتدائی مجلسوں ہی میں حضرتؒ نے اپنے بیان میں حضرت زکریا ملتانیؒ کی آمد اور وہاں کے مشائخ وقت کا ان کے ساتھ معاملہ دودھ کے ہدیہ کا واقعہ اور اس پر پھول رکھکر واپس کرنے کا نفیس ولطیف جواب اور اسکی وجہ سے ان حضرات کا مطمئن ہو جانا' یہ سب امور نہایت شدومد کے ساتھ بیان فرما چکے تھے لیکن لوگوں کے مزاج مزاج میں فرق ہوتا ہے یہ کیا ضروری ہے کہ جس جواب سے حضرت زکریا ملتانیؒ نے اپنے زمانے کے مشائخ کو مطمئن فرمادیا ہو اسی سے اس زمانہ کے لوگ بھی مطمئن ہو جائیں۔ چنانچہ ہوا یہ کہ اب ذرا کھل کر مخالفت کی جانے لگی کہ ابتک تو خال خال اور کوئی کوئی شخص کسی سے کہتا تھا کہ "وہابی ہیں ان کے یہاں نہیں جانا چاہیئے اور کوئی اگر اور قابل ہوا تو اس نے یوں بہکایا کہ اپنے وطن میں لڑائی کرا کے وہاں سے بھاگ کر یہاں آکر پناہ لی ہے ان سے ہوشیار رہنا یہاں بھی نہ مسلمانوں کو لڑا دیں۔ (راقم نے یہ الفاظ خط کشیدہ با دل ناخواستہ تحریر کئے ہیں اور اسلئے تحریر کئے تاکہ آپ کے سامنے مخالفین کا پلان ظاہر ہو سکے کہ کس طرح سے یہ لوگ پیش بندی کرتے ہیں اور کس طرح سے اپنے کام کے لئے پہلے سے زمین ہموار کر رکھتے ہیں۔ حضرت والا کی جانب سے ان امور کا توبہ توبہ تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا جس نے حضرت سے ملاقات کرلی ہے اسکی سمجھ میں تو ان چیزوں کا کذب و بہتان ہونا بالکل آگیا ہو گیا اور بعد کے پیش آنے والے واقعات نے تو یہ ثابت بھی کر دیا کہ حضرت

اقدس وطن سے بھاگ کر یہاں نہیں تشریف لائے بلکہ اسکو ترک کرکے وہاں سے ہجرت فرمائی تھی۔ اس رُو سے بھی اغیار کو اسوقت زک اٹھانی پڑی جب حضرت والاؒ سے وطن کے لوگوں نے معافی مانگی اور اصرار کے ساتھ حضرت کو ایک مرتبہ فتحپور تال نرجا تشریف لے چلنے پر مجبور کردیا۔ حضرت اقدس پھر جیسی شان کے ساتھ وطن تشریف لیگئے ہیں اسکے چشم دید گواہ آج بھی موجود ہیں (اسکا ذکر تفصیل کے ساتھ انشاء اللہ ہم آئندہ کسی موقع پر کریں گے)

بہرحال اغیار کی جانب سے برابر اس امر کی کوشش جاری رہی کہ حضرت والا کو یہاں جمنے نہ دیا جائے اور اگر یہ نہ ہوسکے تو کم ازکم حضرت کو اس طرح سے بدنام کردیا جائے کہ لوگ ہی یہاں نہ آویں لیکن اللہ کی شان کہ جو ترکیب مخالفین کیطرف سے کی گئی وہ انکے حق میں الٹی ہی پڑی چنانچہ جس قدر غلط غلط باتیں حضرت والاؒ کے متعلق مشہور کی گئیں ان سے اس جماعت کا کذب ہی روز بروز کھلتا گیا۔ وہابیت کا پروپیگنڈہ اسلئے نہ چل سکا کہ لوگوں نے دیکھا کہ ان کی مجلسوں میں کتاب وسنت اور اللہ و رسولؐ کی باتیں تو ہوتی ہیں یا پھر بزرگان دین کے واقعات اور اخلاص واخلاق کی تعلیمات ہوتی ہیں ان کے علاوہ وہ تو کچھ بیان ہی نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ع۔ احباب حاضر اند باعدا چہ حاجت است — یعنی ہمارے پاس بیان کیلئے قرآن وحدیث اور بزرگوں کے واقعات کیا کم ہیں؟ پھر ہم اِنکا اُنکا تذکرہ اپنی مجلس میں کیوں کریں؟ — لہٰذا ہم انکی مجلس میں کیوں نہ جائیں اور اگر ہم وہاں نہ جائیں تو ان جیسی کسی مجلس کا پتہ ہی مل جائے جہاں سے ہمکو دین واخلاق کی تعلیم ملے۔ ظاہر ہے کہ اسکا جواب ان کے پاس کیا ہوتا اسلئے یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوسکی

اس زمانہ میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ عید کا موقع آیا اور یہاں شہر کی عیدگاہ کی امامت مولانا محمد میاں صاحب فاروقی سے متعلق تھی وہ بوجہ اپنی علالت کے نماز پڑھانے کے قابل نہ تھے اسلئے انھوں نے حضرت والا کو لکھا کہ میری طبیعت ہے عیدگاہ میں نماز عید پڑھانے کے لئے حضرت والا اپنے یہاں سے

کسی صاحب کو متعین فرمادیں وہ جاکر عیدگاہ میں عید کی نماز پڑھادیں۔ حضرتؒ نے اپنے یہاں سے کسی کو بھیجنا مناسب نہ سمجھا لیکن محلہ کی مسجد کے جو امام تھے قاری غلام نبی صاحب وہ قاری محب الدین صاحب سے مدرسۂ سبحانیہ میں تجوید پڑھ چکے تھے ان سے فرمایا کہ آپ عیدگاہ جاکر نماز پڑھا دیجئے گا۔ چنانچہ عید کے دن قاری غلام نبی صاحب نے عیدگاہ جاکر عید کی نماز پڑھادی بس پھر کیا تھا اس موقع کو اغیار نے غنیمت جانا اور چند دنوں کے بعد ایک پوسٹر منظر عام پر لایا گیا کہ مولانا وصی اللہ صاحب کے ایک مرید نے عیدگاہ میں امامت کرکے سارے مسلمانوں کی نماز کو غارت کردیا۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کے مفتون ہوجانے کے لئے اتنا مسالہ کافی تھا۔

اب اس سے بحث نہیں کہ اگر آج بھی حسب دستور سابق مولانا محمد میاں صاحب فاروقی ہی نماز پڑھاتے تو مسلمانوں کی نماز عید کا کیا حشر ہوتا جبکہ وہ بھی حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے بھی بلکہ ان کے بھی شیخ حضرت حکیم الامتؒ مولانا تھانویؒ سے بھی بیعت تھے۔ لیکن آج کی نفسانی دنیا میں دریافت اور عقل سے کون کام لیتا ہے؟ بات یہ ہے کہ مولانا فاروقی مدظلہٗ مقامی شخص تھے اور عیدگاہ کے مسلّم امام تھے اسلئے ان کے خلاف کچھ کہنا آسان نہ تھا اور مولوی غلام نبی صاحب بیچارے کے یا خود حضرت مولاناؒ کے متعلق سمجھتے تھے کہ یہ پردیسی لوگ ہیں یہاں انکو کچھ قوت حاصل نہیں ہے ان سے آسانی کے ساتھ بھڑا جاسکتا ہے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوا جاسکتا ہے۔ اب کیا اب تو حضرت والا کا نام برسر بازار لیا جانے لگا بلکہ مسلم محلوں کے ہر ہوٹل میں یہی تذکرہ ہونے لگا اب اللہ تعالیٰ کے علم میں جو بھی مصلحت اس میں رہی ہو دیکھنے میں تو یہی آیا کہ حضرت مولانا کی شہرت پورے شہر میں ہوگئی اور مجلس میں لوگ پہلے سے زیادہ آنے لگے۔ مخالفین نے یہ سمجھکر کہ اب حضرت والا کا ذکر عام طور سے شہر میں چھڑ گیا ہے انکا تذکرہ اس طرح سے کردیا جائے کہ لوگوں کو ان سے نفرت ہوکر

ان سے دوری اور بعد ہو جائے۔ چنانچہ حضرت والا کے اندر بظاہر کوئی نقص پاکر حضرتؒ کے تعارف میں حضرت مولانا تھانویؒ کا ذکر کرنا شروع کر دیا اور آخر میں یہ کہ یہ بزرگ جو تشریف لائے ہیں اُنھیں کے خلیفہ ہیں جنھوں نے خود اپنے پیر کی مخالفت کی، پیر کا کیا مسلک تھا اور انھوں نے ان کے خلاف اپنا طریقہ جدا رکھا اور اس موضوع پر محلہ محلہ سیرت کے جلسے ہونے لگے یعنی اعلان تو ہوتا تھا میلاد شریف کا اور بیان کیا جاتا تھا اس میں یہی مسئلہ۔

مکان کی خریداری پر امیر پیر کا لقب تو پہلے ہی مل چکا تھا اب یہ بحث بھی شب کی تقریروں میں سامنے آنے لگی۔ ادھر حضرت اقدسؒ کی بھی اپنی صبح کی مجلس شباب پر تھی خوب لوگ آرہے تھے اور حضرت والا کی اصلاحی اور معرفتِ حق کی باتیں، تصوف وسلوک کے رموز، بزرگانِ دین کے خوف ومحبت کے واقعات موضوع تقریر بنے ہوئے تھے جنھیں جو شخص بھی سنتا تھا محظوظ ہو جاتا تھا۔ اب ان مضامین سے لطف اندوز اور سرشار ہونے والوں سے اگر کوئی کہتا کہ یہ وہابی ہیں تو وہ پلٹ کر فوراً جواب میں یہی کہتا کہ اگر یہی لوگ وہابی اور برُے ہیں تو جاؤ ہم بھی وہابی ہیں۔

حضرت والاؒ شہر کی فضا اور اغیار کی باتوں سے یکسر صرف نظر فرمائے ہوئے صرف لوگوں کے مفید مطلب اصلاح اخلاق اور تحذیر نفاق سے متعلق بیان فرماتے رہے۔ صرف اس سلسلہ میں ایک دن یہ فرمایا کہ مجھے آپ کے شہر میں آکر ایک تحفہ ملا ہے وہ یہ کہ سنا ہے کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ بڑے امیر پیر ہیں ــ تو اس کے متعلق آپ سے یہ کہتا ہوں کہ پیروں کے متعلق یہ خیال اور ان پر یہ اعتراض نیا نہیں ہے، بلکہ خواجہ عبید اللہ احرار ایک بزرگ گذرے ہیں مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کے پیر ہیں مولانا جامیؒ بھی پہلی مرتبہ جب انکی خدمت میں حاضر ہوئے اور انکا عالی شان محل اور وہاں پہ پہرہ چوکی دیکھا تو وہاں سے یہ کہکر واپس ہو گئے کہ ع نہ مرد است آں کہ دنیا دوست دارد (جو شخص دنیا کو دوست رکھے

وہ بھلا کہیں اللہ والا ہو سکتا ہے" حضرت خواجہ صاحب پھاٹک کے اوپر سہ دری میں تشریف فرما تھے انھوں نے سن لیا۔ ادھر مولانا سفر سے تھکے ہوئے تھے پاس کی مسجد میں آرام کرنے کی خاطر جا کر لیٹ رہے، تھکے تو تھے ہی نیند آ گئی خواب میں دیکھا کہ حشر قائم ہے اور میرا ہی نام پکارا جا رہا ہے ایک شخص مدعی حق میرا دامن پکڑے ہوئے اپنے حق کا مطالبہ کر رہا ہے اور میں ادائیگی سے عاجز ہوں کہ اتنے میں خواجہ عبید اللہ احرار کی سواری ادھر سے گذری ہمیں اس حال میں گرفتار دیکھکر اس شخص سے پوچھا کہ کیوں کیا بات ہے تم نے انھیں کیوں محبوس کر رکھا ہے اس نے کہا کہ حضرت میرا حق ان پر آتا ہے حضرت خواجہؒ نے جیب سے رقم نکالی اور اسکو دیکر فرمایا کہ یہ ہمارا آدمی ہے لو یہ اپنا حق اور اسکو چھوڑ دو۔ اتنے میں مولانا جامیؒ کی آنکھ کھل گئی گھبرا کر اٹھ گئے اور اپنے خواب کی تعبیر خود ہی یہ دی کہ میرا حصہ خواجہ صاحب کے یہاں ہے مجھے وہیں چلنا چاہیئے۔ چنانچہ پھر واپس آئے اور اطلاع کرائی، حضرت خواجہ عبید اللہ احرار نے بلا لیا اور مولانا کو دیکھتے ہی فرمایا اجی خواب و خیال کا کیا اعتبار؟ اب تو مولانا جامیؒ کو اور عقیدت ہو گئی عرض کیا کہ حضرت بیعت فرما لیجئے۔ فرمایا کہ پہلے تم نے جو مصرعہ پڑھا تھا اسے پھر سے سناؤ۔ مولانا نے عرض کیا کہ حضرت وہ تو میری ناواقفیت تھی اور گستاخی ہوئی اسکی معافی چاہتا ہوں۔ فرمایا کہ نہیں میں کہتا ہوں کہ وہ مصرعہ پڑھو۔ بہرحال شیخ کے اصرار پر مولانا نے عرض کیا کہ میں نے یہ کہدیا تھا کہ ؎

نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد

فرمایا کہ بات تو تم نے ٹھیک کہی لیکن اس میں دوسرا مصرعہ یہ بھی لگا لو ؎

اگر دارد برائے دوست دارد

دیکھو اگر میرے پاس مال نہ ہوتا تو تم کو کیسے رہا کراتا۔

چنانچہ مولانا جامی کا تعلق جب خواجہ عبید اللہ احرارؒ سے ہو گیا اور اسکے بعد جب مولانا کو خواجہ صاحبؒ کی کامل معرفت ہو گئی تو وہی مولانا جامیؒ یہ بھی فرماتے تھے کہ ؎

چو فقر اندر قبائے شاہی آمد   بہ تدبیر عبید اللّٰہی آمد

(فقیری جب قبائے شاہی میں آئی تو خواجہ عبید اللہ احرارؒ کے ہاتھوں آئی یعنی یہ کہ شاہی اور فقیری ان دونوں میں کچھ منافات نہیں ہے ایک فقیر مزاج بھی بادشاہ ہوسکتا ہے اور ایک بادشاہ فقیر ہوسکتا ہے لیکن اسکے لئے طریقہ اور تدبیر کی ضرورت ہے چنانچہ فقیری نے شاہی قبا اسوقت زیب تن کی جبکہ خواجہ عبید اللہ احرارؒ کی تدبیر اور انکا سا انتظام اسے میسر آیا مطلب یہ کہ انسان کے اندر اگر حضرت خواجہ احرار جیسی بے نفسی اور للّٰہیت، حمایتِ خلق اور غریب پروری پیدا ہو جائے تو پھر وہ امیر کبیر بھی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ بس حضرت اقدسؒ نے اس واقعہ کو بیان کر کے یہی سبق دیا کہ امیر اور دنیا دار مرادف نہیں ہے۔ پھر اگر آدمی امیر ہو اور دیندار ہو تو اسکو تو حدیث میں بھی نعم المال الصالح للرجل الصالح بھی فرمایا ہے۔ یعنی صالح مال ایک صالح انسان کیلئے کیا ہی اچھی چیز ہے۔

اور اسکے بعد حضرتؒ نے مال کے مسئلہ کو ایسا ایسا واضح فرمایا ہے کہ اسکی صحیح حیثیت لوگوں کے ذہنوں میں آگئی ورنہ تو اس باب میں لوگ افراط و تفریط ہی میں مبتلا تھے یعنی یا تو مال کو مطلقاً مذموم سمجھا جاتا تھا اور یا نہیں تو پھر مالدار کیا آدمی اگر دنیا دار ہو جائے تو اسکو بھی برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حضرت والاؒ نے اپنی مجالس میں اس مسئلہ کو بالکل صاف فرما دیا کہ مال نہ تو مطلقاً مذموم ہے اور نہ مطلقاً محمود ہے بلکہ انسان کے اگر وہ جیب اور بکس ہی میں رہے تو خیر غنیمت ہے اور اگر دل میں اتر جائے تو یہ حال برا ہے جیسے پانی کہ اگر وہ کشتی کے نیچے رہے تو اسکے چلنے کا ذریعہ ہے اور اگر کشتی کے اندر آ جائے تو تباہی کا باعث بھی ہے۔ چنانچہ ان مضامین کی قدر حضرات علماء نے فرمائی۔ باقی عوام کا تو ہر زمانہ میں یہ حال رہا ہے کہ وہ علم کی باتوں کا مقابلہ لاٹھی ہی سے کرتے رہے ہیں۔

اسی طرح سے دوسرے معاملہ میں ایک دن بس یہ فرمایا کہ آپ کے اس شہر میں آکر مجھے ایک فیض یہ ملا کہ اپنے پیر کو گالی دیتے اپنے کانوں سے سنا۔ ورنہ

اتنا تو جانتا ہی تھا کہ اہل بدعت حضرت مولانا تھانوی ہی کو کیا تمام علماء دیوبند کو برا کہتے ہیں اور کافر بناتے ہیں لیکن اپنے کانوں سے اپنے پیر کو برا بھلا کہتے ہوئے یہیں الہ آباد ہی میں آکر سنا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور یہ فرمایا کہ سنا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ "حضرت مولانا تھانویؒ نے اپنے شیخ کی مخالفت کی"۔ حالانکہ مدرسہ میں جاکر دیکھ لو پڑھا رہے ہوں گے کہ ہدایہ اور شرح وقایہ میں ہے کہ خلافاً للشافعیؒ یا قال ابو حنیفہؒ کذا خلافاً لابی یوسف یا خلافاً لمحمدؒ تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ امام ابو یوسفؒ یا امام محمدؒ اپنے شیخ اور استاذ ابو حنیفہؒ کے مخالف تھے اور انکا یہ فرمانا مخالفت تھا؟ اگر یہی مطلب سمجھا اور سمجھایا گیا تو بقول قائل ؎

گر ہمیں مکتب وہمیں مُلّا کار طفلاں تمام خواہد شد

(اگر ایسے ہی مدرسے اور ایسے ہی پڑھانے والے رہے تو بچوں کا کام تمام ہی سمجھو)
ظاہر ہے کہ کسی سے اختلاف کرنا اور چیز ہے اور کسی کا مخالف ہونا اور بات ہے بس اسی طرح سے یہ حضرات یعنی حضرت مولانا تھانویؒ یا حضرت مولانا گنگوہیؒ کو حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ سے بعض مسائل فقہیہ میں اختلاف ضرور ہوا لیکن اسکو مخالفت سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے۔ اور پھر یہ کہ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ان حضرات نے اپنے پیر کی مخالفت کی لیکن خود پیر کو یعنی حضرت حاجی صاحبؒ کو اُسکا کچھ بھی خیال نہیں تھا بلکہ جو لوگ اس سلسلہ میں ہیڑم کشی کر رہے تھے انکی طرف سے ملال ہوتا تھا۔ چنانچہ غالباً کسی نے ہند میں مشہور کر دیا کہ حضرت حاجی صاحبؒ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے سخت ناراض ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت گنگوہیؒ کے کانوں تک بھی یہ خبر پہونچی حضرت نے حاجی صاحب کو خط لکھکر استصواب فرمایا اس پر حضرت حاجی صاحبؒ کا جو جواب آیا اس نے اہل عناد کا قصر ہی ڈھا کر رکھدیا۔ تحریر فرمایا کہ :-

"ایک ضروری اطلاع یہ ہے کہ فقیر آپ کی محبت کو ذریعہ نجات سمجھتا ہے

الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی محبت کو میرے دل میں ایسا مستحکم کر دیا ہے کہ کوئی شے اسکو ہلا نہیں سکتی اور میں اپنے سب احباب کی محبت کو اپنے لئے وسیلہ نجات جانتا ہوں اور یقین جانو کہ مجھ کو دنیا میں کسی سے ملال وکدورت نہیں ہے تو پھر اپنے عزیزوں سے جو اس گنہگار کے عقبیٰ کے حامی ہیں کیونکر کدورت رکھونگا۔

اول تو کسی کو مقدور نہیں کہ فقیر کے سامنے آپ کے خلاف زبان ہلاوے کیونکہ اس بارہ میں اسکو سوا میرے رنج و ملال کے کیا فائدہ ہوگا۔ دوسرے جو کوئی فقیر کو دوست رکھتا ہے وہ ضرور آپ سے محبت رکھتا ہے تو اسکے خلاف کبھی کوئی تحریر آپ کے پاس جاوے تو اسکو باور نکرنا۔ عزیزم دل محل ایمان ومعرفت و ومحبت ہے نہ محل کینہ وکدورت۔ آپکی دعا میرے حق میں مقبول ہے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اب اس اخیر زمانہ میں میرے دل کو نور ایمان ومحبت ومعرفت سے نورٌ علیٰ نور فرمادے"۔ فقط"

ملاحظہ فرمایا آپ نے یہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کا خط ہے فقیہ العصر حضرت مولانا گنگوہیؒ کے نام ـــــ چنانچہ حضرت مولانا تھانویؒ سے بھی زیادہ جو بزرگ مسائل شرعیہ میں سخت تھے ان کے ساتھ حضرت حاجیؒ صاحب مہاجر مکیؒ کی کیسی محبت اور کیسے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ مضمون خط سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ حضرت حاجی صاحبؒ کو حضرت مولانا گنگوہیؒ سے مخالفت وعناد رکھنے والوں کی مخالفت کا بھی اندازہ تھا اور انکی اس نوع کی حرکات سے بھی حضرت حاجی صاحب مطمئن نہ تھے کہ دور کا معاملہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص میری ہی جانب سے کوئی تحریر ہندوستان بھیجدے اور اسکی وجہ سے مولانا پریشانی میں پڑ جاویں اسلئے صاف لکھدیا کہ اگر اس کے خلاف کبھی کوئی تحریر بھی جاوے تو اسے باور نکرنا اسلئے کہ وہ دراصل میری تحریر ہی نہ ہوگی بلکہ کسی مہربان کی حرکت ہوگی۔

دیکھا آپ نے ایسی صریح دستاویز کے بعد بھی اغیار کی جانب سے امن نہ تھا۔ تو پھر کسی سے محض اختلاف کرنیوالے کو اسکا مخالف اور اسکے خلاف کرنیکو مخالفت کہدینا کون سی بڑی بات ہے۔

غرض حضرتؒ نے حضرت تھانویؒ کی حضرت حاجی صاحبؒ سے مخالفت کا اعتراض اور اسکا جواب اپنی مجلس میں ذکر فرمایا جو الحمدللہ بہت ہی موثر ثابت ہوا اور پھر اسکے بعد " مرید نے پیر کی مخالفت کی " اس موضوع پر اہل بدعت کی کوئی تقریر نہیں سنی گئی۔ اور " یہ پیرا میر کبیر ہیں " یا " بہت روپئے والے ہیں " اس قسم کی باتوں کا چرچا بھی کم بلکہ قریب قریب ختم ہی ہوگیا۔

اس سلسلہ میں حضرت والا کا ایک اور واقعہ یاد آگیا وہ یہ کہ حضرت کا معمول تھا کہ اکثر جمعہ کو مجلس سے فارغ ہوکر مولوی عبدالمجید صاحب (اسرار کریمی پریس والے) کو یا کسی اور کو ہمراہ لیکر محلہ کٹرہ مسجد بیناشاہ پر قاری حبیب احمد صاحب مدظلہ کے یہاں تشریف لے جاتے وہیں آرام فرماتے نماز جمعہ ادا فرماتے اور قبل عصر واپس تشریف لاتے۔ اس سے حضرت کا مقصد غالباً مجمع سے تنہا ہوکر ذہنی سکون حاصل کرنا تھا۔ قاری حبیب احمد صاحب مدظلہ راوی ہیں کہ اسی طرح حضرت والا ایک دفعہ مولوی عبدالمجید صاحب کے ہمراہ تشریف لائے اور مسجد کے حجرہ میں قیام فرمایا حضرت والا لیٹے لیٹے کچھ گفتگو فرمارہے تھے ہم دونوں پاس بیٹھے ہوئے تھے حضرت کو منشرح دیکھکر میں نے عرض کیا کہ حضرت رکشے پر تشریف لاتے ہیں تھک جاتے ہوں گے، مولوی عبدالمجید صاحب نے بھی اپنی کار بیچ دی ورنہ تو حضرت جیسے کے لئے مناسب تھا کہ ایک کار دروازہ پر کھڑی رہتی اور حضرت جب اور جہاں تشریف لے جانا چاہتے اسمیں تشریف رکھتے اور آرام سے چلے جاتے۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ حضرت والا میری بات کو بغور سنتے رہے اور اسکے بعد فوراً مولوی عبدالمجید صاحب کیجانب متوجہ ہوکر فرمایا کہ مولوی عبدالمجید صاحب! یہ میں نے مکان جو خریدا ہے تو کچھ اپنے لئے نہیں لیا ہے بلکہ اپنے بچوں کے لئے لیا ہے کہ کل کو

وہ میرے بعد یہ نہ کہیں کہ میرے باپ نے ہمکو یہاں پردیس میں لاکر بے سروسامان چھوڑ دیا اور حدیث شریف میں بھی آتا ہے کہ اپنے بچوں کو اپنے بعد محتاج یعنے حاجتمند اور غریب نہ چھوڑ جاؤ کہ وہ دوسروں کے دست نگر رہیں۔ اور دیکھو میرے ساتھ اتنے لوگ بھی تو تھے، طلبہ تھے، آنے جانے والے مہمان تھے، اتنا بڑا مکان نہ ہوتا تو سب کا کام کیسے چلتا؟ باقی خود میری ذات کے لئے تو کسی مسجد کا صرف اتنا بڑا حجرہ کافی تھا مجھے نہ حویلی کی ضرورت تھی نہ موٹر کار کی قاری حبیب احمد صاحب فرماتے تھے کہ حضرت کی یہ تقریر سنکر میں تو پانی پانی ہوگیا اور مجھے بیحد ندامت ہوئی کہ میں نے یہ ذکر کیوں کیا۔

راقم عرض کرتا ہے کہ سبحان اللہ حضرت والا کی بھی کیا شان اصلاح تھی کہ مکان کی خریداری پر مخالفین کو تو وہ جواب دیا جو آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں اور اپنے ایک خادم مولوی کے ذہن میں جہاں ان چیزوں کا تصور آیا تو اسکو اس طرح سے کھرچ کر نکالدیا اور اپنی پسند اپنا ذوق اس پر ظاہر کرکے اسکو بھی اسی ذہن و پسند کی طرف متوجہ ہونیکی جانب رہنمائی فرمائی۔

بہرحال خریداریٔ مکان کے سلسلے میں چونکہ غیر معمولی حالات سامنے آگئے تھے اسلئے ہم نے بھی کسی قدر تفصیل سے انکا ذکر اس غرض سے کردیا کہ حضرت اقدسؒ کے متوسلین کو ایسے مواقع پر حضرت کی سیرت یاد آکر عمل کیجانب داعی بنے کہ حضرت اقدس نے اپنے حسن خلق اور صبر و ضبط ہی کی وجہ سے اہل اہوی پر فتح پائی تھی اور تمام عمر اپنے لوگوں کو یہی چیز سکھلاتے رہے اور یہی خلق اپنے متوسلین میں دیکھنا پسند کیا

چنانچہ حضرت اقدس کے یہی وہ اخلاق و معاملات تھے جن سے متاثر ہوکر جامع معقول و منقول حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ نے حضرت اقدس کو اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا کہ :-

"مخدوما! خانقاہ تھانہ بھون۔ رائے پور اور گنگوہ کی ویرانی

سکے بعد طبیعت بہت افسردہ رہتی تھی۔ البتہ آپ کے احوال وکوائف سنکر یہ مایوسی مبدل بہ توقعات ومسرت ہوجاتی تھی اور سمجھ میں آتا تھا کہ وقت کی عام مایوسیاں مستثنیات سے خالی نہیں ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے آپ سے ملاقات کے وسائل بہم پہونچائے اور میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ آپ سے ملاقات کے بعد مسرت کی بے پایانی میں برابر اضافہ ہوتا گیا ملاقات کی مدت اگرچہ بہت مختصر تھی مگر اس ملاقات سے جو تاثرات مرتب ہوئے وہ نہایت دیرپا اور بے پایاں ثابت ہوئے اب بھی اس ملاقات کی مسرتیں اور سرشاریاں میرے دل میں بحالہ باقی ہیں۔

آنمحترم کو میں نے کمال صلاح واصلاح سے متصف پایا اور آپ کے طریق اصلاح کو اس آیۃ کا پورا نمونہ پایا وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (یعنی تم انکے معبودوں کو برا مت کہو مبادا وہ جہالت کیوجہ سے خدا کو برا کہنے لگیں) اس نفاق اور سلب کمال کے زمانہ میں غیروں کو اپنانا اور اپنوں کو گلے لگانا وہ جنس گرانمایہ ہے جسکا کم از کم اس زمانہ میں ملنا دشوار ہے۔ آپ کا انداز اصلاح مدعیان تصوف کو بلا کسی جنگ وجدل اور حیلہ وتدبیر کے شکست فاش دے چکا ہے اور یہ شعر آپکی اصلاحی مساعی پر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

گر ایں مدعی دوست بشناختے ــــ بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

(اگر یہ مدعی محبتِ خدا کا عارف ہوتا تو اپنے دشمن سے لڑنے میں مصروف نہ ہوتا)

کیونکہ آپ نسبت محمدی (علی صاحبہا الف تحیہ) کے مظہر کامل ہیں اس نسبت کے حاملین کی جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ آپ میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔"

چنانچہ حضرت والا کے اسی نرمی اور خلق محمدی پیش فرمانے کا یہ اثر ہوا کہ مخالفین

اپنا کام کرتے رہے اور حضرت اقدس کے یہاں نئے نئے لوگ برابر بڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے عوام و خواص ہر طبقہ میں حضرتؒ کی نصرت کرنے والے بنا دیئے وللہ الحمد۔

اس سلسلہ میں یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدس کی نصرت کیونکر فرمائی دو حضرات کے واقعات لکھتا ہوں ایک صاحب تو عامی ہیں لیکن شہرت میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں دوسرے صاحب الہ آباد کے خواص میں شمار کیئے جاتے ہیں۔ میری مراد پہلے صاحب سے اپنے صدیق مخلص برادرم انیس احمد صاحب ساکن پر خاص ہیں۔ آپ انکی کہانی خود انکی زبانی سنیئے۔ اور یہی طریقہ اس زمانہ میں کسی معاملہ کا مصدق ہو سکتا ہے ورنہ تو اس زمانہ کی روایات نے اپنا اعتبار بالکل ہی کھو دیا ہے ہمارے حضرت حکیم الامۃؒ اسی سے متاثر ہو کر یہ فرمایا کرتے تھے کہ خبر (روایت) کے معنیٰ تو علماء نے یہ بیان کئے ہیں کہ ما یحتمل الصدق والکذب یعنی خبر وہ ہے جو صدق اور کذب کا احتمال رکھے لیکن اخبار دیکھنے اور سننے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ خبر اسکو کہتے ہیں جس میں صدق کا احتمال بھی نہ ہو۔ اور حکیم الامۃ نے مزاح کے انداز میں ایک حقیقت بیان فرما دی ہے کیونکہ دیکھا جاتا ہے کہ فی زمانہ روایت کے باب میں عوام تو عوام بہت سے خواص اور پڑھے لکھے لوگ بھی ایسا غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کر جاتے ہیں جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید ان کے پیش نظر کذب کی مذمت باقی نہیں رہ گئی ہے یا العیاذ باللہ اسکو وہ حلال سمجھتے ہیں جو منہ میں آیا کہہ گذرے ور جو بات ان کے قرین مصلحت ہوئی زبان سے نکالدی خواہ عالم تحقیق میں وہ بات سیاہ جھوٹ ہی کیوں ہو انا للہ وانا الیہ راجعون اسلئے میں نے عرض کیا کہ اس زمانہ میں روایت وہ قابل اعتبار ہے جس میں راوی خود آپ بیتی بیان کرے۔ چنانچہ بھائی انیس صاحب نے اپنے سابقہ خیالات اور حضرت مصلح الامۃ کے دربار میں اپنی حاضری کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ نہایت دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ صحیح بھی ہے اور حضرت

اقدس کی نصرت جو منجانب اللہ ہوئی اسکی کڑی بھی ہے اسلئے اسکو انھیں
کے لفظوں میں پیش کرتا ہوں

(بھائی انیس احمد پُرخاصوی کی کہانی خود انکی زبانی)

بیان کرتے ہیں کہ میں بچپن ہی سے اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحب
کا معتقد اور بریلوی مسلک کا دلدادہ تھا۔ علماء بریلی (یعنی ان کے مقررین اور
میلاد خوانوں) میں خاص مقام رکھتا تھا اسلئے کہ خود بھی نعت شریف کہتا اور
عمدہ ترنم کے ساتھ پڑھتا بھی تھا اسلئے آس پاس کے جلسوں میں میرا بھی نام
شایع ہوتا تھا اس طور پر اس اپنے صوبہ کے تمام ہی علماء سے میرے تعلقات
اور روابط تھے چونکہ اپنے مسلک پر نہایت پکا تھا اسلئے عرس کے موقعوں پہ
مزارات پر بھی حاضری ہوتی تھی حتی کہ اچھا پڑھنے ہی کی وجہ سے محرم میں نوحہ
اور مرثیہ خوانی کے لئے شیعہ حضرات اپنی محفلوں میں مجھے بھی بلاتے تھے۔ میں جاتا اور
نوحہ پڑھتا تھا۔ (اور خیر مجھے تو اب معلوم ہوا کہ شریعت میں نوحہ اور مرثیہ خوانی اور
اور سینہ کوبی کی ممانعت ہے تاہم علماء بریلی میں سے کسی نے اسپر نکیر نہیں
فرمائی) اور اعلیٰ حضرت سے غائبانہ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ میں بھی ان تمام
لوگوں کو اسلام سے خارج سمجھتا تھا جن پر ہمارے اعلیٰ حضرت نے کفر کا فتویٰ
لگایا تھا جن میں دیوبندیہ وہابیہ سرفہرست تھے۔

ایک مرتبہ الہ آباد سے مولانا محمد میاں صاحب فاروقی نبیرہ حضرت مولانا
شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ ہمارے گاؤں پُرخاص تشریف لائے میرے ہی
یہاں مولانا کا قیام تھا گھر اور گاؤں کے بہت سے حضرات مولانا کی خدمت میں حاضر
تھے میں بھی جاکر قریب ہی بیٹھ گیا۔ اپنے مسلک میں انتہائی متشدد اور طبیعت کا
جری واقع ہوا تھا اسلئے مولانا سے بے جھجھک عرض کیا کہ حضرت بڑے افسوس
کی بات ہے کہ شہر میں آپ جیسی ہستی موجود ہو اور وہاں ایک وہابی آکر اپنا رنگ

جمالے۔ یہ روشن باغ میں کون آگیا ہے کہ سب طرف سے لوگ جا جاکر وہابی ہوئے چلے جارہے ہیں اور آپ لوگ خاموش تماشا دیکھ رہے ہیں اس کا کچھ انسداد نہیں فرماتے۔ اسی نوع کے بلکہ اس سے بھی سخت بے ادبی کے کلمات حضرت مولانا فتحپوری رحمۃ اللہ کی شان میں میری زبان سے نکلے یہ سنکر مولانا محمد میاں بڑی زور زور سے اپنا دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر مارنے لگے اور فرمایا کہ توبہ توبہ برخوردار تم نے ایک اتنے بڑے ولی کی شان میں ایسی بات کہدی اس سے مجھے بیحد تکلیف ہوئی میں آپ کا مہمان ہوں اسلئے آپ سے صرف یہ کہتا ہوں ہوں کہ کسی ولی اور بزرگ کی شان میں بے ادبی اچھی چیز نہیں ہے۔ خدا کا غضب مول لینا ہے سخت مہلک ہے۔ آپ نے مجھے بہت تکلیف پہونچائی لہٰذا اب یا تو آپ میرے سامنے سے ہٹ جائیے یا مجھے اجازت دیجئے کہ میں یہاں سے چلا جاؤ مولانا محمد میاں کی زبان سے ان کلمات کو سنکر میرے بعض عزیزوں نے مجھے اشارہ کیا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور حضرت مولانا سے معذرت کر کے مولانا کو راضی کرلیا۔

ادھر مولانا محمد میاں صاحب کی اس بات کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ اپنے مکان کے ایک گوشہ میں جاکر لحاف اوڑھکر لیٹ گیا اور خوب رویا اور اللہ تعالےٰ سے دعا کی کہ یا اللہ میں اسوقت بڑی الجھن میں پڑا ہوا ہوں مجھے ہدایت عطا فرمائیے۔ یا اللہ! میں کدھر جاؤں؟ یہ محمد میاں فاروقی جن کے یہاں عرس ہوتا ہے جو اجمیر شریف کے عرس میں بھی جاتے ہیں۔ سنی عالم ہو کر بھی ایک وہابی کو کیسے بزرگ کہہ رہے ہیں۔ جبکہ اعلیٰ حضرت نے ان سب کو کافر کہا ہے اسی طرح دل دل میں اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا رہا اور ہدایت طلب کرتا رہا۔ عصر تک اسی طرح بیقرار رہا کہ اچانک قلب میں یہ ارادہ پیدا ہوا کہ حضرت مولانا فتحپوری کو چل کر خود دیکھا جائے۔ چنانچہ پہلی حاضری حضرت والا کے یہاں اس طرح ہوئی کہ اپنے گاؤں پر خاص سے چلکر شہر الہ آباد آیا اور روشن باغ پہونچکر

حضرت والاؒ کے مکان کے پاس آیا اور کسی صاحب سے دریافت کیا کہ حضرت مولانا سے ملاقات کس طرح ہوسکتی ہے انھوں نے کہا کہ اب نماز ظہر کا وقت قریب ہے بہتر ہے کہ آپ مسجد میں حضرت سے ملاقات کرلیں حضرت مسجد تشریف لیجانے ہی والے ہیں۔ چنانچہ ڈھال والی مسجد میں آیا پہلی بار قدم رکھا تو عجیب منظر دیکھا۔ دیکھا کہ مسجد بالکل منور ہے اور ایسی نورانی ہے کہ میں اسکے بیان سے قاصر ہوں (یہ میرے اپنے تاثرات ہیں جو عرض کررہا ہوں) میں مسجد میں ایسے وقت داخل ہوا تھا کہ اذان ظہر ہوچکی تھی بہت لوگ سنتیں پڑھ رہے تھے کچھ لوگ وضو کررہے تھے، عمر بھر میں پہلی دفعہ میں نے اتنی تعداد میں کم عمر طلبہ کو شرعی لباس میں دیکھا یہ منظر بھی مجھے ایسا حسین معلوم ہوا کہ میری حیرت اور تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہ گئی سبحان اللہ! مسجد کو جو دیکھا تو کھچا کھچ بھری ہوئی تھی یہ نظارہ بھی میں نے شاید پہلی بار ہی دیکھا تھا اور بڑی بات یہ تھی کہ تقریباً سب ہی حضرات کے چہرے پر شرعی ڈاڑھی موجود دیکھی اور چھوٹے بڑے سب ہی طلبہ کو شرعی لباس پہنے ہوئے دیکھا۔ انکو دیکھکر میری حیرت اور زیادہ ہوگئی کہ دیکھو تو یہ لوگ کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔ عام طور سے سب ہی لوگوں کا وہی مخصوص لباس تھا جو حضرت مولانا کا تھا یعنی سفید کرتا۔ شرعی پاجامہ اور چوگوشیہ گول ٹوپی اور اسی لباس میں معصوم طلبہ بھی تھے۔ دینداروں کا یہ منظر دیکھکر دل کی جو حالت تھی ناقابل تحریر ہے۔ مسجد کے اندر تمام مجمع بالکل خاموش اور پرسکون تھا کوئی سنت پڑھ رہا تھا اور جو پڑھ چکا تھا وہ تسبیح لئے خاموشی کیساتھ ذکر میں مشغول تھا کوئی یادِ خدا میں مراقب بیٹھا تھا اگر کوئی شخص کسی سے کچھ کہنا چاہتا تو نہایت خاموشی کے ساتھ بلکہ اشاروں سے بات کرتا تھا۔ میں نے بھی وضو سے فارغ ہوکر سنت پڑھی اور مسجد کے شمال کی جانب صحن ہی میں بیٹھ گیا اور پاس کے ایک صاحب سے دریافت کیا کہ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت مولانا صاحب کون ہیں انکی زیارت کے لئے آیا ہوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ حضرت ابھی تشریف نہیں لائے ہیں بس آتے ہی ہوں گے۔

حضرت مولانا کے شوق دیدار میں میں مسجد کے دروازہ کی طرف ٹکٹکی باندھکر دیکھنے لگا
اور ہر نئے آنے والے پر جو مشرع صورت ہوتا یہ گمان کرتا کہ شاید یہی حضرت مولانا ہیں
اور اس سلسلہ میں مجھے اپنے پاس والے سے باربار دریافت کرنا پڑا۔ بالآخر
انھوں نے مجھ سے یہ کہاکہ نہیں صاحب آپ کیوں اسقدر پریشان ہیں خاموش بیٹھے
رہیئے جب حضرت مولانا تشریف لائیں گے تو آپ کو خود بخود معلوم ہو جائیگا کسی سے
دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ اُن کے اس جملہ کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ
میرا دماغ کہیں سے کہیں پہونچ گیا' اب میرے دماغ میں یہ بات گونجنے لگی کہ۔
ارے بھائی یہ مولانا آخر کتنے بڑے بزرگ ہیں کہ انکے آنے پر بغیر تعارف کرائے
ہوئے ایک اجنبی آدمی کیسے خود بخود انھیں پہچان لے گا' کیا وہ بشری لباس میں
نہ ہونگے۔ کیا عام انسانوں سے انکی صورت وشکل اور ہاتھ پاؤں مختلف ہونگے
یا شاید انکا کوئی خاص امتیازی لباس (عبا جوغا وغیرہ) ہوگا جسے وہ زیب تن کئے
ہونگے اسکی وجہ سے پہچاننے میں سہولت ہوتی ہوگی اسی قسم کے خیالات میں غلطاں
و پیچاں تھا کہ اتنے میں حضرت مسجد میں داخل ہوئے تو واقعی بقول ان صاحب کے
کسی سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی حالانکہ لباس میں کوئی امتیاز نہ تھا
لیکن کیا عرض کروں کہ حضرت کس شان سے مسجد میں داخل ہوئے اس کا بیان
تحریر سے باہر ہے اسکا تعلق کچھ دیکھنے ہی سے تھا۔ الغرض حضرت تشریف لاکر سنت
میں مشغول ہو گئے لیکن میں نے اپنے دلی اطمینان کی خاطر پھر ان صاحب سے پوچھ لیا
کہ کیوں صاحب اب تو غالباً حضرت مولانا یہی ہیں انھوں نے کہا جی ہاں۔ حسن اتفاق
سے میں جس صف میں تھا حضرت والا تھوڑے فاصلہ سے اسی میں سنت پڑھ رہے
تھے مجھے موقع مل گیا اور میں جی بھر کر حضرت کو دیکھنے لگا۔

اب مجھ پر کیا بنی اور میرے دل و دماغ میں کیا کیا باتیں آنے لگیں اور کیسے
کیسے خیالات گذرنے لگے اسکو میرا دل ہی جانتا ہے۔ حضرت کو دیکھتے دیکھتے میری نگاہ
ایکدم تمام نمازیوں پر پڑی ہر شخص کو بغور دیکھ رہا تھا یہاں تک کہ مسجد کی بناوٹ اور

اسوقت کا ایک نورانی کیف قلب کو متاثر کر رہا تھا، اسی اثنار میں پہلا سوال جو میرے دل میں پیدا ہوا یہ تھا کہ کیا یہ سب لوگ جو مشترع صورت مسجد میں موجود ہیں اور جنکی صورت سے نور ٹپک رہا ہے ایسا کہ دل بے اختیار انکی جانب کھنچ رہا ہے کیا یہ سب لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور بزرگانِ دین کو نہیں مانتے اور انکی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں اسکا جواب خود بخود یہ ذہن میں آیا کہ نہیں ایسا نہیں ہے کیونکہ اگر ان لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی (نعوذ باللہ) اہانت ہی کرنی ہوتی تو اپنی شکل وصورت، لباس و وضع شریعت اور سنت کے مطابق نہ بناتے اور جس سکون اور آداب کے ساتھ یہ لوگ مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں یہ طریقہ تو حضورؐ ہی کا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے کتنے پابند تھے اور فرماتے تھے کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، اسلئے بغیر حضورؐ سے محبت کے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک بات یہ کہ یہ لوگ بہت سی باتوں کو منع کرتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ پہ اس کو ناجائز بتلاتے ہیں (جسکو ہم لوگ کرتے ہیں) اس میں یہ لوگ بالکل نہیں ڈرتے۔ اسیطرح سے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان لوگوں کو محبت نہ ہوتی تو ابھی اذان ہوئی ہے اس میں اشہدان محمد رسول اللہ نہ کہتے بلکہ اذان میں بھی تبدیلی کر دیتے آخر شیعہ حضرات نے اذان میں تبدیلی کرہی دی ایسے ہی انکی اذان ایک تیسرے قسم کی ہوتی۔

بہرنوع اسی نوع کے خیالات میرے دماغ میں چھائے ہوئے تھے اور میں اسی میں غلطاں وپیچاں تھا کہ دفعۃً یہ خیال آیا کہ میاں انیسؔ یہ تمھیں کیا ہو گیا کہ تم ان وہابیوں، دیوبندیوں کی صداقت وعظمت اور ان کے مسلمان ہونے کا یقین کرتے جارہے ہو جن کے متعلق ہمارے اعلیٰ حضرت ہی نے نہیں بلکہ عرب وعجم کے علمار نے کفر کا فتویٰ دیا ہے۔ خبردار اپنے ایمان کی حفاظت کرو اور اس قسم کے خیالات کو جن سے ان لوگوں کے حق میں ہونے کا یقین پیدا ہو اپنے دماغ سے نکالو۔ اسکے بعد میں نے لاحول پڑھا اور گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد

پھر تقاضا پیدا ہوا کہ حضرت مولانا کو تو ایک بار پھر دیکھ لوں چنانچہ نگاہ اٹھا کر حضرت کی طرف دیکھا تو دیکھا کہ حضرت سنت سے فارغ ہو کر بیٹھے ہوئے گاہے اس طرف گاہے اُس طرف نگاہ پھیر رہے ہیں اور مصلیوں کا عالم یہ ہے کہ سب کے سب گردن جھکائے خاموش بیٹھے ہوئے ہیں اور جیسا کہ حدیث شریف میں حضرات صحابہؓ کرام کے بیٹھنے کا ذکر آتا ہے اللہ تعالےٰ کے دربار میں ایک اور بزرگ کے سامنے یہ لوگ بھی اسی طرح بیٹھے ہوئے ہیں جس نے کانھم علی رؤسھم الطیر (گویا کہ انکے سروں پر چڑیا بیٹھی ہوئی ہو) کا نقشہ سامنے کر دیا۔ یہ مناظر میرے دل پر کیسے کچھ اثرات چھوڑ رہے تھے اسکو میرا دل ہی جانتا ہے۔ پھر دیکھا کہ حضرت کی نگاہ میری جانب ہے میں اسکی تاب نہ لا سکا چنانچہ عظمت اور ہیبت کیوجہ سے میری نگاہ نیچی ہو گئی مگر تھوڑے ہی وقفہ کے بعد میں نے ہمت کر کے دوبارہ جب حضرت کی طرف دیکھا تو دیکھا کہ حضرت کی نظر اب بھی میری ہی جانب ہے پھر تو میرے ہوش اڑ گئے۔ اب یہ طے کر لیا کہ حضرت کی طرف نہ دیکھوں گا اسلئے کہ یہ خیال ہوا کہ شاید انھیں کشف کے ذریعہ میری حالت اور موجودہ میرے گندے خیالات کا علم ہو گیا ہے کہیں ایسا نہو کہ مجھے مسجد ہی سے نکلوا دیں لیکن اسکے ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ ارے بھائی یہ تو وہابی ہیں کشف وکرامات اور روشن ضمیری سے انھیں کیا واسطہ چنانچہ اس خیال کے آتے ہی ہمت کر کے پھر جو نظر اٹھائی تو دیکھا کہ حضرت کی نگاہ کرم اب بھی میری ہی جانب بدستور قائم ہے۔ بس اسدفعہ نگاہ کا ملنا تھا کہ میرا کام ہو چکا تھا۔ اسکے بعد اقامت ہوئی اور سب لوگ نماز کے لیے کھڑے ہو گئے میں کن انکھیوں سے حضرت کو تو دیکھ ہی رہا تھا حضرت نے بھی اٹھتے اٹھتے ایک بار پھر مجھے بڑی لطف بھری نگاہ سے دیکھا' اور اب ہم سب لوگ فرض نماز میں مشغول ہو گئے۔

فرض نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں فوراً وہاں سے اس طرح سے بھاگا جیسے میری گرفتاری ہونے والی ہو مسجد سے روشن باغ میں آ کر اپنے ایک عزیز کے گھر آ گیا اور سب سے پہلے اپنی نماز دہرائی اس خیال سے کہ وہابی کے پیچھے نماز

نہیں ہوتی۔ نماز سے فارغ ہوکر میں انکے ایک کمرے میں اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے آرام کرنے کے لئے جاکر لیٹ رہا۔ تنہائی ہونے کی وجہ سے میرے دل کی دنیا پھر آباد ہونی شروع ہوئی اور کبھی ایک اضطراری اور اختلاجی کیفیت طاری ہوتی کبھی حضرت کی نظر اور مسجد کا دلکش منظر یاد آکر ایمانی لذت اور حلاوت کی کیفیت محسوس ہوتی۔ غرض کافی دیر تک اسی سوچ اور فکر میں غلطاں و پیچاں چارپائی پر کروٹ بدلتا رہا، پھر معًا اللہ تعالیٰ کی جانب توجہ ہوئی اور یاد آیا کہ اب سے پہلے محمد میاں مدظلہٗ کی گفتگو کے بعد گاؤں میں بھی میری یہی کیفیت ہوئی تھی اور میں خوب رویا تھا اور رو رو کر اللہ تعالےٰ سے دعا رکی تھی تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ اللہ تعالےٰ گویا یہ فرمارہے ہیں کہ گھبراؤ نہیں تمھیں صحیح راستہ مل جائیگا۔ چنانچہ اُس گریہ و بکا کی لذت اسوقت بھی محسوس کر رہا تھا لہٰذا ایسی حالت میں پھر اللہ تعالیٰ ہی سے ہدایت کا طلب گار ہوا اور کروٹ لیکر لیٹے لیٹے خدا تعالیٰ کی جانب متوجہ ہوکر عرض و معروض کرنے لگا آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اسی طرح دیر تک چپکے چپکے روتا رہا کہ اتنے میں مجھے آہٹ ملی اور سمجھا کہ شاید صاحب خانہ میرے آرام کے سلسلہ میں اخلاقاً مجھ سے کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں، آہٹ کے ملتے ہی میرے آنسو تھم گئے اور میں اُٹھکر بیٹھ گیا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے یہ عزم لیکر چلا کہ انشاء اللہ میں حضرت مولانا کی کتابوں کا مطالعہ کروں گا۔ چنانچہ عصر کے وقت اپنے ان عزیز کے مکان سے چل کر خانقاہ شریف کیطرف کتاب حاصل کرنے کی غرض سے روانہ ہوا لیکن ابھی راستہ ہی میں تھا کہ پھر شیطانی وساوس نے مجھے پریشان کرنا شروع کیا۔ ایک خیال یہ آیا کہ میاں کیا تمھیں اس پر یقین نہیں آرہا ہے کہ یہ دیوبندی لوگ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہیں اور ان کے عقائد باطل ہیں اور یہ لوگ اہلسنت والجماعت سے خارج بلکہ اسلام ہی سے خارج ہیں جیسا کہ ہمارے علماء بریلی کہتے ہیں اسلئے واپس چلو ورنہ ایمان کی خیر نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انکی کتاب پڑھکر ایمان ہی کھو بیٹھو، اسی لئے ان لوگوں کی کتابوں

کے دیکھنے کو ہمارے علمار منع کرتے ہیں:۔اس وسوسہ کا حملہ مجھ پر ایسا شدید ہوا کہ میں چلتے چلتے رک گیا اور کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ گھر واپس چلوں یا کیا کروں؟ چنانچہ چند قدم واپس ہوا پھر یکایک حق تعالیٰ کی جانب سے رہنمائی ہوئی اور دوسرا خیال معًا یہ آیا کہ اجی ہم جب کالج میں پڑھتے تھے تو اس میں آخر غیر مسلموں اور دیگر مذاہب کی کتابیں پڑھتے ہی تھے تو کسی مذہب کی صرف کتاب پڑھنے سے کیا ہوتا ہے؟ انسان کو اپنے طریقہ میں پختہ ہونا چاہیئے پھر کسی مذہب کا اسپر کوئی اثر نہ ہوگا۔اسطرح سے ان لوگوں کی کتابوں کے پڑھنے میں کیا حرج ہے۔ پھر یہ کہ یہ لوگ اپنی حرکت سے باز آنے والے نہیں ان کتابوں میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھیں گے تو اپنے علمار کی تصدیق ہو جائیگی آخر تو پڑھے لکھے ہیں کچھ جاہل تو ہیں نہیں کہ کچھ سمجھتے بوجھتے نہ ہوں اور کوئی کسی کو جبرًا تو وہابی بناتا نہیں اور نہ کسی پختہ سنی کو وہابی بنانا آسان ہے۔ہاں کم فہم اور کم علم آدمی کے لئے بیشک دوسرے لوگوں کی کتابوں کا دیکھنا مضر ہے باقی کسی پکے شخص پر کیا اثر۔ اور اگر ہمارے علمار اس لئے منع کرتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں حقائق ہیں، کتاب وسنت کی تعلیم ہے، اخلاق اور صدق وامانت اور دیانت کی بحث ہے اسلئے ان کے دیکھنے کے بعد لوگ فورًا رسوم وبدعات سے نکل جائیں گے اگر اسلئے منع کرتے ہیں تب تو یہ صریح مداہنت ہے اور ایک بہت بڑی دینی خیانت ہے۔ کچھ اسی نوع کی باتیں ذہن میں چکر لگانے لگیں۔ اسوقت میری عمر ۲۲ / ۲۳ سال کی تھی، الحمدللہ زمانۂ حال کی آزادی کی ہوا سے محفوظ تھا یعنی الہ آباد صرف حضرت مولانا کی زیارت کے داعیہ سے حاضر ہوا تھا اور ان وساوس کے بعد بھی یہ خیال نہ آیا کہ چلو شہر کی سیر کرکے مکان واپس چلیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو میری ہدایت منظور تھی اسلئے متعدد بار وساوس اور پھر اسکے جوابات کے ذریعہ طبیعت کو یکسو کر دینے کا سامان ہو رہا تھا۔ چنانچہ حضرت والا کی زیارت اور مسجد کے دلکش نورانی منظر کے اثرات جو قلب پر چھا چکے تھے وہی غالب آئے اور اب میں نے قدم خانقاہ شریف کی طرف بڑھایا اور خانقاہ کے قریب ہی ایک کتاب کی دوکان (ادارۂ اشرفیہ) کے قریب

کھڑا ہوگیا۔ کچھ توقف کے بعد دوکان میں داخل ہوا اور مالک دوکان سے جو ایک مولوی شکل کے تھے دریافت کیا کہ جناب مجھے یہ بتائیں کہ کیا حضرت والا نے کچھ کتابیں بھی لکھی ہیں؟ انھوں نے کہا جی ہاں تشریف رکھیئے۔ میں نے کہا ذرا دو ایک کتاب مجھے دکھلائیے۔ چنانچہ یاد ہے کہ انھوں نے تلاوت قرآن ۔ وصیۃ الاحسان اور اعترافِ ذنوب مجھے دی اور میں نے اجمالی طور سے انکا مطالعہ شروع کر دیا۔ ان میں سے میں نے اعترافِ ذنوب کا انتخاب کیا کیونکہ اس میں میں نے اولیاء کرام کا نام جا بجا دیکھا مثلاً حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ۔ مولانا رومؒ۔ امام غزالیؒ۔ شیخ سعدیؒ وغیرہ دوکان سے اس کتاب کو لیکر روشن باغ کے چوراہے پر آیا اور کھڑا دیکھتا رہا کہ مشرع صورت آدمیوں کا ہجوم نماز عصر پڑھنے کے لئے مسجد کی طرف جا رہا ہے۔ دل میں تو آیا عصر کی نماز بھی حضرت ہی کی مسجد میں پڑھی جائے لیکن نفس اور شیطان نے پھر پریشان کیا اور یہ خیال آیا کہ ایسی نماز سے کیا فائدہ کہ جسے پھر دہرانی پڑے یہ سوچکر اپنے ان عزیز کے یہاں چلا آیا اور وہیں نماز عصر پڑھی۔ دعاء میں بہت رویا کہ اے اللہ! تو ہی میری مدد فرما اور میرے حال پر رحم فرما۔ غرض اسوقت پھر میری کیفیت اضطراب کی صورت اختیار کر گئی جسکو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

بہرحال نماز اور دعاء سے فارغ ہوا تو میری ایک عزیزہ نے کہا کہ بھیا! آخر تمھیں کیا تکلیف ہے؟ میں تمھیں بہت پریشان دیکھ رہی ہوں تمھارے چچا دفتر سے آتے ہوں گے کہو تو کسی ڈاکٹر کو دکھلا دوں میں نے ان سے کہ کہا کہ نہیں مجھے کوئی بیماری نہیں ہے اسوقت دین کا نشہ طاری ہے اس سے وہ مطمئن ہوگئیں کیونکہ میرے دینی جذبات سے واقف تھیں۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ آج کی شب یہیں قیام کرونگا۔ تھوڑی دیر بعد سعیدالدین چچا بھی دفتر سے آگئے رات کے وقت ان سے کچھ دینی بات چیت چلی اسی سلسلہ میں حضرت مولانا کا بھی ذکر آیا تو انھوں نے بھی حضرت کی بہت تعریف کی، کہا کہ وہ تو بہت بزرگ آدمی ہیں ان کے ماننے والے بہت ہیں اور رفتہ رفتہ دیکھ رہا ہوں کہ الہ آباد کے لوگ مولانا سے

بہت قریب ہوتے جارہے ہیں اور اس محلہ کے بہت سے لوگ تو مرید بھی ہو گئے ہیں اور باہر سے بھی لوگوں کی آمد و رفت کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ انکی مجلس میں ہر طبقہ کے لوگ جاتے ہیں۔ میں نے اسکے ان سے پوچھا کہ مجلس کا کیا مطلب؟ انھوں نے کہا سب لوگ جمع ہوتے ہیں اور اس میں حضرت مولانا کچھ وعظ بیان فرماتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے کبھی اس میں شرکت کی ہے؟ جواب دیا نہیں۔ میں نے کہا کیوں؟ کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ بزرگ تو ضرور ہیں مگر وہابی ہیں اس لئے میں نہیں گیا اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں انھوں نے کہا کہ تم شاید کوئی کتاب پڑھ رہے تھے میں نے کہا کہ اسوقت تو نہیں پڑھ رہا تھا ہاں عشار کے بعد ایک کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں انھوں نے پوچھا کونسی کتاب ہے۔ میں نے کہا مولانا وصی اللہ صاحب کی کتاب لایا ہوں۔ انھوں نے تعجب سے کہا ارے یہ تم کیا کہہ رہے ہو، تم اور انکی کتاب! میں نے کہا کہ ہاں میں نے خرید لیا ہے تاکہ خود پڑھکر دیکھوں کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان دین کی شان میں کیا کیا کہا ہے کیونکہ اس کتاب میں چند بزرگوں کے نام میری نظر سے گذرے ہیں۔ اس کے بعد ان عزیز سے سلسلۂ گفتگو ختم کرکے میں اپنے بستر پہ گیا اور کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہوگیا۔ اور مطالعہ سے پہلے اللہ تعالیٰ سے یہ دعار کی کہ یا اللہ میں اس کتاب کا مطالعہ تعصب کی عینک سے نکروں بلکہ مجھے غیر جانبدارانہ طور پر خالی الذہن ہوکر خلوص کے ساتھ اسکے پڑھنے کی توفیق عطا فرما۔ چنانچہ یہ دعار کرکے مطالعہ شروع کیا۔ اس کتاب میں حضرت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ صحابۂ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کے علاوہ بہت سے بزرگان دین اور اولیار کرامؒ کے ایسے ایسے واقعات ایسے موثر انداز میں لکھے ہیں کہ سخت سے سخت دل انسان بھی اگر خلوص سے انکو پڑھے تو متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اور اگر دین کی کچھ فہم اور ذوق بھی اسے حاصل ہے تو بغیر روئے رہ نہیں سکتا۔ اس کے مطالعہ سے اس پر گریہ طاری ہو جائے گا اور بڑے سے بڑے متکبر

اور مغرور کا تکبر پاش پاش ہو جائیگا۔ کیونکہ اس کتاب میں حضرتؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ جو شخص جسقدر اللہ تعالیٰ سے قریب ہوتا ہے اسی قدر اسکو اللہ تعالیٰ کی معرفت زیادہ ہوتی ہے اور اپنی معرفت کلی ہوتی ہے اسلئے وہ اللہ تعالیٰ سے بہت ڈرتا ہے اور اسکے عذاب سے لرزاں و ترساں رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہی عبدیت اور بندگی بہت پسند ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں حضرتؒ نے حضور اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر صحابہؓ، تابعینؒ اور اولیائے کرام تک کے واقعات بیان فرمائے ہیں کہ ان حضرات نے کس کس طرح سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں باوجود معصوم و محفوظ ہونے کے عاجزی، فروتنی اور انکساری اور تواضع اختیار کی ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں پڑھنے والے پر یہ اثر ہوتا ہے کہ جب انبیاء کرامؑ اور اولیاء عظام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس طرح سے گریہ وزاری کی ہے رو رو کر دعائیں مانگی ہیں، اسکے روبرو گڑگڑائے ہیں تو ہم گنہگار امتی اس دربار میں کس کیفیت کے تجھوے ہیں ہمیں اللہ تعالےٰ سے کتنا ڈرنا چاہیئے۔

یہاں پہونچکر میں نے یہ بھی سوچا کہ جب حضرت والا کی کتاب کا اتنا اثر پڑھنے والے پر پڑتا ہے تو براہ راست حضرت کی مجالس کی تاثیر کا کیا عالم ہوتا ہوگا کتاب کا ایک ایک واقعہ پڑھتا جاتا تھا اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ایک طرف اللہ تعالےٰ کی عظمت و جلال کا استحضار ہوتا جاتا تھا تو دوسری طرف اپنے کو کچھ نہ سمجھنے کا داعیہ قلب میں راسخ ہوتا جاتا تھا۔ اور جو سچ پوچھئے تو پہلے بہت کچھ مزارات کی سیر کی لیکن اولیاء کرام کی صحیح معرفت اسی کتاب کے مطالعہ کی معرفت ہوئی۔ اب رات بھی کافی جا چکی تھی اور کتاب بھی ختم ہوگئی لہٰذا سو رہا اور بہت سویرے سے ہی میری آنکھ کھل گئی، اٹھ بیٹھا اور شب کی تنہائی میں میری حالت غیر ہونے لگی یعنی ایک بار پھر شیطان سے مناظرہ کرنا پڑا۔ کچھ تو رات کے تاثرات کا اثر قلب پر پڑ چکا تھا لیکن وساوس کی یورش نے اس فیصلہ پر مجبور کر دیا کہ میاں مجالس و لجلس میں کہاں جاؤ گے صبح اٹھکر چلو گھر چلو۔

میں پھر کشمکش میں پڑ گیا بالآخر وہی مجرب نسخہ کہ اضطرار کی حالت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دستگیری فرماتے ہیں یاد آیا اور میں نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے پھر دعا کی کہ اے میرے پروردگار مجھ پر رحم فرما آخر میری یہ باطنی حالت ایک حال پر کیوں قائم نہیں رہتی پارہ کی طرح ادھر ادھر کیوں لڑھک رہی ہے ، میرے مالک مجھے ایک حال پر رکھ اور استقامت نصیب فرما ! اس سے دل کو قدرے سکون ہوا اٹھا اور اٹھکر نماز فجر گھر ہی میں پڑھی اور مجلس کے وقت کے انتظار کی توفیق ہوگئی ۔

الغرض وقت ہوگیا تو میں گھر سے خانقاہ کی طرف چلا چونکہ اس ماحول کے لئے نیا اور اجنبی سا تھا اس لئے روشن باغ کے چوراہے پر آیا اور کھڑا ہوگیا دیکھتا کیا ہوں کہ ہر چہار جانب سے لوگوں کی آمد شروع ہے اور خانقاہ کے اوپر کے حصے پر جا رہے ہیں اور کچھ لوگ جو ادھر ادھر دکانوں پر چار چار پانچ پانچ کی تعداد میں پہلے سے کھڑے تھے وہ بھی اب اوپر کو ایک ایک کر کے جانے لگے ۔ میں نے ایک صاحب سے ہمت کر کے یہ دریافت کیا کہ جناب کیا میں بھی مجلس میں چل سکتا ہوں کوئی رکاوٹ تو نہیں ہے انھوں نے کہا نہیں نہیں آپ شوق سے چلئے اور آئیے میرے ساتھ چلئے چنانچہ میں بھی اوپر چڑھ گیا دیکھا کہ صحن میں بہت سے متشرع صورت کے لوگ، بہت سے مولوی نما حضرات سر جھکائے خاموش بیٹھے ہیں میں بھی سب کے پیچھے خاموشی سے جا کر بیٹھ گیا ۔ تھوڑے وقفہ کے بعد جو میں نے مجمع کیجانب نظر کی تو دیکھا کہ سامنے سہ دری کے اندر (جسپر کھپریل پڑا تھا) ایک گوشہ میں ایک چوکی بچھی ہے اور اس پر پشت کیجانب گاؤ تکیہ اور سامنے ایک چھوٹی سی تپائی جس پر چند کتابیں رکھی ہوئی ہیں اس سے میں نے یہی سمجھا کہ ابھی مولانا شاید اس مجمع میں نہیں تشریف لائے ہیں کمرہ میں ہیں اور آکر اسی مسند پر بیٹھیں گے اسکے بعد میں کیا دیکھتا ہوں کہ کمرہ سے بھی ایک ایک دو دو کر کے چند حضرات

باہر آکر مجلس گاہ میں بیٹھ گئے اور اب سب لوگوں کی نگاہ اسی کمرہ کی جانب لگی تھی جس سے شاید حضرت مولانا تشریف لانے والے تھے یہ بھی دیکھا کہ مجلس کے کچھ لوگ مجھے بھی غور سے دیکھ رہے ہیں اسپر مجھے خیال ہوا کہ یہ لوگ مجھے اجنبی سمجھکر دیکھ رہے ہیں اور یہ دیکھکر تسلی کرلی کہ اور بھی چند حضرات ایسے تھے جنکی ڈاڑھی منڈی ہوئی تھی اور لباس کوٹ و پتلون تھا انکو دیکھکر مجھے اطمینان ہوا اور اب میں مطمئن ہوکر بیٹھا سب اہل مجلس کو ایک ایک کرکے دیکھنے لگا بعض حضرات مجھے اس مجمع میں ایسے نظر آئے جس نے ابتک کے اس خیال کی تردید کردی کہ وہابی کے چہرہ پر نور نہیں ہوتا کیونکہ میں نے ایسی نورانی صورت اپنے سابقہ مجمع میں کبھی نہیں دیکھی تھی بہرحال لوگوں کی اسقدر مہذب اور شائستہ مجلس اور مجلس میں ایسی سنجیدگی سچ کہتا ہوں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی بغرض جملہ سامعین بڑی بیقراری کے ساتھ حضرت مولانا کا انتظار کررہے تھے کہ اسی اثنار میں حضرت والا کمرہ سے کسی صاحب کا ہاتھ پکڑے ہوئے نکلے اور تخت پر آہستہ سے رونق افروز ہوگئے۔ اب اہل مجلس کا رنگ ہی بدل گیا اور میرا تو دل دھک دھک کرنے لگا (راقم عرض کرتا ہے کہ شاید یہ اس لئے رہا ہو کہ ابھی یہ آنا ایمانی نہ تھا بلکہ امتحانی تھا اور یہ آنا آمد نہ تھا بلکہ آورد تھا یعنی خود نہیں آئے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے پیشانی پکڑکر بھیجا تھا اسلئے ابھی قلب میں اعتقاد بھی نہ تھا اور سابق گندگیوں کا اثر تھا ہی اس لئے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں قلعی نہ کھل جائے۔ ایسے ہی موقع کے لئے کہا گیا ہے کہ ؎

پیش اہل دل نگہدار ید دل تا نہ باشی پیش اہل دل خجل

اللہ والوں کے سامنے اپنے دل کی بہت حفاظت کرنا ورنہ اہل دل کے سامنے تم رسوا ہی ہوجاؤ گے۔ چونکہ ابھی عقیدت کامل نہ ہوئی تھی تردد تھا اس لئے یہ الجھن تھی۔ واللہ اعلم)

لیکن میں نے پھر اپنے کو سنبھالا اور خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ جس کی زیارت

کے تم متمنی تھے اللہ نے کرادی۔ یہاں ایک لطیفہ اور سن لیجئے کہ حضرت والا کے تشریف لانے سے پہلے میرے ذہن میں یہ آرہا تھا کہ مولانا جوں ہی کمرہ سے باہر قدم رکھیں گے تو یہ سب مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگ بلند آواز سے نعرۂ تکبیر اللہ اکبر! کہیں گے اور مولانا وصی اللہ صاحب زندہ باد کا نعرہ لگائیں گے اس لئے کہ یہی طرز علماء بریلوی کا میں اب تک دیکھ چکا تھا لیکن شور کو کون کہے خاموشی ہی میں اضافہ ہوگیا اور ہوا یہ کہ ہر شخص حرکت میں آگیا کوئی سنبھل کر بیٹھ رہا ہے کوئی اپنی ٹوپی درست کر رہا ہے کوئی آہستہ آہستہ آگے جگہ پاکر کھسک رہا ہے. کوئی اپنے پھیلے ہوئے دامن کو سمیٹ کر دوسروں کے لئے جگہ بنا رہا ہے کوئی پیچھے سے آکر خالی جگہ پُر کر رہا ہے۔ یہ عمل ایک آدھ سکنڈ میں بس پورا ہو چکا تھا اب سب لوگ ہمہ تن گوش ہوکر بیٹھ گئے میرے دل میں آیا کہ دیکھئے مولانا آخر کیا بیان کرتے ہیں بہت ممکن ہے علماء بریلی ہی پر ہاتھ صاف کریں سوچا کہ اگر ایسا ہوا تو تم کیسے سن سکو گے ادھر مجلس کا رعب اتنا تم پر غالب آچکا ہے کہ تم درمیان سے اٹھکر بھاگ بھی نہ سکو گے میں ان لغویات ہی میں مشغول تھا کہ مولانا تشریف لائے اور مسند پر بیٹھکر مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ نظر مجمع کے ہر فرد پر پڑ رہی تھی اور جس پر پڑتی وہ سرنگوں ہو جاتا تھا۔ یہ میں نے پہلی کرامت دیکھی کہ بڑے سے بڑا شخص بھی حضرتؒ سے نگاہ ملا نہیں سکتا تھا۔ میں حضرتؒ کی طرف بغور دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں حضرت کی نظر فیض اثر مجھ پر پڑی فوراً ہی میری نگاہ نیچی ہوگئی۔ اب میں گردن جھکا کر سوچنے لگا کہ دیکھئے پہلا جملہ زبان مبارک سے کیا نکلتا ہے۔ اتنے میں میرے کانوں نے یہ سنا کہ فرمایا کہ سنو! شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ اپنی کتاب میں صحبت اہل اللہ کی تاثیر کے متعلق فرماتے ہیں۔ عبارت تو یاد نہیں رہی ایسا یاد پڑتا ہے کہ نیک صحبت اختیار کرنے کی ترغیب کا بیان اس میں تھا۔

(۱) احقر ناقل عرض کرتا ہے کہ شاید حضرت والاؒ نے اس موقع پر یہ عبارت

سنائی ہوکہ ـــــ بعد حمد و صلوٰۃ کے فقیر حقیر، اللہ قوی و باری کا یہ نحیف ترین بندہ عبدالحق بن سیف الدین ترک دہلوی بخاری عرض پرداز ہے کہ تمام ان اہل فہم اور ارباب بصیرت کے نزدیک جن کا شمار باخبر اور قابل اعتبار ہستیوں میں کیا جاتا ہے یہ امر محقق اور مسلّم ہے کہ موثر ترین حالات بلکہ افضل ترین عبادات اہل اللہ کی صحبت اور مقربان خدا کی ہمنشینی ہے۔ اسلئے کہ ان کی استقامت اور ان کے ثبات واستقلال کو دیکھکر سالک کے اندر بھی ایک قوت و ہمت پیدا ہوجاتی ہے جسکی وجہ سے عبادت کا تعب اور ریاضت کی مشقت کا برداشت کرنا جوکہ اس طریق پر چلنے کے لئے لازم ہے اسکے لئے آسان ہو جاتا ہے بلکہ ان حضرات کے جمال کے مشاہدے سے اسکے قلب میں ایک نور پیدا ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے شک وشبہات کی تاریکیاں کہ در اصل وہی بعد و حجاب ہوتی ہیں اسکے قلب سے زائل ہوجاتی ہیں۔ انتہی۔

دیکھئے یہاں حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے مصاحبت اہل کمال کو افضل ترین عبادت قرار دیا ہے۔)

پھر حضرتؒ نے شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کا نام اور قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کا نام لیا اور ان کے نام کے بعد رحمۃ اللہ علیہ بھی فرمایا۔ ان کے اقوال بھی صحبت نیک کے فوائد و برکات سے متعلق تھے۔ اس وقت ذہن میں نہیں ہے کہ کیا قول بیان فرمایا تھا۔

(راقم عرض کرتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا شاید یہ کلام نقل فرمایا ہوکہ ـــــ شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل میں ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے فرمایا کہ پانچویں شرط شیخ کے لئے یہ ہے کہ وہ کسی مرشد کامل کی صحبت میں رہا ہو اور ان سے ادب سیکھا ہو۔ زمانہ دراز تک ان سے باطنی نور اور اطمینان حاصل کیا ہو اور یہ یعنی صحبت کاملین اسلئے

شرط ہوئی کہ مراد نہیں ملتی جب تک مراد پانے والوں کو نہ دیکھے جیسے انسان کو علم نہیں حاصل ہوتا مگر اہل علم کی صحبت سے ۔ اور اسی قیاس پر ہیں اور پیشے جیسے آہنگری کہ بدون صحبت آہنگر کے یا نجّاری کہ بدون صحبت نجّار کے نہیں آتی "۔

اسکے تحت حاشیہ میں مترجم لکھتے ہیں کہ :۔ شاہ صاحب نے یہاں یہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت جو جاری ہوئی ہے کہ آدمی مراد کو نہیں پہونچتا بدون مراد پانے والوں کی صحبت کے اسکا راز یہ ہے کہ انسان اسی نہج پر مخلوق ہوا ہے کہ یہ کمال کو حاصل نہیں کرسکتا بغیر اپنے ابنائے جنس کی مشارکت اور اسکی معاونت کے، بخلاف اور حیوانات کے کہ ان کے کمالات پیدائشی ہیں اور کسبی نہایت کمتر۔ چنانچہ تیرنا حیوانات میں پیدائشی کمال اور انسان کو بغیر سیکھے نہیں آتا ۔ (شفاء العلیل ص۲۱)

اور حضرت قاضی صاحب پانی پتی رح کا شاید یہ ارشاد بیان فرمایا ہو کہ تحفۃ السالکین ترجمہ ارشاد الطالبین میں ہے کہ قرب الٰہی کا سبب جذب ہے اور یہ جذب کبھی بلا کسی واسطہ کے ہوتا ہے اسکو اجتبار کہتے ہیں اور اکثر کسی امر کے توسط سے ہوتا ہے اور وہ متوسط حکم استقرار دو چیزیں ہوسکتی ہیں ایک عبادت (اور جو جذب اسکے واسطہ سے ہوتا ہے اسکو ثمرۂ عبادت کہتے ہیں) دوسری انسان کامل کی صحبت (اور جو جذب اسکے توسط سے ہوتا ہے اسکو تاثیر شیخ کہتے ہیں) یہ تاثیر شیخ تاثیر عبادت سے بڑھکر ہے ۔ لہٰذا جو جذب کسی شیخ کامل کے توسط سے ہوتا ہے وہ بڑھا ہوا ہوتا ہے اس جذب سے جوکہ عبادت کے واسطہ سے ہوتا ہے ۔ جیسا کہ فرشتوں کے باب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وما منا الا لہ مقام معلوم یعنی ہم میں سے ہر ایک کے لئے ایک معین مقام ہے ۔ اور شیخ سے جو جذب ملتا ہے وہ ترقی پر ترقی دیتا ہے

یہاں تک کہ شیخ کے مقام تک پہونچا سکتا ہے)
غرض تمام علماء و مشائخ کا نام حضرت بہت احترام سے لیتے تھے اور ہر ایک کے نام کے بعد رحمۃ اللہ علیہ یا قدس سرہٗ ضرور فرماتے تھے اسی اثناء میں خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی آیا ان کے نام نامی کو حضرت کی زبان سے سنکر یقین جانیے کہ میں چونک پڑا اور غور کرنے لگا کہ دیکھو ان کے بارے میں کیا فرماتے ہیں ؟ لیکن حضرتؒ نے انکی جو بات نقل فرمائی وہ آجتک یاد ہے۔ فرمایا کہ حضرت اجمیری رح فرماتے ہیں کہ "اچھی صحبت اچھے عمل سے بہتر ہے اور بری صحبت برے عمل سے بھی بدتر ہے" اور اسکے بعد حضرت نے مولانا رومؒ کا ایک شعر پڑھا جس کو میں بریلوی مولوی صاحبان کی زبان سے بھی سن چکا تھا وہ شعر یہ تھا کہ ؎

یک زمانہ صحبتے با اولیا — بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

(تھوڑے عرصہ تک اولیاء اللہ کی صحبت سو سال کی طاعت بے ریا سے بڑھکر ہے)
اس شعر کو پڑھکر حضرت نے پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب کے سر پر ہاتھ رکھکر فرمایا کہ اس شعر کیطرف حضرات علماء کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جس کو لوگ پڑھ پڑھکر وعظ کی محفل کو تو خوب گرماتے ہیں لیکن اسکا مطلب شاید ہی کوئی سمجھتا ہو۔ میں نے جب یہ سنا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس مجمع میں ماشاء اللہ علماء بھی موجود ہیں جب ہی تو حضرت انکو مخاطب فرمارہے ہیں اسلئے حضرت کی ایک خاص عظمت قلب میں بیٹھ گئی کہ حضرت بزرگ ہونے کیساتھ ساتھ زبردست عالم بھی ہیں اور حدیث شریف میں جو آتا ہے کہ عالم اپنی قوم میں ایسا ہوتا ہے جیسے نبی اپنی امت میں ہوتا ہے تو اسکا مطلب حضرت کی بارعب مجلس ہی کو دیکھکر سمجھ میں آیا۔ کیسی باوقار اور کیسی مہذب و شائستہ اور کسقدر نورانی مجلس اور تقریر تھی کہ سبحان اللہ نہ کسی کو برا بھلا کہا جارہا تھا نہ گالی گلوج کا انداز تھا سیدھے سادے طور پر ایک نہایت اہم بات اور ضروری مسئلہ جو دین میں اساس کی حیثیت رکھتا ہے یعنی صحبت نیک کی ضرورت اور اسکے فوائد پر مدلل کلام فرمایا جارہا تھا اور ساری مجلس دم بخود تھی کیا عوام اور کیا خواص یعنی علماء۔ سمجھ میں آیا کہ ایک عالم ربانی اور شیخ حقانی

کی یہی شان ہوا کرتی ہے۔ اور جب سامعین کے قلوب میں کسی کی اتنی عظمت ہوتی ہے جب ہی اس سے فائدہ اور فیض بھی پہونچتا ہے۔ اس موقع پر مجھے مولانا رومؒ کا ایک شعر یاد آگیا۔ فرمایا ہے کہ ؎

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم　　تا غلام شمس تبریزی نہ شد

کیونکہ علماء کو اس مجلس میں حضرت کا مطیع و منقاد دیکھکر مولانا روم کا خود کو حضرت شمس تبریز کا غلام کہنے کا مطلب سمجھ میں آگیا اور اسکا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور مجھے احساس ہوا کہ واقعی جو بزرگ کہ نائب رسول کہلانے کے مستحق ہوا کرتے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جیسے حضرت مولانا۔ اور صحیح معنوں میں جو لوگ صوفی کہے جانے کے مستحق ہیں وہ یہی لوگ ہیں واقعی انھیں لوگوں کو صوفی کہنا زیب دیتا ہے اور ابتک جو تم نے پیری مریدی کا ماحول دیکھا وہ تو اس مبارک جماعت کی نقالی اور طریق کی ایک تفریح تھی، جہاں پیر اور مرید دونوں آزاد ایک طرف پیری و مریدی تھی اور دوسری طرف نماز تک غائب اور معاً بعض بدعتی پیر ذہن میں آگئے جو یہ راگ الاپتے ہیں کہ ہماری نماز تو پیر کی محبت ہے توبہ توبہ۔ حضرات صحابہ کرامؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر واقعی دل و جان سے فدا تھے انھوں نے کبھی ایسی بات زبان سے نہیں نکالی کہ ہماری نماز تو رسولؐ کی محبت ہے اور بس۔ اور آج بدعت کی نئی شریعت میں لوگ اسکے کہنے سے بھی باک نہیں رکھتے۔ اس سلسلہ میں خود اپنی آنکھوں دیکھا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے اندازہ لگائیے کہ یہ بدعت لوگوں کو کس طرح دین سے دور کر دیتی ہے۔ ایک جگہ قوالی ہو رہی تھی ایک خوش الحان قوال کوئی شعر گا رہا تھا اتنے میں مغرب کی اذان ہوگئی ایک صاحب نے کہا کہ مغرب کی اذان ہو رہی ہے لہٰذا اب یہیں اسی جگہ نماز پڑھ لی جائے یہ سنکر ایک شاہ صاحب نے قوال سے کہا تم اپنی قوالی جاری رکھو ہماری نماز یہی ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ انکا یہ جملہ سنکر عوام کو بھی برا لگا کیونکہ لوگوں میں بے عملی آگئی ہے لیکن الحمد للہ بداعتقادی نہیں آئی ہے اور یہ موجودہ بدعت تو لوگوں کو بداعتقاد بنا دیتی ہے۔

بہر حال حضرت کے یہاں حاضری سے مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی خانقاہ جسکا نام ہے وہ اسی اور اسی طرح کی جگہوں کا نام ہے جہاں اصلاح و تربیت اور اور روحانی امراض کا علاج اور تزکیۂ نفس کرایا جاتا ہے۔

اور میں اپنی ان ہدایات کو بھی حضرت والا ہی کا فیض، برکت بلکہ کرامت سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے پہلے کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حضرت اقدس سے مجھے اتنی عقیدت، اتنی محبت اور حضرت کی ایسی عظمت میرے قلب میں ہو جائیگی اور بلاشبہ یہ حضرت والا کی للّٰہیت ہی کا ثمرہ تھا کہ ایک میں کیا نہ جانے کتنے گمراہ لوگوں نے حضرت کے توسل سے صراط مستقیم پایا۔

غرض تھوڑی دیر کے بعد (یعنی تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہ کر) مجلس ختم ہو گئی لیکن اسکے بعد بھی سب لوگ گردن جھکائے (جیسے کسی گہری سوچ میں ہوں) بیٹھے ہی رہے۔ شاید یہ بات ہو کہ یہ حضرات ابھی بیان کی ہوئی حضرت کی باتوں کو اپنے حالات پر منطبق کر رہے تھے، اور سب لوگ گویا اپنے گریبان میں منہ ڈالکر یہ غور کر رہے تھے کہ افسوس ہمکو کیا ہونا چاہیئے اور ہم کیسے ہیں یا جو بھی وجہ ہو مجھے انکی یہ ادا بہت پسند آئی پھر تھوڑے ہی وقفہ کے بعد ایک صاحب آئے اور حضرت سے مصافحہ کرکے رخصت ہوئے پھر دوسرے اٹھے پھر تیسرے اسی طرح سے ایک ایک کرکے لوگ اٹھتے رہے اور مصافحہ کرکے جاتے رہے۔ واپسی میں اور ختم مجلس میں شور اور ہلڑ نہیں تھا بلکہ نہایت ادب و وقار کے ساتھ آہستہ آہستہ ایک ایک کرکے لوگ اٹھے، یہ منظر بھی دل پر اپنا نقش جما گیا۔ اتنے میں میں نے ایک صوفی صاحب کو جو کہ مجلس سماع میں رقص کرتے تھے انکو بھی یہاں دیکھا ان سے آہستہ سے پوچھا کہ آپ یہاں کہاں؟ انھوں نے جواب دیا کہ پھر کیا ہوا! یہ کہکر چلدیئے۔ جب مجمع کم ہوا تو میں بھی مصافحہ کیلئے بڑھا حضرت نے مجھے آتے دیکھا تو فوراً ہاتھ بڑھا دیا میں نے مصافحہ کیا تو مجھ پر رعشہ طاری تھا پیر کی پنڈلیاں تھرتھرا رہی تھیں وہاں سے آکر ایک دوسرے کمرے میں بیٹھ گیا اور مڑکر دیکھا تو حضرت مسند پر سے اپنے کمرے میں جاچکے تھے۔

ہم یہ بیان کر رہے تھے کہ الہ آباد کے قیام میں اگر ایک جانب مخالفین کی مخالفت چل رہی تھی تو دوسری جانب اللہ تعالیٰ کی جانب سے عجیب عجیب طرح سے نصرت بھی ہو رہی تھی اس سلسلہ کے جزئی واقعات تو بہت ہیں ہم نے صرف ایک عامی کا حال آپ کے سامنے انھیں کی زبان میں پیش کیا دیکھئے کتنا زیادہ انہماک رسوم و بدعات میں انھیں تھا لیکن حضرت اقدس کی تشریف آوری پر اللہ تعالےٰ نے کس کس طرح سے انکی ہدایت کا انتظام فرمایا بھائی انیس صاحب کی اس آپ بیتی میں ہمارے لئے یہ سبق موجود ہے کہ نفس اور شیطان۔ انسان کے احباب ۔ اسکا خاندان اور دنیوی ماحول کس طرح سے اسکو اپنی بندش میں لئے رہتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت نہو تو انسان کا ان بندشوں سے نکلنا بڑا ہی مشکل ہے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ان سے نجات کا طریقہ صرف تضرع و زاری بجناب باری ہی ہے۔ اگر کسی کو اسکی توفیق ہو جائے تو پھر حسب وعدۂ الٰہی وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا اللہ تعالیٰ اسکی ضرور ہی دستگیری فرماتے ہیں۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جب بھائی انیس صاحب کو اسکی توفیق ہو گئی تو پھر لیلائے مقصود نے بھی رونمائی کی یعنی حضرت والا کی نہ صرف زیارت ہی سے وہ بہرہ ور ہوئے بلکہ حضرتؒ کی توجہ اور دعاؤں کے بھی مورد بنے اور بیعت کا شرف بھی حاصل ہو گیا۔ پھر اسکے بعد انھوں نے اپنے احباب میں حضرتؒ کی تعلیمات کا چرچا کیا اور گاؤں کے لوگوں کو بھی مسلک حق کی جانب دعوت دی۔ چنانچہ بہت لوگوں کو ان سے نفع پہونچا۔

دوسرا واقعہ نصرت کا براہ راست حضرت کی ذات سے متعلق تو نہ تھا لیکن حضرت کے شیخ حضرت حکیم الامۃؒ سے متعلق تھا اسلئے اسکا اثر ظاہر ہے کہ خود حضرت پر پڑا اور حضرتؒ کے مسلک پر بھی پڑا اور میری مراد اس سے شاہ عبدالمعبود صاحب کی نصرت ہے مجھسے خود جناب شاہ صاحب کے کسی عزیز قریب نے ایک دن یہ بتلایا کہ رات کو ایک نہایت اہم واقعہ ہو گیا وہ یہ کہ ہمارے محلہ میں میلاد

کے نام سے سالانہ جلسے ہوا کرتے ہیں؟ امسال بھی ہو رہے تھے میاں (یعنی شاہ عبدالمعبود صاحب) چونکہ حضرت مولانا کیخدمت میں اکثر آتے رہتے ہیں یہ بات دوسری جماعت کو نہایت شاق گذرتی تھی اسلئے امسال محلہ کے جلسے میں بھی تقریباً روزانہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا نام لیا جاتا تھا اور برا بھلا کہا جاتا تھا۔ آخری دن ایک مولوی صاحب نے اسٹیج پر آتے ہی زہر اگلنا شروع کردیا۔ میاں کی طبیعت خراب تھی دائرے والے مکان میں لیٹے ہوئے تھے لاؤڈ اسپیکر کا رخ بھی اسی جانب تھا اسلئے صاف آواز آرہی تھی۔ نیند تو نہ آسکی تھوڑی دیر تک تو میاں لیٹے لیٹے سنتے رہے بالآخر چھڑی ٹیکتے ٹیکتے جلسہ گاہ میں پہونچے لوگوں نے دور سے دیکھا کہ میاں آرہے ہیں تو کرسی کا انتظام کیا سمجھے کہ شاید تقریر سننے آرہے ہیں اور کرسی کو مجمع کے آخر میں لاکر رکھدیا میاں آئے تو یہ فرمایا کہ کرسی وہاں اسٹیج کے قریب بچھاؤ لوگوں نے تعمیل حکم کیا اور کرسی اسٹیج کے قریب ہی بچھادی گئی اسپر تشریف رکھکر فرمایا کہ لائیے ذرا مائیک مجھے دیجئے روزانہ کی تقریر گھر ہی سے سنتا رہتا تھا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ شاید کچھ لوگوں کو اسپر ناگواری ہے کہ میں نے بارش کے موسم میں جلسہ کی اجازت اپنی خانقاہ میں کیوں نہیں دی اسی وہم کے پیش نظر مولانا تھانویؒ کے ساتھ ساتھ اشارۃً وکنایۃً مجھے بھی کہا سنا جا رہا تھا تو میں قریب اس لئے آگیا ہوں کہ میرے اوپر آپ کے مقرر صاحب کو فتویٰ لگانے میں آسانی ہو یہ کہکر مائیک پھر مقرر صاحب کیطرف بڑھا دیا کہ ہاں لیجئے اور اب فرمائیے آپ کیا فرماتے ہیں ان مولوی صاحب نے شاہ صاحب سے کہا کہ آپ سے میں صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ اشرف علی کو مسلمان سمجھتے ہیں؟ شاہ صاحب نے فرمایا کہ مسلمان! یہ تو آپ نے بہت معمولی سی بات کہی میں تو انھیں نہ صرف مسلمان بلکہ عالم دین۔ فقیہ زمانہ۔ اور اپنے وقت کا غوث و قطب بلکہ مجدد سمجھتا ہوں اس پر وہ مولوی صاحب خفا ہوکر اور یہ کہکر اسٹیج سے اتر کر چلے گئے کہ پھر میں

آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا اور جلسہ میں ایک شور و ہنگامہ مچ گیا اور سب لوگ منتشر ہوگئے جلسہ ختم ہوگیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ معاملہ صرف معمولی شور و شغب کے بعد ختم ہوگیا کوئی فساد نہیں ہوا" انتہی۔

شب کے اس واقعہ کی اطلاع حضرت والا کو بھی ہوئی حضرت پر بیحد اثر ہوا۔ راقم کے ذریعہ حافظ یٰسین صاحب اور راقم کے والد مولوی سراج الحق صاحبؒ کو بلوایا اور ایک پیغام شاہ عبدالمعبود صاحبؒ کے پاس بھیجا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پیغام کے بیان سے پہلے کچھ مختصر تعارف شاہ عبدالمعبود صاحب کا بھی کردوں تاکہ ناظرین کو واقعہ علی وجہ البصیرت ذہن نشین ہو سکے۔

شاہ عبدالمعبود صاحب سجادہ نشین ہونے سے پہلے مجیدیہ اسلامیہ کالج الہ آباد میں ٹیچر تھے ان کے ماموں حافظ محمد یٰسین صاحب مدظلہ حضرت تھانویؒ سے بیعت تھے اور حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ کے مخصوص خدام میں تھے حافظ صاحب کے ہمراہ شاہ عبدالمعبود صاحب بھی تھانہ بھون تشریف لیجاتے تھے اور حضرت حکیم الامۃؒ سے بیعت بھی ہوگئے تھے تھانہ بھون میں آمد و رفت کے سلسلہ میں ہمارے حضرت مصلح الامۃؒ سے بھی شاہ صاحب کی اچھی خاصی ملاقات تھی یہاں الہ آباد میں دائرہ حضرت شاہ محمدی میں (جو دائرہ شاہ غلام علیؒ کے نام سے بھی مشہور ہے) حضرت محمدی شاہ صاحبؒ کے بعد شاہ عبدالمعبود صاحب کے بڑے والد جناب شاہ عبدالشکور صاحبؒ صاحب سجادہ ہوئے پھر ان کے بعد شاہ عبدالمعبود صاحب کے والد صاحب گدی نشین ہوئے۔ اب تک شاہ عبدالمعبود صاحب اس مسلک سے دور بلکہ نفور تھے۔ تھانہ بھون کی آمد و رفت جاری رہی اسکول میں ماسٹر تھے راقم کے والد مولوی سراج الحق صاحبؒ سے بڑی گہری دوستی تھی شاہ صاحب نے مزاج چونکہ مرنج و مرنجان کا پایا تھا اور بڑے ظریف

اور خوش نذاق شخص تھے والد صاحب کے ہمراہ اصغر گونڈویؒ کے یہاں بھی اکثر حاضری رہا کرتی تھی۔ حضرت تھانویؒ کے وصال کے بعد مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ کی تربیت میں بھی یہ دونوں حضرات ساتھ ساتھ رہے چنانچہ جب مولانا عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ علیل ہوئے تو زمانۂ علالت شاہ عبدالمعبود صاحب کے مکان ہی میں جو نور اللہ روڈ کے قریب ہے گذارا اور اسمیں شک نہیں کہ شاہ عبدالمعبود صاحب نے حق تیمار داری اور حق خدمت ادا ہی کر دیا پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد مولانا عیسیٰ صاحبؒ علاج کیلئے جون پور ڈاکٹر عبدالحی صاحب مدظلہ کے یہاں تشریف لے گئے وقت موعود آپہونچا تھا وہیں اس دنیا سے سفر ما گئے اور محلہ کی مسجد کی پشت پر امام کی محراب سے متصل دفن ہوئے۔ واقعی شیخ کی موجودگی بھی خدا کی رحمت ہوتی ہے اور اسکا سایہ اٹھ جانا گویا تاریکی میں انسان کو ڈالدیتا ہے یہی یہاں ہوا کہ حضرت تھانویؒ کے وصال کے بعد جب مولانا عیسیٰؒ صاحب نہ رہ گئے تو ان حضرات پر سے اصلاحی گرفت ختم ہوگئی ادھر یہ سانحہ در پیش آگیا کہ شاہ صاحب کے والد شاہ عبدالرؤف صاحب بھی بیمار ہوئے اور انکی حالت دن بہ دن گرتی ہی گئی لہٰذا یہ مسئلہ سامنے آیا کہ آپ کے بعد آپ کا جانشین کون ہوگا؟ شاہ عبدالمعبود صاحب دل سے ان رسوم کے قائل تو نہ تھے جو آجکل کے پیروں کے یہاں رائج ہیں تاہم بعض حالات ایسے سامنے آئے کہ جانشین بنا دیئے گئے اور شاہ صاحب انکار نہ کر سکے۔ ادھر شاہ عبدالرؤف صاحب کا انتقال ہوگیا تو شاہ عبدالمعبود صاحب لوگوں کی جن رسوم پر ابتک ہنستے تھے اب ان تمام امور کو خود انجام دینا پڑ گیا۔ خاندانی جانشین اور یہ کہ پیر کا لڑکا ہی پیر ہوگا یہ کسقدر غلط اصول تھا کہ اہل ہو یا نہ ہو بہر حال لڑکے کے لئے باپ کی گدی پر بیٹھنا لازم تھا یہ طریقہ بھی اختیار کرنا پڑا قوالی اور دیگر رسوم میں شرکت بھی ناگزیر سی ہوگئی۔ حالات سے مجبور ہو کر

سب کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا تھانویؒ کے مسلک سے تعلق رکھنے والوں
کو بڑی ندامت اٹھانی پڑی اور ہر وقت کی شماتت اعدار برداشت کرنی
پڑی یعنی لوگ طعنے دینے لگے کہ دیکھئے شاہ صاحب تو آپ ہی کے سلسلہ
کے آدمی تھے اور مولانا تھانویؒ کے مرید تھے بالآخر انکو بھی اِدھر ہی آنا پڑا
اسکا اثر یہ ہوا کہ شاہ عبدالمعبود صاحبؒ گویا اپنی جماعت سے کٹ سے گئے
اور ہم لوگوں کا باہم ملنا جلنا بھی ختم سا ہوگیا۔ والد صاحبؒ یا شاہ صاحبؒ
کے اور دوسرے احباب مثلاً محمد احمد صاحب ٹیلر ماسٹر۔ پروفیسر محمد احمد
صاحب صدیقی۔ شاکر حسین خانصاحب ۔ ماسٹر محمد ابراہیم صاحب۔ سید
حسن صاحب کمشنر وغیرہ جو کہ نہایت ہی بے تکلف دوستوں میں سے تھے
اور حافظ یسین صاحب جو شاہ صاحب کے حقیقی ماموں تھے ان سب سے
تعلق ختم سا ہوگیا بس کہیں راستہ میں شاہ صاحب مل جاتے تو سلام و
دعا رہو جاتی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی حالات تھے کہ اسی دور میں حضرت
مصلح الامۃؒ کا ورود الہ آباد میں ہوا پھر حضرتؒ نے بخشی بازار میں مکان خرید لیا
تو حضرت والاؒ کا مکان شاہ صاحب کے اپنے آبائی مکان اور دائرہ شاہ محمدی
کے درمیان میں پڑتا تھا اسلئے کبھی کبھی شاہ صاحب حضرت مولاناؒ سے ملنے
بھی آجاتے تھے لیکن ہمارے حضرت والاؒ نے کبھی ان کے اس تبدیلیٔ مشرب
کے متعلق ایک لفظ ان سے نہیں فرمایا بس خیر خیریت جانبین سے دریافت
ہوتی اور مختصر سا قیام کر کے شاہ صاحب واپس تشریف لیجاتے مگر اسطرح
سے بھی آتے جاتے رہنے سے انکا حجاب کم ہوا اور حضرت تھانویؒ کا اور
زمانۂ قیام تھانہ بھون کے سابق واقعات کا چرچا حضرت سے ملاقات کی مجلس
میں رہتا اور یہ مجلس کچھ دیر دیر تک رہنے لگی یہاں تک کہ ایک دن شاہ صاحب
نے حضرت والاؒ سے عرض کیا کہ حضرت کی عام مجلس میں بھی آنے کو بہت
جی چاہتا ہے لیکن طبیعت خراب رہتی ہے دیر تک بیٹھ نہیں سکتا اس لئے

حضرت کوئی وقت مقرر فرمادیں تو اسوقت حاضر ہو جایا کروں گا۔ چنانچہ بعد عصر اکثر شاہ صاحب تشریف لانے لگے حضرت نے اتنا فرمایا کہ آپ کے مجھ سے اس طرح سے ملنے سے آپ کے لوگ تو کچھ خفا نہ ہو جائیں گے شاہ صاحب نے فرمایا کہ نہیں حضرت بالکل نہیں یہ سلسلہ پیری مریدی کا ایسا ہے کہ جو پیر کا مسلک ہوتا ہے وہی مرید کا مسلک ہوتا ہے۔ حضرت والا یہ سنکر مسکرائے۔ بہرحال شاہ صاحب اس طرح سے برابر آتے رہے اور اب ان کے اس اقدام کا حضرتؒ کے لوگوں پر اثر پڑا کہ انکو بھی شاہ صاحب کی جانب سے انشراح ہونے لگا اور باہم ملاقات اب کچھ قلبی مسرت کے ساتھ ہونے لگی۔

شاہ صاحب مستقل بیمار ہی رہتے تھے اور روز بروز کمزور ہونے لگے بس یہی وہ زمانہ تھا کہ ان کے محلہ میں وہ جلسہ ہوا جس کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں اور وہ واقعہ پیش آیا جسکی اطلاع ہونے پر حضرتؒ متاثر ہوئے اور حافظ یسین صاحب مدظلہ، کو اور والد صاحب مولوی سراج الحق صاحبؒ کو بلوایا اور ان لوگوں سے فرمایا کہ آپ لوگ ہمارا ایک کام کر دیں گے؟ دونوں حضرات نے عرض کیا کہ حضرت کے حکم کی تعمیل کو ہم اپنی سعادت تصور کریں گے۔ فرمایا کہ عبدالمعبود کے یہاں جانا ہے ـــ اور حافظ یسین صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ تو شاید ان سے ملتے بھی نہیں پھر کیسے جائیں گے؟ حافظ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت کا حکم ہوگا تو وہاں بھی چلا جاؤں گا۔ فرمایا کہ ہاں ٹھیک ہے آپ دونوں حضرات شاہ صاحب کے پاس جائیے انسے میرا سلام کہیئے اور یہ کہیئے کہ گزشتہ شب آپ کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا مجھے اسکی کچھ اطلاع ملی ـــ " اس بنا پر آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کے اس واقعہ نے ہم سب کی گردن نیچی کر دی کہ ہم لوگ تو ناحق تھانوی ہونے کا دم بھرتے ہیں تھانوی تو در اصل آپ ہیں کہ رات حضرت مولاناؒ (تھانویؒ) پر آپ نے اسپنے کو قربان ہی کر دیا تھا کیونکہ نفسانیت کا زمانہ ہے اگر بات اور بڑھ جاتی

اور لاٹھی ڈنڈے چھری چاقو کی نوبت آجاتی تو کیا حشر ہوتا۔ وہ تو اللہ تعالےٰ نے فضل فرما دیا کہ سلسلہ آگے نہیں بڑھا لیکن آپ نے تو حضرت مولانا رح کی نصرت ایسے عنوان سے فرمائی کہ ہم نے کسی دیوبندی کو تو دیکھا نہیں کہ اسطرح سے پیش آیا ہو اس لئے ہم آپ سے شرمندہ ہیں۔ اور آپ کے اطمینان کیلئے آپ کو اس بات کی بشارت دیتے ہیں کہ آپ تھانہ بھون سے محروم نہیں آئے آپ کو وہاں سے کچھ ملا ہے یعنی کوئی دولت ملی ہے اور اسی کا یہ اثر تھا کہ آپ سے حضرت تھانوی کی شان میں بے ادبی اور گستاخی برداشت نہ ہو سکی اس لئے کہتا ہوں کہ آپ انشاء اللہ حشر کے دن حضرت مولانا تھانوی رح ہی کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے" ___ (جس وقت ان کلمات کو اپنی زبان مبارک سے حضرت ادا فرما رہے تھے تو آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں اور انتہائی تاثر کے ساتھ یہ پیغام ارشاد فرمایا) ___ ان دونوں حضرات نے عرض کیا کہ حضرت ابھی عبدالمعبود کے پاس جاتا ہوں اور حضرت کا یہ پیغام سناتا ہوں اور آکر حضرت کو جواب دیتا ہوں۔

راقم عرض کرتا ہے کہ باب اصلاح کی یہی وہ نزاکتیں تھیں جنکی رعایت کرنے پر اہلِ نفس قادر ہی نہیں ہو سکتے۔ اور ہمارے حضرت اس میدان کے شہسوار تھے۔ شاہ عبدالمعبود صاحب رح کی اس تبدیلی کی اصلاح کسی کے بس کی بات نہ تھی اور لوگ صرف اتنا ہی کر سکے کہ ان سے اپنا تعلق ختم کر لیا اور ہمارے حضرت مصلح الامۃ رح کو دیکھئے کہ بدعت اور رسوم کی شناعت اور قباحت کو ان سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا تاہم اپنے اخوانِ طریقت کی اس لغزش پر کتنا صبر و ضبط سے کام لیا اور بالآخر اس زلت سے گرے ہوئے پر کس طرح سے رحم اور شفقت کا معاملہ فرمایا اور کس طرح سے اِس سے اُس کو نکالنے کی سعی فرمائی یعنی ایک بھائی سے چوک اور لغزش ہو گئی تو اسکو چھوڑ نہیں دیا اور رشتۂ اخوت کو توڑ نہیں دیا بلکہ حضرت تھانوی رح سے اسکا رشتہ بالآخر

اس طرح سے جوڑ ہی دیا تاکہ آج بھی وہ یہ سمجھیں کہ بعض کوتاہیوں میں مبتلا ہونے سے ہم حضرت تھانویؒ کے سلسلہ سے نکلے نہیں بلکہ اب بھی اس سے واصل ہیں۔
اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے کہ ؎

نشا پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

غرض دونوں حضرات شاہ عبدالمعبود صاحب کے پاس گئے حضرت کا پیام پہونچایا شاہ صاحب نے بھی قلب بریاں سے نکلی ہوئی بات کو دل گریاں سے سنا اور تاثر کے ساتھ سنا۔ لوگ کہتے تھے کہ عبدالمعبود صاحب آنکھوں سے تو نہیں روئے لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ دل انکا بھی رو رہا ہے ؎

الفت کا جب مزا ہے کہ دونوں ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

حضرت والاؒ بھی تھانہ بھون کی ملاقات کی بنا پر شاہ عبدالمعبود صاحب کو اولاد کی مانند چاہتے تھے اور شاہ صاحب بھی حضرت والاؒ کی شفقت اور رافت کو ملاحظہ فرمانے کے بعد یہ سمجھے ہوں گے کہ ابھی ہمارے سر کے اوپر ہاتھ رکھنے والے موجود ہیں۔ سبحان اللہ۔

الغرض میں یہ عرض کر رہا تھا کہ الہ آباد میں مخالفین کیطرف سے مخالفت بھی ہوتی رہی لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے ایسے لوگوں سے اس اس طرح سے حضرتؒ کی اور حضرت والا کے مشن کی نصرت فرمائی کہ لوگ متحیر ہی تو رہ گئے چنانچہ بھائی انیس صاحب اور شاہ عبدالمعبود صاحب کے واقعات سے آپ نے اندازہ فرمالیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ انیس صاحب کو خلوص واستقامت نصیب فرمائے اور شاہ صاحب مرحوم کی مغفرت فرمائے اور آخرت میں مزید درجے بلند فرمائے ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضرتؒ والا اب الہ آباد میں ہیں اور اپنا مستقل ذاتی مکان بھی الحمد للہ ہو گیا ہے ایک طرف اہل الہ آباد میں سے بہت سے لوگوں کو حضرتؒ کی آمد کی خوشی اور مسرت ہے تو دوسری جانب بعض لوگوں کو پریشانی اور ناگواری ہے چنانچہ مخالفین کی مخالفت اور موافقین کی نصرت کے بعض واقعات ہم گذشتہ سطور میں پیش کر چکے ہیں اب ناظرین اپنے ذہن میں یہ بھی رکھیں کہ حضرت سے لوگوں کے تعلقات کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اعظم گڈھ میں — فتحپور، کوپا گنج، گھوسی، مئو، کاریساتھ اور ندوہ سرائے وغیرہ کے حضرات سے تو حضرت والا کا دیرینہ ہی تعلق تھا۔ پھر گورکھپور جانے کی وجہ سے اہل گورکھپو سے خصوصی تعلقات ہوئے اسلئے الہ آباد آنے کے بعد ان حضرات کے بھی خطوط برابر آتے رہے جسکی وجہ سے ہر جگہ کے معاملات کی یاد تازہ ہوتی رہی۔ وطن کے لوگوں کا فتنہ کرنا اور ایسا فتنہ جسکی وجہ سے حضرت نے وطن ہی کو خیر باد کہدیا اسکا سارا نقشہ اہل وطن کے خطوط سے یاد آجاتا تھا اور اہل گورکھپور کی مکاتبت کی وجہ سے وہاں کے اہل شہر کی انتہائی نازیبا حرکت جس نے اُسوقت حضرت کو ترک شہر پر نہ سہی ترک جائے قیام پر تو مجبور ہی کر دیا تھا اور حضرت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو گئے تھے اور الہ آباد جب حضرت تشریف لائے تو یہاں بھی جب لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو اسکا مصداق پایا کہ ؎

بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیدا ست

چنانچہ اب حضرت والا کے سامنے خصوصی طور سے تین شہروں کے معاملات تھے وطن کے، گورکھپور کے اور خود اہل الہ آباد کے

وطن کے معاملات کا حاصل یہ تھا کہ کسی کے خط میں حضرتؒ کی جدائی اور ترک وطن کے انتہائی صدمہ کا اظہار ہوتا اور وہ رو رو کر اپنی کوتاہی کی معافی کا طلبگار ہوتا۔ کسی کے خط میں سفارش ہوتی کہ فساد کا اصل مجرم میرے واسطے سے آپ سے معافی مانگنے الہ آباد آنا چاہتا ہے۔ کوئی یہ لکھتا ہے کہ اب ہم لوگوں کو آپکے

یہاں سے چلے جانے کے بعد اپنے نقصان کا علم اور اندازہ ہوا اور آپ سے دینی فیض نہ حاصل کرنے پر قلق ہوا۔ اب ہم اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے ہیں اور اپنی حالت کے سدھارنے کا آپ سے وعدہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں کا ہر ہر مضمون حضرت والا کے غیظ و غضب میں تحریک ہی پیدا کرنے والا تھا اسلئے حضرتؒ نے اسی انداز کے سب کو جوابات بھی دیئے۔

اہل گورکھپور کا جرم تو وہیں کے دوسری جگہ قیام کے زمانہ میں ہی معاف اور صاف ہو چکا تھا تاہم علالت کے بعد جب حضرت الہ آباد تشریف لے آئے تو جیسا کہ کہا گیا ہے کہ "قدر مردم بعد مردن و قدر نعمت بعد زوال" یعنی نعمت کی قدر اسکے زائل ہو جانے کے بعد ہوا کرتی ہے۔ اسی اصل کے ماتحت گورکھپور کے بھی خطوط آنے لگے کہ صحت کے بعد ایک دفعہ پھر گورکھپور تشریف ارزانی فرمائی جائے۔ کسی نے اپنے تاثر اور تاسف کو ایسا ظاہر کیا جو کہ اس شعر کا گویا مصداق تھا کہ ؎

بے رونقی، جمود و تعطل، سکوت مرگ
ایسا ہے کائنات کا نقشہ ترے بغیر

ظاہر ہے کہ اسکی وجہ سے بھی حضرتؒ کے سامنے گورکھپور کے زمانۂ قیام کے تمام ہی واقعات یاد آکر حضرت کے نشاط و کیف میں اثر انداز ہو کر اسکو مکدر کر دیتے تھے چنانچہ ان حضرات کو بھی اسی کے مطابق جواب مرحمت فرمائے۔

اور الہ آباد میں مخالفین کی مخالفت کی تو حضرتؒ کو ذرہ برابر پرواہ نہ تھی اسکے متعلق تو یہی فرماتے تھے کہ مخالفین کا ہونا اور مخالفت کا کیا جانا یہ ایک خدائی نظم ہے اسی کی وجہ سے اہل اخلاص ممتاز ہوا کرتے ہیں اور انکو خدا کے یہاں سے نمبر ملتا ہے اور یہی وہ خدائی دستور ہے جس پر تمام انبیاء کو چلایا گیا ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن بنائے شیاطین جن میں سے

بھی اور شیاطین انس میں سے بھی. فرماتے تھے کہ رنج ان لوگوں کے معاملات سے ہوتا ہے جو احباب میں داخل ہیں اور ہماری بات اور تعلیمات پر عمل نہیں کرتے نص کو اپنا پیشوا نہیں بناتے بلکہ انکا مقتدا انکا نفس ہوتا ہے۔

ہم یہاں بعض خطوط اہل وطن کے بعض اہل گورکھپور کے اور بعض اہل الہ آباد کے نقل کرتے ہیں تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ حضرت اقدسؒ کیا کام کیا کرتے تھے صرف لوگوں کو مرید ہی کرتے تھے یا انکی کچھ خدمت بھی اپنے لئے ضروری سمجھتے تھے اور یہ کہ انکی خدمت کے سلسلہ میں کسقدر ضیق کس قدر پریشانی اور کتنا بار قلب مبارک پر اٹھانا پڑتا تھا انھیں سب امور کا تصور کر کے کبھی کبھی یہ شعر پڑھ دیا کرتے تھے کہ ؎

خون دل پینے کو اور لخت جگر کھانے کو یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو

ترتیب بیان یہ ہوگی کہ پہلے اہل الہ آباد کے معاملات کا ذکر ہوگا پھر اہل گورکھپور کا پھر اہل وطن کا اسلئے کہ اہل وطن کے خطوط میں فساد کے اصل مجرم کے معافی کا بھی ذکر ہے۔ چنانچہ وہ الہ آباد آیا اور حضرت سے معافی طلب کی اور پھر اسکی درخواست پر حضرت والا نے وطن کا سفر بھی فرمایا ان سب کا بیان ذرا طویل بھی ہوگا اور اہل وطن ہی کے خطوط پر مرتب بھی ہے اسلئے یہاں ترتیب خط بھی ترتیب نفس الامری کے برعکس پیش کرنی پڑی۔

(بعض حالات اہل الہ آباد)

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں الہ آباد میں بھی باہم حضرتؒ کے لوگوں ہی میں بڑے بڑے اختلافات تھے ان میں سے بعض معاملات حضرت کے سامنے آئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی صاحب نے کسی موقع پر حضرت اقدسؒ کا کوئی فیصلہ اپنے خلاف پاتے ہوئے دل میں یہ خیال کیا کہ حضرتؒ کو ہر شخص کے پورے حالات کی اطلاع تو ہوتی نہیں اس لئے اپنے اجتہاد سے یہ فیصلہ

فرمایا ہے اور اجتہادی غلطی معصوم نہ ہونے کی بنا پر حضرتؒ سے بھی ہوسکتی ہے۔ غالباً اسکی اطلاع کسی طرح حضرتؒ کو بھی ہوگئی اس پر کسی صاحب کے واسطہ سے ان صاحب معاملہ کے پاس کہلوایا کہ جاکر ان سے کہو کہ :-

"آپ کا ابتک میرے متعلق جو یہ خیال تھا کہ — "میں باوجودیکہ تھانہ بھون میں رہا لیکن نہ تو حضرت مولاناؒ کو سمجھا اور نہ ان کے طریق کو سمجھا نہ خود اپنے کو پہچانا نہ اپنے پاس آنے جانے والوں کو پہچانتا ہوں، نہ یہ جانتا ہوں کہ کون مخلص ہے اور کون غیر مخلص اور کسی کو جو کہتا سنتا ہوں وہ بھی بلا بصیرت ہی کے یوں ہی کہہ سن دیتا ہوں کچھ سمجھتا نہیں — تو یہ جو آپ کا میرے متعلق اب تک خیال ہے اب اسکا کیا حال ہے۔ اب بھی آپ اسی پر ہیں یا اسمیں کچھ تبدیلی ہوئی ہے اس کے متعلق کچھ فرمائیے"۔

ان صاحب نے فرمایا کہ "استغفراللہ! حضرت والا کے متعلق اس قسم کا خیال تو وسوسہ کے درجہ میں بھی کبھی دل میں نہیں گذرا بلکہ اسکے برخلاف حضرت والا کے متعلق اپنا تو یہ خیال ہے کہ اسوقت ہندوستان میں حضرت مولانا تھانویؒ کے جو لوگ موجود ہیں سب سے بڑھکر حضرت ہی کو اور حضرت کے طریق تربیت کو جانتا ہوں۔

لیکن اسکے ساتھ ساتھ اپنا جو مرض ہے جو اپنے اندر پہلے بھی تھا اور اب بھی موجود ہے وہ یہ کہ حضرت والا کی اس بزرگی کو مانتے ہوئے بھی میرے متعلق جو بعض واقعات پیش آئے اس سلسلہ میں یہ وسوسہ ضرور ہوا کہ حضرت والا سے اجتہادی غلطی واقع ہوئی اسکو میں بزرگی کے منافی نہیں سمجھتا چنانچہ ایسے وقت میں اپنے متعلق یہ بھی خیال ہوا کہ جیسی کہ بعض لوگوں کو حضرت والا سے والہانہ عقیدت ہے اپنے کو اس سے خالی پاتا ہوں"۔

اور اس سلسلہ میں وہ صاحب چند جزئی واقعات بتانے لگے کہ "حضرت والا نے مجھ سے چند ایسی باتوں پر مواخذہ فرمایا کہ میں اس جرم کا مرتکب نہیں تھا۔

اسوقت یہ خیال بھی ہوتا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص حضرتؒ سے باتیں صحیح غلط نقل کرتا ہے اس سے بہت تکلیف ہوتی تھی کہ اب اس سے کس طرح بچا جائے۔

(اسی قسم کی گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ وہ صاحب واسطہ کہتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا کہ جزئیات نہ بیان کیجئے بس بات تو صاف ہوگئی۔ آپ جس چیز کو خطائے اجتہادی سے تعبیر کرتے ہیں، حضرت والا نے بھی جو یہ فرمایا ہے کہ ـــــ آپ کا جو یہ خیال تھا کہ میں نے طریق وریق کچھ سیکھا نہیں ہے اور یونہی کہتا سنتا رہتا ہوں تو اسکا بھی یہی مطلب ہے ــــــــــ اور جناب محترم! میں نے دو ایک آدمیوں سے اور اسی قسم کے کلمات سنے! اور جب سنا تو طبیعت پر ایک دھکا سا لگا وہ یہ کہ جب بھی شیخ کی کسی رائے کو نہ ماننا ہوا تو کہدیا کرتے ہیں کہ وہ کوئی نبی تو ہیں نہیں یا یہ کہ کیا حضرت یہ وحی سے فرمارہے ہیں؟ یا یہ کہ خطائے اجتہادی بزرگوں سے بھی ہوسکتی ہے۔ تو جناب والا اس کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ یہ تو شریعت کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ معصوم صرف انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں اور اب کسی پر وحی نہ آویگی اور یہ کہ علماء و مشائخ سے بھی اجتہادی غلطی ہوسکتی ہے۔ لیکن باوجود اس امر کے مسلم ہونے کے پھر جب کوئی شخص اسکو اپنی زبان سے کہتا ہے تو یہ کلمۃ حق یُراد بہا الباطل ہی کا مصداق معلوم ہوتا ہے اور اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے اندر اور اسکے باطن میں انکار اور سوئے اعتقاد مضمر ہے کہ ایک شخص سے اعتقاد نہیں ہے اسکو نہیں ماننا چاہتا اسلئے اسکے متعلق ایسا کہہ رہا ہے ورنہ یہ حقیقت سے روشناس کرانا نہیں ہے بلکہ اسکی توہین مقصود ہوتی ہے اور یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ مودودی جماعت کے لوگ حضرات صحابہ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ نبی تو تھے نہیں کہ انکی کسی خبر اور روایت میں غلطی کا احتمال نہو تو اس سے انکار حدیث کا شبہ ہوتا ہے اور اس عنوان کو لازم ہے کہ صحابہ کرامؓ ہی پر سے اعتماد اٹھ جائے بات بالکل صحیح ہے لیکن مقصد نہایت بھونڈا ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ آج ہم لوگوں کا یہی مرض ہے کہ عمل تو کچھ ہے بھی لیکن
اعتقاد میں بہت خامی ہے حالانکہ اعتقاد کی سرحد شروع ہی وہیں سے ہوتی ہے
جہاں عقل کی حد ختم ہو جاتی ہے ۔ عقیدت و محبت کے بعد پھر شیخ کی تجویز میں اس
قسم کی ناگواریاں نہیں ہوا کرتیں کیونکہ بالفرض وہ اگر کسی معاملہ میں اسکے مظلوم
ہونے کے باوجود ظالم سے الٹی معافی مانگنے کو فرمائے تو یہ نفس پر شاق تو ہو سکتا
ہے لیکن ایک سعید مرید اسکو اپنی زبان سے یوں نہیں کہہ سکتا کہ شیخ سے اس
معاملہ کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید وہ اتنا تو کہہ سکتا ہے
کہ حضرت اس سے معافی مانگنا قلب پر شاق بہت ہے اور اسکی ایذاؤں کے
پیش نظر اس سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن چونکہ آپ کا حکم ہے اس لئے
معافی مانگتا ہوں ۔ ادھر یہ عمل کرے اُدھر اللہ تعالےٰ سے دعا کرے کہ یا اللہ!
شیخ پر حقیقت حال منکشف فرما دیجئے ۔ اب اگر دنیا ہی میں فیصلہ ہو گیا اور مخلص
و منافق میں امتیاز ہو گیا تو فبہا ورنہ صبر کرے اور سمجھے کہ کل قیامت کو انشاء اللہ
تعالیٰ ان سب پر مجھے اجر ملیگا ۔ اسمیں گو ضیق بھی ہو گی اور تکلیف بھی مگر
طریق میں قدم رکھا ہے اور مخلص ہے تو ان سب کو اللہ تعالےٰ کے لئے برداشت
کرے ۔ اور حضرات مشائخ جو یہ فرماتے ہیں کہ طریق میں لوہے کے چنے چبانے
ہوتے ہیں تو آخر وہ کون سے چنے ہیں؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہی سب چنے ہیں جو
چبانے پڑتے ہیں ۔ ایک صالح اور نیک بخت مرید کا تو ایسے مواقع پر یہی طرز عمل
ہونا چاہیئے

نہ یہ کہ کسی مواخذہ پر شیخ ہی سے بدظنی کرنے لگ جائے اور اسکے خلاف
وساوس کا شکار ہو جائے کیونکہ اس طرح سے اگر ہر ہر بات پر خود ہی ...
ایک رائے قائم کرے گا تو شیخ کی جانب سے اسکے آگے ایک سد اور دیوار
حائل ہو جائیگی جو اسکے حق میں فیض سے مانع ہو گی ۔

اور پھر مرید کو یہ حق ہی کب پہونچتا ہے کہ وہ دل ہی دل میں شیخ سے یہ

یہ مطالبہ کرے کہ شیخ کسی کی اصلاح و تربیت کے بارے میں اسکی رائے پر عمل کرے۔ شیخ و مربی تو وہ ہوا اور رائے و تجویز اسکی یہ کیوں ؟ یہ تو مشیخت کے بالکل خلاف ہے۔ اس طور پر تو کوئی شیخ شیخ ہی نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح سے شیخ کے لئے بھی یہ کب جائز ہے کہ مثلاً دو مریدوں کا آپس میں کوئی نزاع ہو تو وہ کسی ایک کے ساتھ ہو کر دوسرے کا فریق بن جائے۔ اور کسی مرید کے لئے کسی حقیقی شیخ سے متعلق یہ خیال کرنا کب روا ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ شیخ مجھ ہی کو کہتے ہیں اور مجھ ہی سے مواخذہ فرماتے ہیں۔ اسکو (فریق مقابل کو) کچھ نہیں کہتے۔

جناب محترم ! میں تو حضرت کے یہاں رہتا ہی ہوں دیکھتا ہوں کہ حضرت اس باب میں کس درجہ عدل سے کام لیتے ہیں۔ اصلاح کے سلسلہ میں باہر والوں کی تو کیا رعایت کریں گے جبکہ اپنے گھر کے خاص لوگوں تک کو نہیں چھوڑتے ہر شخص سے سوال ہر شخص سے پوچھ کچھ برابر جاری رہتی ہے۔ مگر اسکو وہی شخص جانتا ہے یا شیخ جانتے ہیں۔ اب یہ کیا ضروری ہے کہ شیخ سب سے اپنے اس قسم کے معاملات بتا بھی دیں۔

سب سے مواخذہ ہوتا ہے اور حضرت والا کا کوئی مقرب نہیں ہے جو مخلص ہے وہی دوست ہے ورنہ اخلاص سے دور رہکر کوئی اپنے کو مقرب سمجھے تو دھوکہ میں ہے۔

(وہ صاحب جو واسطہ تھے کہتے ہیں کہ) اسی قسم کی باتیں میں نے عرض کیں جبکو ان صاحب نے بغور سنا اور تسلیم کیا۔ فرمایا کہ تم ٹھیک کہتے ہو اور آخر میں فرمایا کہ حضرت والا سے میری جانب سے جاکر عرض کر دیجئے کہ :۔

" حضرت والا نے جو بیان فرمایا ہے اسکا تو وسوسہ بھی الحمد للہ نہیں ہوتا باقی اپنے اندر خامی بہت موجود ہے اسکے دور ہونے کی حضرت سے دعا کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا کی سچی محبت اور کامل عقیدت

تصیب فرمائے۔

حضرت والا سے آکر ان صاحب کا جواب نقل کیا حضرت نے یہ تحریر خود اپنے قلم سے لکھدی اور فرمایا کہ مجلس میں وہ صاحب تشریف لا دیں گے پہلے اسکو سنا دو پھر اس کے بعد مجھ سے زبانی گفتگو کریں۔ تحریر یہ تھی:-

"۔۔۔ صاحب سلمہٗ ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آخر مجھکو کام کرتے ہوئے بہت دن ہو گئے آپ بھی اسکو سمجھتے ہیں یہ بتلائیے کہ بھلا کوئی معتقد یہ کہہ سکتا ہے اور وہ بھی شیخ کے مواجہہ میں کہ مجھکو آپ سے عقیدت والہانہ نہیں ہے۔ فلاں صاحب بھی معافی کے لئے تشریف لائے تھے جب بھی یہی لفظ کہا تھا میرے سامنے دو مرتبہ ہو گیا پیچھے تو معلوم نہیں کتنی مرتبہ یہ لفظ کہا گیا ہوگا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ادھر اقرار کامل اور دوسری طرف انکار یا موہم انکار لفظ۔ آخر کیا لفظ کے کچھ احکام نہیں ہوتے؟ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ میں کسی کا فریق نہیں بنتا اور نہ بننا منا سب ہے۔ بہت سے لوگ ابتدا میں آئے اور اسکے بعد بدل گئے یہ بدلنا اپنی اغراض نفسانیہ کی وجہ سے ہوتا ہے ورنہ بدلنے کے کوئی معنی نہیں اب آپ فرمائیے کہ آپ کیا سمجھے؟ اور آپ کو میں کیا سمجھوں۔ دو چیز ہے۔ اخلاص یا غیر اخلاص۔ بین بین درجہ معتبر نہیں۔ آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ نئے نئے لوگ گھس گئے ہیں اور ہمارے خلاف کہتے ہیں۔ یہ سب دلائل شرعیہ کے ماتحت فرماتے ہوں گے؟ شیخ کے مقابلہ میں یہ سب نفس کے پیچ ہیں جو مواخذہ کے وقت غیر مخلص سے صادر ہوا کرتے ہیں۔ عقیدت تو ان امور سے روک سکتی ہے ورنہ غیر معتقد بیدھڑک زبان سے نکالکر طریق سے نکلجاتا ہے اور اپنے کو خارج بھی نہیں سمجھتا۔ اسکو سمجھنے کے بعد پھر زبانی گفتگو کرنا۔

اس تحریر کو ان صاحب کو سنا دیا اور زبانی یہ کہا کہ ایک بات آدمی دوسروں کے لئے کہہ سکتا ہے لیکن وہی بات اپنے شیخ کو نہیں کہہ سکتا۔ یہ طریق بہت نازک ہے اس میں ادب ہی تو اصل چیز ہے۔

دیکھئے ہم لوگ علماء کے متعلق کہتے ہی رہتے ہیں کہ فلاں مسئلہ میں فلاں سے اجتہادی غلطی ہوئی اور یہ کچھ معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا لیکن یہی بات ہم اپنے شیخ کو نہیں کہہ سکتے" سعدیؒ نے گلستاں میں فرمایا ہے کہ۔ع ۔ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست"۔ جب عام مشائخ کا یہ حکم ہے تو پھر اپنے شیخ کا تو کیسا کچھ ادب ہوگا؟ اسی طرح مولانا روم فرماتے ہیں کہ ؎

گر خطا گوید ورا خاطی مگو ور شود پر خوں شہید آنرا مشو

(یعنی کوئی اللہ والا اگر غلط بھی کہے تو اسکو خاطی مت کہو اور اگر کوئی شہید پرخوں ہو جائے تو اسکو مت دھوؤ)

خونِ شہیداں ز آب اولیٰ تر است ویں خطا از صد صواب اولیٰ تر است

(اسلئے کہ شہیدوں کا خون پانی سے بڑھکر پاک ہے اسی طرح سے انکی خطائیں سیکڑوں صواب سے بڑھکر ہیں)

یہ گفتگو سنکر ان صاحب نے فرمایا کہئے تو کچھ لکھدوں باقی حضرت کے سامنے زبانی تو مجھ سے کچھ نہ عرض کیا جائے گا۔

اس گفتگو سے ناظرین کو اندازہ ہوا ہوگا کہ نئے اور مبتدی نہیں بلکہ حضرت والا سے قدیمی تعلق والوں کے بھی بہت سے معاملات یونہی چل رہے تھے تفصیل کی نہ یہاں ضرورت ہے نہ سب کا بیان کرنا ممکن ہے اسلئے صرف چند خطوط نقل کرتا ہوں تاکہ لوگوں کے حالات اور انکی اصلاحات کا انداز معلوم ہو سکے اور یہ معلوم ہو جائے کہ حضرت والا پر اپنے لوگوں کی عدم اصلاح کسقدر ضیق اور رنج کا سبب بنتی تھی۔

چونکہ یہاں لوگوں کے باہمی اختلافات قدیمی تھے اسلئے بیجا نہ ہوگا کہ اگر اس موقع پر فتحپور (وطن) ہی کے دورِ قیام کی تحریر پیش کروں ——— حضرت والد ماجد مولوی سراج الحق صاحبؒ مرحوم کے ہاتھ کی ایک تحریر کا غذات

میں ملی۔ وھو ہذا۔

(ایک اہم انتباہ اور ضروری اطلاع)

تمہید: اس مرتبہ احقر کی حاضریٔ فتحپور کے زمانہ میں حضرت شیخ مدظلہٗ کے پاس ایک لفافہ گمنام پہونچا جسکا پتہ کاتب نے کسی وجہ سے ردّمی سلمہٗ سے لکھوایا تھا حضرت والا مدظلہٗ کو اس تحریر سے سخت تکدر ہوا اور حضرت والا نے احقر کو بتاکید وتہدید حکم فرمایا کہ "یہ مضمون (جو آگے درج ہے) الہ آباد والوں کو جا کر سنا دو" ۔۔ چونکہ سب برادرانِ طریق کا ایک جگہ جمع ہونا دقت طلب ہے نیز زبانی کہنے سے زیادہ اثر تحریر کا ہوگا اسلئے میں الہ آباد کے جملہ برادران طریق سے درخواست کرتا ہوں کہ حضرت والا مدظلہٗ کے فرمانِ ذیل کو غور سے دو تین بار پڑھ لیں اسکے بعد اس کاغذ کی پشت پر دستخط کر دیں تاکہ میں یہی تحریر حضرت والا مدظلہ کی خدمت بھیجدوں۔

والسلام احقر سراج الحق غفرلہٗ
۱۱ر نومبر ۵۵ء

وہ فرمان یہ ھے:-

(الہ آباد کے ان تمام لوگوں کے نام جو مجھسے تعلق رکھتے ہیں)

کچھ عرصہ سے میرے پاس الہ آباد سے ایک خاص نزاع کے متعلق فریقین نزاع کے خطوط یکے بعد دیگرے مسلسل آرہے ہیں آج بھی ایک خط گمنام آیا ہے ہرچند کہ میں نے دو ایک بار ممانعت لکھ بھیجی کہ مجھے ان سب قصوں سے معاف رکھا جائے اور ان میں نہ ڈالا جائے اور میرے متعلقین میں سے کسی کی شکایت دوسرا فریق یا کوئی اور شخص مجھ سے نکرے مگر الہ آباد والے باز نہیں آتے اور بار بار میرے پاس لکھ لکھکر بھیجتے ہیں اب میں آخری بار الہ آباد والوں کو تصریحًا اطلاع دیتا ہوں کہ:-

اگر کسی کو کسی سے کوئی خلش ہو تو ایک فریق یا دوسرا فریق مجھے کیوں پریشان کرتا ہے عدالت موجود ہے وہاں جا کر چارہ جوئی کرے یا جو جی چاہے کرے میرے پاس آئندہ سے کھٹکر کچھ نہ آوے۔

ورنہ میں الہ آباد کے تمام متعلقین کے بارے میں یہ رائے قائم کرلونگا کہ سب کے سب اس میں شامل ہیں اور سب مجھے ایذاء دینا چاہتے اور یہ چیز سب کے لیئے سخت مضر ہوگی اسلئے آئندہ فریق معاملہ بھی اور ان کے مشیرکار وبہی خواہ بھی اس سے بہت بچیں۔ والسلام"۔

(حضرت والا کا فرمان ختم ہوا)

چند تشریحی معروضات از احقر سراج:

۱۔ حضرت والا مدظلہٗ کے اس لفظ سے کہ "عدالت موجود ہے وہاں جاکر چارہ جوئی کرے" کہیں کوئی برادر طریق عدالتی چارہ جوئی کی حضرت کیطرف سے اجازت نہ سمجھ بیٹھیں، عدالت کی تباہ کاریاں دیکھتے ہوئے کوئی معمولی مسلمان بھی یہ بات نہ کہیگا نہ کہ حضرت والا مدظلہٗ! جنکا منصب تذکیر آخرت۔ انابت الی اللہ کی تعلیم دینا ہے۔ یہ لفظ تو ہماری پست اخلاقی پر عتاب اور طنزیہ خطاب ہے ورنہ حضرت والا مدظلہٗ کا منشا اور تعلیم یہ ہے کہ اخلاق عالیہ کو اختیار کرو اور معاملات میں انکا اظہار کرو۔ صاحب حق اللہ کی رضاء کے حصول کے لیئے اپنا حق معاف کرنے کی ہمت کرے اور جس کے ذمہ کوئی مطالبہ کسی کا آتا ہو وہ اللہ کی رضاء کے حصول کے لیئے ادائے حق کی نیت کرے اس میں دینی جوش اور جلدی سے کام لے تاکہ نفس کو اور مشیرکاروں کو بہکانے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ ع۔ نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد۔

حضرت والا کے ارشاد پر ایک اللہ کے بندے نے ہمت سے کام لیکر اللہ کی مدد سے، حضرت کی تشریف آوری کے وقت میں ایسا ہی کیا تھا۔ پس جیسا افواہاً معلوم ہوا ہے کہ عدالت جانے کی تیاریاں ہورہی ہیں خدا کے لیئے اس

رائے پر نظر ثانی کر لیجائے ۔
۲۔ حق اور خاصان حق کی نہ تو عنایت دیکھکر مطمئن ہو جانا چاہیئے اور نہ حق اور خاصان حق کی کدورات سے بے نیاز و بے پروا ہو جانا چاہیئے ۔ اب کسی صاحب کو اسکی ہمت اور نیت نکرنی چاہیئے کہ ہم مطالبہ تو حضرت ہی کے سامنے لینا اور دینا چاہتے ہیں، جیسا سنا جاتا ہے ۔
۳۔ سب صاحبان خوب سن لیں کہ کسی ایک نے بھی اگر اس فرمان والا کے خلاف کیا تو جملہ الہ آبادی اخوانِ طریق پر اسکا وبال پڑے گا اسلئے اپنے اوپر بھی رحم کریں اور سب الہ آبادی اخوان طریق کے حال پر رحم کریں اور اس کی خلاف ورزی نکریں ۔ والسلام

دستخط کنندگان :۔ محمد سراج الحق غفرلہٗ ۔ عبد الوحید عفی عنہ حبیب احمد عفی عنہ ۔ خلیل احمد غفرلہٗ ۔ احقر عبد القدوس رومی غفرلہٗ ۔ شاکر حسین خاں عفی عنہٗ ۔ صابر حسین عفی عنہ ۔ محمد عبد الستار عفی عنہ ۔ کریم اللہ عفی عنہ محمد ادریس عفی عنہٗ ۔ عبد الحکیم عفی عنہٗ ۔ محمد شفیع اللہ عفی عنہ ۔ خلیل الرحمٰن ۔ سید حسین مصطفےٰ عفی عنہٗ ۔ نثار احمد ۔ محمد یٰسین عفی عنہٗ ۔ عبد المنان عفی عنہٗ محمد ابراہیم عفی عنہٗ ۔ منیر الدین وغیرہ ۔

حضرت اقدس باوجود اسکے کہ اصلاح میں سخت تھے مگر قلب کے بہت نرم تھے ۔ اُدھر والد صاحب کے ذریعہ اہل الہ آباد کو یہ تحریر بھیجی جسمیں احقر کے بعض اعزہ بھی مخاطب تھے اسلئے حقیقت حال سمجھانے کے لئے والد صاحب مرحوم کے فتحپور سے جانے کے بعد ہی مجھ سے کچھ فرمایا اور فرمایا کہ اپنے والد صاحب کو بھی لکھدو چنانچہ راقم نے یہ تحریر بھیجی :۔

(آپ کے جانے کے بعد حضرت والا کی خدمت میں آپ کا تاسف وتاثر عرض کیا تو حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ ——— میں تم لوگوں کو جو کہتا سنتا رہتا ہوں تو اسلئے تاکہ تمھاری عزت رہے تمھارے والد کی عزت رہے رد می کی عزت رہے عیسیٰ کی عزت رہے کیونکہ انسان کی عزت اسکے افعال ہی سے ہوتی ہے۔ آدمی جس بات کو کہدے پھر اسکو تو کرنا ہی چاہیئے۔ میرا ذاتی کوئی نفع نہیں ہے۔ یہ سب باتیں سمجھ لوگے تو عزت کے ساتھ رہوگے اور یہ فرمایا کہ میری اس گفتگو کی اطلاع اپنے والد صاحب کو بھی کردو)

انھیں حالات میں حضرت والا الہ آباد تشریف لائے اور یہاں بعض لوگوں سے بعض کے معاملات الجھے ہی ہوئے تھے اس سلسلہ میں فرداً فرداً بھی اور خطاب عام کے ذریعہ بھی حضرت برابر سب کو نصیحت فرماتے رہے تاآنکہ حضرت کا سفر فتحپور (وطن) درپیش ہوگیا اور حضرت والا تین ماہ کے لئے ۱۹۶۱ء میں فتحپور تشریف لے گئے اور وہاں کی فتح کی خوشی کے ساتھ ساتھ یہاں کے لوگوں کا غم بھی ہمراہ لے گئے ـــ چنانچہ جناب نثار خاں صاحب مرحوم کے خط کے جواب میں فتحپور سے لکھا کہ :-

"دیکھو بھائی میرے ہی لوگوں نے بعض میرے ہی لوگوں کے خلاف قصداً اضرار پہونچانے کی کارروائی کی ہے اور بہت دنوں سے یہ کارروائی کر رہے ہیں مجھکو بہت تکلیف ہے اور لوگ انکی بزرگی کے معترف ہیں اسوجہ سے میرا جی چاہتا ہے کہ الہ آباد نہ آؤں آپ بتائیے کہ یہ حرکت میرے زمرہ میں داخل ہو کر کیسی ہے؟ میں ایسے لوگوں کی صورت دیکھنا گوارا نہیں کرتا جو مسلمانوں کے درپئے آزار بنے رہتے ہوں ـــ زمرہ والے نہیں بلکہ عموماً مسلمان اسی میں مبتلا دیکھے جاتے ہیں والی اللہ المشتکی۔

اب بتلائیے کہ آپ کے کیا خیال مبارک میں آیا؟ اگر آپ کی بات کی طرف کوئی کان لگائے تو اسکو بھی سنا دیجئے اور جلد اسکا جواب مرحمت فرمایئے

یہ بھی سن لیجئے کہ میں اہل اصلاح کا نہیں ہوں اسلئے میرا جسقدر کوئی شاکی ہو درست ہے اب میرے لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں سے علیٰحدگی اختیار کروں ورنہ انکی باتوں کی نسبت بدعقیدہ لوگ میری طرف کریں گے یا کرتے ہیں — اب میں ان لوگوں کے معاملے کو خدا کے حوالہ کرتا ہوں ہر شخص خود وہاں اپنا جواب دہ ہے"۔

پھر غالباً انھیں ایام میں ایک اور تحریر شاکر خاں صاحب مرحوم مولوی عبدالمجید صاحب وکیل انعام الحق صاحب کے نام آئی۔ وھو ہذا۔

جناب شاکر خاں صاحب و مولوی عبدالمجید صاحب وکیل انعام الحق صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،۔

آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ یہ بات ضرور ایسے لوگوں کو پہونچا دیجئے جو شکایت یہاں پہونچا کر اپنا تابع بنا کر اپنے دشمن سے انتقام لینا چاہتے ہیں وہ یہ سن لیں کہ گو میں اصلی پیر نہیں ہوں مگر ایسا بھی نہیں ہوں کہ یہ لوگ مجھکو اپنا تابع بنالیں انکو اپنا ہوش درست کرنا چاہیئے اور اپنا رتبہ پہچاننا چاہیئے جب چند ٹھیکرے کسی کے پاس ہو جاتے ہیں تو اسکا دماغ چل جاتا ہے — اللہ تعالیٰ کا ڈر اسکے دل سے نکل جاتا ہے اور نہایت بدفہم و بداخلاق ہو جاتے ہیں اور ظلم پر کمربستہ ہو جاتے اور پھر اپنے کو عادل بھی سمجھتے ہیں اور ہم جیسے سے منوانا چاہتے ہیں۔

میں یہ الفاظ اس لئے لکھ رہا ہوں تاکہ یہ لوگ باز آئیں اور سمجھیں کہ ہم پر نفس مسلط ہے اور وہی یہ سب کرا رہا ہے ورنہ بارہا معافی تلافی ہو چکی اور کہہ چکے ہیں کہ دل صاف ہو گیا۔ زبان سے کہہ دیتے ہیں اور دل اور نفس ہرگز اس پر راضی نہیں ہوتا نفاق انکا شیوہ ہو گیا ہے میں نے بہت نرمی سے سمجھایا مگر انھوں نے نفاق کو جو انکی زندگی کا نصب العین ہے نہیں چھوڑا

لیپ پوت میرے یہاں نہیں ہے ۔ اصلاح نفس ہے اور اصلاح نفس انپر آسان نہیں ۔ آکر غلط اقرار کر لیتے ہیں اور لوگ باور کر لیتے ہیں ۔ وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون "۔

پھر اسی درمیان میں اور انھیں حالات میں جناب قاری محمد مبین صاحب مدظلہ کو ایک تحریر لیکر الہ آباد بھیجا جسکا جواب شاکر خاں صاحب کے خط میں ملاحظہ ہو اور آگے حضرت والا نے جو انکو جواب تحریر فرمایا وہ ملاحظہ ہو :۔

" شب میں جناب قاری صاحب نے حضرت والا کی وہ تحریر بھی احقر کو سنائی جو اپنے ہمراہ لائے ہیں انشاء اللہ اسپر عمل کرونگا خانہ جنگیوں سے دور رہونگا۔ آپسمیں میل جول اور محبت رکھونگا کسیکی دلآزاری نہ کرونگا۔ ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرونگا جو خدا اور رسول کی مرضی کے موافق ہو اور حضرت والا اسکو پسند فرمائیں، ہمارے قلوب میں حضرت والا کی سچی قدر پیدا ہو جائے اور ہماری زندگی حضرت کے زیر سایہ گذرے اور حضرت کی برکات اور فیوض سے ہم لوگ بہرہ اندوز ہوں ۔ ہم اپنے بزرگوں کے بدنام کنندہ نہ بنیں ۔ ہمارے اعمال و اطوار سے ہمارے بزرگوں کی نیک نامی ہو ۔ ہم نے واقعی حضرت کی قدر نہیں کی اب ہمکو اللہ تعالیٰ قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں ؎

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح   باز پس رفتی وکس قدر تو نشناخت دریغ

(اے نظیری تو آسمان سے مانند مسیح کے آیا اور پھر چلا بھی گیا مگر تیری قدر کسی نے بھی نہ پہچانی)

تحقیق : خانصاحب سنئے آپکو معلوم ہے کہ شمس الدین خاں کی وجہ سے میں اپنا مکان و خانقاہ اور مسجد سب چھوڑ کر چلا گیا تھا ۔ اب اسکے تعلقات سنئے ہر کام میں ہمارے پیش پیش رہتا ہے ہمارے ہر مشورہ میں شریک اور دل سے شریک رہتا ہے، یہانتک کہ اسکی ایک بچی کو اسی کے فریق کے ایک آدمی نے مار دیا تھا جس پر اسکو بہت غصہ آیا مگر یہ کہا کہ ہم مولانا کو لانے میں پیش پیش تھے

(بقیہ حاشیہ)

اسلئے ہم فساد نکریںگے ورنہ بتاتے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ کہاں تک وہ مان گیا ہے۔ اب گاؤں کا حال سنئے چار بریلوی نے اس مذہب سے تائب ہوکر مجھکو تحریر لکھدی ہے کہ ہم دیوبندی ہیں اور آہستہ آہستہ امید ہے سب تائب ہوجائیں گے۔ اب موافقین کو لیجئے سب نے تحریر دیدی ہے کہ ہم شریعت مقدسہ پر عمل کرینگے اور باہم اتفاق واتحاد سے رہیں گے اور تمھارا کہنا مانیں گے۔ اور دیار کے لوگ بھی بہت زیادہ متاثر ہیں اور اس تاثر کا اثر خارج میں ظہور پذیر ہورہا ہے حالانکہ میں کہیں جاتا نہیں ہوں مگر اہل الٰہ آباد میں بقول حضرت مولانا محمد حسین صاحب رحمہ اللہ حسد کا مادہ زیادہ اور مشائخ کے اعتقاد واعتماد کا مادہ بہت کم ہے اسلئے سچی عقیدت سے یہ لوگ محروم ہیں بلکہ آج میرے پاس بخشی بازار کے لوگوں کی تحریر موجود ہے انھوں نے میری بات سمجھی ہے اور اسکا اقرار کیا ہے کہ ہم جو چیزیں تم نے لکھی ہیں یعنی دینی ماحول پیدا کریں گے اور تنازع ونزاع باہمی سے بچیں گے اور اتفاق واتحاد سے رہیں گے، یہ کس قدر دور تھے قریب ہو گئے اور جو قریب سمجھے جاتے تھے دور ہیں۔ جانتے ہیں کیا بات ہے؟ ہم سب بداخلاقی کے شکار ہیں۔ مسلمانوں کے حقوق ہی نہیں پہچانتے اور ان پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اسکو دین ہی نہیں سمجھتے فقط نماز روزہ کو دین سمجھتے ہیں درمختار میں ہے واذا کان الرجل یصوم ویصلی ویضر الناس بیدہ ولسانہ فذکرہ بما فیہ لیس بغیبۃ قولہ فذکرہ بما فیہ لیس بغیبۃ ای یحذرہ الناس ولا یغتروا بصومہ وصلوتہ فقد اخرج الطبرانی والبیھقی والترمذی اترعون فی الغیبۃ عن ذکر الفاجر اذکروا بما فیہ یحذرہ الناس شامی ج۵ ص۲۷ جب آدمی روزہ رکھتا ہو نماز پڑھتا ہو اور پھر بھی لوگوں کو اپنے ہاتھ اور زبان سے ضرر پہونچاتا ہو تو اسمیں جو برائی ہے اسکا ذکر غیبت نہیں ہے تاکہ لوگ اس سے احتیاط کریں اور اسکے نماز وروزہ سے دھوکا نہ کھائیں۔ طبرانی وغیرہ میں ہے کہ کیا تم فاجر کی غیبت کرنے سے ڈرتے ہو؟ ارے نہیں اسکی باتیں خوب بیان کرو تاکہ لوگ اس سے بچ سکیں۔ پس ایسا شخص اپنے علی الاعلان فسق کیوجہ سے واجب الاحترام نہیں ہے۔

جیساکہ ابھی حضرت والاؒ نے تحریر فرمایا کہ ـــــ اہل الہ آباد میں حسد کا مادہ زیادہ ہے اور لوگ بداخلاقی کے شکار ہیں "مسلمانوں کے حقوق نہیں پہچانتے اور معلوم ہو تو ان پر عمل کرنے کو تیار نہیں"۔ تو سچ ہے اپنے معاملات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بالکل صحیح تشخیص فرمائی اور یہ حسد ایسا شدید مرض ہے کہ اس سے گلو خلاصی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت اقدس کو الہ آباد کے لوگوں کی اصلاح کے سلسلے میں مشققت اٹھانی پڑی۔ اللہ تعالےٰ حضرت والا کو اسکا اجر عطا فرمائے۔ اب جنکو بننا تھا بن گئے اور جنکی قسمت میں محرومی لکھی تھی وہ محروم رہے۔ ناظرین کو حضرت والا کے سابقہ جوابات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ کسقدر اصلاح کے لئے بیتاب ہیں اور کتنی ضیق اس سلسلہ میں قلب والا کو اٹھانی پڑی یہاں تک کہ اپنے ایک جواب میں شاکر خانصاحب کو یہ تحریر فرمایا کہ :-

"آپ کا خط عین انتظار میں آیا۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ میری تحریر بہت لوگوں کو پسند ہوئی۔ میں نے صرف اسوجہ سے لکھا کہ میری نااہلی ظاہر ہو۔ اب تو آپ کے خط سے بھی ظاہر ہوگیا کہ سب (ہی لوگ) مظلوم ہیں۔۔۔۔ اور ظالم کا پتہ نہیں اب میں کچھ نہیں لکھونگا۔ ان حالات کے متعلق آپ لوگوں کے فیصلہ کا منتظر ہوں۔۔۔۔ لکھکر انتظار رفع فرمائیے۔ اور معاملہ کو خدا کے حوالہ کرتا ہوں ہر شخص خود وہاں اپنا جواب دہ ہے اور میں نااہلی کا اقرار کرتا ہوں کہ میرے لوگوں کا ایسا ہونا میرے نقصان کی دلیل ہے ؎

میں گلہ کرتا ہوں اپنا تو نہ سن غیروں کی بات
ہیں یہی کہنے کو وہ بھی، اور کیا کہنے کو ہیں

اب اپنے دین کا ہر شخص ذمہ دار ہے"۔ والسلام۔ وصی اللہ عفی عنہ

اسی سلسلہ کی ایک اور تحریر ملاحظہ فرمائیے :-

ایک صاحب نے جن کا تعلق حضرت اقدسؒ سے دیرینہ تھا۔ اپنے معاملات اور لوگوں کی آویزشوں سے پریشان ہوکر حضرت کی خدمت میں دس آدمیوں کے نام تحریر کئے کہ ان ان لوگوں سے مجھے شکایت ہے اور غالباً مقصد انکا یہ تھا کہ یہ لوگ بھی چونکہ آپ سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا آپ ہی میری طرف سے ہوکر ان لوگوں سے بھڑ جائیے۔ حضرت والا نے اسی پرچہ پر ان صاحب کو تو یہ جواب تحریر فرمایا کہ :-

" میں لکھ چکا ہوں کہ ــــ الہ آباد کے لوگوں کو (ہر ایک کو) سمجھ گیا ہوں اور اصلاح میں بھی لگ گیا ہوں اس سے زیادہ کیا کرسکتا ہوں۔ اب آپ کے وہ لوگ مرضی موافق ہو جائیں یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ میں نے بہت کچھ کر دیا ہے۔ آپ لوگوں کا تابع نہیں ہوسکتا۔ اپنے اپنے دین کا ہر شخص کو اختیار ہے جو جیسا کریگا ویسا پائے گا اور پا ہی رہا ہے۔ ہر شخص پر اپنے نفس کی اصلاح فرض ہے جیسے نماز اور روزہ فرض ہے اور یہ مشکل امر ہے۔

والسلام وصی اللہ عفی عنہ"

اور شاکر خانصاحب کو اس سلسلہ میں یہ تحریر لکھکر ایک صاحب کی معرفت ارسال فرمائی وھو ہذا :-

آج ایک خط آیا ہے اسمیں ایک پرچہ ہے اپنے کئی دشمنوں کا نام لکھکر بھیجا ہے میں ان لوگوں سے تنگ آگیا ہوں۔ ایک عبارت شامی سے لکھ رہا ہوں ملاحظہ ہوئیے فرمائیے جس میں ازالۂ امراض نفسانیہ کو فرض کہا گیا ہے اور نماز و روزہ کیطرح فرض عین۔ اب آپ بتلائیے کہ یہ بزرگ لوگ جو ہمارے ساتھ متعلق ہیں کیا اصلاح نفس کو فرض عین سمجھتے ہیں حاشا و کلا۔ سب جگہ کو فاسد کرنے کے بعد اب ہماری جگہ کو فاسد کرنا چاہتے ہیں

اب بتائیے کہ ہم لوگ کہاں جائیں؟ اور اپنا دین ان سے کسطرح بچائیں۔ آپ کو اسکا جواب دینا اور حق جواب دینا لازم ہے۔ گرفت خداوندی ہماری گرفت سے کہیں زیادہ ہے ان اخذہ الیم شدید۔ شامی کی عبارت ہے اعلم ان علم الاخلاص والعجب والحسد والریاء فرض عین مثلها غیرآفات النفوس والکبروالشح والحقد الخ جان لو کہ اخلاص۔ عجب۔ حسد اور ریا کا علم فرض عین ہے اور اسی طرح دیگر رذائل نفس کا بھی مثلاً کبر۔ شدت بخل کینہ۔ دھوکا دہی۔ غصہ۔ عداوت۔ بغض۔ طمع۔ غرور۔ خیانت مداہنت۔ حق بات سے سرکشی۔ مکر۔ خداع۔ قساوتِ قلبی طول امل وغیرہ اور ان امراض سے کوئی بشر خالی نہیں ہوسکتا لہٰذا ان تمام چیزوں کا علم بوقت حاجت حاصل کرتا رہے تاکہ اس کا نفس ان گندگیوں سے پاک وصاف ہوجائے کیونکہ انکا ازالہ فرض عین ہے اور ازالہ ان رذائل کا بدون انکی تعریف اور علامات کی صحیح معرفت کے ممکن نہیں۔ انتہیٰ۔

اور معرفت اسلئے نہیں ہورہی ہے کہ نفس کی اصلاح کو کوئی فرض عین ہی نہیں سمجھتا۔ صرف نماز روزہ کو فرض سمجھتے ہیں اسکی وجہ سے انھوں نے اپنا دین ہی نہیں تباہ کیا ہے بلکہ اپنی دنیا بلکہ اپنا گھر اور تمام محلہ اور تمام شہر تباہ کردیا ہے۔

اب ہم لوگوں کو بھی یہ بداخلاق تباہ کرنا چاہتے ہیں اور اپنی اس ناپاکی اور پلیدی کا انکو علم بھی نہیں۔ اب آپ لوگ بتائیے کہ ہم کیا کریں؟ فقط ایک ہی چیز اب باقی رہ گئی ہے کہ انکی نفسانیت کی جزا کو خدا کے حوالہ کریں کہ وہ احکم الحاکمین ہے۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

ملاحظہ فرمایا آپ نے اس طرح سے دلسوزی اور تعب و مشقت ایک مصلح کو قوم کی اصلاح کی خاطر اٹھانی پڑتی ہے۔ واقعی جو حضرات مصلحین متبع سنت ہوئے ہیں انکو ایسا ہی دیکھا گیا ہے کہ وہ حضرات اور تمام سنتوں کے ساتھ ساتھ لعلک باخع نفسک ان لا یکونوا مومنین ترجمہ (شاید آپ اپنے نفس کو ان کے مسلمان نہ ہونے کے غم میں ہلاک ہی کر دیں گے) والی سنت سے بھی متصف ہوتے تھے اور شاید زمانہ میں ایسے مصلحین کی کم یابی ہی پر افسوس کرتے ہوئے کبھی کبھی یہ فرماتے تھے کہ —— "اب آج دھرا ہے اخلاص اور دھرے ہیں مصلح کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ دوسروں کی اصلاح کی خاطر اپنے قلب و دماغ پر اتنا تعب اور بار برداشت کرے"

راقم نے اہل الہ آباد کا ابتک یہ ایک ہی رخ بیان کیا ہے اور مقصد اس سے یہ تھا کہ آپ پر یہ ظاہر کر دیں کہ ہمارے حضرت اقدس کی تمام ہی زندگی اسی کشمکش میں گذری۔ وطن میں اہل وطن اور اہل اطراف سے جو سابقہ پڑا وہ تو کہیں بڑھکر تھا یہاں تک فساد برپا کر کے لوگوں نے حضرت والا کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ پھر گورکھپور میں ایسا فتنہ تو نہ تھا تاہم بہت بہت ضیق وہاں بھی حضرت کو ہوئی، بالآخر الہ آباد تشریف لائے تو یہاں کے حالات آپ کے سامنے ہی ہیں ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ واقعی ؎

خون دل پینے کو اور لخت جگر کھانے کو یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو

غرضکہ حضرت اقدس کے اسی نوع کے خط فتحپور سے آتے رہے چنانچہ اکثر شاکر خاں صاحب مرحوم کے نام آتا اور انھیں کو حضرت واسطہ بناتے اور مضمون خط کو تمام متوسلین حضرت والا کو سنایا جاتا۔ یہاں تک کہ اسی سلسلہ کا ایک خط خانصاحب مرحوم نے ایک دن اہل مجلس کو سنا کر انسے جواب طلب کیا۔ اہل الہ آباد نے اس پر متفقہ طور پر جو جواب حضرت اقدس

کو لکھا وہ یہ ہے :-

(اہل الہ آباد کا معافی نامہ اور آئندہ اصلاح کا عزم)

عرض ہے کہ آج مجلس میں حضرت والا کا خط شاکر خاں صاحب نے ہم سب کو سنایا حضرت والا نے جو کچھ تحریر فرمایا بالکل صحیح ہے بیشک ہم لوگوں سے بہت کوتاہیاں ہوئیں۔ حضرت والا معاف فرما دیں۔ اب ہم لوگ دل سے ارادہ کرتے ہیں کہ شریعت مقدسہ پر پورے طور سے پابندی کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق پیدا کریں گے۔ آپس کے جو تعلقات بگڑے ہیں ان کو درست کریں گے اسمیں کامیابی کے لئے حضرت والا سے درخواست دعاء و توجہ کی ہے۔

دستخط متوسلین حضرت والا (الہ آباد)

(حضرت اقدسؒ کا جواب باصواب)

آپ حضرات کی حق پرستی سے جی بہت خوش ہوا میں اہل حق کے ساتھ ارتباط رکھنا چاہتا ہوں اور اسکو اپنی سعادت سمجھتا ہوں اور اب ان لوگوں سے مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے (جنکی یہ تحریر ہے) اور (اب جنکی تحریر ابھی نہیں آئی ہے) ان لوگوں کا انتظار ہے۔ اور سب سے معافی مانگتا ہوں۔

والسلام وصی اللہ عفی عنہٗ

راقم عرض کرتا ہے کہ اہل اللہ کی خفگی اور ناراضگی کچھ اپنے نفس کیلئے نہیں ہوا کرتی بلکہ یہ حضرات جس کو کچھ کہتے سنتے ہیں یا کسی سے ناخوش ہوتے ہیں تو محض للہ اور فی اللہ ہوتے ہیں جب وہ شخص برائی سے باز آجائے

اور توبہ کرلے تو پھر ان حضرات کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آجاتا ہے کہ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ جو شخص گناہ اور معصیت سے توبہ کرلے تو پھر وہ ایسا ہو جاتا ہے گویا اس نے وہ گناہ کیا ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اب اس سے نوش نہ ہو جانے کے کیا معنی؟ نیز یہ حضرات یہ بھی سمجھتے ہیں کہ انسان نفس اور شیطان کے ہاتھوں گرفتار ہے۔ بیچارہ [illegible] مجبور ہی ہے اسلئے اس پر انکو رحم بھی آتا ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ کہیں مواخذہ میں ہم سے کچھ زیادتی ہو گئی ہو اس سے معافی بھی طلب فرما لیتے ہیں۔ یہ اللہ والوں کی سیرت ہے اور انکا یہی کردار وقت پر کتنوں کو ذبح کر دیتا تھا۔ یعنی کتنے لوگ انکی اس ادا سے بسمل ہو جاتے تھے۔

چنانچہ اہل الہ آباد کا مجموعی طور پر جب معاملہ صاف ہو گیا تو بطور نصح نصیح کے حضرت اقدس نے پھر ایک تقریر فرمائی اور پھر اسکو بہ نفس نفیس اپنے قلم سے لکھکر حاضرین کو سنا بھی دیا۔ اب چونکہ ان حضرات کے علاوہ یہ مضمون تمام امت کے لئے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا تھا اور ہر اس شخص کے مفید اور کارآمد تھا جس کا تعلق کسی شیخ سے ہو یا وہ راہ اصلاح میں قدم رکھنا چاہتا ہو اسلئے ہم اسکو یہاں بعینہٖ درج کرتے ہیں:۔

فرمایا کہ —— میں نے کل بعد نماز ظہر جو بیان کیا تھا اسکو قلم بند کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ جو شخص دعوت الی اللہ کا کام کرتا ہے وہ اگر بصیرت سے خالی ہے تو حسب تصریح مشائخ مکر میں پڑا ہوا ہے اسکا فساد اسکی اصلاح سے زیادہ ہو گا۔ جو شخص خود مطمئن نہیں ہے وہ دوسروں کو کیا مطمئن کر سکے گا اور جس شخص کو خود یقین نہیں ہے وہ دوسروں میں یقین کیسے پیدا کر سکتا ہے اسلئے اس منصب کے لوازم میں سے بصیرت اور یقین ہے اپنے طریق کا۔ یہ اب جو لوگ ایسے شخص کے پاس آمد و رفت رکھتے

والے ہیں انکو جتنا اسکا یقین ہوگا کہ ہمارا متبوع محقق ہے
بصیرت پر اور یقین پر ہے اتنا ہی اسکا اتباع کریں گے اور
اس طرح انکو بھی رفتہ رفتہ بصیرت حاصل ہو جائیگی
ورنہ اتباع کی دولت سے کبھی فائز المرام نہ ہوں گے ہم کھلی
آنکھوں اسکا تجربہ کر رہے ہیں کہ کثرت سے لوگ اسکا شکار ہیں
کہ جب ایسا آدمی کوئی اصلاحی چیز یا کسی غلطی پر انکو تنبیہ کرتا ہے
تو نفس و شیطان اسکو سمجھاتا ہے کہ انھوں نے تمھارے معاملہ
میں غلطی کی ہے اور تمھارے دشمن کے کہنے پر عمل کیا ہے
اور ہر فریق اپنے معاملہ میں اسی پر عمل پیرا ہے۔ اب بتائیے کہ
اگر ایسا ہے تو ایسے شخص کو یک لخت جواب دیدو کہ — ع
او خویشتن گم است کرا رہبری کند۔

لیکن اگر چھوڑنے کی ہمت نہیں ہے تو سیدھی اور صاف
بات یہ ہے کہ قلب کا ضعف یقین دور کرو اور پختگی سے بلا تردد و
بلا شک عقیدہ راسخ کرو کہ یہ شخص ہمارا خیر خواہ ہے اگرچہ ہمارے نفس
کے خلاف کرتا ہے ہمیں اسکا اتباع کرنا ہی دین ہے اور اسی
میں ہماری فلاح ہے اسکے بعد دیکھو کہ راستہ کھلتا ہے یا نہیں

اہل الہ آباد کی اصلاح کے سلسلہ میں لوگوں کے احوال اور حضرت اقدس کا مواخذہ اور عتاب اور ان سے ناراضگی کا منظر تو آپ نے دیکھا
نیز یہ کہ ان حالات میں حضرت والا کو کس قدر ضیق برداشت کرنی اور تعب اٹھانا
پڑتا تھا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت اقدس یہاں کسی سے
خوش ہی نہیں تھے ایسا نہیں بلکہ اللہ والوں کی خفگی اور ناراضگی
محض لوگوں کی اصلاح کی غرض سے ہوتی تھی جب کسیکو اپنے نقص کا احساس

اور حالت کی درستگی کا خیال پیدا ہوجاتا تھا تو پھر اسکے بعد کچھ نہیں حضرت بھی مطمئن ہوکر خوش ہوجاتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ابھی ملاحظہ فرمایا کہ اتنی ناراضگی کے بعد بھی جب لوگ گڑگڑائے اور معافی مانگی تو حضرت والا نے بھی انھیں معاف ہی فرما دیا۔

اسکے علاوہ الہ آباد میں حضرت کی تشریف آوری بہت سے لوگوں کے حق میں رحمت ثابت ہوئی۔ ہمارے بھائی عبداللطیف صاحب حسن منزل والے خود مجھ سے فرماتے تھے کہ حضرت والا کے الہ آباد تشریف لانے کا فائدہ جس جس کو ہوا وہ جانے خود مجھے اتنا فائدہ ہوا کہ اسکو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بس یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ ناچیز پر کرم ہی ہوا کہ یوں سمجھئے کہ جیسے پیاسے کے پاس کنواں پہونچ جائے۔ کہتے تھے میرے شروع کے حالات کچھ گڑبڑ ہو چلے تھے اس طرح سے کہ یوں تو الحمدللہ میں نماز روزہ کا بچپن ہی سے پابند تھا مگر ایک غیر متشرع پیر کے یہاں پھنس گیا تھا اللہ پاک نے کرم فرمایا اور کسی کی صحبت کیوجہ سے مجھے ان سے نجات ملی۔ پھر حضرت اقدس کے یہاں فتحپور تال نرجا حاضر ہوا تو سکون ہوا کہ ہاں یہ صحیح جگہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا کچھ کرنا ایسا ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد حضرت والا اپنے وطن سے گورکھپور تشریف لے گئے اور اور اسکے بعد بلا شان و گمان الہ آباد آ گئے اور یہاں مکان بھی لے لیا اس لئے میں نے تو اللہ تعالیٰ کا بہت بہت شکر ادا کیا اور یہ سمجھا کہ حضرت والا الہ آباد میری ہی اصلاح کے لئے بھیجے گئے ہیں اور مجھے حضرت کی صحبتوں سے بہت ہی فائدہ ہوا اب بھی ہر دن روز افزوں معلوم ہوتا ہے

اسی طرح سے ایک جوان صالح کا اصلاحی خط ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ حضرت کے یہاں سے پانے والوں نے کون سی دولت پائی تھی۔

وہ لکھتے ہیں کہ :-

حال : الحمد للہ کہ معمولات پورے کر رہا ہوں۔ حضرت اقدس دعا فرمائیں کہ اللہ تعالے ذکر کے برکات مجھ جیسے نالائق کو محض اپنے فضل وکرم سے نصیب فرمادیں۔ آج اسکول کی کتاب پڑھ رہا تھا بیچ بیچ میں تسبیح لیکر اسم ذات کا ورد کرنے لگتا تھا، یکایک دل اللہ تعالے کیطرف متوجہ ہوگیا طبیعت میں ایک شوق پیدا ہوا کہ جو کچھ ملنا ہو جلدی سے مل جاوے، گو میں کسی قابل بھی نہیں ہوں مگر قابلیت بھی تو ادھر ہی سے عطا ہوگی۔ زبان پر بار بار خواجہ صاحبؒ کا یہ شعر آنے لگا

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی　　　اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

آنسو آنکھ سے نمودار ہوگئے۔ حالانکہ یہ شعر پڑھتے ہوئے شرم آتی ہے مگر حضرت بس جی یہی چاہتا ہے کہ جلدی سے عطا ہو جائے۔ حضرت اقدس اس نالائق کو کسی آسان راستہ سے پہونچا دیں۔ اب تو بعض وقت طبیعت بہت الجھتی ہے۔ غیر اللہ کا خیال دل میں دیکھکر سخت افسردگی ہوتی ہے بعض وقت تو مرنے کا جی چاہنے لگتا ہے بعض وقت تو قاری صاحب[۵] کے یہاں پڑھنے جاتا ہوں وہاں بھی جانے کو جی نہیں چاہتا۔ مشکوٰۃ شریف پڑھتا ہوں مگر پھر بھی طبیعت پتہ نہیں کیوں بھاگتی ہے۔ حضرت اقدس میرے لئے راستہ جو بھی تجویز فرمادیں مشکل یا آسان سب منظور ہے کیونکہ حضرت میری فلاح سب سے زیادہ چاہتے ہیں مگر طبیعت بس یہی چاہتی ہے کہ جلدی سے عطا ہو جائے۔

تحقیق : ابھی ملے گا کیوں گھبراتے ہو۔

حال : حضرت اقدس میری حالت پر سب سے زیادہ توجہ فرمادیں۔ آپ ہی اگر چاہیں گے تو مشکل بھی آسان، اور دیر بھی سویر، اور بعید چیز بھی قریب ہو جاویگی حضرت اقدس فرمایا کرتے ہیں کہ نوجوان لڑکے محنت بہت کرتے ہیں مگر جو سب مشکل کو آسان کرنیوالی ہے یعنی محبت وہی حاصل نہیں کرتے تو حضرت اقدس کس طرح حاصل ہو حضرت ہی اس نالائق کو حاصل کرادیں باقی میں خود اپنے اندر

---

۵ قاری صاحب سے مراد کٹرہ کے قاری حبیب احمد ۲ ۴ ۳ صاحب مظاہری ہیں۔

طاقت نہیں پاتا ۔ تحقیق : اللہ تعالیٰ محبت دے۔

اسی طرح سے ایک اور صاحب کا عریضہ ملاحظہ ہو جو کہ دین کے ساتھ ایک ممتاز دنیوی عہدے پر فائز ہیں اور اسکا مصداق ہیں کہ ؎۔ ما احسن الدین والدنیا اذا اجتمعا ۔ دنیا کے ساتھ اگر کسی انسان میں دین بھی جمع ہو جائے تو سبحان اللہ کیا ہی خوب بات ہے ــــ وہ حضرتؒ کو لکھتے ہیں کہ:۔

حال : معمولات واذکار و نوافل حضرت والا کی دعا کی برکت سے پورے کر لیتا ہوں ۔ اپنے رذائل کی نگرانی رکھتا ہوں ۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور حضرت والا کی توجہ اور دعا کی برکت سے متجاوز عن الحدود نہیں ہوتا ہوں ۔ بس اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور کرم کو ہر امر میں ہر آن اپنے ساتھ پانے لگا ہوں جس سے بڑی طمانیت قلبی میسر ہے ۔ اپنا جہل علمی جو کہ ایک حقیقت ہے اور جو نگاہوں سے پوشیدہ تھا سامنے آگیا اور تقریباً ہر آن پیشِ نظر و خیال رہتا ہے جسکی وجہ سے ناز و کبر کی بنیاد ہی ہل گئی ہے ۔ حضرات علماء کا احترام اور انکی منزلت کسی آن فراموش نہیں ہوتی بلکہ ہر بندۂ مومن اپنے سے علم میں اور ہر اعتبار سے اچھا نظر آتا ہے ، حصولِ تواضع اور استحضار فنائے خودی میں اس سے بڑی مدد مل رہی ہے ۔ جناب باری تعالیٰ کے فضل و کرم و مغفرت کے علاوہ ایک شمہ بھی سرمایہ اپنے پاس نہیں جو کہ قابل قبول ہو سکے یا پھر ان کے فضل و کرم کے بعد اپنے بزرگوں کے دامن کا سہارا ہے ۔

اپنے علم دینی کے نہ ہونے کے سبب قدرے افسوس ہے کہ میں نے کیوں نہیں عربی پڑھی کہ قرآن و حدیث کو عربی میں سمجھ لیتا ۔ ارادہ ہے اولین فرصت پر انشاء اللہ تعالیٰ بقدر ضرورت عربی پڑھونگا ۔

اپنے بچوں کی تعلیم کے باب میں بھی بہت غیر مطمئن ہوں ۔ بڑے بچے کو

انگریزی تعلیم میری سمجھ میں راس نہیں آرہی ہے۔ اپنی آئندہ حاضری میں جو انشاء اللہ تعالےٰ جلد ہوگی انکو بھی ساتھ لاؤنگا تاکہ حضرت والا انکو دیکھکر فیصلہ کردیں

اپنے عربی نہ جاننے سے جو اسوقت ایک بڑا فائدہ اپنی تسلی کے لئے محسوس ہو رہا ہے وہ یہ کہ اس سے میرا کبر کا مادہ بہت زیادہ ٹوٹ گیا جو شاید علم دین کے ہوتے ہوئے آسانی سے نہ جاتا اور بعد اس رذیلہ کے شکست کے ممکن ہے کہ علم دینیات کا پڑھنا مجھے مفید ہو۔ چنانچہ جو علوم دینی کہ اردو میں ہیں انکو پڑھنے سے بہت زیادہ فائدہ محسوس کر رہا ہوں۔ جتنا ہی ان علوم کو پڑھتا ہو اپنا جہل زیادہ سے زیادہ منکشف ہو رہا ہے اور آجکل اسی حالت کا غلبہ ہر آن رہا کرتا ہے ؎

جبھی جا کے مکتبِ عشق میں سبقِ مقامِ فنا لیا
جو پڑھا لکھا تھا نیازؔ نے اسے صاف دل سے بھلا دیا

اللہ تعالےٰ حضرت کو حیات خضری اور دولت سرمدی کے ساتھ قائم ودائم رکھیں مجھ ناکارہ کی اصلاح انشاء اللہ تعالےٰ حضرت کی دعا اور توجہ سے ہو جائے گی۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے ان خطوط کو سبحان اللہ کیسا اچھا حال ہے ایسے ایسے کتنے حضرات تھے جن کے حالات میں انقلاب آیا باقی دیکھنے کی جو چیز ہے وہ یہ کہ قدر مشترک کے طور پر دونوں خطوط میں جو بات ہے وہ معمولات کی پابندی ہے۔ اس طریق میں اسی سے پاتا ہے جو پاتا ہے اور جو محروم رہتا ہے وہ اسی میں کوتاہی کرتا ہے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے احوال، اعمال کے تابع ہوتے ہیں جیسا عمل ہوگا ویسا ہی حال پیدا ہوگا۔ اللہ تعالےٰ اسکا کچھ حصہ راقم کو بھی عطا فرمائے۔

اسی طرح سے ایک کلی نفع جو الہ آباد کو حضرتؒ کی تشریف آوری سے

ہوا وہ یہ تھا کہ یہاں ایک دینی ماحول پیدا ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدسؒ کی ناراضگی کے دور میں ایک اللہ کے بندہ سے یہی لفظ لکھوا دیا۔ حضرت والاؒ اس سے بہت خوش ہوئے اور سمجھے کہ اس نے نفع کی صحیح تعبیر کی ہے۔ چنانچہ ایک صاحب نے حضرتؒ کو لکھا کہ:۔

حال: آپ کی غیرموجودگی سے ہم لوگ یہاں ایک بہت بڑی کمی محسوس کرتے ہیں لیکن "صاحب امر" کی حیثیت سے آپ کو کلی اختیار ہے کہ آپ جہاں چاہیں رہیں لیکن الہ آباد کو فراموش نہ فرمائیں۔

جو دینی ماحول آپ کی موجودگی سے الہ آباد میں پیدا ہوا ہے وہ الہ آباد کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے (اسکے جواب میں حضرت والا نے تحریر فرمایا کہ)

تحقیق: دینی ماحول ہی تو چاہتا ہوں اب تو گذر ہم لوگوں کا بغیر اسکے مشکل ہے اللہ تعالیٰ ہر جگہ یہ ماحول پیدا کر دے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے ان صاحب نے حضرت اقدس کی الہ آباد تشریف آوری کا نفع یہاں ایک دینی ماحول پیدا ہو جانے کو لکھا تھا۔ اسکو حضرت والا نے کسقدر پسند فرمایا اسلئے کہ یہ ایک واقعی بات تھی اور حضرت سے الہ آباد والوں کو جو فائدہ حاصل ہوا تھا اسکی صحیح عکاسی تھی ورنہ حضرت اقدس کچھ تعریف پسند نہ تھے بلکہ بطور خوشامد کے اگر کوئی بیجا تعریف کرتا یا مبالغہ آمیزی سے کام لیتا تھا تو اسپر سخت مواخذہ فرماتے تھے۔ یوں فرماتے تھے کہ پیر کو موٹے موٹے الفاظ بولکر راضی کرنا اور دل سے اسکو نہ ماننا یہ کیسا ہے؟ اس سوال پر انسان کے حواس گم ہو جاتے تھے برخلاف اسکے یہاں ان صاحب کے جواب کو کسقدر سراہا اور فرمایا کہ "جی ہاں دینی ماحول ہی تو چاہتا ہوں۔ اور اب اس زمانہ میں نیک لوگوں کا بغیر اسکے گذر مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ دینی ماحول پیدا فرما دے"

چنانچہ جس طرح سے ان وکیل صاحب نے دینی ماحول کو لکھا تھا اسی طرح سے حضرت اقدسؒ کے ایک سوال کے جواب میں الہ آباد ہی کے

ایک اور مولوی صاحب نے بڑی تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے (جسکو اسی شمارہ کے ص۴ پر ملاحظہ فرمالیا جائے) ان حضرات کے بیان اور حضرت اقدس کی تصدیق سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کے منتسبین خاص اور مخصوص مخلصین سب ہی اسپر متفق تھے کہ الہ آباد میں دنیدار اور دیندار وں کا ایک ماحول اور مرکز جو پیدا ہوا ہے وہ صرف حضرت اقدسؒ ہی کی اصلاحی مساعی کا ثمرہ تھا۔ حضرت سے قبل بھی علماء و مشائخ اور واعظین برابر ہی یہاں تشریف لاتے رہے اور لوگوں نے ان سے دینی اثر بھی قبول کیا لیکن جسے کہنا چاہیئے کہ الہ آباد کو ایک دینی مرکزیت جو حاصل ہوئی وہ صرف حضرت کی برکت تھی اس میں اہل فہم کی دو رائے نہیں ہے۔

زمانۂ قیام الہ آباد میں شہر میں اپنے مکان کے علاوہ اطراف و جوانب کے بعض مقامات سے بھی حضرت کو خصوصی تعلق تھا۔ چنانچہ شہر کے مغربی جانب ۱۶ - ۷ میل کے فاصلہ پر بمرولی نامی ایک موضع دریائے گنگ کے کنارے آباد ہے، چودھری عزیز الرحمان صاحب مرحوم وہاں کے مشہور زمیندار تھے حضرت تھانویؒ سے بیعت تھے انکے بعد ان کے صاحبزادے چودھری حبیب الرحمان صاحب نے اپنے والد کی جگہ لی ماشاء اللہ جوان صالح آدمی تھے اور ہمارے حضرتؒ سے بیعت تھے انکا تعلق حضرت سے کچھ اتنا بڑھا کہ حضرت والا کبھی کبھی شہر کی فضا سے گھبرا کر بمرولی چودھری حبیب الرحمان صاحب کے یہاں تشریف لیجاتے تھے۔ کبھی ایک ہی دن کبھی دو چار دن اور بعض مواقع پر تو چند ماہ قیام فرمایا چنانچہ ایسے مواقع پر تو انکا گھر رشک خانقاہ بن جاتا تھا۔ جو حضرات باہر کے الہ آباد تشریف لاتے انھیں وہیں حضرت کے پاس بھیجدیا جاتا اس بستی کی ایک مسجد بالکل تجری من تحتھا الانھار کی یاد تازہ کردیتی تھی صبح و شام کے وقت اسکے کھلے ہوئے صحن سے گنگا کی لہروں کا نظارا کیا جاسکتا تھا۔ نہایت سکون و راحت کا مقام تھا۔ بعض حالات میں حضرت

اقدس کے لئے شہر کی مسموم فضا کا اس فضا سے تبادلہ ناگزیر ہو جاتا تھا اور صحت کے لئے مفید تر ہوتا تھا۔

اسی بستی کا واقعہ ہے کہ ایک بار مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی مدظلہٗ حضرت اقدس کے پاس تشریف لائے حضرتؒ نے کسی مصلحت کی بنا پر چودھری حبیب الرحمان صاحب کو بلا کر فرمایا کہ چودھری صاحب! آپ کے ہمنام اعظم گڈھ سے ایک مولانا صاحب آئے ہیں آپ انکو پہچانتے ہیں؟ انھوں نے عرض کیا جی ہاں حضرت خوب جانتا ہوں۔ فرمایا کہ ان کے پاس جائیے اور ان سے کہئے کہ (حضرت) مولانا نے مجھسے دریافت کیا ہے کہ اخلاص کسے کہتے ہیں اور اسکا جواب مولانا حبیب الرحمان صاحب سے پوچھکر مجھے دیجئے۔ لہٰذا آپ فرما دیجئے کہ میں کیا جواب دوں؟ چودھری صاحب کا بیان ہے کہ مولانا حبیب الرحمان صاحب لیٹے ہوئے تھے میرے منہ سے یہ سوال سنتے ہی یکبارگی اٹھکر بیٹھ گئے اور ذرا دیر کے لئے سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ پھر مجھ سے فرمایا کہ جاکر حضرت سے کہئے کہ حضرت اخلاص اسکو کہتے ہیں کہ آدمی جسکا ہو جائے بس اسی کا ہو کر رہے۔ چودھری صاحب کہتے تھے کہ میں نے حضرت سے جاکر اس جواب کو نقل کر دیا تو حضرت مسکرا دیئے اور زبان سے کچھ نہیں فرمایا۔

بمرولی سے حضرت اقدس کو اسلئے بھی انس تھا کہ دریا کے کنارے مسجد کے آس پاس بہت سی پرانی قبریں تھیں اور چند قبریں ایک مقبرہ کے اندر احاطۂ مسجد میں بھی تھیں ان کے متعلق چودھری صاحب کہتے تھے کہ حضرت زکریا ملتانیؒ کے کسی عزیز خاص کی قبر ہے جنھوں نے کسی راجہ سے یہاں آکر جہاد فرمایا تھا یعنی یہاں بزرگوں کے آثار پائے جاتے تھے۔ واللہ اعلم۔

پھر موضع بمرولی سے ایک ڈیڑھ میل غربی جانب اسرولی نامی ایک بستی دریا کے کنارے ہی آباد ہے، مولوی مقبول احمد صاحب یہاں کے بڑے زمیندار شمار ہوتے ہیں اور حضرت سے بیعت بھی تھے انکی وجہ سے کبھی کبھی حضرتؒ

امروہی بھی تشریف لے گئے ہیں۔

اسی طرح سے شہر کے شرقی جانب دس بارہ میل کے فاصلے پر سید آباد ریلوے اسٹیشن سے تین میل شمال اترا ؤں نامی ایک بڑا گاؤں ہے جہاں مولوی حکیم حبیب اللہ صاحب مرحوم رہتے تھے اور حضرت والا سے بیعت تھے انھیں مولوی حکیم حبیب اللہ صاحب کے ایک خویش مولانا محمد فاروق صاحب اترانوی ہیں مولانا کے ایک بڑے بھائی حافظ محمد حنیف صاحب مرحوم بھی تھے یہ دونوں بھائی ہمارے حضرت سے پہلے حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادی سے اصلاحی تعلق رکھتے تھے اور حضرت مولانا سراج احمد صاحب امروہوی سے مولوی فاروق صاحب نے تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ پھر حضرت الہ آبادیؒ کے وصال کے بعد ہمارے حضرتؒ سے دونوں کا تعلق ہوگیا۔ حافظ حنیف صاحب بہت دیندار اور نیک سیرت انسان تھے جلد ہی اس دنیا سے سفر آخرت فرما گئے مولانا فاروق صاحب کی صلاحیت واستعداد میں انکی تربیت کو بھی خاص دخل تھا اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے ان کے بعد مولانا محمد فاروق صاحب بیچارے گویا تنہا رہ گئے لیکن کچھ تو انکی سلامتی طبع اور ذاتی استعداد پھر حق تعالیٰ کے فضل وکرم اور آخر میں حضرت مصلح الامتؒ کی تربیت نے اپنا پورا کام کیا کہ ؎

آہن کہ بہ پارس آشنا شد　　فی الحال بصورتِ طلا شد

نیز مزاج میں اسم فاروق نے بھی پورا اثر کر رکھا تھا یعنی فارق بین الحق والباطل کے کامل مظہر تھے۔ طباعی اور تیزی کے ساتھ ساتھ حکیم الامتؒ کی کتب کے غامض مطالعہ نے محققانہ اور مناظرانہ مزاج بنا دیا تھا۔ پھر ماحول بھی مولانا کو بدعت نواز ملا اسلئے زمانہ طالب علمی ہی سے ہر مسئلہ پر بحث ومباحثہ، عقلی ونقلی دلیل پیش کرنا اور دوسروں سے بھی طلب کرنا طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ بہرحال انکے اطراف میں اسی نوع کے عالم کی ضرورت بھی تھی چنانچہ اللہ تعالےٰ نے مولانا سے بڑا کام لیا جسکی تفصیل کے لئے حالات مصلح الامۃ کے صفحات

متحمل نہیں۔ اور بقول قائل شنیدہ کے بود مانند دیدہ انکی دینی محنت اور انکے ثمرات، ایک گاؤں کے اندر لوگوں کی دینداری۔ وضع قطع صالحانہ۔ آبادی مسجد اور عربی مدرسہ کا قیام۔ نیز علم دین کے طلبہ اور طالبین کی ہماہمی کا مشاہدہ آج بھی برائے العین کیا جا سکتا ہے۔

حضرت والا سے تعلق کے بعد ہی سے عموماً اور بالخصوص حضرت اقدسؒ کے الہ آباد میں قیام فرمانے کے بعد سے مولانا محمد فاروق صاحب کا جذبۂ اخلاص بھی ترقی کرتا رہا اور اسی کے بقدر حضرت اقدس کے ساتھ انکا تعلق بھی بڑھتا گیا۔ چنانچہ حضرت والا کبھی کبھی مولوی فاروق صاحب کے تعلق کے لحاظ سے اتراؤں بھی تشریف لیجانے لگے۔ کبھی خود مولوی فاروق صاحب ہی درخواست کرتے اور ہمراہ لوا جاتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حضرت اٹھتے اور مولوی عبدالمجید صاحب کا یا کسی اور کا ہاتھ پکڑتے اور فرماتے چلوا تراؤں چلیں۔ غرض حضرت اقدس کے اس طرح اچانک پہونچ جانے سے وہاں عید ہو جاتے کا منظر مولوی صاحب اکثر بیان فرماتے تھے۔ چونکہ یہاں کے عوام بھی مولوی صاحب کے تربیت یافتہ تھے اور طلبہ تو ماشاء اللہ بہت ہی مہذب اور فہیم تھے اسلئے حضرتؒ کو یہاں بہت آرام ملتا پھر ماشاء اللہ ان سب پر مولوی صاحب کا حسن انتظام جسے مولوی صاحب موصوف نے حضرت تھانویؒ کے حالات و ملفوظات اور خود اپنے حضرت اقدس کی تربیت سے سیکھا تھا، یہ اور حضرت والا کے لئے راحت رساں ثابت ہوتے۔ چنانچہ جانے کو تو حضرت متعدد جگہ تشریف لے گئے لیکن الہ آباد سے باہر کہیں جانے کا مقصد یہیں حاصل ہوتا تھا۔ اسی بناء پر کبھی کبھی یہ فرمادیا کرتے تھے کہ مولوی فاروق! میں نے الہ آباد میں گھر لے لیا ہے اگر کہیں و یہاں میں رہنے کا ارادہ ہوا تو یہیں اتراؤں میں گھر بنواؤں گا۔

غرض یہاں ع یہاں کے سکون کے علاوہ طلبہ کا مجمع اور متشرع صورت انسانوں کا اجتماع مولوی فاروق کا حسن نظم، لوگوں کا ایثار ان ساری چیزوں نے اس بستی کے قیام کو موزوں و راحت رساں بنا دیا تھا۔

یہی اتراؤں وہ بستی ہے جہاں حضرت حکیم الاسلام جناب قاری محمد طیب صاحبؒ نے حضرت اقدس مصلح الامۃؒ سے آکر ملاقات فرمائی اور اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ حضرت سے یا تو بچپن کی ملاقات تھی یا اب بچپن میں ہوئی ہے اور اسی مقام کے متعلق غالباً مولوی فاروق صاحب کو حضرت قاری صاحبؒ نے لکھا تھا کہ — اتراؤں کا سفر الحمدللہ نہایت ہی پرسکون اور بہت سے دینی منافع کا سبب بنا اس پر میں جسقدر بھی اتراؤں کم ہے (اوکما قال)

اس شمارہ کی "تعلیمات مصلح الامت" میں آئے ہوئے ملفوظات نیز گذشتہ شمارہ کے ملفوظات زریں اسی اتراؤں میں ارشاد فرمائے گئے ہیں چونکہ حضرت قاری محمد طیب صاحب گورکھپور کیطرف سے واپس تشریف لائے تھے اور اسی ریلوے لائن پر سید آباد (اتراؤں کا ریلوے اسٹیشن) واقع تھا اس خیال سے بھی نیز یہاں مولانا محمد فاروق صاحب کے ذریعہ انکی رہائش اور آرام کا بھی اچھا انتظام ہو سکتا تھا پھر یہ کہ وہ حضرت والا سے ملاقات کے طالب ہو کر تشریف لا رہے تھے شہر الہ آباد میں آکر مطلوب ہو جاتے ان مصالح کی بنا پر حضرت نے جائے ملاقات اتراؤں ہی کو تجویز فرمایا۔

غرض اور تمام مقامات سے زائد حضرت اتراؤں تشریف لے گئے اور بمرولی بھی متعدد بار گئے اس کے علاوہ حضرت نے غالباً دو بار چائل کا بھی سفر فرمایا حافظ محمد شفیع صاحب حضرت والا سے محبت کرتے تھے چائل کے باشندے تھے انھوں نے حضرت سے درخواست کی کہ حضرت ہمارا تعلق حضرت مولانا مدنیؒ سے تھا چنانچہ حضرت جب کبھی الہ آباد تشریف لاتے یا ادھر سے گذرتے تو خادم کے غریب خانہ پر ضرور تشریف لاتے وعظ فرماتے دو ایک دن روح پرور دینی مجلسیں ہوتیں اور عام لوگوں کو نفع ہوتا تھا لیکن حضرت مولانا مدنیؒ کے بعد یہ سلسلہ فیض و افادہ ختم ہو گیا اس لئے جی چاہتا ہے کہ حضرت کبھی کبھی چائل غریب خانہ پر تشریف لیچلیں

تو دیہات کی فضا سے انشاء اللہ حضرت والا کو بھی راحت ہوگی اور ہم لوگوں کو دینی نفع حاصل کرنے کا ایک موقع ہاتھ آجائے گا اور بزرگوں کی آمدورفت کا سلسلہ جو اب بند ہے مسلسل ہوجائے گا۔ حضرت اقدس نے بھی (چونکہ محبت کا جواب محبت ہوتی ہے) انکی درخواست قبول فرمالی اور پھر شاید دو بار چپائل تشریف لے گئے جن میں سے ایک دفعہ تو راقم بھی ہمراہ سفر تھا اور بہت سے باہر کے مہمان اور علماء حضرات جو حضرتؒ کے یہاں آئے ہوئے تھے وہ بھی شریک سفر تھے چنانچہ یاد پڑتا ہے کہ مئو اعظم گڈھ کے مدرسہ دارالعلوم کے ایک اعلیٰ مدرس جناب قاری ریاست علی صاحب نے وہاں جمعہ کے بعد جامع مسجد میں حضرت اقدس کے حکم سے تقریر بھی کی تھی اس لئے کہ حافظ محمد شفیع صاحب نے حضرتؒ سے وہاں کسی کی تقریر کی خواہش ظاہر کی اور عرض کیا کہ حضرت یہاں اہل بدعت کی بھی خاصی تعداد ہے پہلے بھی اور اب بھی یہ لوگ ہم لوگوں کے متعلق بہت پروپاگنڈہ کر رہے ہیں کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے۔ بزرگوں کے منکر ہیں لہٰذا کوئی صاحب اگر آج جمعہ کے بعد مسجد میں کچھ تقریر فرمادیں تو عام لوگوں کو بھی کچھ دین کی باتیں سننے کا موقع مل جائے گا اور ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں سے انکی غلط فہمی دور ہوجانے کا ذریعہ ہوجائے، حضرت کی مجلس میں تو صرف خاص ہی خاص لوگ آتے ہیں۔ چنانچہ حضرتؒ نے قاری ریاست علی صاحب سے فرمایا کہ آپ کچھ کہہ دیجئے گا۔ الحمد للہ قاری صاحب کے وعظ کا بہت ہی اچھا اثر پڑا جس کا اندازہ اس سے ہوا کہ اگلے دن مجلس میں مقامی لوگ زیادہ آئے۔ اس طرح سے حضرت والاؒ نے اپنے بزرگوں کے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری فرمائی لیکن خود الہ آباد کے مشاغل اسقدر کثیر تھے کہ اسکی وجہ سے وہاں زیادہ آنے جانے کا موقع نہ مل سکا۔ یہ چھوٹے چھوٹے اسفار تو حضرت والاؒ کے الہ آباد سے شرقاً وغرباً

ہوئے یعنی اترائوں شہر سے مشرق میں واقع تھا اور بمرولی، اسرولی شہر سے بجانب مغرب واقع تھا اسکے علاوہ حضرت شہر کے شمالاً وجنوباً بھی کبھی کبھی تشریف لیجاتے تھے جنوب سے مراد مہیوہ کا سفر ہے یہ دریائے جمن کے پارلب دریا ایک چھوٹا سا موضع ہے دریا کے بالکل کنارے پر ایک مسجد بنی ہوئی ہے دیکھنے والوں نے بیان کیا کہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جب الہ آباد تشریف لاتے تو یہاں بھی آتے تھے اور ایک آدھ شب مسجد سے باہر دریا کی جانب ایک پختہ چبوترہ تھا اس پر حضرت کا پلنگ بچھتا تھا اور حضرت آرام فرماتے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ الہ آباد کے مشہور ٹھیکیدار شیخ عبداللہ صاحب مرحوم اسی بستی مہیوہ کے رہنے والے تھے ان کے صاحبزادے مولوی مسیح الدین صاحب مرحوم حضرت مولانا تھانوی رح کے شاگرد تھے جنھوں نے غالباً کانپور میں حضرت رح سے پڑھا تھا اسی تعلق سے حضرت یہاں تشریف لاتے تھے اور اسی نسبت کی وجہ سے شہر الہ آباد میں اکثر حضرت اقدس مولانا تھانوی رح نے مسجد شیخ عبداللہ مرحوم واقع ریلوے اسٹیشن الہ آباد پر ہی قیام فرمایا اور اکثر مواعظ آپ کے اسی مسجد پر ہوئے یہ مسجد بھی انھیں شیخ عبداللہ صاحب مرحوم کنٹریکٹر ریلوے کی بنوائی ہوئی ہے۔ یوں حضرت تھانوی رح کا الہ آباد میں قیام اور وعظ عبدالباقی خانصاحب مرحوم ساکن چک الہ آباد کے یہاں بھی ہوا اسلئے کہ خانصاحب کا حضرت اقدس سے بیعت کا تعلق تھا۔ چنانچہ اس شاگردی اور اس بیعت کا اثر آج تک ان دونوں حضرات کے خاندان میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے یعنی حضرت تھانوی رح سے عقیدت اور حضرت رح کے سلسلہ سے محبت آج بھی ان میں پائی جاتی ہے۔

پس کبھی کبھی حضرت والا از خود رکشہ پر کسی کو ہمراہ لیکر ۴-۵ میل سفر طے فرماکر مہیوہ تشریف لیجاتے تھے اور وہاں کے لوگ غایت ادب و تعظیم

وتکریم کے ساتھ پیش آتے ۔ اسی طرح سے شمال کی جانب تقریبًا ۳ میل کے فاصلہ پر الہ آباد یونیورسٹی کے پاس محلہ کٹرہ واقع ہے جو شہر ہی کا ایک محلہ ہے کوئی دیہات تو نہ تھا مگر یہاں مسجد بینا شاہ کے امام جناب قاری حبیب احمد صاحب مظاہری حضرت کے دست گرفتہ تھے اس لئے حضرتؒ کبھی کبھی خاصکر جمعہ کے دن مجلس کے بعد وہاں بھی چلے جاتے قاری صاحب کے حجرے میں استراحت فرماتے اور نماز جمعہ کے بعد واپس تشریف لاتے اس مختصر سے سفر میں دیہات کا سا لطف وانشراح تو نہ ہوتا تاہم مجمع سے الگ ہونے کیوجہ سے خلوت کی یکسوئی اور اسکا سکون ضرور حاصل ہو جاتا تھا اسی جگہ کا وہ واقع ہے جو ہم نے پہلے بھی کہیں عرض کیا ہے کہ ایکدن قاری صاحب کے حجرہ میں حضرت والا لیٹے ہوئے تھے ایک جانب قاری حبیب احمد صاحب بیٹھے تھے ایک جانب مولوی عبدالمجید صاحب بیٹھے تھے حضرت والاؒ قاری حبیب احمد صاحب کی جانب رخ کرکے باتیں فرما رہے تھے کہ اسی اثنار میں قاری صاحب نے حضرت اقدس کے تعب اور تکان سفر کو محسوس کرکے مولوی عبدالمجید صاحب سے کہا کہ حضرت کیلئے تو ضرورت تھی ایک کار کی جو دروازہ پر کھڑی رہتی اور جب اور جہاں حضرت تشریف لیجانا چاہتے اس میں بیٹھکر تشریف لیجاتے آپ کے پاس کار تھی تو بہت آرام تھا اب آپنے اسکو بیچ دیا ۔ بطور اپنی دلی خواہش کے قاری صاحب نے مولوی صاحب سے اسکا اظہار کیا مولوی صاحب تو اسکا کیا جواب دیتے خاموش تھے حضرت نے بھی اسکو سن لیا بس فوراً کروٹ عبدالمجید صاحب کی طرف بدل لی اور ان سے فرمایا کہ مولوی عبدالمجید! میں نے یہ جو اتنا بڑا مکان خریدا ہے وہ محض بچوں کے لئے تاکہ میرے بعد وہ یہ نہ کہیں کہ مجھکو میرے باپ نے پردیس میں لاکر گھر سے بے گھر کردیا اس لئے میں نے یہ مکان خریدا ہے کچھ اپنی راحت مقصود نہیں تھی کیونکہ میرے لئے تو کسی مسجد کا بس اتنا بڑا حجرہ کافی تھا۔ قاری صاحب کہتے تھے کہ حضرت کے منہ سے یہ جواب

سنکر میرے ہوش اڑ گئے اور میں تو پانی پانی ہوگیا اور مجھے افسوس ہوا کہ میں نے یہ اظہار تمنا کیوں کردیا۔

غرض اس طرح سے الہ آباد کے چاروں جانب شرقاً وغرباً اور شمالاً وجنوباً جو حضرتؒ نے دورہ فرمایا تو شاید اس میں یہ مصلحت بھی ہو کہ اللہ تعالیٰ کے دین کا چرچا پورے شہر اور اطرافِ شہر میں عام ہو جائے اور لوگ دین اختیار کریں۔ چنانچہ بعد میں اسکے آثار بھی دیکھے جا رہے ہیں کہ اترا ؤں کے مولانا محمد فاروق صاحب اور وہاں کے دیندار عوام اور اسی طرح سے بمرولی کے چودھری حبیب الرحمان مرحوم (جب تک زندہ رہے) اور اسرولی کے مولوی مقبول صاحب، اسی طرح اہل ہیوہ اور کٹرہ کے قاری حبیب احمد صاحب مدظلہ یہ سب حضرات رفاقتِ خانقاہ کا حق حضرت اقدسؒ کے بعد بھی اسی طرح سے انجام دے رہے ہیں جس طرح حضرت کی حیات میں دیتے تھے۔ اللہ تعالےٰ سب کو اپنا تعلق نصیب فرمائے اور دین اور اہل دین کی محبت ان کے قلوب میں پیدا فرمادے۔ آمین۔

الہ آباد ہی کے زمانہ قیام میں حضرت والاؒ نے ایک سفر فتحپور ہسوہ کا بھی فرمایا۔ یوں تو حضرت اقدس کے تمام ہی اسفار الہ آباد ہی سے ہوئے سفر علی گڈھ۔ سفر جونپور۔ سفر کوپا گنج۔ سفر وطن۔ سفر لکھنؤ اور اسفار بمبئی ان میں سے ہر جگہ کا سفر اپنی جگہ ایک مستقل شان رکھتا تھا اس لئے ہم نے ان سب کیلئے الگ الگ مستقل عنوان قائم کرکے وہاں کے حالات بیان کئے ہیں اور سفر فتحپور ایک مختصر سا سفر تھا جو اتفاقی طور پر پیش آگیا تھا اس لئے اسکا ذکر الگ سے نہیں کیا گیا بلکہ الہ آباد کے اطراف کے سفروں کے منجملہ شمار کرکے انھیں کے بیان کے ساتھ اسکا بیان کردینا بھی مناسب معلوم ہوا۔

فتحپور کی مشہور ترین شخصیت اس زمانہ میں مولانا عبدالوحید صاحب مدظلہ مدرس مدرسہ اسلامیہ (فتحپور) کی تھی جو کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح

کے شاگرد رشید تھے اور حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے طریق سے وابستہ
اور حضرت کے بیحد معتقد تھے غالباً حضرت تھانویؒ ہی کے اس حکم سے کہ اب میں
کام کے لائق نہیں رہا میرے خلفاء میں سے کسی سے رجوع کیجئے، مولانا عبدالوحید
صاحب نے اپنا اصلاحی تعلق حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ الہ آبادی سے قائم
فرمایا لیکن حضرت مولانا تھانویؒ کے بعد مولانا الہ آبادی بھی زیادہ دنوں زندہ
نہ رہ سکے چنانچہ مولانا کو شیخ کی ضرورت تھی لیکن ہنوز کسی کا انتخاب نہ کیا تھا
کہ اسی اثناء میں راقم نے جو (اُن دنوں) مدرسہ اسلامیہ فتحپور (ہسوہ) ہی میں مدرس تھا
فتحپور تال نرجا (اعظم گڈھ) کا پہلا سفر کیا۔ واپسی پر جیسا کہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ
لوگ حالات اور تاثرات معلوم ہی کرتے ہیں مولانا عبدالوحید صاحب نے بھی
حضرت مصلح الامۃ مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے حالات دریافت کئے
راقم نے آپ بیتی اور آنکھ دیکھی سنادی غالباً اسی سے مولانا عبدالوحید صاحب
نے متاثر ہوکر حضرت والا سے مکاتبت شروع کردی۔ مجھے یاد ہے کہ اس سلسلہ
میں مولانا عبدالوحید صاحب نے ایک دفعہ حضرتؒ سے یہ بھی دریافت کیا کہ یہاں
فتحپور (ہسوہ) میں ایک مولوی صاحب ہیں جو اپنی تقریروں میں یہ کہتے ہیں کہ
حضرت تھانویؒ کو سیاست سے پہلے اختلاف ضرور تھا لیکن اگر آج حضرتؒ
موجود ہوتے تو انہیں شرکت فرماتے اور فلاں جماعت کو مناسب تصور فرماتے
آپ بھی چونکہ حضرت تھانویؒ کے مزاج شناس رہ چکے ہیں اسلئے آپ سے استصواب
کرنا چاہتا ہوں کہ کیا ان مولوی صاحب کا یہ کہنا درست ہے۔ حضرت اقدسؒ نے
فتحپور نرجا سے اسکا یہ جواب مرحمت فرمایا کہ وہ صاحب بالکل غلط کہتے ہیں حضرت
تھانویؒ کا جو مزاج اور اصول تھا اسکے پیش نظر یہ البتہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرتؒ
اگر آج موجود ہوتے تو اپنے مسلک میں اور سخت ہوجاتے اور مسلمانوں کے لئے
سیاست حاضرہ میں شرکت بالکل پسند نہ فرماتے۔ (مولانا صاحب موصوف
اور حضرت اقدس کا یہ سوال وجواب روایۃ بالمعنی کے طور پر ہے الفاظ ہوسکتا ہے

کچھ بدل گئے ہوں لیکن مفہوم یہی تھا۔ چنانچہ مولانا کی یہ مکاتبت کسی اخبار میں میں نے خود دیکھی تھی)۔

مولانا موصوف کے اسی سوال فرمانے کی بنا پر راقم جب فتحپور ہسوہ سے فتحپور تال نرجا حضرت اقدس کے پاس حاضر ہوا تو حضرت نے دریافت فرمایا کہ یہ آپ کے یہاں مولانا عبدالوحید صاحب کون ہیں؟ چنانچہ احقر نے مولانا کی تعریف یا تعارف جو سمجھ میں آیا تفصیل سے حضرت سے عرض کیا اسکی وجہ سے حضرت کو بھی مولانا کی جانب غائبانہ توجہ ہوگئی تھی بالآخرہ تعلق بعیت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور بعض حالات مولانا کے ہم حضرت والا کے قیام گورکھپور کے بیان میں لکھ چکے ہیں کہ حضرت اقدس نے فتح الباری کے درس کے لئے اپنی علالت کے زمانہ میں اپنا بدل مولانا ہی کو تجویز فرمایا۔ مولانا کی استعداد اور صلاحیت کے پیش نظر حضرت اقدس نے کئی بار مولانا سے اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ مولانا کچھ دنوں کے لئے مستقل طور سے حضرت کے یہاں قیام کریں لیکن مولانا کی ضعیف والدہ اور پھر انکی علالت و خدمت نے مولانا کو فتحپور (ہسوہ) سے باہر کہیں جانے کی اجازت ہی نہیں دی۔

فتحپور (ہسوہ) کا سفر حضرت اقدس کو یوں پیش آیا کہ مولانا عبدالوحید صاحب فتحپوری کے غالباً خالہ زاد بھائی اور بہنوئی (جو اب راقم الحروف کے بھی سمدھی ہوگئے ہیں یعنی) جناب سید فخر الحسن صاحب حضرت اقدس سے بعیت تھے ایک دن حضرت سے ملنے کے لئے مع اپنی اہلیہ کے تشریف لائے، حضرت کا بہت ادب کرتے تھے اور حضرت بھی ان سے بہت محبت کے ساتھ پیش آتے تھے چنانچہ حضرت نے ان سے فرمایا کہ کہئے تو ہم آپ کے ساتھ فتحپور چلیں انھوں نے عرض کیا کہ حضرت کی خدمت کی صلاحیت تو اپنے اندر پاتا نہیں تاہم حضرت کا گھر ہے اگر تشریف لیچلیں تو زہے نصیب اور اسکو میں اپنے لئے انتہائی سعادت سمجھوں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ اپنے گھر میں بھی مشورہ کرلو اور تیار رہنا گاڑی

کے اوقات بھی معلوم کر لو اور جس وقت ہم کہیں فوراً چلے چلنا اب خدا معلوم حضرت اقدس کو کس بات کا انتظار تھا تاہم اپنا خیال تو یہی ہے کہ ان حضرات کا مسلک تو یہ ہوتا ہے کہ ؎

رشتۂ درگردنم افگندہ دوست　　　　می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ دوست کی جانب سے گلے میں رسی پڑی ہوئی ہے بس جہاں اسکی مرضی ہوتی ہے کھینچ کرلے جاتا ہے نہ اپنی رائے سے کچھ کرتے ہیں نہ اپنی رائے سے کچھ کہتے ہیں بلکہ اشارۂ غیبی جسکا دوسرا نام انشراح قلب ہے اسکے منتظر رہتے ہیں جب انشراح پاتے ہیں تب ہی کوئی کام کرتے ہیں ورنہ ذراسی کھٹک بھی ہوتی ہے تو اس کام سے باز رہتے ہیں۔ چنانچہ اگلے دن صبح کی گاڑی سے سفر کرنا طے ہوا۔ راقم السطور بھی ہمراہ تھا اور اسکے علاوہ دو ہی ایک آدمی اور تھے۔ چونکہ حضرت نے علی الصباح اپنا فیصلہ ظاہر فرمایا اس لئے اسکا بھی موقع نہ تھا کہ بذریعہ تار ہی مولانا عبدالوحید صاحب کو حضرتؒ کے تشریف بری کی اطلاع کیجا سکے نتیجہ یہ ہوا کہ اچانک نو دس بجے دن کے وقت حضرت اقدسؒ کا رکشا مولانا عبدالوحید صاحب کے مکان پر موجود تھا۔ مولانا جب اندر سے نکلے تو بلا شان و گمان حضرت والا کو دیکھکر محو حیرت رہ گئے جلدی سے اندر جاکر باہر کمرے میں پلنگ اور بستر کا انتظام کرکے فوراً حضرت اقدس کو لیجاکر بٹھایا۔ ہم لوگوں سے دریافت کیا کہ خیریت تو ہے یہ اچانک حضرت نے سفر کیسے فرمایا؟ ان سے پوری تفصیل عرض کی گئی تب انھیں جاکر اطمینان ہوا۔ پھر اسکے بعد دیگر انتظامات میں مشغول ہوگئے۔ ہمراہ جانے والے مہمانوں کے لئے جائے قیام تجویز کیا۔ اور فوراً عمائدین شہر کو حضرت کی تشریف آوری کی اطلاع دی چنانچہ خبر پاتے ہی لوگ زیارت و ملاقات کے لئے حاضر ہونے لگے بعد ظہر مدرسہ اسلامیہ کی مسجد میں مجلس کا اعلان ہوا لوگ وہاں بھی حاضر ہوئے۔ چنانچہ پہلی مجلس مدرسہ ہی کی مسجد میں ہوئی۔ (مدرسہ کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے حضرتؒ نے فرمایا کہ اب مجھے یاد آیا اسجگہ میں حضرت تھانوی کے ہمراہ ایکبار آچکا ہوں)

خیال تھا کہ حضرت کے لئے اور آنے جانے والوں کے لئے مدرسہ ہی میں قیام مناسب رہیگا لیکن حضرت والا نے کسی وجہ سے وہاں کا قیام پسند نہیں فرمایا بلکہ مولانا عبدالوحید صاحب کے مکان کی بیٹھک اور باہری مختصر سے صحن میں آرام فرمایا۔ صبح کو یہیں مجلس کا بھی انتظام ہوا اور اسکے بعد تقریباً سارے دن ہی آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ بہت سے لوگ بیعت ہوئے بہت سے زیارت سے مستفید ہوئے۔ ایک صاحب جو غالباً پوسٹ ماسٹر تھے دمہ کے مریض تھے وہ تو حضرت کو پاکر اتنا خوش ہوئے کہ ہر وقت بیٹھے ہی رہتے تھے حضرت والاؒ نے بھی انکی قدر فرمائی اور اجازت دیدی کہ جب تک آپ کا جی چاہے بیٹھے رہیے آپ ہی لوگوں کی خدمت کے لئے تو آیا ہوں۔ وہ بھی یہی کہتے تھے کہ مولوی عبدالوحید صاحب! حضرت کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے بھیجا ہے ہم مریض آدمی کسی قابل نہیں رہ گئے، یہ خدا کا انتہائی کرم ہوا کہ میاں کو یہاں بھیجدیا۔ یہ صاحب حضرت سے بیعت بھی ہوئے اپنے بچوں کے لئے متعدد تعویذ بھی حضرت سے لکھوائے چنانچہ انکی اس وارفتگی اور محبت کا راز بعد میں معلوم ہوا اس طور پر کہ حضرت کی واپسی کے چند ہی ایام یا ماہ کے بعد انکا انتقال ہوگیا اس سے پتہ چلا کہ جس کا حصہ جس کے یہاں مقدر ہو چکا ہوتا ہے کس کس طرح اللہ تعالیٰ اسکو حصۂ مقدور پہونچاتے ہیں۔ غرض اسی دن یا دوسرے دن صبح کو حضرت کی واپسی ہوگئی اور فتحپور کے قصبات و دیہات میں حضرت کے تشریف لانے کی اطلاع اسوقت پہونچی جس دن حضرت وہاں سے روانہ ہورہے تھے ورنہ جگنی، مسی، عالم گنج اور نوادہ سے خلقِ کثیر زیارت کے لئے آجاتی اسلئے کہ وہاں کے لوگ پہلے سے مولانا سید ظہور الاسلام صاحبؒ سے وابستہ تھے اور الہ آباد آجانے پر حضرت والا سے بھی غائبانہ واقف تھے۔ اور اللہ والے متخلق باخلاق اللہ تو ہوتے ہی ہیں تو جس طرح سے حق تعالیٰ کا معاملہ ہے کہ جب کوئی بزرگ عالم میں مشہور ہوا اور جہاں اسکا کام پھیلا بس اسکو اپنے پاس

بلا لیتے ہیں یہی حال ان حضرات کا بھی دیکھا جاتا ہے کہ شہرت سے اسقدر بھاگتے ہیں اور اس کے فتنہ سے مفتون ہونے سے اتنا بچتے ہیں کہ جہاں انکی شہرت ہوئی اور لوگ رجوع ہوئے بس اس بستی ہی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ بہرحال فتحپور کا یہ مختصر سا سفر اپنے کوائف اور لطائف کی رو سے بہت خوب رہا فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

بھائی فخر الحسن صاحب جنکے ہمراہ حضرتؒ فتحپور تشریف لے گئے تھے کہتے تھے کہ میں بسلسلہ ملازمت کانپور میں تھا وہاں ایک جگہ موقع سے پلاٹ فروخت ہو رہا تھا تو میں نے خیال کیا کہ ایک پلاٹ میں بھی لے لوں اور یہیں مکان بنوا کر رہوں اسکے لئے میں نے حضرت کو لکھا مگر کسی وجہ سے وہاں زمین نہ لے سکا۔ خیر بات آئی گئی ہوگئی، اسکے بعد جب حضرت فتحپور تشریف لائے تو حضرت کو میرا وہ لکھنا یاد تھا مجھے بلایا اور فرمایا کہ تم سے کہتا ہوں کہ تم مکان یہیں فتحپور میں بنوانا۔ میں کچھ نہ سمجھا کہ یہ حضرت کیوں فرما رہے ہیں اسوقت تو حضرتؒ سے عرض کردیا کہ بہت اچھا لیکن برابر متردد رہا کہ فتحپور میں وہ بھی کسی موزوں محلہ میں بھلا مکان یا زمین مجھے کیونکر مل سکے گی استنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرتؒ کا مشورہ حقیقت بن کر سامنے آگیا اور مولانا عبدالوحید صاحب کے مکان سے تقریبًا بالکل متصل ایک بہت بڑی زمین جس پر کچھ کھنڈرات رہ گئے تھے فروخت ہونے لگی اللہ تعالےٰ نے باوجود بے سروسامانی کے ہمت دیدی اور میں نے حضرت سے کئے ہوئے وعدہ کے بموجب اسکو خریدنے کا عزم کرلیا پھر کچھ نہ پوچھیے کہ اللہ تعالےٰ نے کس طرح غیب سے رقم کی فراہمی کا انتظام فرما دیا۔ چنانچہ الحمدللہ اب پنشن کے بعد یہاں بڑے سکون اور راحت کی زندگی اپنے عزیزوں میں دیندارانہ ماحول میں گذار رہا ہوں اور اب جاکر حضرتؒ کی وہ بات سمجھ میں آئی کہ نہیں جی تم یہیں فتحپور میں مکان بنوانا۔ اس طرح سے ایک نیک اور مفید مشورہ عطا فرما کر حضرت والا نے انکی محبت کا نقد صلہ انکو مرحمت فرما دیا۔

الہ آباد کے علماء اور مشائخ

اور حضرت مصلح الامتہ رح

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضرت اقدس رح نے علاج کے سلسلے میں الہ آباد کو لکھنؤ پر کیوں ترجیح دی حالانکہ یہاں صرف دو ہی طبیب مشہور تھے ایک مولانا حکیم سید فخر الدین صاحب جعفری اور دوسرے حکیم عثمانی صاحب بانی جامعہ طبیہ الہ آباد اور لکھنؤ تو ماشاء اللہ طبیبوں کا دیس ہی تھا۔ چنانچہ جس طرح یہاں اطبائے یونانی کی قلت تھی اسی طرح سے طبیب روحانی بھی یہاں شاذ و نادر ہی رہ گئے تھے اور جو تھے بھی تو بہت ہی زیادہ گمنام اور گوشۂ خمول میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور دیگر سلاسل کا حال تو معلوم نہیں خاص اپنے سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے لوگوں میں سے یہی دو تین حضرات کا چرچا تھا۔ ایک تو یہی ہمارے حکیم مولانا شاہ سید فخر الدین احمد جعفری رح تھے کہ انکے یہاں سلسلۂ بیعت اور تعلیم و تربیت باطنی ذکر و اشغال کا کچھ معمول تھا لیکن خود حکیم صاحب کی زیادہ شہرت طب میں تھی شیخ طریقت کے اعتبار سے چند ہی حضرات تھے جو دست گرفتہ تھے اور جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ہم لوگوں کو باوجودیکہ حضرت حکیم صاحب موصوف سے بہت قرب تھا کہ انھیں کے قائم کردہ مدرسہ عالیہ مصباح العلوم سے والد صاحب رح نے فاضل و کامل کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن ہم کو حضرت حکیم صاحب کا یہ حال نہ معلوم ہو سکا تھا کہ حکیم صاحب رح نے اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی رح خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رح قدس سرہٗ کے وصال کے بعد ہمارے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رح سے رجوع فرمانا چاہا تھا (جسکی تفصیل ہم پہلے لکھ چکے ہیں) اس لحاظ سے تو حضرت حکیم صاحب رح بالکل اپنے ہی سلسلہ اور مسلک کے

تھے مگر افسوس ہم اس سے انکی زندگی میں نہ واقف ہو سکے۔ غرض ایک تو آپکی ذات تھی جو یہاں کچھ فیض پاشی فرما رہی تھی۔

دوسرے آپ کے شیخ و مرشد حضرت مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ کا گھرانا تھا جو حضرت الہ آبادیؒ کا اثر لئے ہوئے تھا اور اپنے مخصوص طرز پر دین کا کام کرتے ہوئے ایک زمانہ تک الہ آباد کا دینی مرکز شمار کیا جاتا تھا حضرت مولانا الہ آبادی کے صاحبزادے مولانا شاہ ولایت حسین صاحبؒ ہی سے تصدیق رویت ہلال کر کے کلکٹر عید و بقرعید کی تعطیل کا اعلان کرتا تھا عیدگاہ کی امامت بھی آپ ہی سے متعلق تھی اور آپ کے بعد آج بھی یہ امور یعنی رویت ہلال کی تصدیق اور امامت عیدگاہ وغیرہ حضرت مولانا الہ آبادیؒ کے نبیرۂ کلاں حضرت مولانا محمد میاں صاحب فاروقی الہ آبادی سے متعلق ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا الہ آبادی چونکہ حضرت مولانا اشرفعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی تھے اسلئے ان کے صاحبزادے یعنی مولانا ولایت حسین صاحب نے اپنے صاحبزادے یعنی مولانا محمد میاں صاحب مدظلہ کو برائے تعلیم و تربیت کچھ دنوں کے لئے تھانہ بھون بھی بھیجا تھا۔ ہمارے حضرت مصلح الامتؒ سے ابتدائی ملاقات مولانا محمد میاں صاحب کی یہیں تھانہ بھون ہی میں ہوئی تھی اسی انس و تعلق کا وہ اثر تھا جو آپ آئندہ سطور میں مولانا محمد میاں صاحب مدظلہ کے تعلقات کے سلسلہ میں ملاحظہ فرمائیں گے کہ حضرت اقدسؒ سے کسقدر عقیدت و محبت کا مظاہرہ فرمایا ہے۔

ان دو جگہوں کے علاوہ ایک تیسری جگہ اور بھی تھی جسے سلسلۂ چشتیہ صابریہ سے خاص شرف تعلق حاصل تھا اور وہ تھی شیخ اکبر ثانی حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی قدس سرہٗ کی خانقاہ اور حضرتؒ کی اولاد و احفاد کا سلسلہ جنکی خدمات سے حضرت شیخ قدس سرہٗ کے بعد سے لیکر آج تک الحمدللہ دائرۂ شیخ محب اللہ الہ آبادی قدس سرہٗ خالی نہیں رہا۔ چنانچہ حضرت اقدس شیخ محب اللہ

الہ آبادیؒ کے آٹھویں سجادہ نشین حضرت مولانا حکیم شاہ نعمت اللہ صاحبؒ ہوئے آپکے حالات میں لکھا ہے کہ ابتدائی تعلیم مختلف حضرات سے حاصل کی کچھ دنوں کانپور میں بھی تعلیم حاصل کی پھر فرنگی محل تشریف لے لئے اور فرنگی محل میں مولانا عین القضاۃ صاحبؒ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ ۔ مولانا عبدالباقی صاحب فرنگی محلیؒ سے کچھ کتابیں پڑھیں پھر وہاں سے مدرسہ عبدالرب دہلی تشریف لے گئے اور وہاں مولانا عبدالعلی صاحبؒ سے اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ سے تفسیر و حدیث پڑھی نیز وہیں حکیم عبدالمجید خانصاحب سے طب کی سند بھی حاصل کی اور پھر اپنے وطن الہ آباد ہی واپس آ گئے۔ آپکو اپنے والد ماجد سے خرقہ و خلافت ملی جو حضرت شیخ کی اولاد ہی میں سے تھے۔ آپکی کوئی اولاد نہ تھی اسلئے اپنے برادر معظم شاہ رحمت اللہ صاحبؒ کے صاحبزادے حافظ شاہ عبید اللہ صاحب مدظلہ العالی کی تعلیم و تربیت میں کوشاں رہے اور اپنے سفر حج میں روانگی سے پہلے انکو سجادگی عطا فرمائی جو بحمداللہ اسوقت موجود ہیں۔ بڑے زندہ دل، متواضع اور خوش مزاج انسان ہیں۔ ہمارے حضرت مصلح الامۃؒ کی خدمت میں بھی نیازمندانہ حاضری دیتے تھے حضرت والا بھی ان سے بیحد محبت فرماتے تھے اور ہمارے حضرتؒ کا تو یہ خاص مزاج ہی تھا کہ مشائخ کی محبت و ادب سے قلب معمور تھا اسلئے جیساکہ مشہور ہے کہ مجنوں کو لیلیٰ کی گلی کے کتے سے بھی محبت تھی ہمارے حضرتؒ کو اپنے سلسلہ کے بزرگوں سے خصوصی طور سے ایسی محبت اور شفقت تھی کہ اس دیار کا کوئی ادنیٰ سا انسان بھی ملجاتا تو اسکے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرماتے گویاکہ وہ شیخ کا فرستادہ ہو۔ چنانچہ الہ آباد میں ہمارے ایک دوست اور حضرتؒ کے خداموں میں سے ایک صاحب ہیں جنکا نام "اشرف علی" ہے وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک دن حضرت والا تنہا اپنے حجرہ میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے میں حاضر ہوا اجازت لیکر سامنے فرش پر کچھ فاصلے سے بیٹھ گیا اتنے میں حضرت والا بھی پلنگ سے نیچے اتر کر اسی فرش پر

بیٹھ گئے میں نے ہرچند عرض کیا کہ حضرت آپ اوپر ہی تشریف رکھیں لیکن حضرت نے نہ مانا کچھ دیر کے بعد فرمایا کہ تم ہمارے شیخ کے ہمنام ہونا اسوقت اسی تصور کا غلبہ ہوا جسکی وجہ سے میں اوپر بیٹھنے پر قادر ہی نہ ہوسکا بھائی اشرف علی کہتے تھے کہ میں مارے شرم کے گڑا جاتا تھا لیکن حضرتؒ نے اپنے اس ارشاد میں ایک ایسا ادب تعلیم فرمایا کہ انشاءاللہ عمر بھر بھولنے والا نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس سلسلۂ صابریہ کی خصوصیت ہی ہے اور اسکا طغرائے امتیاز ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ صابر کلیریؒ کا واقعہ مشہور ہی ہے کہ بارہ برس مراقبہ میں مدہوش رہے لیکن پانچوں وقت جب اذان ہوتی آنکھ کھولدیتے اسی زمانہ میں انکے پیرومرشد حضرت فرید گنج شکرؒ نے ایک ڈوم خیریت حال طلب کرنے کے لئے بھیجا تو اس سے صرف اتنا پوچھا کہ "پیر اچھے ہیں؟" اور خود گولرا ابال کر بدون نمک کے نوش فرماتے تھے اسدن خادم سے فرمایا پیر کا ڈوم آیا ہے آج گولر میں نمک ڈال دینا۔ اسکے بعد وہ حضرت نظام الدین اولیاء کے یہاں بھی گیا وہاں شاہی ٹھاٹھ تھا اسی کے مطابق اسکی خاطر اور استقبال ہوا چلتے وقت انعام واکرام سے بھی نوازا گیا۔ اس نے حضرت فرید گنجؒ کی خدمت میں آکر دونوں جگہوں کا حال بیان کیا اور کہا کہ حضرت نظام الدین تو بہت اخلاق سے ملے لیکن صابر کلیری صاحب بہت خشک معلوم ہوتے ہیں وہ مجھے تو کیا پوچھتے آپ کو بھی نہیں پوچھا۔ شیخؒ نے فرمایا کہ آخر زبان سے کچھ کہا بھی یا نہیں کہا ہاں بس یہ کہا کہ "پیر کیسے ہیں"؟ اس پر حضرت فرید کو وجد آگیا اور فرمایا کہ جس مقام فنا میں وہ ہیں یہ انکا غایت کرم ہے کہ میں انکو یاد ہوں انکا اتنا پوچھ لینا ہی بہت ہے اور تمہارے لئے کھانے میں نمک ملانے کو جو کہا تھا یہ اُنکی طرف سے انتہائی خاطر تھی۔

غرض اس سلسلۃ الذہب کا خاص تحفہ ادب تھا جس سے اللہ تعالیٰ

نے ہمارے حضرت مصلح الامۃؒ کو بھی نوازا تھا۔ چنانچہ شاہ عبیداللہ صاحب توشیخ کی اولاد ہی میں سے تھے اسلئے حضرت ان سے بھی بہت محبت فرماتے تھے جس طرح کہ مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ کی اولاد ہونے کی حیثیت سے مولانا محمد میاں صاحب فاروقی مدظلہٗ کو بہت مانتے تھے۔

غرض ان ہی تین مقامات سے سلسلۂ صابریہ کی کچھ جھلک ملتی تھی۔ لیکن حضرت مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ نیز حضرت مولانا نعمت اللہ شاہ صاحبؒ اور مولانا حکیم سید فخر الدین احمد صاحب جعفریؒ کے وصال کے بعد الہ آباد تقریباً اس سلسلہ سے خالی ہو رہا تھا چنانچہ ایک موقع پر جبکہ حضرت مصلح الامۃؒ الہ آباد کے لوگوں سے ناراض ہوکر اہلِ فتحپور (تال نرجا) کی درخواست پر وطن تشریف لے گئے تو شہر الہ آباد سے بھی بہت سے حضرات ہمراہ سفر تھے اور فتحپور آتے جاتے رہے۔ اسی سلسلہ میں ایکبار حضرت شاہ عبیداللہ صاحب محب اللٰہی بھی تشریف لے گئے وہاں الہ آباد کے اور بہت سے حضرات تھے۔ شاکر خاں صاحب، وکیل انعام الحق صاحب بھی تھے کسی نے شاہ عبیداللہ صاحب سے یہ کہا کہ حضرت الہ آباد سے ناراض ہوکر تشریف لائے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اب الہ آباد واپس نہ جائیں کچھ اس سلسلہ میں آپ حضرت سے کہیئے شاہ عبیداللہ صاحب مدظلہٗ کا خود بیان ہے فرمایا کہ

"مجھے جب اس بات کا علم ہوا تو میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے تنہائی میں آپ سے کچھ کہنا ہے حضرتؒ نے فوراً لوگوں کو ہٹا دیا اور خلوت کردی میں نے عرض کیا کہ اب اس زمانہ میں سلسلۂ چشتیہ صابریہ کی حضرت ہی تو جان تھے۔ مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ۔ مولانا شاہ نعمت اللہ صاحب محب اللٰہیؒ اور مولانا حکیم شاہ فخر الدین صاحب جعفریؒ تک کچھ نہ کچھ کام ہوتا رہا

اور ہم لوگ تو ابھی صاحبزادے ٹھہرے، اس لئے آپ جب الٰہ آباد
تشریف لائے تو بڑی تسلی ہوگئی تھی کہ اگر کہیں گاڑی آٹکے گی
تو حضرت سنبھال لیں گے اب سنا ہے کہ حضرت تشریف
نہیں لیجائیں گے، یہ سنکر بڑا رنج اور قلق ہے۔

شاہ عبید اللہ صاحب مدظلہٗ فرماتے تھے کہ میری زبان سے یہ الفاظ سن کر حضرتؒ نے میرے مونڈھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ نہیں میں الہ آباد کو نہیں چھوڑوں گا الہ آباد کو نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے لوگوں سے آکر کہا کہ آپ لوگ اطمینان رکھیں حضرت الہ آباد واپس تشریف لیچلیں گے۔

اسی طرح سے ایک موقع پر حضرت اقدسؒ نے مولانا محمد میاں صاحب فاروقی سے دریافت فرمایا کہ:۔

"آپ نے تو حضرت مولانا تھانوی کو بھی دیکھا ہے اور وہاں
جو کام ہوتا تھا وہ بھی آپ کے پیش نظر ہوگا اس لئے آپ سے پوچھتا
ہوں کہ یہاں مجھ سے بھی اس نوع کا کچھ کام ہو جائے گا؟

مولانا محمد میاں نے عرض کیا کہ:۔

"حضرت یوں جانے کو تو میں تھانہ بھون بھی گیا اور حضرت تھانویؒ
کا زمانہ بھی پایا لیکن اپنی بدنصیبی کیوجہ سے محروم ہی رہا اور حضرتؒ
کے وصال کے بعد تو یہ سمجھ لیا تھا کہ اب کیا کوئی ایسا شفیق مصلح
ملے گا لیکن اللہ تعالیٰ کا کچھ ایسا فضل ہوا کہ حضرت (الہ آباد تشریف
لائے اور حضرت) سے تعلق ہوگیا اور اصلاح و سکونِ قلب کا
کامل ذریعہ ہاتھ آگیا۔ چنانچہ حضرت والا کی شفقت کچھ اس درجہ
اپنے اوپر بڑھی دیکھی کہ اب اپنی اصلاح کی امید ہونے لگی
ورنہ تو تھانہ بھون جاکر بھی یہ نالائق محروم ہی رہا۔

باقی حضرت نے جو یہ دریافت فرمایا ہے کہ مجھ سے طریق کا بھی کچھ نفع لوگوں کو پہونچے گا یا نہیں اسکے متعلق عرض کرتا ہوں کہ آئندہ حضرت کے فیوض و برکات کا سلسلہ کتنا وسیع ہوگا یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن ہم تو ان دو چار سالوں میں دیکھ رہے ہیں کہ ایسے ایسے لوگوں کو ہدایت ہوئی ہے جنکو دین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہی الہ آباد میں دیکھ رہا ہوں، یہی علی گڑھ کے بارے میں سنا اور یہی بمبئی میں دیکھا مجھے علی گڑھ کا حال پہلے کا بھی معلوم ہے، اور حضرت والا کے تشریف لیجانے کے بعد سے انگریزی دانوں اور ان لوگوں میں جنھیں آزاد خیال سمجھا جاتا تھا دین کی جانب بہت زیادہ نمایاں میلان پیدا ہوگیا۔ بمبئی خود میرا آنا جانا برابر ہوتا ہے میں جانتا ہوں کہ بعض میرے احباب جو بہت زیادہ آزاد تھے انکو نماز باجماعت اور تلاوت کا شوق پیدا ہو گیا اور الہ آباد تو میرا وطن ہی ہے میں یہاں کی فضا سے اور یہاں کے حالات سے بخوبی واقف ہوں لوگوں کی طبیعتوں کا پہلا رنگ بھی میرے سامنے ہے اور حضرت کی تشریف آوری کے بعد سے جو رنگ بدلا ہے وہ بھی میرے سامنے ہے۔ چنانچہ میں تو حضرت کے فیض کو روزافزوں ہی دیکھ رہا ہوں اور یہ دیکھ رہا ہوں کہ لوگوں کو حضرت کے باطن کا اور روحانیت کا فیض پہونچ رہا ہے۔ فالحمدللہ علی ذلک۔

ان دونوں حضرات (یعنی محمد میاں صاحب فاروقی اور شاہ عبیداللہ صاحب محب اللہی) کا بیان پیش کرنے سے مقصود یہ تھا کہ حضرت والاؒ نے اپنے قیام الہ آباد کو جو تجویز فرمایا اہیں حضرت کس قدر مصیب تھے کہ یہاں کے خواص بھی محسوس کر رہے تھے کہ اب الہ آباد کسی چشتی صابری شیخ سے خالی ہے اور عام لوگوں میں طریق کی پیاس موجود ہے اللہ تعالیٰ نے اسی لئے حضرت والا کے قلب میں ڈالا کہ الہ آباد قیام فرمائیں۔ چنانچہ الحمدللہ صرف حضرت اقدس کے

تشریف لے آنے کے بعد یہ جگہ دین و شریعت اور سلوک و تصوف کا ایک مرکز بن گئی اور خود اہل الہ آباد کو حضرتؒ سے بہت نفع ہوا۔

(بعض خواص اہل الہ آباد کے حالات)

ان تمام حضرات کا ذکر کرنا جنکو حضرت اقدس سے فیض پہونچا بہت مشکل ہے اور شاید حالات مصلح الامت کے طالب کے لئے تطویل کا باعث بھی ہو اس لئے بطور نمونہ میں پہلے چند علماء پھر اہل علم و دانش اور پھر چند ارباب محبت اور خدام کا ذکر کرتا ہوں

(۱) مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہریؒ: جہاں تک میرا خیال ہے الآباد کے علماء میں حضرت اقدسؒ سے استفادہ و قرب کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ مرتبہ پر جناب والد ماجد مولانا سراج الحق صاحب ہی کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ آپ درس نظامیہ کے فارغ التحصیل عالم تو نہ تھے بلکہ الہ آباد ہی کے کامل و فاضل وغیرہ فارسی میں اور پرائیویٹ ایف۔ اے کا امتحان انگریزی میں پاس کیا تھا لیکن حضرت مولانا تھانویؒ سے تعلق کے بعد سے حضرت کی کتابوں کے مطالعہ کا نیز حدیث و تفسیر کی کتابوں کا بھی دیکھنے کا شوق ہوا، استعداد علمی ماشاء اللہ جیّد تھی چنانچہ جلالین شریف، بیضاوی شریف، تفسیر ابن کثیر اور روح المعانی وغیرہ تفسیریں اور فتح الباری، بخاری شریف، مشکوٰۃ شریف مرقات وغیرہ حدیث میں اور ہدایہ فقہ میں بلا تکلف سمجھ لیتے تھے۔ حضرت تھانویؒ کی کتابوں کا مطالعہ اردو ہی میں کر لینے والا نصف عالم ہو جاتا ہے پھر والد صاحب تو عربی داں بھی تھے اور اُس زمانہ کے عالم و فاضل پاس تھے جبکہ نقل بازی کا رواج نہیں تھا اسی لیاقت کی وجہ سے گورنمنٹ کالج الہ آباد میں فارسی عربی کے مدرس ہو گئے یہاں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ کے فیض صحبت سے دین اور تصوف کا

رنگ اور زیادہ ہوگیا۔

حضرت الہ آبادیؒ کے بعد ہمارے حضرت مصلح الامۃؒ سے تعلق پیدا ہوا۔
حضرت تو اہل علم کے قدرداں تھے ہی اہل الہ آباد میں سے والد صاحبؒ کو نہایت
قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اپنی نظر توجہ فرماتے رہے۔ حضرت کے مضامین
مجلس جیسے کچھ دقیق ہوتے تھے جاننے والوں پر مخفی نہیں والد صاحبؒ کو ان مضامین
پر وجد آجاتا تھا اور بہت داد دیتے تھے جس سے حضرتؒ کو بہت مسرت ہوتی تھی۔
علم ادب اچھا تھا اسلئے حضرت والا کسی عربی یا فارسی کتاب کے بعض حصے کا
ترجمہ کرنے کا بھی حکم فرماتے تھے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ "مولوی صاحب! مبین
اور قمر الزماں کو بھی کوئی کتاب ادب کی پڑھا دیجئے"۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ
والد صاحبؒ کو تصنیف وتالیف کا بھی شوق تھا لیکن ذہن بچپن ہی سے چونکہ
اہل تشیع کی تردید کا خوگر تھا اسلئے اسی قسم کی کتابیں لکھیں مثلاً تحفۂ کربلا۔ سیرت
زین العابدین۔ اہلبیت واہلسنت۔ وفات سرور کائنات۔ اور اصلاح مسلمین
کے لئے فلاح وترقی کے اصول نیز مسائل حاضرہ میں خلافت وملوکیت کی حقیقت
تصنیف کیں اور مسلمانوں کو سنت سے قریب کرنے کے لئے معمولات نبوی لکھی
جو بہت مقبول ہوئی اور "مناجات مقبول کریمی میں جو اضافات ہیں وہ بھی جناب
والد صاحب کے ذہن کی پیدا وار ہیں" ان اضافات نے اسکو بہت زیادہ مقبول
بنا دیا ہے چنانچہ مناجات مقبول کریمی کے علاوہ وہ کہیں اور ملتے بھی نہیں۔

جو حضرات مجلس حضرت والا میں شریک ہوتے تھے وہ جانتے ہیں کہ
حضرت والا مولانا موصوف کو اپنے قریب ہی بلاکر بٹھاتے تھے اور کبھی کبھی ساری
مجلس آپ ہی سے مخاطب ہوتے۔ والد صاحب مرحوم حضرت والاؒ کے الہ آباد
تشریف لانے کے قبل کسی کسی مسجد میں قرآن شریف کا ترجمہ سنایا کرتے تھے
لیکن جیسا کہ قاعدہ ہے کہ ہر شخص کو ہر ایک سے مناسبت نہیں ہوتی اس لئے
اسکی سب باتیں پسند نہیں ہوتیں چنانچہ بعض حضرات والد صاحبؒ سے خوش نہ تھے

ادھر جب حضرت تشریف لائے اور وہ سب حضرات بھی حضرت کی مجلس میں آئے تو دیکھا کہ مولوی سراج صاحب کا یہاں بھی خاص مقام ہے لیکن حضرت کے طور و طریقے سے ناواقفیت کی بنا پر جب ایک روز یہ منظر دیکھا کہ حضرت والا بہت خفا ہیں اور مولوی سراج صاحبؒ کے سر کے اوپر اپنا ہاتھ مار رہے ہیں تو مجلس سے باہر آنے کے بعد اس قسم کے لوگوں نے باہم کہا کہ دیکھو ہم لوگ مولوی سراج صاحب کو جیسا سمجھتے تھے حضرت نے بھی آج اپنے عمل سے اسکی تائید فرما دی دیکھو نا آج کتنا پٹے ہیں (اگر ان میں خرابی نہ ہوتی تو انکی یہ پٹائی کیوں ہوتی) -

خدا جانے انکی یہ بات حضرت والا کے کانوں تک کیسے پہونچ گئی، فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون ان جاہلوں کے سامنے تو کچھ بات کرنا مشکل ہے دیکھو تو میں لوگوں کی عام بدحالی پر خفا ہو رہا تھا اور مولوی سراج صاحب سامنے بیٹھے ہوئے تھے اس سے انھیں کو مخاطب کر کے کچھ کہہ رہا تھا اور اس شخص نے اس سے کیا نتیجہ نکالا - خیر وہ دن تو گذر گیا اب دیکھئے حضرت والاؒ نے اپنی خداداد بصیرت سے ان کے خیالات فاسد کو کس طرح سے زائل فرما دیا کہ کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا اور ان کا پورا علاج فرما دیا -

ہوا یہ کہ دوسرے دن جب لوگ مجلس میں آئے تو حضرت والا اپنی جگہ سے مجلس میں ذرا دیر سے تشریف لائے اور آئے بھی تو جلال میں بھرے ہوئے آتے ہی فرمایا کہ اب میں یہ تو گوارا نہ کرونگا کہ روز آکر ٹخ ٹخ کروں اور آپ لوگ ٹس سے مس نہ ہوں میں مجلس ہی بند کر دوں گا جب تک یہ جان نہ لوں کہ کون مخلص ہے اور اخلاص کیساتھ آتا ہے، کون لوگ ہمارا تماشا بنانے کے لئے آتے ہیں اور سب حاضرین سے فرمایا کہ آپلوگ نیچے کے کمرے میں چلئے اور ایک ایک شخص آکر مجھکو اطمینان دلائے کہ وہ اخلاص سے اور کام کرنے کے لئے آتا ہے اور والد صاحب سے فرمایا کہ مولوی سراج صاحب آپ سب کو لیکر جائیے پہلے لوگ آپ کو مطمئن کریں اور آپ جب ان سے مطمئن ہو جائیے تو انکو لیکر میرے پاس آئیے۔

اب آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ ان لوگوں پہ جنھوں نے کل کچھ اور کہا تھا آج کیا گذر گئی ہوگی، اس طرح سے حضرتؒ نے سب پر یہ ثابت کر دیا کہ یہ معتوب نہیں ہمارے محبوب ہیں۔ آپ کے شہر کے عالم دین ہیں، انھیں حضرات سے تو مجھے کام لینا ہے جب یہی آپ کی نظروں میں معیوب ہونگے تو کام کیسے چلے گا؟ چنانچہ سب نے وعدہ کیا بالآخر والد صاحبؒ کی سفارش سے سب کی رسائی مجلس حضرت والا میں ہوئی۔

راقم عرض کرتا ہے کہ یہی وہ انداز اصلاح تھے حضرت مصلح الامتؒ کے دل جس کے لئے ترستا ہے اور اب کوئی نظر نہیں آتا ؎

سیدھے تیر و بے کماں کے جو دل شکار کرلے
ہم تو جلیلؔ ایسے قاتل کو ڈھونڈھتے ہیں

یوں والد صاحبؒ کو حضرت والاؒ کی طرف سے "اجازت" تھی لیکن والد صاحبؒ کے مزاج میں تواضع و انکسار حد درجہ تھی جس کے سبب چند ہی لوگوں کو اسکا علم ہو سکا حضرت اقدسؒ کی حیات مبارک میں تو کسی کی کیا مجال تھی جو اپنے اس منصب کا کسی سے ذکر کرتا بعد میں بھی والد صاحبؒ کا مذاق طبع اس قسم کی باتوں میں اخفا رہی کا تھا۔

بہرحال بمبئی میں بھی کئی دفعہ حضرت کی خدمت میں حاضری دی۔ سفر حج کے وقت بھی موجود رہے بلکہ حضرتؒ کے ایما سے معیت سفر کی تیاری میں لگ گئے روزانہ حج کمیٹی کا چکر لگاتے اور مایوس ہوکر واپس آجاتے کہ درخواست کی منظوری کی کوئی شکل نہیں نکل رہی ہے بالآخر ہم لوگوں کو پانی کے جہاز سے رخصت کرکے خود ہوائی جہاز سے سفر کا ارادہ کر لیا لیکن افسوس کہ مدینہ منورہ میں ہم سب سے تو ملاقات ہوگئی مگر حضرت اقدسؒ تو جدہ ہی میں ہم سب سے جدا ہو چکے تھے۔

حضرت والد صاحبؒ بھی ان چند حضرات میں سے تھے جن سے حضرت والاؒ اپنے گھر کے لوگوں کے متعلق مشورہ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ "حضرت نے قاری مبین صاحب مدظلہٗ کے سلسلہ میں میری رائے معلوم فرمانا چاہی اور اپنے خیال کا

اظہار فرمایا میں نے حضرت کی تائید کی جس سے حضرت خوش ہوئے چنانچہ حضرت قاری
صاحب مدظلہ سے فرماتے تھے کہ آپ کو حضرت والا نے اپنی جگہ بٹھایا ہے اسلئے
آپ کو بلاخوف لومۃ لائم کام کرنا چاہیئے اللہ تعالیٰ کی مدد آپ کے شامل حال ہوگی
چنانچہ جب تک زندہ رہے برابر مجالس میں شرکت فرماتے رہے۔ مدرسہ میں
بعض اسباق کے درس دیئے اور ہر طرح قاری صاحب مدظلہ کے رفیق ومعین
بنے رہے درمیان کے چند ماہ فتحپور ہسوہ کے مدرسہ اسلامیہ میں گذارے
بالآخر پھر الہ آباد آگئے اور ۲ر جون ۱۹۷۷ء کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو
رحلت فرمائی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃً۔

مولوی عبدالقدوس رومی سلمہ : راقم الحروف کے چھوٹے بھائی ہیں
اور اسمیں شک نہیں کہ الہ آباد سے فتحپور تال نرجا جانے والوں میں سبقت انھیں کو
حاصل ہوئی انھوں نے اپنا حال کسی موقع پر خود ہی لکھا ہے جو پہلے بھی کسی جگہ
آچکا ہے تاہم یہ موقع اسکے لئے زیادہ موزوں تھا اسلئے مکرر عرض ہے وہ لکھتے
ہیں کہ :۔

"حضرت مصلح الامۃؒ کی زیارت پہلی بار مسجد خواص لکھنؤ میں ہوئی تھی
جبکہ حضرت حکیم الامۃؒ بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے ہوئے تھے حضرتؒ
کی عیادت کیلئے حضرت مصلح الامۃ بھی لکھنؤ تشریف لائے تھے جسکی اطلاع
خط کے ذریعہ مجھکو بھی ہو چکی تھی میں ان دنوں سہارن پور میں زیر تعلیم تھا چنانچہ
وہاں سے الہ آباد جاتے ہوئے لکھنؤ اتر گیا بعد مغرب مسجد خواص پہونچا رات کا
اندھیرا شروع ہو چکا تھا سوچتا ہوا گیا کہ مسجد خواص پہونچکر کسی سے دریافت
کرنا پڑے گا (کہ حضرت مصلح الامۃ کون ہیں اور کہاں مقیم ہیں) پھر اطمینان سے
حضرت سے ملونگا مگر وہاں صورت عجیب پیش آئی وہ یہ کہ میں متجسسانہ انداز
میں جیسے ہی مسجد میں داخل ہوا اور ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اب یہاں کسی سے
دریافت کروں کہ ایک دم سے ایک بزرگ شخصیت نے شاید میرا طالبعلمانہ حلیہ

اور انداز تجسس دیکھکر ہی مجھکو پہچان لیا اور خود ہی آگے بڑھکر مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بڑی آہستہ اور دھیمی آواز سے فرمایا " وصی اللہ "

مزاج پرسی وغیرہ کی ضروری بات چیت کے بعد میں نے باہر جاکر کھانا کھانے کے لئے حضرت سے اجازت چاہی اور خیال تھا کہ ابھی واپس آتا ہوں لیکن مجھے کچھ دیر ہوگئی اور یہاں بعد عشاء مسجد کی روشنی بجھادی گئی اور شب خیز حضرات طریقۂ مسنونہ کے مطابق بعد عشاء فوراً ہی محو استراحت ہوگئے تھے اسلئے حضرت سے بھی اسوقت ملاقات نہ ہوسکی اور میں رات کی گاڑی سے الہ آباد چلا آیا ۔

پھر اسکے بعد سے خط وکتابت جاری رہی اور کچھ دنوں بعد جی چاہا کہ حضرت حکیم الامۃ سے کم ازکم بیعت ہی کی درخواست کروں اسکا ذکر پہلے اپنے حضرت مصلح الامت سے عریضہ میں کیا اجازت ومرضی معلوم ہوجانے کے بعد حضرت حکیم الامۃؒ سے درخواست کی جواب آیا کہ "تعلیم کے زمانہ میں بیعت مناسب نہیں ہے" جواب پڑھکر مایوسی ہوئی اور اسی مایوسی میں حضرت مصلح الامت علیہ الرحمۃ کو بھی ایک عریضہ تحریر کیا جسکا جواب سراپا تسلی یہ آیا کہ "آپ اپنے کو حضرتؒ ہی سے بیعت سمجھیں"

پھر دوسری بار حضرت مصلح الامۃؒ کی خدمت میں حاضری فتحپور ۱۹۴۲ء کے تاریخی زمانہ میں ہوئی جس سے کچھ ہی قبل اسٹیشنوں کی سوختت اور لائنوں کی توڑ پھوڑ ہوچکی تھی اور اسکے بعض آثار اسوقت بھی موجود تھے ۔ الہ آباد سے اندارا دہاں گھوسی وہاں سے براہ کاریسا تھ فتحپور پہونچا ۔ حضرت والاؒ کے مکان سے متصل جانب غرب مکتب کی عمارت میں قیام تھا اسوقت علٰحدہ سے خانقاہ کے نام سے کوئی عمارت نہ بنی تھی ۔ کھانے کا انتظام حضرت مصلح الامۃؒ کے دولت خانہ ہی سے تھا حضرت کی نشست گاہ ہی میں ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا مجھے کھلا دیا جاتا تھا ۔ چونکہ کوئی خادم وغیرہ مکان میں نہ تھا اس لئے

حضرت والا ہی کو یہ زحمت اٹھانی پڑتی یعنی اندر سے کھانا حضرت ہی کو بہ نفسِ نفیس لانا پڑتا لیکن کرتا کیا مجبور تھا بعد ظہر مجلس عام ہوتی جس میں قرب و جوار کے حضرات اور باہر سے آئے ہوئے مہمان شریک ہوتے۔ اشراق کے بعد بھی کبھی کبھی مجلس خاص ہو جاتی تھی بالکل وہی صورت تھی جو حضرت حکیم الامتؒ کی خانقاہ اشرفیہ میں دیکھی تھی۔

اس دفعہ حاضری شاید دو تین ہی دن کے لئے ہوئی تھی اسلئے جی چاہتا تھا کہ حضرت کی خدمت میں زیادہ سے زیادہ وقت گذرے چنانچہ حضرت والا سے مجلس اور اوقات حاضری سے متعلق معلوم کرنا چاہا تو فرمایا کہ تم دور سے تھوڑے وقت کے لئے آئے ہو جس وقت چاہو آجایا کرو چنانچہ دن کا اکثر حصہ حضرتؒ ہی کی خدمت میں گذرتا تھا۔

جب واپسی کا دن ہوا تو صبح حضرت نے نہایت شفقت و محبت کیساتھ ناشتہ کرایا اور واپسی کے سفر خرچ کے متعلق دریافت فرمایا کہ کرایہ ہے؟ پھر فرمایا کہ کتنے روپئے پاس موجود ہیں؟ احقر کے عرض کرنے پر جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ موجودہ رقم کرایہ کے لئے کافی ہے تو گویا گنج کے ایک حاجی صاحب کے ہمراہ (غالباً حاجی سلیمان صاحب مرحوم تھے) مجھے رخصت کر دیا۔ میں گویا گنج سے مئو پھر وہاں سے الٰہ آباد چلا آیا۔

الٰہ آباد سے تال تر جانے والوں میں سبقت کا پہلو راقم السطور کے لئے مقدر ہو چکا تھا بعد میں تو الدال علی الخیر کفاعلہ (بھلائی کا بتانے والا بھی مانند کرنے والے کے ہے) کی صرف تسلی ہی بنکر رہ گیا۔

میرے ساتھ تو حضرت اقدس کی یہ کرم فرمائیاں رہیں لیکن افسوس اس ناکارہ (رومی) کا ساتھ محرومی نے نہ چھوڑا اسلئے عمل تو کچھ کر نہ سکا البتہ محبت اور تعلق کیوجہ سے امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ آخرت میں اللہ تعالیٰ حضرت والاؒ ہی کے زمرہ میں محشور فرمائینگے کہ المرء مع من احب[۵] ارشاد نبوی ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرتؒ کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین

(انتہی)

---

۵ انسان اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس سے اسکو محبت ہو۔

۱۴۔ "مولوی قاری حبیب احمد صاحب مظاہری آپ مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کے فارغ التحصیل ہیں الہ آباد ہی کے ایک دیہات کے باشندے ہیں شہر کے ایک مشہور محلہ کٹرہ میں بینا شاہ کی مسجد میں آپ کے والد صاحب بچوں کو قرآن حفظ کراتے تھے ان کے وصال کے بعد لوگوں نے قاری صاحب موصوف ہی کو انکی جگہ مقرر کرلیا، اسوقت سے آپ اسی مسجد میں بچوں کو تعلیم دے رہے ہیں اور اپنے آنے کے بعد مدرسہ کو ترقی دی اور حفظ و ناظرہ کے علاوہ فارسی اور ابتدائی عربی تعلیم کا بھی انتظام فرمایا۔ نیز مسجد سے متصل زمین خرید کر اس پر مدرسہ کی مستقل عمارت تعمیر فرمائی۔ چنانچہ "مدرسہ عربیہ نعمانیہ کٹرہ الہ آباد" کے نام سے وہ ماشاء اللہ اسوقت ترقی پر ہے۔ آپ کا تعلق بھی ہمارے حضرت مصلح الامۃؒ سے ہوا اور حضرت والا کے الہ آباد تشریف لانے پر آپکو بھی استفاضہ کا زیادہ موقع ملا۔ حضرت اقدسؒ نے آپکو بھی اجازت دی چنانچہ الحمدللہ حضرت کے صحیح طریقہ کار پر خمول اور گمنامی کے ساتھ دین کی اشاعت کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔"

آپ نے اپنا واقعہ خود بیان کیا کہ میں دور سے آتا تھا اسلئے دیر ہو جاتی تھی لہٰذا مجلس میں پیچھے ہی جگہ ملتی تھی، ایک دن حضرت نے فرمایا قاری صاحب یہاں آگے تشریف لائیے چنانچہ مجھے قریب بٹھلالیا۔ اسکے بعد سے جب آتا وہیں قریب بیٹھتا تھا۔ ایک دن پھر کچھ دیر ہوگئی تو پیچھے ہی بیٹھ رہا حضرت کی نظر پڑی تو فرمایا "اور دور بیٹھو کہیں چھینٹ نہ پڑ جائے" مجھے یہ سنکر بڑی ندامت ہوئی اسکے بعد سے قریب بیٹھنے کا اہتمام کرنے لگا۔

قاری صاحب فرماتے تھے کہ مجھے یہ بھی تمنا تھی کہ حضرت اور لوگوں کے سر پر ہاتھ مار مار کر انکو متوجہ فرماتے ہیں کاش یہ شرف مجھے بھی نصیب ہوتا چنانچہ اسکے بعد ہی سے حضرت میری جانب بھی اسی طرح متوجہ ہونے لگے اور دونوں ہاتھ سے میرے سر پر تھپکی دینے اور متوجہ کرنے کیلئے میرا بھی سر ہلانے لگے اور پھر تو بعد میں زور زور سے سر پر ہاتھ پڑنے لگا۔ حضرتؒ انگوٹھی بھی پہنے ہوئے تھے اس لئے

بعض مرتبہ کٹاک سے وہ سر پر لگتی جس کی وجہ سے کچھ چوٹ بھی لگ جاتی تھی لیکن اس امر میں تخلف ہوتے کبھی نہیں دیکھا کہ حضرت والا نے بعد مجلس بوقت مصافحہ میرے سر کو اپنے سینۂ مبارک کے قریب کر کے میرے کان میں چپکے سے فرمایا کہ قاری صاحب آپکی توہین کرتا ہوں معاف کیجئے گا۔ حضرت کے اس فرمانے کیوجہ سے میں مارے شرم کے پانی پانی ہوجاتا۔

قاری صاحب مدظلہ نے فرمایا کہ ایک دن فجر کے بعد میں اپنے کمرہ میں سو رہا تھا خواب دیکھا کہ ایک بہت بڑا انجن جو کہ بہت ہی خوبصورت بھی تھا میری طرف چلا آرہا ہے اور تنہا انجن ہی تھا اس کے ساتھ ڈبے نہیں لگے تھے۔ مجھے گھبراہٹ ہوئی کہ یہ انجن کیوں میری طرف چلا آرہا ہے۔ اسی اثنار میں کسی نے حجرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا میں اٹھکر باہر نکلا اور دریافت کیا کون ہے؟ تو ایک صاحب نے کہا کہ حضرت مولانا تشریف لائے ہیں رکشے پر ہیں میں فوراً نیچے گیا اور حضرت کو لیکر اوپر کمرہ میں آیا، خیر اسوقت تو مجھے کچھ خیال نہ ہوا لیکن کچھ دنوں بعد پھر جب خواب یاد آیا تو ذہن گیا کہ اجی وہ انجن ہمارے حضرت والا ہی تھے ہماری اپنی گاڑی کا چلنا حضرت ہی کی ذات مبارک سے وابستہ ہے۔

ایک اور واقعہ حضرتؒ کی کرامت کے سلسلے میں قاری صاحب سے سنا فرماتے تھے کہ میرے استاد مولوی جلیل صاحب تبلاتے تھے (اور مولوی صاحب موصوف کو حضرت (قدس سرہٗ) سے احقر ہی نے ملایا تھا) کہ میں اپنے چھوٹے بچے کو لیکر ایک دن حضرت کی مسجد میں حاضر ہوا میں ابھی وضو ہی کر رہا تھا کہ وہ اندر جاکر نماز پڑھنے لگا اسی وقت حضرت والا بھی تشریف لائے دیکھا کہ بچہ دعار مانگ رہا ہے۔ جب وہ دعار سے فارغ ہوا تو حضرت نے انگلی کے اشارے سے اسکو بلایا اور اس سے فرمایا کہ تم کیا دعار مانگ رہے تھے اس نے کہا کہ حضرت میرا بھائی پاکستان میں ہے میں اللہ تعالیٰ سے دعار مانگ رہا تھا کہ یا اللہ تعالیٰ میرے بھائی صاحب آجائیں۔ حضرت نے برجستہ فرمایا اچھا گھر جاؤ وہ آگئے ہیں۔ چنانچہ

نماز سے فارغ ہو کر ہم لوگ جب گھر پہونچے دیکھا کہ واقعی وہ لڑکا آچکا تھا میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ کوئی شان نہ گمان حضرت کو اسکا آجانا کیسے معلوم ہوگیا اور کس طرح حضرت نے میرے نیچے سے فرمایا کہ جاؤ وہ آگئے ہیں، سوا اسکے کہ یہی کہا جائے کہ یہ حضرت والا کا صریح کشف اور کھلی کرامت تھی۔

(قاری حبیب احمد صاحب کا ایک عریضہ حضرت مصلح الامۃ کے نام)

عرض حال: ابتدا سے جب سے کہ اصلاحی تعلق پیدا ہوا آج تک کبھی بحمد اللہ اسکا وسوسہ بھی نہیں آیا (کہ میں کسی کو بیعت کروں) ہمیشہ ہمہ تن اپنا ہی غم رہا جب کبھی کوئی اس قسم کی فرمائش کرتا ہے تو حیرت اور بہت ہی ندامت ہوتی ہے سمجھا بجھا کر اسکو اپنے سے بے فکر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کبھی بھی آجتک یہ نہیں ہوا کہ جی خوش ہوا ہو کہ اچھا ہے ایک آدمی ہاتھ لگا۔ اگر کوئی نہ مانا تو حضرت کی خدمت اقدس میں عرض کیا اس شرمسار و بدکار کو اسکا بیحد اہتمام رہتا ہے کہ اپنی وجہ سے دین اور اکابر دین کی کسی درجہ میں بدنامی وانگشت نمائی نہ ہو۔

ارشاد مرشد: اللہ تعالیٰ آپ کے ارادہ میں برکت عطا فرمائے۔

عرض حال: مجھ سے بڑھکر قیامت اور دنیا میں کون روسیاہ ہوگا اگر محبوب بندوں کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں میری وجہ سے برا وسوسہ بھی پیدا ہونے لگے حق تعالیٰ ہی سے استمداد ہے کہ اس نسبۃ قدسیہ کی حفاظت فرمائے جو آبگینہ سے بھی زیادہ نازک ہے۔ بندہ میں ایسی طاقت کہاں۔ حضرت سے تعلق محض حفاظت دین وایمان کے لئے پیدا کیا ہے۔ بڑی خواہش یہی ہے کہ سنت کی حلاوت کسطرح نصیب ہو جائے

ارشاد مرشد: آمین۔ آمین۔

عرض حال: عزت و جاہ کے بارے میں حضرت ہی کی جوتیوں کے طفیل میں یہ عقیدہ راسخ ہو چکا ہے کہ یہ چیزیں اپنی جدوجہد سے حاصل نہیں ہو سکتیں، خدا جب چاہتا ہے عنایت فرما دیتا ہے۔

ارشاد مرشد : بیشک، بیشک

عرض حال : انکی طلب شعبہ دنیا مے باخصوص دین کی راہ سے قابل گریہ ہے۔ حضرت والا سے بھی دعا کی درخواست ہے انشاء اللہ تعالیٰ یہ خادم کبھی امانت میں خیانت کا قصد نہیں کر سکتا۔

ارشاد مرشد : دعا کرتا ہوں۔

عرض حال : حق تعالیٰ صدق اور اخلاص نصیب فرمائے، روز و شب ایسی سعی میں ہوں کہ دونوں جہان میں کام آوے تاکہ آخرت میں نجات اور دنیا میں حیوٰۃ طیبہ نصیب ہو۔

ارشاد مرشد : آمین۔ آمین (رجسٹر ۲ ص ۱۷۱)

(دوسرا ایک خط ملاحظہ فرمائیے)

عرض : بحمدہ تعالیٰ ... نہایت شوق و ذوق سے ہر کام ادا ہوتا رہتا ہے۔ طبیعت ہلکی رہی اور کسی قسم کا تکان وغیرہ نہ رہا تو ثمرۂ عاجلہ یعنی کیفیات وغیرہ سے بھی محرومی نہیں رہتی لیکن کسی حال میں کبھی بھی اس ثمرہ کے عدم سے متاسف نہیں ہوتا۔

ارشاد : بارک اللہ۔

عرض : معمولات پر استقامت کی توفیق کو خواہ کسی حال اور کسی طرح ہو ہزار نعمت سمجھتا ہوں۔ ظاہر و باطن تیزی کے ساتھ اپنے کام میں لگ رہے ہیں۔ قلب میں قوت یادداشت الٰہی اور عقیدت و محبت مرشد کا روز افزوں عقلاً و طبعاً اضافہ محسوس کر رہا ہوں۔ نماز میں دل ہیبت و عظمت الٰہی سے اکثر اوقات دبا ہوا پاتا ہوں۔ اکثر ذات پاک کی طرف توجہ رہتی ہے۔

ارشاد : الحمد للہ۔ الحمد للہ۔

عرض : ایسی نماز اس عاجز کو آجتک نصیب نہیں ہوئی تھی جیسی بہم صُحبت بابرکت کی بدولت ہو رہی ہے۔ صبح کی مجلس میں ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ تمام دن اسکا اثر

باقی رہتا ہے۔

ارشاد : مبارک ہو۔ مبارک ہو۔

عرض : مجلس کی حاضری میں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا جنت میں بیٹھا ہوا ہوں۔ الحمدللہ دنیا و مافیہا بھولی رہتی ہے۔

ارشاد : الحمدللہ۔ بارک اللہ۔

عرض : مجلس ختم ہوتے ہوتے ہر دن قلب میں ایک نئی لذت اور جدید ہمت اور حوصلہ لیکر اٹھتا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ ساری عمر میں ایمان کی لذت اب کچھ مل رہی ہے اور ایمان کے راستوں سے اب کچھ روشناسی ہو چلی ہے۔

ارشاد : الحمدللہ۔

عرض : شکر بر شکر یہ کہ الہ آباد کی تشریف آوری کی نعمت غیر مترقبہ سے نوازا۔ ان حضرات کو بھی حق تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ جنھوں نے حضرت والا تک ہمکو پہونچایا اور جنھوں نے اپنے کو اس طرح پیش فرمایا کہ حضرت والا نے ان پر اعتماد کرتے ہوئے قیام فرمایا۔ اور ہم تشنہ کام خدام الہ آباد کو اپنی عنایت و کرم کی بارش سے سیراب فرمایا

ارشاد : یہ سب افضال خداوندی ہے۔

عرض : (حضرت والا کی مجلس میں سنا ہوا) راہب کا یہ جملہ کہ " اے حنیفی ایک ساعت کی مشقت ابدالآباد کی راحت کے لئے برداشت کرلے " تمام اعمال میں بجلی کا کام دیتا ہے۔ اور حضرت کا یہ آیت تلاوت فرمانا کہ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا اکثر دہراتا رہتا ہوں اور بیشمار نفع ہوتا ہے۔

ارشاد : الحمدللہ۔

عرض : نیز اس ارشاد کی تکرار بھی اپنے لئے اکسیر اعظم پاتا ہوں کہ " اگر ہمارے باطنی عیوب پر لوگ مطلع ہو جائیں تو منہ پر اسقدر تھوکیں کہ ہم منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں، اللہ تعالیٰ کی ستاری کہ وہ ہماری حفاظت فرماتا ہے "

ارشاد : بیشک۔

عرض : اسکی برابر کوشش کرتا ہوں کہ ہر کام خدا کے لئے ہو اور نیت خیر کے ساتھ ہو نیت کا اہتمام کرتا ہوں۔ حضرت نے اپنی خاص عنایت سے اسطرف توجہ دلاکر قرب کے ایک بڑے وسیلہ سے روشناس فرمادیا۔

ارشاد : بیشک یہ قرب کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔

(قاری حبیب احمد صاحب کا تیسرا خط سفر حج میں جاتے ہوئے)

عرض : ہم خدام جسوقت رخصت ہوئے حضرت کا مزاج مبارک کچھ ناساز تھا اسلئے جی لگا ہوا ہے حق تعالیٰ کے دربار عالی میں درخواست ہے کہ حضرت کو شفائے کامل عنایت فرمائے امید کہ اب طبیعت ٹھیک ہوگی

ارشاد : الحمد للہ ٹھیک ہے۔ میری طبیعت آپ لوگوں کی طبیعت ٹھیک رہنے سے ٹھیک رہتی ہے۔

عرض : حضرت والا کی دعاؤں سے بیحد آرام رہا۔ ہمارے ڈبہ میں صرف حاجی حبان صاحب تھے اس ناکارہ خادم کو حضرت والا کے صدقہ میں تمام رفقاء سفر نے بہت آرام پہونچایا بہت خیال رکھتے تھے۔

ارشاد : کیا یہی سب اس سفر کا مقصد اعلیٰ ہے۔ انا للہ۔

عرض : جس دن سے حضرت نے یہ فرمایا ہے کہ یہ میرا ہے (اگرچہ اس روسیاہ کے اطوار ایسے نہیں) سمجھ میں نہیں آتا کہ اللہ کے بندے کس قدر خلوص و محبت سے پیش آتے ہیں۔ یا اللہ! اپنے نیک بندوں کے ظن کے مطابق اس نامہ سیاہ کو بھی نیک فرمادے اور حضرت ہی کے صدقے میں آخرت کی عزت بھی نصیب فرما اور شرمساری سے بچا۔

ارشاد : میں بیچارہ کیا چیز ہوں۔

عرض : حضرت والا نے فرمایا تھا کہ تین چیزیں خلاصۂ تصوف ہیں۔ ازالۂ غفلت۔ دفع رذائل اور قدر خواطر۔ الحمد للہ مختصر نسخہ سنکر بیحد خوشی ہوئی اور اسی وقت سے پلّے باندھ لیا۔

ارشاد: صرف خوشی سے کیا کام چل سکتا ہے۔

عرض: ذہن میں برابر انکا تکرار کرتا رہتا ہوں اور عمل کی کوشش کرتا ہوں ۔ اللہ تعالےٰ کے فضل سے بجد نفع محسوس کر رہا ہوں ۔

ارشاد: اگر یہ سب ہے تو غنیمت ہے ۔

عرض: دعاء فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس سفر کا ہم لوگوں کو کامل نفع نصیب فرمائے اور اس دنیائے دوں سے نفرت عنایت فرما کر اپنا بنالے ۔

ارشاد: آمین ۔

(اسکے ہمراہ یہ تحریر بھی بھیجی گئی)

سفر حج میں اصل فکر یہ ہونی چاہیئے کہ جا تو رہا ہوں اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے قبول فرمالیں تو سب کچھ ہے ورنہ سارا سفر ایک تعب ہی ہے اور احباب کی خدمت بھی سب ضایع۔ آپ نے اپنے خط میں مقصود کا ذکر تک نہیں کیا اور جو چیز بالکل غیر مقصود تھی اسکا سب سے پہلے ذکر کیا۔ یہ کیوں؟ اگر ان سب باتوں کا ذکر اسلئے کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک احسان کا جو اپنے اوپر ہے ذکر مقصود ہے تو خیر کر سکتا ہے لیکن اپنے شیخ سے جس کے سامنے فنا ہو کر پیش ہونا چاہیئے اس قسم کے عنوان سے اپنے کو پیش کرنا تو کسی طرح مناسب ہی نہیں تھا۔ بڑے لوگوں کی نظر بڑی چیزوں پر رہتی ہے۔ ایک عالم نے حضرت والا کو اسی سفر سے لکھا تھا کہ "حضرت سرنگوں جا رہا ہوں" اور چھوٹے بھیا لوگوں کی نظریں انھیں چیزوں پر محصور رہتی ہیں۔ اس قسم کے لوگ اس زمانہ میں زیادہ ہیں۔

یہ اسلئے کہا جا رہا ہے کہ اگر ان چیزوں پر نظر جم گئی تو یہ کچھ اچھی چیز نہیں ہے۔ نہایت مضر ہے۔ بہت لوگوں نے انھیں چیزوں میں مشائخ کو لے لیا ہے (یعنی انھیں اپنے درجہ سے گرا دیا ہے)۔ والسلام۔

(موصوف کا چوتھا خط سفر حج سے واپس آنے کے بعد)

عرض: مجالس مبارک کی برکت سے دل میں محبت الٰہی اور عظمت وتعلق کا روز افزوں اضافہ

پاتا ہوں ۔ ارشاد : ماشاء اللہ ۔ دل کی غذا ہی محبت الٰہی ہے ۔

عرض : محبت الٰہی سے زیادہ کسی چیز میں لذت نہیں پاتا

ارشاد : خوب ، بیشک یہی بات ۔

عرض : معاصی سے قلبی نفرت اور طاعت کیطرف طبعی رغبت بڑھتی جارہی ہے ۔ لوگوں کے معاملات سننے سے بھی وحشت ہوتی ہے ۔ ارشاد : الحمد للہ ۔

عرض : ہمہ وقت یکسوئی کے اسباب پر نظر رہتی ہے اور اسکو حق تعالیٰ کی ایک نعمت عظمیٰ سمجھتا ہوں بدون اسکے حق تعالیٰ سے تعلق رہنا مشکل ہے ۔ ارشاد : بیشک یہی بات ہے ۔

عرض : پوری نماز میں بار بار توجہ کی تجدید کرتا ہوں اور باری تعالیٰ سے ادائیگی حق کے قصور کا اعتراف کرتا رہتا ہوں ۔ ارشاد : خوب بات ہے ۔

عرض : اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ حضرت والا کے صدقہ میں "احسان" نہیں تو اسکی ادنیٰ جھلک ضرور پاتا ہوں ۔ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ پورا احسان نصیب فرمائیں ۔ ارشاد : ماشاء اللہ ۔ دعا کرتا ہوں ۔

عرض : تلاوت کا بھی یہی حال ہے کہ اس کا انداز طبعی طور پر بہت بدل گیا ہے ۔ بجائے ادھر ادھر جانے کے دل ادھر ادھر کے خیالات سے جان بچا کر زیادہ سے زیادہ متوجہ ہونے کی کوشش کرتا ہے ۔ ارشاد : خوب ۔ الحمد للہ ۔

عرض : نماز و تلاوت ختم کرتا ہوں تو دل میں ایک بڑے رنج کا اثر محسوس کرتا ہوں کہ افسوس بڑا قصور ہوا ادنیٰ حق بھی ادا نہ ہوا یہ عمر جو گذر رہی ہے واپس نہیں آسکتی ۔ قصور کا یہ حال ہے کس طرح منہ دکھا سکوں گا ۔ بعد طاعات استبشار شاذ و نادر ہی کبھی نصیب ہوتا ہے ۔ استغفار کرتا رہتا ہوں اور دل سے نادم ہوتا ہوں ۔ ارشاد : بہت مبارک حال ہے ۔

عرض : دل کا ہمہ وقت تقاضا ہے کہ عبد مخلص بننے کی جلد از جلد کوشش کر ۔ چنانچہ برابر زیادہ "اخلاص" کی کوشش کرتا ہوں ۔ الحمد للہ کہ حضرت کے یہاں سے یہ چیز بہت بڑی ملی ۔ ارشاد : الحمد للہ علی احسانہ ۔

عرض : دونوں پاک درباروں میں اسی کی بہت زیادہ دعا مانگی ۔ ارشاد : خوب کیا ۔

عرض : اپنی سعادت سمجھکر دونوں درباروں میں حضرت اور حضرت کے متعلقین کیلئے خوب ہی دعا کی بالخصوص فلاح دارین اور خدمت دین کی مزید توفیق مزید اخلاص و مقبولیت کی ۔ ارشاد : بہت خوش ہوا جزاکم اللہ تعالےٰ بڑا احسان کیا ۔